سچی کہانیاں، آپ بیتیاں، جگ بیتیاں

ماہنامہ

سرگزشت

کراچی

اگست 2013

نگرانِ اعلیٰ

معراج رسول

مشعل راہ: اس نابینا کی داستان جس نے ایشیا کا سب سے بڑا انعام جیتا

دیدہ ور: پنجاب کے [illegible] نابینا [illegible] داستان جس نے ایک تاریخ مرتب کی

اندھیرے اجالے: ایک عجیب و غریب سچ بیانی کہ وہ کبھی آنکھوں والی کہلاتی اور کبھی نابینا

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

جلد 23 ✿ شمارہ 09 ✿ اگست 2013ء

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مدیرہ اعلیٰ : عذرا رسول

مصور : شاہد حسین

شعبۂ اشتہارات

نیجر اشتہارات	محمد شہزاد خان	0333-2256789
نمائندہ کراچی	محمد رمضان خان	0333-2168391
	رانا محمد حمید	0323-2895528
نمائندہ لاہور	فراز علی بٹ	0300-4214400

◈◈◈

قیمت فی پرچہ 60 روپے ✿ زرِ سالانہ 700 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقامِ اشاعت: C-63، فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ، کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس، ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط و کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200 Fax :35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

MEMBER APNS CPNE

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!
السلام علیکم!

اسرائیل نے دعویٰ کیا ہے کہ وہ ایٹم بم بنا لینے کے قریب ہے۔ اس نے یہ بھی کہا ہے کہ ایسا اس نے بحالتِ مجبوری کیا ہے کیونکہ ایران نے ایٹم بم بنالیا ہے جس کی وجہ سے اس کی سالمیت کو خطرہ ہے۔ ایران سے اسے خطرہ ہو یا نہ ہو لیکن اسرائیل سے پورے عالم اسلام کو خطرہ ہے۔ ماضی میں اس نے عرب ممالک کے ساتھ جو کچھ کیا اسے نظر انداز کردیا جائے تو بھی اس کے جرائم کی فہرست بہت لمبی ہے۔ اس فہرست میں 9/11 کی واردات بھی ہے جسے زبردستی مسلمانوں کے سر تھوپا گیا اور اس کی آڑ لے کر مسلمانوں کو پوری دنیا میں رسوا کیا گیا۔ شدومد سے زہر اگلا گیا۔ یورپ کے بیشمار شہروں میں مسلمانوں کی املاک کو نقصان پہنچایا گیا۔ راہ چلتے مسلمان راہگیروں کو قتل کیا گیا۔ مساجد میں توڑ پھوڑ اور آتش زنی کی گئی۔ مسلم ممالک کے خلاف محاذ تیار کیا گیا۔ گویا اس ایک واردات نے پوری دنیا میں مسلمانوں کو دہشت پسند کے طور پر متعارف کرادیا ہے۔ بات یہیں تک محدود نہیں رہی، عالم اسلام کا ہر ملک انتشار کا شکار ہوگیا۔ ایسا لگتا ہے جیسے ایک عالمی سازش رچی گئی ہے کہ تمام مسلم ممالک کو تباہ و برباد کردیا جائے۔ عراق و افغانستان تو کھنڈر بن ہی چکے تھے، لیبیا، شام اور مصر بھی اسی قطار میں آگے ہیں۔ بحرین اور تیونس کی حالت بھی دگرگوں ہے۔ متحدہ عرب امارات اور سعودیہ بھی خوفزدہ ہیں کہ تمام غیر ملکیوں کو بے دخل کرتے جارہے ہیں۔ پاکستان بھی دہشت گردی کی لہر سے لرزاں ہے۔ اس تناظر میں عالمِ اسلام کا جائزہ لیا جائے تو ایک ہی بات سمجھ میں آرہی ہے کہ ہر مسلم ملک کو غیر مستحکم کرنے کی ایک مربوط سازش تیار کی گئی ہے۔ ہمارے خیال سے اس سازش کا بس ایک ہی علاج ہے جسے برسوں پہلے علامہ اقبال نے بیان کیا تھا ؎

ہوس نے کردیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہوجا، محبت کی زباں ہوجا

معراج رسول

نابینا بینا

وہ گیارہ بہن بھائیوں میں ساتویں نمبر پر تھا۔ اس کے ماں باپ اس سے بہت پُرامید تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ آگے چل کر خاندان کا نام روشن کرے گا۔ مگر جب وہ صرف تین برس کا تھا تو اس کی آنکھوں میں انفیکشن ہوگیا۔ اس گاؤں میں آنکھوں کا کوئی باقاعدہ ڈاکٹر تو نہیں تھا لیکن ایک ہرفن مولا قسم کا جراح ضرور موجود تھا جس کا دعویٰ تھا کہ وہ دنیا کی ہر بیماری کا علاج کرسکتا ہے۔ اس کا باپ اسے اس جراح کے پاس لے گیا۔ اس جراح نے نہ جانے کون سی دوائی استعمال کرائی کہ اس کی بینائی ہی ختم ہوگئی۔ وہ بالکل نابینا ہوگیا۔ مگر اس بچے کو علم حاصل کرنے کا شوق تھا۔ اس نے اپنے اساتذہ کی توجہ اور محنت سے قرآن شریف حفظ کرلیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے فقہ، احادیث اور تاریخ کا علم بھی حاصل کرلیا تھا۔ مکتب سے فراغت کے بعد اس نے الازہر یونیورسٹی میں داخلہ کی درخواست دی۔ ایک اس کی غربت اور دوسرے اس کا نابینا پن، جواب انکار میں آیا تو اس نے چیلنج کیا کہ اگر وہ داخلے کے قابل نہ ثابت ہو تو اس پر ہمیشہ کے لیے الازہر کے دروازے بند کردیے جائیں۔ سخت مقابلے کے بعد اسے امتحان میں بیٹھنے کی اجازت دے دی گئی جہاں اس نے نمایاں کامیابی حاصل کی۔ پھر وہیں سے اس نے عربی لٹریچر میں PHD کی اعلیٰ ترین سند حاصل کی۔ اس نے عربی کے معروف شاعر ابوالعالی المیرہ پر مقالہ لکھا تھا۔ اس کے بعد اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ ترقی کی منازل طے کرتا چلا گیا۔ اس نے پورے مصر میں اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے دھوم مچادی تھی۔ قاہرہ یونیورسٹی نے اسے عربی کا پروفیسر مقرر کردیا۔ اس کے علاوہ وہ سکندریہ یونیورسٹی کا بانی ریکٹر بھی تھا۔ اس دوران اسے فرانس میں اسکالرشپ مل گئی اور وہ حصولِ تعلیم کے لیے فرانس پہنچ گیا۔ وہاں اس کی ملاقات سوزانے نامی ایک خاتون سے ہوئی جو اسے فرانسیسی سکھانے لگی۔ سوزانے اس کی صلاحیتوں سے اتنی متاثر ہوئی کہ اس نے شادی کی پیشکش کردی ــــ سوزانے نے یہ رشتہ آخری عمر تک نبھایا تھا۔ اس کی دو اولادیں ہوئیں، امینہ اور مونس۔ امینہ بھی بے انتہا ذہین ثابت ہوئی۔ وہ پہلی عورت تھی جس نے قاہرہ یونیورسٹی سے ماسٹر کیا تھا۔ وہ کئی برس تک فرانس میں رہا۔ یہاں اس نے بہت کام کیے۔ ناول لکھے، مضامین لکھے، اس کی تحریروں میں ایسا اثر تھا کہ اس کو پڑھنے والے اس کے گرویدہ ہوجاتے۔ فرانس میں رہ کر اس نے دوسرا PHD بھی کرلیا اور 1919ء میں وہ فرانس سے مصر واپس آگیا۔ مصر آنے کے بعد اسے قاہرہ یونیورسٹی کا پروفیسر بنایا گیا تھا۔ 1950ء میں اسے مصر کا وزیرِ تعلیم بنادیا گیا تھا۔ اس نے تعلیم کے فروغ کے لیے بہت کوششیں کیں اور اس کی کوششوں سے مصر میں جدید تعلیم کے امکانات روشن ہونے لگے۔ اگرچہ اس کے کئی ناول منظرِ عام پر آچکے تھے لیکن یورپ اور مغرب میں اس کا تعارف اس کی سوانح عمری ''الایام'' سے ہوا (The Days) اس کتاب نے جیسے پوری دنیا کو اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا۔ اسے مصر کا سب سے ذہین اور روشن دماغ دانشور اور ادیب سمجھا جانے لگا۔ پھر اس نے قبل از اسلام کے ادب کی تاریخ لکھنی شروع کی۔ اور یہیں سے وہ ایک متنازعہ حیثیت اختیار کرتا چلا گیا۔ اس کا نظریہ تھا کہ قرآن میں جو تاریخی واقعات بیان کیے گئے ہیں، ان واقعات کو تاریخی اعتبار سے بالکل درست نہیں لینا چاہیے۔ کیونکہ وہ واقعات سمجھانے کی غرض سے مثالوں کے ذریعے بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے اس نظریے نے ایک آفت برپا کردی۔ بہت سے لوگ اس کے مخالف ہوگئے لیکن اس نے یہ بات ایک محقق ہونے کی حیثیت سے کہی تھی۔ اس کا دوسرا خیال تھا کہ مصریوں کی تاریخ، اسلام کی تاریخ سے کہیں زیادہ قدیم ہے۔ اس لیے مصریوں کو اپنی جڑیں قبل از اسلام (یعنی فراعنہ مصر کے عہد میں) ... تلاش کرنی چاہئیں۔ وہ ایک طرف تاریخ، رومن اور یونانی لٹریچر پر عبور رکھتا تھا تو دوسری طرف وہ عربی کا بھی پروفیسر تھا۔ اس کے چاہنے والے لاکھوں کی تعداد میں تھے۔ اس کی کتاب Pre-Islamic Poetry نے ایک طوفان برپا کردیا تھا۔ اسے اس کے عہدوں سے ہٹادیا گیا لیکن فوراً ہی قاہرہ کی امریکن یونیورسٹی نے اسے اپنے یہاں رکھ لیا۔ جہاں سے وہ 1944ء میں ریٹائر ہوا۔ اس کی تصانیف کی فہرست بہت طویل ہے۔ Wednes day Conversations (مضامین کا مجموعہ) The Sufferers اور A man of Letters (ناول) ابن خلدون، مصر کی تہذیب کا مستقبل اور تاریخ وغیرہ وغیرہ۔

دنیا کی ہر بڑی زبان میں اس کی کتابوں کے ترجمے ہوچکے ہیں۔

مصر کے اس عظیم دانش ور، ناول نگار اور شاعر کو دنیا طٰہٰ حسین کے نام سے جانتی ہے جس کا انتقال 28 اکتوبر 1976ء کو ہوا اور یہ عظیم شخص نابینا تھا، مکمل نابینا۔

شہرِ خیال

☆محمد عمران جونانی نے کراچی سے لکھا ہے" سرگزشت کے پرانے شمارے کہیں سے ہاتھ آئیں تو ضرور حاصل کرتا ہوں، کچھ روز قبل اپنے مخصوص بک اسٹال پر چکر لگا یا تو حسین اتفاق سے دس پرانے شمارے اچھی حالت میں ہاتھ آئے، دل خوش ہو گیا۔ مارچ 99 کے شہرِ خیال کے آخر میں نہ شاملِ اشاعت خط لکھنے والوں کے ناموں کے ساتھ کچھ لوگوں کو مختصر جوابات بھی دیئے گئے تھے جیسے آپ کی فرمائش نوٹ کرلی گئی ہے۔ وغیرہ...... بعد میں یہ سلسلہ بند کیوں کر دیا؟ (اب بھی اگر کوئی جواب طلب خط ہوتا ہے تو جواب دیا جاتا ہے) کراچی کے رہائشیوں کو فائدہ ہے کہ شمارہ وقت پر مل جاتا ہے۔ معراج صاحب اب بڑے سے بڑا سانحہ بھی ہمارے رہنماؤں کی زبان کھلوانے میں ناکام رہتا ہے جب تک ان کا اپنا ذاتی فائدہ شامل نہ ہو۔ جس طرح حادثہ کی صورت میں تھانہ اہلکار حدود کے لیے لڑتے ہیں بالکل اسی طرح کہا گیا کہ قائد کی قیام گاہ کی تباہی کا معاملہ صوبائی حکومتوں کے زیرِ تحت آتا ہے۔ اب تو یہ ڈر ہے کہ" اپنے خنجر سے آپ خودکشی "کرنے والی علامہ کی بات ہمارے اوپر صادق نہ آرہی ہو۔ ڈاکٹر ساجد صاحب کا یہی کمال ہے کہ ان کا مضمون پڑھتے ہوئے مرکزی کردار سے ہی نہیں دوسری نابغۂ روزگار شخصیات سے بھی ملاقات ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر غلام جیلانی صاحب کی سوانح نے بہت متاثر کیا۔ ایسے ہی لوگ اردو ادب کے ماتھے کا جھومر ہیں جن پر پورے اعتماد سے فخر کیا جاسکتا ہے، شاعری نثر نگاری تقریر غرض ہر شعبہ میں مہارت سے آگے بڑھنا اللہ کی عطا کردہ خاص صلاحیتوں کا مظہر ہے۔ ایسا زرخیز ذہن ہر کسی کو عطا نہیں ہوتا۔ ساتھ ہی ساتھ خاندان، مخلص دوستوں اور شاگردوں کا ایسا کارواں ملا کہ خوش بختی پر کوئی کلام نہ رہا۔ واہ بشیر مرزا صاحب واہ! اتنے بڑے پیدائشی فنکار ہونے کے باوجود ایسے عجیب ڈھنگ سے زندگی گزاری کہ نہ یہاں کے رہے نہ وہاں کے، تھوڑی سی پلاننگ، درست فیصلے، نفسانی ناجائز خواہشات کو لگام دے کر انسان دنیا و آخرت کے لیے خیر ہی خیر پاتا ہے بصورت دیگر انجام شکیل صدیقی صاحب کی تحریر کی صورت میں سامنے ہے۔ ابن کبیر صاحب کی سنسنی خیز تحریروں میں دو پیار کرنے والوں کا ذکر ضرور ساتھ چلتا ہے۔ "عفریت" نے امریکی طوفان سینڈی کے بارے میں لکھی گئی تحریر کی یاد تازہ کردی، پڑھنے میں بہت مزہ آیا ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کراچی کے کیپری سنیما میں بیٹھ کر" جراسک پارک" دیکھ رہے ہیں...... یہ عزم و ہمت، حوصلہ اور شوق کی داستان ہے جو طارق عزیز خان کے قلم کی بدولت "بلند حوصلہ" کی صورت میں ہم تک پہنچی۔ اس سے قبل انہی صفحات میں Reinobl Messner کا تفصیلی تذکرہ پڑھ چکے ہیں، سرگزشت کا خاصہ ہی دریا کو کوزے میں بند کرنا ہے۔ دنیا جہان کی کہانیاں ایک ہی جگہ دستیاب وہ بھی نہایت آسانی سے۔ ماؤنٹ ایورسٹ کی تسخیر سے متعلق اہم معلومات پرمبنی تراشہ خزانہ ثابت ہوا۔ فضائی حادثوں کا شکار ہو کر ہمت نہ ہارنے والوں کا تذکرہ اکثر سرگزشت کا حصہ بنتا ہے اور ہر بار جینے کی ایک نئی امنگ حاصل ہوتی ہے، زندگی لکھی ہو تو موت خود اس کی حفاظت میں لگ جاتی ہے کہ یہ امانت اسی کی ہے۔ "ہمتِ مرداں" امجد رئیس کی مختصر مگر دلچسپ کتھا ثابت ہوئی۔ آفاقی صاحب اپنے مخصوص انداز میں بابو صادق سے متعارف کرواتے نظر آئے ان کے بارے میں ضمنی طور پر پہلے بھی پڑھا تھا، موت سے چند روز قبل لاہور آنے کا پڑھ کر اس یقین کو تقویت ملی کہ جیسے موت کا وقت متعین ہے اسی طرح تدفین کی جگہ بھی۔ اس مرتبہ فلمی الف لیلہ بہت ساری وجوہات کی بنا پر خاص تھی۔ علامہ اقبال کے آباؤ اجداد کے بارے میں گراں قدر معلومات نے سیراب کیا۔ وہ واقعی عظیم ماں باپ کی اولاد تھے۔ علامہ کی زندگی کے کچھ روحانی گوشے اب بھی یقیناً راز ہیں جنہیں بس اللہ ہی جانتا ہے۔ اس کے بعد آفاقی صاحب کے اعزاز میں ہونے والی دلچسپ تقریب کا احوال سامنے آیا، سونے پہ سہاگا، آفاقی صاحب اور اس دور کی دوسری باکمال ہستیوں کی تازہ تصویر ٹھہری، دل خوش ہو گیا۔ ترکی سفرنامہ میں باسفورس کی سیر نے تازہ دم کر دیا آتش کی تھکن اتر گئی۔ قاری کو ساتھ لے کر چلنا اسی کو کہتے ہیں۔ حضرت ایوب انصاریؓ کے مزار کی حاضری کے تفصیلی احوال کا انتظار رہے گا...... اقبال احمد صاحب کی "مہا شکاری" ایک ہمہ جہت تحریر ہے جو بلاشبہ عرصہ تک یاد رہے گی، ان چند صفحات میں ایک دنیا آباد تھی۔ شکاریات کی سنسنی، اس زمانے کے ہندوستان کا احوال، لوگوں کا رہن سہن، طرزِ زندگی، ساتھ ہی ساتھ یہ ایک کامیاب ادیب کی بھی کہانی ہے جسے فوٹو

گرانی کا بھی شوق تھا۔ کیا کہنے آپ کے انتخاب کے، مزہ آگیا۔ پہلی سچ بیانی "محسنہ" واقعی اس قابل ہے کہ اسے اول نمبر دیا جائے۔ عابد کی پہلی بیوی رخسانہ والا رویہ آج کل بہت سی نئی نویلی دلہنوں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ صبر شکر کے ایسے ثمرات ہیں کہ پھر کسی شے کی حاجت باقی نہیں رہتی بصورت دیگر پورا خاندان تباہ ہو جاتا ہے۔ زندگی نام ہی اتار چڑھاؤ کا ہے۔ نگار اور عابد خوش قسمت ہیں کہ ذرا سی غفلت سے ہونے والے اتنے بڑے حادثے کے بعد بھی ایک فرشتہ صفت مسیحا کی بدولت ان کی زندگی معمول کی ڈگر پہ آگئی۔ عمران کی "عورت ایک پہیلی" حقیقت سے کچھ دور لگی لیکن اس دنیا میں ناممکن کچھ نہیں۔ اتنے عرصہ تک انجان عورت کو اپنے گھر میں رکھنا شدید نقصان کا باعث ہے، اور ظاہر ہے اس کی اجازت نہ دین میں ہے نہ دنیا میں۔ کچھ تذکرہ "شہرِ خیال" کا ہو جائے۔ رانا محمد شاہد صاحب نے بجا فرمایا کہ اللہ یقیناً یہ نہیں چاہتا کہ ہنستے مسکراتے چہرے آنسوؤں میں بھیگ جائیں۔ ڈرائیور کے پاس لائسنس تک نہیں، الیکٹرک وائرنگ معیاری نہیں اور پھر جس طرح ہمارے ہاں ڈرائیونگ ہوتی ہے الامان الحفظ۔ اللہ لواحقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ خاتون ٹیچر جو بچیوں کو بچاتے ہوئے جاں بحق ہوئیں ان کا عمل اس بات کا واضح اشارہ ہے کہ ابھی معجزہ کی امید باقی ہے۔ محترمہ صوبی شاہ! ہم نے دنیا ہی کو سب کچھ جان لیا ہے جب تک یہاں سے جانے کا پکا یقین نہیں ہوگا انسان دوسروں پر خرچ کیسے کرے گا؟ وحید ریاست بھائی صاحب، اللہ آپ کو مکمل صحت عطا فرمائے اور دل سے نکلی دعائیں قبول فرمائے، شعر آپ نے بہت خوبصورت نقل کیا۔ سچ بیانیوں کے حوالے سے منظر علی خان صاحب کا بے لاگ تبصرہ پسند آیا، کسی نے سچ بیانیوں پر اتنا نہیں لکھا۔ طاہرہ گلزار صاحبہ کا He is pakistani اور See he is Paki والا جملہ زبردست ہے۔ بات سچی ہو تو اسی طرح دل کو لگتی ہے جیسے آپ کا خط۔ شہرِ خیال کے اکثر خطوط پہ آپ نے تبصرہ کیا، پڑھ کر لطف آیا۔ سدرہ بانو صاحبہ کی بات سے مکمل اتفاق ہے کہ امریکی حکومت کم سے کم اپنی عوام کے ساتھ تو ضرور مخلص ہے وہ لوگ کسی بھی چھوٹے بڑے واقعے کو ناک پر بیٹھی مکھی کی طرح اڑا نہیں دیتے بلکہ بات کی تہ تک جاتے ہیں۔ سدرہ انجم صاحبہ! خوش آمدید بھلی کرے آیا۔ سعید احمد چاند صاحب کو غیر حاضری کے بعد دوبارہ دیکھ کر خوشی ہوئی۔ کیا بات ہے جی آپ نے تو دلیپ صاحب کی حمایت کرتے ہوئے سائرہ بانو کی تین نسلوں سے پردہ ہٹا دیا۔ ویسے ایک بات تو طے ہے کہ دلیپ صاحب ہم پاکستانیوں کے دل میں بستے ہیں۔ احسان سحر کا خط اپنائیت بھری فرمائش لیے ہوئے نظر آیا یہ اور بات ہے کہ اکثر فرمائش سرگزشت ایڈوانس میں پوری کر چکا ہے لیکن کرکٹرز کے بارے میں مضامین واقعی کم ہیں۔ (نہیں جناب، ایسا کوئی اہم کھلاڑی نہیں بچا جس پر تحریر نہ لکھی ہو) ڈاکٹر روبینہ ثاقب انصاری صاحبہ آپ ایک حساس اور باشعور دل کی مالک ہیں۔ آپ نے سچ کہا کہ ہمارے ہاں سسرال کے معاملات ایسے الجھے ہوئے ہوتے ہیں کہ انسان اکثر مقامات پر صرف سوچتا رہ جاتا ہے۔"

☆حمیرا کریم نے پشاور سے لکھا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ یہ خط کافی پہلے چلا ہے محکمہ ڈاک کی مہربانی سے اب ملا، انہوں نے لکھا ہے" اک طویل عرصہ بعد سرگزشت میں حاضری دے رہی ہوں دل تو بہت چاہتا ہے کہ شہرِ خیال میں وقتاً فوقتاً شامل ہوتی رہوں لیکن سرگزشت جب تک Complete کروں تب تک خط بھیجنے کی تاریخ گزر جاتی ہے۔ یہ بیت بازی میں آپ نے عجیب اصول رکھا ہے کہ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کر سکتے ہیں۔ اب بھلا بتاؤ کہ اگر اس سارے Pege میں کوئی ایک شعر بھی پسند نہ آیا ہو تب کیا کریں؟ (گزشتہ یا گزشتہ سے پیوستہ ماہ کے شمارے سے اشعار منتخب کر کے جواب دے دیں) میرا بہت دل کرتا تھا کہ سرگزشت کے انعامی علمی آزمائش کے سلسلے میں بھی باقاعدگی سے شرکت کروں کہ شاید کبھی تو ہم بھی انعام پا ہی جائیں؟ بات کسی لالچ کی ہرگز نہیں ہوتی۔ یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہوتی ہیں جیت کی۔ اور یہ چھوٹی چھوٹی خوشیوں کے پھول ہماری زندگی میں، کبھی کبھار کتنے رنگ بکھیر دیتے ہیں اس کا اندازہ صرف ہم جیسے محروم لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ ہم ایسے لوگ جو شاید قدرت کی طرف سے محروم رکھے گئے۔ سرگزشت میں روحانی سے متعلق بھی تحاریر دیا کریں۔ پہلے تو باقاعدگی سے نظر آتی تھیں ایسی تحریروں میں وقفہ ہوتا گیا ہے۔ میرے لیے ہدایت و مغفرت کی دعا ضرور کریں میرے قارئین بہن بھائی۔ والسلام۔"

☆تنویر اقبال تنویر، واگھورو نے دریا خان بھکر سے لکھا ہے" سرگزشت کے لیے افسانہ" اپنے حصے کا کردار" لے کر حاضر ہو رہا ہوں۔ میرا یہ افسانہ پہلے بھی دو پرچوں میں شائع ہو چکا ہے۔ اب ایک کاپی سرگزشت کے لیے ارسال کر رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے سرگزشت کے قیمتی صفحات میں سے کچھ گنجائش" اپنے حصے کا کردار" کے لیے نکل آئے گی (معذرت کے ساتھ پوچھنا پڑ رہا ہے کہ یہ بات کس نے بتائی ہے کہ سرگزشت میں افسانے چھپتے ہیں یا دوسری جگہ شائع شدہ مواد چھپتا ہے۔ سرگزشت کا اپنا مزاج ہے اور صرف سچی، آپ بیتی ہی چھپتی ہیں، پلیز! ایک بار سرگزشت پڑھ لیں)"

☆ڈاکٹر روبینہ نفیس ثاقب بھکر سے رقم طراز ہیں" شہرِ خیال کے باسیو، آپ سب کیسے ہیں؟ رانا شاہد کرسی صدارت پر براجمان ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔ پتا نہیں کیوں ہر بار میرا خط لاسٹ میں شائع ہوتا ہے شاید نواز شریف کو ووٹ دینے کی یہ سزا ہے (مہنگائی اور لاقانونیت میں جو اضافہ ہوا اسے کیوں بھول گئیں؟ اس کی وجہ کون ہے) سعید احمد چاند، آپ کو یاد کرتے کرتے تو میرے سر کے بال بھی کالے ہو گئے، اور آپ کہہ رہے ہیں کہ ہمیں بھلا دیا...... ارے چاند جی، ہم ہیں وفا کے عادی ہر دم وفا کریں گے۔ سدرا انجم، میری جان، کیا کرو گی میرا دکھ جان کر، تم بھی دکھی ہو جاؤ گی، آپ دعاؤں میں یاد رکھنا، اور خوش رہا کرو طاہرہ گلزار، مرد کا کام ہی عورتوں کو دیکھ کر دل تھام لینا، دھوکا دینا ہے اور تو بے چاروں کے پاس کرنے کو کوئی کام رہ نہیں گیا ہے۔ میری طرف سے آپ سب کو رمضان شریف کی مبارک باد۔ اللہ پاک ہم سب کو روزے رکھنے عبادت کرنے کی توفیق دے (آمین) پلیز آپ سب مجھے اپنی دعاؤں میں ضرور یاد رکھیں۔ میں بھی سب کو دعاؤں میں شامل رکھوں گی۔ کہانیوں میں "محسنہ" نے دل و دماغ کو ہلا دیا، جیسے جیسے کہانی انجام کو پہنچتی رہی میری آنکھیں برستی رہیں۔" وہی ہوتا ہے" بھی اچھی لگی۔

☆ محمد اجمل خان، بلمورک، میامی امریکا سے رقمطراز ہیں "میں امریکا میں مقیم ہوں اور آپ کے ماہ نامہ کا قاری ہوں بلکہ سارے اہلِ خانہ بڑے شوق سے پڑھتے ہیں (خوش آمدید اور پسندیدگی کا شکریہ) معیار اور مواد اچھا ہوتا ہے۔ امید ہے کچھ مزید بہتر بنانے کی سعی کریں گے۔ (ہماری ہمیشہ یہی کوشش ہوتی ہے) کچھ فیض، ساحر لدھیانوی، امرتا پریتم، اسرار الحق مجاز، مجروح سلطانپوری، شکیل بدایونی کی سوانح کے متعلق بھی لکھیں کہ وہ فلمی دنیا کے بھی لازوال شاعر تھے (ان سب پر مفصل مضمون چھپ چکا ہے) میں کچھ تراشے معلوماتی ارسال کر رہا ہوں جو نہ صرف قارئین بلکہ شاید آپ کو بھی پسند آئیں۔ امید کرتا ہوں آپ رسالہ میں جلد ہی انہیں شائع کریں گے۔ ایک ہی ایشو میں شائع کریں شکریہ! (کوشش کریں گے کہ جلد یہ معلومات شائع ہو جائیں)"

☆ آصفہ ضیاء احمد نے حیدرآباد سے لکھا ہے "اپنی ایک تازہ ترین کاوش "سرگزشت" کے لیے ارسال کر رہی ہوں۔ پسند آنے کی صورت میں کسی قریبی شمارے میں جگہ دے کر ممنون فرمائیے گا۔ اشاعت یا ناقابلِ اشاعت دونوں صورتوں میں اگر آپ مجھے مطلع کر دیں تو عین نوازش ہوگی۔ بہت سی دعاؤں اور نیک خواہشات کے ساتھ اجازت چاہوں گی۔ (اس شمارے سے فارغ ہوتے ہی تحریر پڑھ لی جائے گی)"

☆ عبدالحمید جانی نے بہاولپور سے لکھا ہے "ماہ رمضان المبارک کی آمد پر مبارک باد پیش کرتا ہوں - اللہ تعالیٰ اس ادارے کو دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی عطا کرے (آمین) شہرِ خیال کے لکھاری، طاہر الدین، سدرہ بانو ناگوری، رانا محمد سجاد، ڈاکٹر آر ایم ای، اعجاز حسین سٹھار اور دیگر لکھاری، یہ وہ چمکتے ستارے ہیں کہ جن کی روشنی سے سرگزشت کو چار چاند لگے ہوئے ہیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو اور توفیق دے کہ وہ اسی طرح روشنیاں بکھیرتے رہیں ۔ یہ ماہ رمضان المبارک کا مہینا ہے۔ آیئے اس بابرکت مہینے میں ہم سب مل کر دعا کریں کہ ہمارا ملک امن کا گہوارہ بنے اور اللہ تعالیٰ اس ملک کو سلامت رکھے۔ (آمین)... میں آفاقی صاحب سے گزارش کرتا ہوں کہ کچھ فرصت کے لمحات نکال کر انڈین اداکار شیام کے بارے میں تفصیلی تبصرہ لکھیں اس کی آخری فلم شبستان تھی۔ میں امید کرتا ہوں کہ آفاقی صاحب مجھے مایوس نہیں کریں گے۔ شکریہ! (شیام پر الف لیلیٰ میں تحریر لگ چکی ہے)"

☆ سدرہ بانو ناگوری کا تبصرہ کراچی سے "جولائی کا شمارہ بڑے ہی خوبصورت اور دلچسپ سرورق کے ساتھ 28 تاریخ کو ملا۔ انکل کا اداریہ بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر گیا۔ افسوس کہ قائد کی رہائش گاہ پر حملہ بھی ہمارے حکمرانوں کی بے حسی میں کوئی تبدیلی نہ لا سکا اور ہمارا وہی میڈیا جو کہ ہر معاملے میں پیش پیش ہوتا ہے شاید وہ اس سانحے پر اپنا کردار بہتر طریقے سے نہ نبھا سکا۔ نئی حکومت نے ہمیں جو سنہرے خواب دکھائے تھے وہ ایک ایک کر کے بکھرتے جا رہے ہیں۔ یوں لگنے لگا ہے جیسے نئی حکومت بننے کے بعد حالات اور بھی ابتر ہو چلے ہیں۔ رانا شاہد صدارت کی کرسی کے ساتھ عمدہ تبصرہ کرنے پر بھی مبارک باد۔ ایم فضل کھرل تعریف کرنے کا شکریہ میری ہم نام اور ہم خیال سدرہ انجم بڑی نوازش کہ آپ کو میرے تبصرے پسند آتے ہیں۔ آپ کی دعائیں ساتھ ہوئیں تو یقیناً سرگزشت سے میرا رشتہ سدا جڑا رہے گا۔ ڈاکٹر روبینہ ثاقب اپنی پریشانیاں لوگوں سے شیئر کرنے کی بجائے خدا سے مدد مانگیے کیونکہ اگر خدا مشکل راستے دیتا ہے تو ان پر چلنے کے لیے مضبوط جوتے ضرور فراہم کرتا ہے۔ چند دن پہلے میں نے مشہور مصنف ڈاکٹر عائض القرنی کی کتاب "غم نہ کریں" پڑھی تھی۔ میری خواہش ہے کہ آپ وہ کتاب پڑھیں مجھے یقین ہے کہ آپ اپنی تمام پریشانیاں بھول کر بہت پرسکون ہو جائیں گی۔ ابن کبیر کی تحریر "عفریت" خوب رہی جملوں کا انتخاب بڑے خوبصورت انداز میں کیا گیا۔ ویری سیڈ کہ عفریت سے انتقام کا جذبہ الیگزینڈر کو اسی کا نشانہ بنا بیٹھا۔ "فلمی الف لیلیٰ" میں آفاقی انکل کی یادداشتوں نے بہت مزہ دیا۔ پرانی فلموں کی داستان پڑھ کر لگا جیسے سامنے ٹی وی اسکرین روشن ہو گئی ہو اب تو ایسی خوبصورت فلموں کا تصور بھی محال ہے کیونکہ آج فلموں کے نام پر جو کچھ دکھایا جا رہا ہے وہ کسی سے بھی ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ 3 گھنٹے کی فلم دیکھنے کے بعد بھی مقصد سمجھ میں نہیں آتا۔ شاید فلم انڈسٹری کے زوال کا سبب بھی یہی ہے۔ پہلی سچ بیانی "محسنہ" ایک الگ اور منفرد انداز کی سچ بیانی ثابت ہوئی۔ زندگی کبھی خوشی کبھی غم کی مانند ہے۔ نگار صاحبہ کو اتنی ساری خوشیوں کے بعد تکلیف کا سامنا کرنا پڑا تو وہ اس دکھ میں حقیقت کو بھی نہ سمجھ سکیں مگر سحر صاحب نے بڑی ذہانت سے کام لے کر مسیحا کے روپ میں ان کو دوبارہ زندگی سے روشناس کر وا لیا۔ "نہیں چاہیے" ایک نئے انداز میں منظر امام کی زبانی پڑھنے کو ملی۔ اچھا ہوا کیوپڈ اپنی دنیا میں واپس چلا گیا اگر وہ یہیں رہ جاتا تو نہ جانے اور کتنے محبت کے ماروں کو اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑتے۔ شکیل کی تحریر "الٹی تدبیر" بے حد پسند آئی۔ باپ بیٹے کی الٹی حرکتوں کو پڑھ کر بہت لطف اندوز ہوئے۔"

☆ افتخار احمد گھمن لاہور سے لکھتے ہیں "اپنا خط شہرِ خیال میں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ خطرہ تھا کہیں محکمہ ڈاک یا ردی کی ٹوکری کی نظر نہ ہو جائے، اداریہ میں بس یہ بات نظر آئی کہ آج ہماری سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ہم بیرونی امداد کے کشکول کو توڑ دیں تو کئی مسائل حل ہو جائیں گے موجودہ حکومت کو بے شمار مسائل کا سامنا ہے جن میں سرِفہرست توانائی کا بحران ہے، دیکھیں اسے وہ کیسے حل کرتی ہے۔ اگر نیت صاف ہو تو مسائل حل ہوں گے ورنہ پہلے سے بڑے ہو جائیں گے۔ گاما پہلوان کا مختصر تعارف حاصل ہوا۔ شہرِ خیال میں ڈاکٹر ایم ای سرِفہرست رہے۔ علی مغل، عزیز اللہ، منظر علی خان، عمران خان یاور، اعجاز حسین سٹھار، ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری، ابن مقبول جاوید احمد صدیقی، رانا سجاد سب شامل تھے۔ میری طرف سے سب کو سلام' اشتراکی مفکر کارل مارکس کے حالاتِ زندگی پڑھے۔ کیسے کیسے مصائب کا سامنا کرنا پڑا لیکن اپنی دھن کا پکا تھا۔ نہ غربت آڑے آئی نہ گھریلو حالات نہ اولاد کا غم۔ دنیا والوں کی مخالفت علیحدہ مول لی لیکن اپنے کام میں مگن رہا۔ تسخیرِ خلا، میں روسی خلا نورد یوری گیگرین کے حالات بھی پڑھے۔ جو سب سے پہلا شخص تھا جس نے خلا کی سیر کی۔ اس میں روسی حکومت کے جھوٹ کے متعلق بتایا گیا تھا۔ مگر یہ جھوٹ زیادہ عرصہ چھپ نہ سکا۔ ہاتھیوں کے نرغے میں

پھنس جانے والے گارڈ کا قصہ بھی خوب رہا۔ جہاں قدم قدم پر خطرہ تھا لیکن قسمت نے ساتھ دیا اور وہ بچ گئے۔ ترکی کے سفر کی دلچسپ داستان بھی پڑھی۔ بہت خوب سفر تھا۔ تاریخی معلومات بھی مل رہی تھیں۔ آیا صوفیہ، نیلی مسجد کے بارے میں خوب معلومات رہیں۔ جہنمی گڑھے، بھی معلوماتی رہی۔ کیونکہ خبروں میں ایسے واقعات پر انسان حیران رہ جاتا ہے جب تک سائنس نے ترقی نہیں کی تھی ان واقعات کو پُراسرار بنا کر پیش کیا جاتا تھا۔ مگر ان میں ابھی تک بہت اسرار بھی ہیں۔ پاکستانی فلموں کے مزاحیہ اداکار لہری کے حالاتِ زندگی بھی پڑھے۔ آپ بیتیوں میں لے پالک میں ایک عورت کا ماجرا پڑھا جس کے ساتھ اس کے لے پالک بیٹے بھانجے نے کیسا سلوک کیا۔ اس میں اس کا بھانجا اگرچہ پورا قصوروار نہیں بلکہ اس کے حقیقی والد نے اس برائی یعنی دولت کو اپنے نام کرانے کا بیج بویا تھا۔ کیونکہ اس کے والدین کی آمد سے پہلے تو وہ بہت اچھا سلوک کر رہا تھا۔ ایک مرتبہ ڈسنے کی وجہ سے دوسرے کسی کو لے پالک بنانا نہیں چاہتی یہ خاتون۔ دولت کی ہوس میں انسان واقعی اندھا ہو جاتا ہے جہاں رشتے بھی حقیر معلوم ہوتے ہیں۔ آج ہی ٹی وی پر ایک خبر دیکھ رہا تھا جس میں علماء اکرام نے متفقہ طور پر پولیو قطرے پلانا جائز اور ان کی ٹیموں پر حملے کو حرام قرار دیا ہے۔ آج بھی ہمارے معاشرے میں جہالت کے سائے ہیں جہاں پولیو کے قطرے پلانا حرام سمجھا جاتا ہے حاملہ عورتوں کو کلینک یا اسپتال میں چیک اپ نہیں کروانے دیا جاتا۔ لیکن، قطرہ قطرہ زندگی میں ایک ایسی لڑکی کا واقعہ پڑھا جو آج بھی اپنی جان خطرے میں ڈال کر لوگوں کے بچوں کو پولیو کے قطرے پلا رہی ہے۔ واقعی وہ عظیم مجاہدہ ہے۔ جو عظیم کام کر رہی ہے اس کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہے۔ آزادی میں ایک سیلی نے کس طرح ایک لڑکی کو طلاق دلوائی یہ پڑھا۔ جب کہ وہ شخص انا کی خاطر اپنی بیوی کو طلاق دینا نہیں چاہتا تھا۔"

☆ چوہدری مدثر حسین ویڈز، کھاریاں سے "جولائی کا شمارہ ملا۔ شمارے پر سرسری نگاہ ڈال کر خط لکھ رہا ہوں کیونکہ پورا میگزین پڑھ کر تبصرہ کیا تو خط لیٹ ہو جائے گا میں نے سرگزشت نیا نیا پڑھنا شروع کیا ہے۔ یقین مانیں آپ کا میگزین عالمی لیول کا ہے۔ میں ایک قومی معیار کا اخبار اور دو میگزینوں میں لکھتا ہوں۔ مگر پڑھتا سرگزشت ہوں جو نہایت دلچسپ میگزین ہے۔ امید ہے کہ آپ میرا خط شاملِ اشاعت کریں گے۔ انشاء اللہ آیندہ ماہ تفصیل کے ساتھ اور جامع تبصرہ لکھوں گا۔ اللہ آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ (آمین)"

☆ احسان سحر، میانوالی سے رقمطراز ہیں "انکل معراج رسول صاحب اور مسز معراج رسول صاحبہ کے لیے خصوصی دعاؤں کے ساتھ ان کا بھتیجا حاضرِ خدمت ہے۔ (خوش رہیے) اس ماہ کا سرگزشت جولائی بکھیرتا ہوا 2 جولائی کو ملا۔ پہلی بار ادارے کے چاروں شمارے بہت لیٹ ملے۔ لگتا ہے نئی حکومت کی مہربانیوں کا اثر ہمارے خوبصورت شماروں پر بھی پڑنے لگا ہے۔ اللہ بچائے اس دفعہ بھی وہی حالت ہے جو پہلے سے تھی حالات بدلتے نظر نہیں آتے۔ پاکستان سے دشمنی عروج پر ہے جس کی تازہ مثالیں، قائداعظم محمد علی جناح کی یادگار کو تباہ کرنا اور سیاحوں پر حملہ ہے وقفے وقفے سے کئی علاقوں میں دھماکے اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ نئی حکومت نے عوام کو جو جھوٹے دلاسے دیے ہیں اس میں زیادہ کیا دھرا ہمارا بھی ہے۔ صرف حکمرانوں کو موردِ الزام ٹھہرایا نہیں جا سکتا ہم کون سے معصوم ہیں، چوری، قتل غارت، میں ہم بھی شریک ہیں۔ لوٹ ہم بھی ایک دوسرے کو رہے ہیں۔ دھوکا دہی ہماری رگوں میں رچی بسی ہے۔ خود تو اپنے گریبان میں جھانکتے نہیں اور گلے شکوے حکمرانوں سے کرتے ہیں۔ حکمرانوں سے زیادہ طاقتور ہم خود ہیں۔ اگر ہم ایک ہی صف میں مل کر کھڑے ہو جائیں ارادہ کر لیں مستحکم ہو جائیں تو کون سا کام ہے جو ہم نہیں کر سکتے۔ ہم کاہلی، سستی کا شکار ہو کر کام دوسروں کے کندھے پر ڈال دیتے ہیں اور نتیجہ وہی نکلتا ہے جو ہم دیکھ رہے ہیں اور دیکھتے رہیں گے۔ سب سے پہلے معراج رسول انکل کو پڑھا انکل کو بھی اپنا ہم خیال پایا۔ بابائے قوم قائداعظم کی نادر و نایاب یادگار کو ملبے کا ڈھیر بنانے کی وجہ بھی یہی ہے کہ کوئی بھی تاریخی چیز پاکستان میں زندہ نہ رہے۔ اور نہ کچھ باقی بچے، جس سے پاکستان کی ثقافت کا اظہار ہو۔ اگر ایسا ہی سلسلہ چلتا رہا تو وہ دن دور نہیں جب اثاثے ورثے، ثقافت گم ہو جائیں گی۔ جواں مردی میں شیرِ میسور ٹیپو سلطان کے والد حیدر علی کے بارے میں پڑھا۔ سچی بات ہے جو ہمارے حکمران گزرے ہیں ٹیپو سلطان ہی مجھے سب سے زیادہ پسند ہے۔ کیا بہادر نڈر اور دلیر حکمران تھا۔ خاص کر اس کا کہا ہوا فقرہ' شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔ شہرِ خیال میں رات کے اندھیرے میں حاضر ہوئے تاکہ کوئی دیکھ نہ لے۔ کرسی صدارت رانا محمد شاہد کے ہاتھ، بلکہ دونوں ہاتھوں میں تھی۔ تبصرہ زیادہ تر جو ملکی حالات کے حوالے سے تھا اب ان حالات کو رونا چھوڑیں جی یہ تو چلتے رہیں گے خوامخواہ دل جلانے کا فائدہ۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب استادِ ادب لے کر آئے پروفیسر غلام جیلانی کے حوالے سے پڑھا۔ کافی خوبصورت انداز میں ان کی زندگی پر قلم چلایا گیا۔ شاعری سے انشائیہ لکھنا اور وہ بھی مزاحیہ انداز میں بہت مشکل ہے۔ کافی سحر انگیز شخصیت رہی پروفیسر صاحب کی۔ بیچ میں جو حالات چلے انہوں نے بہت دکھی کیا۔ زندگی میں ایسے موڑ تو آتے بھی رہتے ہیں۔ سب کی زندگی یکساں نہیں ہوتی۔ "فنکار" شکیل صدیقی لے کر آئے۔ پاکستان کا نادر اثاثہ جو ایسے بھی ضائع ہوا نہ ان کی زندگی میں نہ ان کے بعد۔ ایسی شخصیات زمانے کی دھول میں گم ہو چکی ہیں۔ پڑھ کر افسوس ہی کرتے ہیں بس۔ شطرنج کے حوالے سے معلومات اچھی لگی۔ لیکن یہ کھیل بوڑھوں کا ہے، ہم جیسے تو بھاگ دوڑ والے کھیلوں کے دلدادہ ہیں خوامخواہ بیٹھ کر ایسے بور کھیل کیوں کھیلیں۔ عفریت، کافی دلچسپ اور عمدہ تحریر رہی۔ دلچسپی شروع سے قائم رہی اور بڑھتی ہی چلی گئی۔ ہرکولیس اور جیکولن کے درمیان پروان چڑھتی محبت نے کافی متاثر کیا۔ بلند حوصلہ سر ایڈمنڈ ہلری نے واقعی بہادری کی تاریخ رقم کی۔ انسان واقعی بہت ہی پیچیدہ جاندار ہے جس کے آگے کچھ ناممکن نہیں۔ ہمت مرداں، گوروں کا ایک اور کارنامہ اور ہمت نے متاثر کیا۔ کافی بہادری کا مظاہرہ کر کے خود کو موت کے بے رحم شکنجوں سے آزاد کیا۔ فلمی الف لیلیٰ میں اس بار بہت کچھ پڑھنے کو ملا۔ شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبال کی زندگی اور ان کے والد صاحب پر بھی مختصر مگر جامع مضمون اچھا لگا۔ دوسرے پاکستانی ڈائریکٹروں کا حال احوال بھی ساتھ سنے کو ملا اور آفاقی صاحب کو ملنے والا اخراجِ تحسین پڑھ کر کافی خوشی ہوئی۔ واقعی آفاقی صاحب صحیح معنوں میں اس کے حقدار تھے۔ اور شکر ہے پاکستان میں کسی کو تو فلم کے حوالے سے ایسا اعزاز نصیب ہوا جو کہ بہت کم ہی دیکھنے میں

آتا ہے۔ بے زبان ہمدرد، جہاں وفادار جانور کی بات ہو تو وہاں کتا ایسا جاندار ہے جس کی وفاداری انسان کے اپنے سائے سے بھی زیادہ ہے۔ سایہ تو ساتھ چلتا ہے، ساتھ چھوڑ بھی دیتا ہے۔ یہ بے جان وجود آخر کر بھی کیا سکتا ہے لیکن کتا ایسا جانور ہے جو ساتھ ہو نہ ہو اس کی وفاداری ضرور ساتھ رہتی ہے۔ ترکی نمی دانم، بہت خوبصورت انداز سے یہ سفر چل رہا ہے۔ سیفٹی ریزر ایک مختصر پُر دلچسپ معلومات رہی۔ مرد حضرات جو شان اور خوشی سے جیلٹ گال پر چلاتے ہیں اس کا آخر پتا چل ہی گیا۔ مہاشکاری، اسے تو پہلے شائع ہونا چاہیے تھا خیر دیر سے آئے درست آئے۔ کافی متاثر ہوئے اس شکاری کے کارناموں سے کہ ایسے لوگ بھی گزرے ہیں جو اپنی مثال آپ تھے۔ ''خونچکاں واردات'' نے بہت زیادہ ہی چونکا کر رکھ دیا یقین ہی نہیں آرہا کہ تین گولیاں انسان سر میں کھا کر زندہ رہ سکتا ہے نا صرف زندہ بلکہ آرام سے چل پھر بھی سکے لیکن قدرت کے کاموں اور رازوں کو آج تک کوئی جان سکا ہے جو ہم جیسے حقیر دماغ کو الجھائیں (سرگزشت دلچسپ وعجیب وغریب واقعات کو اہمیت دیتا ہے) سراب ہر بار نئے انداز میں پڑھنے کو ملتی ہے یہ کاشف صاحب کا ہی خاصہ ہے کہ اتنے سال گزرنے کے باوجود بھی کہیں بھی کہانی میں جھول نظر نہیں آیا۔ بیت بازی کے تمام اشعار اچھے لگے۔ چھوٹے چھوٹے معلوماتی پارچے بھی کافی اچھے لگے اور پسند آئے۔ پہلی سچ بیانی محسنہ سے آغاز کیا۔ کافی متاثر کیا واقعی الگ طرز کی ایسی سچ بیانی مدتوں یاد رہے گی سحر کا ڈراما اور سحر کا کردار واقعی سحرانہ تھا جس نے ایک زندگی کو پھر سے زندہ دلی کی طرف لوٹا دیا۔ ایسی لڑکیاں واقعی بہت ہی کم ملتی ہیں جو ایسی قربانی پیش کریں جو دوسروں کے لیے ایک نہ بھولنے والا سبق چھوڑ جائیں۔ جو دوسروں کے بارے میں برا چاہتے ہیں، سوچتے ہیں، وہ خود ہی اس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ جس نے کبھی دوسروں کا برا نہ چاہا ہو' اللہ پاک بھی نہیں چاہتے کہ اس کے ساتھ برا ہو۔ ہر قدم پر ان کی حفاظت کرتے ہیں۔ آخر میں ان کو بھیا تک سبق مل ہی گیا۔ ''نہیں چاہیے'' منظر امام اپنے انداز میں ایک سچ بیانی لے کر حاضر ہوئے جو کافی متاثر کن ثابت ہوئی۔ کیوپڈ کو آخر پتا چل ہی گیا اور اندازہ ہو گیا کہ آج کے دور میں بغیر مقصد کے کوئی محبت کرتا ہی نہیں اور اگر کرے بھی تو اس کا نتیجہ یہی نکلتا ہے جو دیکھنے میں آیا۔ اور وہ بھی بے جوڑ محبت کیونکہ آج کل کے دور کی محبت جوڑ کے بغیر پایۂ تکمیل تک بہت مشکل سے بھی پہنچ پاتی ہے۔ ''زندہ در گور'' اس کی ہمت اور بہادری ہی تھی جو وہ دن رات قبر میں بھوک اور پیاس کو برداشت کر گیا اور زندگی کی جانب پلٹ آیا۔ کافی سبق آموز کہانی رہی، جو ہم بغیر کسی تصدیق کے اپنے پیاروں کو قبر کے حوالے کر دیتے ہیں۔ گول میڈل، سچ پوچھیں تو اگر میں ہوتا تو فوراً اسی وقت اس کا منہ توڑ دیتا۔ اتنے عرصہ اچھے کام کیے اگر انسان کو ایسا پھل ملے تو وہ... جس نے برا کیا ہو کیوں خالی ہاتھ جائے۔ اسے بھی تو سزا ملنی چاہیے۔ الٹی تدبیر، کافی اچھی اور شاندار کہانی رہی۔ لنگڑے منان کی جاسوسی کی مہارت نے کافی متاثر کیا اور ابا کے جملے نے کافی ہنسایا بھی لیکن آگے چل کر معاملہ کافی خطرناک رخ اختیار کر گیا۔ اگر شکیل میاں ذرا سمجھداری سے کام لیتے تو معاملہ اتنا نہ بگڑتا جو اسے جیل جانا پڑتا۔ جذباتی پن بعض اوقات انسان کو منہ کے بل گراتا ہے۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ جوش سے نہیں ہوش سے کام لیا جائے تو انسان بہت کچھ پالیتا ہے۔ لیکن ہم مسلمانوں کی پہلی تو خامی ہے کہ کام پہلے کرتے ہیں اور سوچتے بعد میں ہیں۔ اشکِ ندامت، غرور، تکبر یہی چیزیں تو انسان کے وجود میں ازل سے ہیں اور یہی انسان کو ایسی چوٹ دیتی ہیں جس سے انسان کا وجود شیشے کی طرح بکھر جاتا ہے لیکن ہم بکھرے اور ٹوٹے ہوئے وجود کو دیکھ کر... بھی سبق حاصل نہیں کرتے اور نتیجہ میں بہت کچھ گنوا بیٹھتے ہیں جو صدیوں بعد حاصل کرتے ہیں۔ ادائیگی کافی سبق آموز تحریر تھی۔''

☆معراج الدین نے حیات آباد، پشاور سے لکھا ہے''اداریے میں محترم معراج رسول صاحب ہر محبِ وطن کی طرح زیارت والے واقعے پر دل گرفتہ نظر آئے۔ واقعی پاکستان اور پاکستانیوں کے دل پر وار کیا گیا ہے۔ وزیر داخلہ نے فرمایا کہ 3، 4 مہینے میں اسے دوبارہ تعمیر کر لیا جائے گا لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ اس کی نوبت ہی کیوں آئی۔ عمارت کو تو دوبارہ تعمیر کر لو گے لیکن قائد کی وہ نادر اشیاء کہاں سے لاؤ گے اور قوم کا مجروح شدہ احساسِ حب الوطنی کا مداوا کیسے کرو گے۔ یک صفحی سرگزشت میں شیر میسور سلطان فتح علی ٹیپو کے والد حیدر علی کے بارے میں مختصراً پڑھا۔ وہ واقعی عزم و ہمت کے پیکر تھے۔ اداریے اور یک صفحی سرگزشت کے زینوں پر چڑھ کر ہم شہرِ خیال کے بالا خانے میں پہنچ گئے تو رانا محمد شاہد کو کرسی صدارت پر جلوہ افروز دیکھا۔ ان کا لاجواب تبصرہ بھی پڑھنے کو ملا۔ اس کے علاوہ عمران خان، منظر علی خان، طاہرہ گلزار باجی، عمران جونانی، احمد خان توحیدی اور شاہد جہانگیر پشاور، سعید احمد چاند اور سدرہ بانو جی کے تبصرے بھی لاجواب تھے۔ احسان سحر کا فرمائشوں سے بھرا تبصرہ بھی اچھا لگا۔ مہوش باجی (کراچی) بالکل غائب ہیں۔ فوراً حاضری دیجیے۔ طاہرہ باجی! پچھلے 3 مہینے میں نے ہر بار آپ کے بارے میں لکھا لیکن دو بار خط پہنچا ہی نہیں جبکہ تیسری بار قینچی کی نظر ہو گیا۔ پھر بھی میں اپنی کاہلی کی معافی چاہتا ہوں۔ شاہد جہانگیر انکل کے سوال کے جواب میں، میں کہوں گا کہ گل حمید کی قبر پر دعا کرنے تو میں گیا تھا لیکن ان کی قبر معلوم نہ کر سکا۔ لیکن دعا کر لی۔ انشاء اللہ ان تک پہنچ گئی ہو گی۔ مصروفیات کے باعث پورا شمارہ نہیں پڑھ پایا ہوں لیکن جتنا پڑھا ہے اس پر تبصرہ پیشِ خدمت ہے۔ واردات خونچکاں، نے ہمیں امریکی معاشرے کی ایک مکروہ جھلک دکھا دی۔ اگرچہ پرانا واقعہ ہے۔ لیکن اس قسم کے واقعات اب امریکا میں عام ہیں۔ جو آگ امریکا نے ساری دنیا میں لگائی ہے اس کی چنگاریاں اس کے اپنے دامن تک پہنچ رہی ہیں۔ سراب کی 75 ویں قسط لاجواب تھی۔ شہباز ایک بار پھر پھنس چکا ہے اور وہ بھی انڈیا میں دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے آگے۔ سچ بیانیوں میں محسنہ سب سے بہترین سچ بیانی تھی۔ اس قسم کی بیماریوں میں شاک ہی اکلوتا راستہ ہوتا ہے۔ نرس سحر کا کردار بھی قابلِ ستائش تھا۔ عورت ایک پہیلی، عجیب وغریب تحریر تھی۔ سارہ نے اپنے مقصد کو پورا کرنے کے لیے واقعی عجیب راستہ اختیار کیا لیکن اس کے پاس کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا۔ وہی ہوتا ہے، جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔ میرے خیال میں اس کہانی کے لیے یہ عنوان ٹھیک رہے گا۔ اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتے ہیں لوگ بھی سازش کرتے ہیں اور اللہ بھی تدبیر کرتا ہے اور اللہ بہترین تدبیر کرنے والا ہے۔ لوگوں کی سازشوں کے باوجود اللہ نے ارجمند کو بچا لیا۔ ''نہیں چاہیے'' کو کہانی کے بجائے ایک دیومالائی داستان کہنا ٹھیک ہو گا۔ لیکن اس کے پس منظر میں کراچی کے حالات کا عکس ہمیں دکھایا گیا تھا۔ زندہ در گور، واقعی عجیب تحریر تھی۔ اس قسم کے بہت واقعات نظر سے گزرے ہیں۔ کرم دین تو واقعی خوش قسمت تھا۔ لیکن ہر کوئی ایسا خوش قسمت نہیں ہوتا۔ گولڈ میڈل پڑھ کر ہمیں بے اختیار ہنسی آگئی۔ ''الٹی تدبیر'' میں شکیل کا باپ اور لنگڑا منان بڑے دلچسپ تھے۔ اشک ندامت، میں

حیا تاں بری تھی مگر سوتن نہیں۔ موت کا تو ویسے بھی وقت مقرر ہے۔ لیکن آخر میں یار محمد کو تھوڑا سکون تو مل جاتا۔''

☆رانا محمد سجاد نے مظفر گڑھ سے لکھا ہے''گرمیاں اپنا اصل رنگ دکھاتی ہوئی نظر آرہی ہیں اوپر سے لوڈشیڈنگ کا مسلسل بڑھتا ہوا عفریت۔ دیکھیے کب تک چھٹکارا نصیب ہو۔ جولائی کا شمارہ ملا کچھ دیر سے موصول ہوا۔ معراج صاحب نے بلاشبہ درست کہا کہ سقوط ڈھاکا کے بعد ایک اور بڑا سانحہ ہے۔ یقین نہیں آیا کہ یہ سب کچھ ہو چکا ہے اور ساتھ ہی معصوم طالبات کی بس پر حملہ کرنے والی تنظیم نے ایک اور دکھ دیا۔ ہم لوگ ایک سانحے کے بعد دوسرے سانحے کا انتظار کرتے ہیں اس کی مثال نانگا پربت کی مثال ہے کہ دہشت گرد آئے اور کتنی آسانی سے قتلِ عام کر کے چلے گئے۔ اور وہ بھی سیاحوں کا جس سے سیاحت کے شعبے کو جو پہلے ہی نہ ہونے کے برابر ہے ختم ہو گیا ہے۔ اس کو شدید نقصان پہنچا۔ یک صفحی سرگزشت میں حیدر علی کا تذکرہ خوب رہا۔ شہرِ خیال میں رانا شاہد سے ملاقات ہوئی۔ اچھا تبصرہ تھا۔ وحیدہ ریاست بھٹی کا تبصرہ جاندار رہا۔ منظر علی خان نے دلچسپ تبصرہ کیا۔ پشاور سے دھواں دھار آمد رہی طاہرہ گلزار کی۔ محمد عمران جونانی، سیاحت پر آپ نے جو برمحل مصرع پڑھا وہ لطف دے گیا۔ پتا نہیں یہ ساری محرومیاں ہماری قسمت میں کیوں لکھ دی گئی ہیں۔ تبصرہ تو شاندار رہا ویسے جلدی خط لکھا کریں۔ شہر قائد سے احمد توحیدی کی حاضری خوب رہی۔ شاہد جہانگیر آپ کی تو بہت شہرت ہو گئی ہے بس آپ ایسی تحریریں بھیجتے رہا کریں۔ سدرہ بانو ناگوری آپ کو مبارک ہو روشنیوں کے شہر میں اندھیرا بانٹنے والوں کے گرد گھیرا تنگ ہو رہا ہے۔ بس دعا کریں اور تبصرے پر شکریہ کی ضرورت نہیں، طاہر الدین بیگ، سعید احمد چاند احسان سحر کے تبصرے پسند آئے شدرہ انجم یہ قلم اٹھانے کی جسارت سے کیا مراد ہے؟ اور یہ تین سال تک خاموشی کیوں اختیار کیے رکھی۔ اب باقاعدگی سے حاضری دیجیے گا۔ ڈاکٹر روبینہ صاحبہ لگتا ہے آپ شش و پنج میں ہوتی ہیں کہ خط لکھیں یا نہ لکھیں؟ آخر لکھنا ہی پڑتا ہے لیکن دیر سے۔ اصل میں آپ سرگزشت کی دیرینہ قارئین میں سے ہیں۔ خالد حسن چیمہ، ہمایوں دین خان پور کٹورا سے، ادیب الرحمٰن، اور محترم انور اعجاز صاحب تو بالکل ہی بھول گئے ہیں ساتھیوں کو بہرحال جہاں بھی ہوں خدا اپنی عافیت میں رکھے آمین! سرورق کی اولین کہانی ''استادِ ادب'' کا مطالعہ کیا ادب کے متلاشیوں کے لیے ایک گراں بہا تحفہ ثابت ہوئی۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا بھی ذکر ہو جائے تو بہت اچھا رہے گا۔ تو کب پیش کر رہے ہیں پھر؟ (فرمائش نوٹ کر لی) فنکار خوبصورت تحریر تھی۔ ویسے اس کے بارے میں پہلے نہیں جانتے تھے۔ شطرنج کا ابھی مطالعہ نہیں کیا ''عفریت'' نے بالکل متاثر نہیں کیا۔ بلند حوصلہ، شاندار رہی۔ ایک بات ضرور کہوں گا کہ کے ٹو کے بارے میں کوئی تحریر خاص طور پر شائع ہونی چاہیے کہ اس کو کس کس نے اب تک فتح کیا ہے (مفصل تحریر آچکی ہے) ''ہمتِ مرداں'' سرگزشت کے معیار کی نہ تھی۔ فلمی الف لیلہ، عہدِ ماضی کی یادگار فلموں کا ذکر خوب رہا۔ علی سفیان آفاقی کو خراجِ تحسین والا صفحہ بہت پسند آیا۔ اللہ تعالیٰ آفاقی صاحب کو اور طویل عمر عطا فرمائے۔ امیمہ سلیم کی ''بے زباں ہمدرد'' زبردست رہی۔ ولیم کی قوتِ ارادی اپنی جگہ لیکن وفادار جانور نے اپنا کردار خوب ادا کیا۔ ''ترکی نمی دانم'' ابھی جاری ہے۔ اپنی تمام تر دلچسپیوں کے ساتھ پرانی یادگاروں کے ساتھ جو سلوک یہاں کیا جاتا ہے، وہ قابلِ افسوس ہے۔ جم کاربٹ کی کہانیاں تو بہت پڑھیں شکاریات پر پہلی بار تفصیلی تعارف ہوا۔ ''سراب'' ایک بار پھر بھارت یاترا پر دیکھتے ہیں کیا کیا ہنگامے سامنے آتے ہیں۔ سرورق کی پہلی سچ بیانی ''محسنہ'' تو کوئی خاص نہیں تھی کہانی کے وسط سے ہی پتا چل گیا تھا کہ یہ سب طے شدہ ڈراما ہے۔ عورت ایک پہیلی، میں دو مختلف عورتوں کی نفسیات کو ظاہر کیا گیا ہے۔ سارہ نے عمران کو اچھی طرح استعمال کیا اور پھر اپنی زندگی سے باہر کر دیا۔ گولڈ میڈل پڑھ کر حیرت بھی ہوئی اور ہنسی بھی کہ محض ایک خط کی بنیاد پر اپنا سب کچھ سمیٹ کر باہر چلے جانا قطعاً دانشمندی نہیں تھی، اور ہنسی اس لیے کہ کس حصول کے لیے خط لکھا تھا کہ الٹا معاملہ گلے پڑ گیا۔ اشکِ ندامت، حیا تاں کا جذباتی فیصلہ ساری زندگی کے لیے روگ بن گیا۔ شمارے کی آخری سچ بیانی ''ادائیگی'' اچھی تحریر رہی۔ ویسے تو اس میں عظیم نے شروع میں ہی بتا دیا تھا کہ برسوں کی دبی کچلی خواہش قرار دیا۔ لیکن یہ عظیم کی سراسر غلط سوچ ہے کہ اس نے حلالہ جیسے فعل کو اپنی نفس کی تسکین کے لیے استعمال کیا۔ مجموعی طور پر شمارہ ٹھیک رہا۔ فلمی الف لیلہ میں اگر موجودہ عہد کی فلموں کا تذکرہ کر دیا جائے تو زیادہ مناسب ہو گا۔ کافی عرصہ سے کسی کھلاڑی کی سوانح حیات بھی شائع نہیں ہوئی توجہ دیجیے (حیرت ہے کئی کھلاڑیوں کی سوانح تو اسی سال آئی ہیں)''

☆انجم فاروق ساحلی، لاہور سے لکھتے ہیں''امید ہے آپ اور ادارہ کے دیگر احباب و اہلِ خانہ بخیر و عافیت ہوں گے۔ جولائی کا سرگزشت اچھے سوبر ٹائٹل کے ساتھ منظرِ عام پر آیا۔ خطوط کی محفل خوب بھری بھری تھی خط شائع کرنے کا شکریہ۔ مضامین میں عفریت، ہمت مرداں، سیفٹی ریزر، بے زبان ہمدرد اچھی کاوشیں تھیں۔ فلمی الف لیلہ اور ترکی نمی دانم خوب تحریریں تھیں۔ مہاشکاری اور واردات خونچکاں بھی اچھی رہیں۔ پہلی تینوں آپ بیتیاں معیاری تھیں باقی ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔ سراب مخصوص انداز میں رواں دواں ہے۔ مضامین کے انتخاب میں مدیر سرگزشت کی مہارت اپنے عروج پر ہے۔ چار دل والی مچھلی، رنجقوں کے راجا، کی کیا پوزیشن ہے؟ (ریفرنس نہ ہونے کی وجہ سے......) چین کے قدیم طرزِ زندگی کے متعلق معلومات ہیں (ریفرنس کے ساتھ لکھ بھیجیں کہ کہاں سے ترجمہ کی، تا کہ شائع کرنے سے پہلے چیک کر لیا جائے)''

☆رانا محمد شاہد، بورے والا سے''جولائی کا شمارہ امید و آس لیے دوشیزہ کے سرورق کے ساتھ ملا۔ شاید یہ وہی امید و آس تھی کہ ایک دن میں ٹھیک ہو جاؤں گی اور اپنے پیار کرنے والے شوہر اور اولاد کے درمیان ہوں گی۔ مگر اس سحر نامی نرس کا کردار سب سے الگ تھا۔ دوسروں کے لیے قربانی دینے اور انہیں زندگی کی طرف واپس لانے کے لیے بڑے بڑے نفسیاتی گر آزمائے جاتے ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اصل جینا تو ہوتا ہی دوسروں کے لیے ہے کیونکہ اس دنیا میں درخت اپنی چھاؤں میں خود نہیں بیٹھتے، دریا اپنے پانی سے خود سیراب نہیں ہوتے، اصل زندگی دوسروں کے لیے ہی وقف کرنے میں ہے۔ اداریے میں معراج رسول صاحب نے قائد اعظم کی رہائش گاہ کی تباہی پر حکمرانوں کا ضمیر جگانے کی کوشش کی۔ قائد اعظم ریذیڈنسی کی

تباہی کے بعد قائد کے زیرِ استعمال عمارات وزیر مینشن اور دوسری عمارات کی سیکورٹی بڑھادی گئی۔ یہ حقیقت ہے کہ یہ تاریخی عمارات ہمارا قومی ورثہ ہیں مگر کیا یہ اچھا نہیں ہوتا کہ ہم قائد کے نظریات کو بھی زندہ کردیں۔ لوگ اس نظریے کو اپنی زندگیوں کا حصہ بنالیں۔ شیرِ میسور ٹیپو سلطان کے والد حیدر علی کی یک صفحی سرگزشت دلچسپ اور معلوماتی تھی۔ شہرِ خیال میں عمران خان نے کرپشن پر بات کی، حال ہی میں ایک سروے رپورٹ سامنے آئی ہے کہ ہمارا شمار دنیا کے 34 ویں کرپٹ ترین ممالک میں ہوتا ہے جبکہ بھارت کا نمبر 87 واں ہے۔ گویا ہم بھارت سے 3 گنا زیادہ کرپٹ ہیں اور یہ سچ ہے کہ کسی بھی ملک ومعاشرے کی بنیادی خرابی بے ایمانی ہی ہوتی ہے۔ ایماندار ملکوں ومعاشروں میں خوشحالی ہوتی ہے۔ طاہرہ گلزار نے رویوں پر بات کی۔ ہمارے رویے کیا اور کیسے ہیں۔ ہم چھینٹے اڑانے پر رکشے والے کو قتل کردیتے ہیں، معمولی جھگڑے پہ خون بہادیتے ہیں مگر ہم نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ بھی ادا کرتے ہیں۔ کیا محبت، برداشت، رواداری، وضع داری ہمارے نبی کریم ﷺ کی تعلیمات نہیں ہیں؟ آپ نے تو ان لوگوں کے لیے بھی دعا کی جنہوں نے ساری زندگی آپ کو تکلیفیں پہنچائیں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ ”انسان مکان بدلتا ہے، رشتے بدلتا ہے، دوست بدلتا ہے لیکن پھر بھی دکھی رہتا ہے، آخر کیوں؟ کیونکہ وہ اپنا رویہ نہیں بدلتا۔ شاہد جہانگیر شاہد آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کا مضمون اتنا پسند کیا گیا، اتنے لوگوں نے رابطہ کیا۔ ورنہ آج کی دنیا میں کتابوں، رسالوں کو کون دیکھتا ہے۔ یہ تو انٹرنیٹ، موبائلز، ٹی وی چینلز کا دور ہے۔ (ریڈنگ میٹر کی اپنی اہمیت ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو آج اخبار ورسائل بند ہوچکے ہوتے خود اس ادارے کے چار ڈائجسٹ ہیں۔ صد شکر کے ہر ڈائجسٹ بہت بڑی تعداد میں چھپتا ہے۔ جبکہ ڈائجسٹ کے قاری الگ الگ مزاج کے ہیں، الگ الگ پسند ہے، پھر دیگر اداروں کے ڈائجسٹ بازار میں ہیں۔ سیاسی ودیگر جرائد بھی بڑی تعداد میں بک اسٹالز پر نظر آجائیں گے۔ یہ پرچے بکتے ہیں تبھی تو چھپتے ہیں) ویسے آپ خوش اس لیے ہیں کہ سرگزشت میں مضمون چھپا اور گل حمید کو 79 سال گزر جانے کے باوجود لوگوں کی ان کے متعلق جاننے اور چاہنے والوں کی کوئی کمی نہیں آئی، احسان سحر کے خط سے تو یہی لگتا ہے کہ وہ نئے قاری ہیں۔ میانوالی سے خاص وابستگی ہے کیونکہ میانوالی کے قریبی شہر پپلاں میں میرا سسرال ہے۔ جولائی کے شروع میں میری پھوپھو جان کا وہاں انتقال ہوگیا تھا، اس لیے وہیں تھا۔ آپ اور قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔“

☆ اعجاز حسین سنتھار، نور پور تھل سے ”طویل مضامین پڑھتے ہوئے مجھے سخت کوفت ہوتی ہے لیکن ”استادِ ادب“ دل کی آنکھوں سے پڑھا ہے۔ غلام جیلانی اصغر کا ہمارے علاقہ میں بھی بڑا نام ہے۔ بڑے بھائی سجاد حسین سنتھار ایڈووکیٹ ان کے شاگرد رہنے کے ساتھ کافی قریب بھی رہے ہیں۔ جوہر آباد کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران وہ ان کی ادبی محفلوں میں شامل رہے۔ اب یہ مضمون انہوں نے پڑھا ہے اور پرانی یادیں تازہ کیں۔ ایسے بے غرض لوگ اب کہاں رہ گئے ہیں۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ تعلیم بھی منافع بخش کاروبار بن گیا ہے۔ ”فلمی الف لیلہ“ میں آفاقی بھائی نے سابقہ قسطوں کی کمی پوری کردی ہے اب قارئین کے گلے شکوے دور ہوگئے ہیں۔ کئی پاکستانی اور بنگلہ دیشی فنکاروں کے حالات اور جدوجہد سے آگاہی ہوئی ہے۔ یادگار فلموں کے بارے میں جان کر اور نایاب، پرانی تصاویر دیکھ کر دل سے آہ نکل جاتی ہے۔ بزرگ مثال کے طور پر کہا کرتے تھے کہ جب دانت تھے تو چنے نہ تھے اب دانت نہیں رہے تو چنے وافر مقدار میں دستیاب ہیں۔ یہی حال ہمارا ہے جب اچھی فلمیں بن رہی تھیں، سینما گھروں کی رونقیں عروج پر تھیں تو ہمارا شہروں میں جانا تھا نہ وسائل تھے کہ فلم بینی کا شوق پورا کرتے اب شہر میں آنا جانا لگا رہتا ہے اور جیب میں رقم بھی ہوتی ہے لیکن سینما گھر اجڑ کر بھوت بنگلا کا منظر پیش کرتے ہیں۔ سیفٹی ریزر، معلومات دینے والا مضمون ہے (شکریہ کہ آپ نے کتابت کی غلطی بتائی، چیک کیا تو واقعی 138 نہیں 38 لکھا تھا)“ واردات خونچکاں“ میں امریکی معاشرے کی وحشت، بربریت اور لاقانونیت کی جو تصویر دی گئی ہے میں سمجھتا ہوں حالات اس سے بھی بڑھ کر خطرناک ہوں گے لیکن ہم اپنے روز وشب کے تناظر میں دیکھیں تو کسی کو کچھ کہنے کے قابل کہاں ہیں۔ چند گزرے سالوں کو تو چھوڑ ہی دیں۔ صرف نئی منتخب جمہوری حکومت کے ہی ڈیڑھ ماہ کو سامنے رکھیں اور خونریزی کا اندازہ کرلیں کسی کی طرف انگلی اٹھائیں گے تو وہ احساسِ شرمندگی سے کانپنے لگے گی۔ سچ بیانیوں میں ”محسنہ“ واقعی الگ انداز کی ہے۔ واقعات کے ساتھ چلتے ہوئے حسبِ توقع اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا کہ دراصل سارا ڈراما ہے۔ مرد کی فطرت ہی ایسی ہے لیکن عابد اس مزاج کے لگتے نہ تھے تبھی ان کی شخصیت نظروں سے گر گئی تھی لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ یہ سب طے شدہ تھا تو ان کی اداکاری اور منصوبہ سازی کے قائل ہوگئے۔ جو مرد شادی شدہ ہوتے ہوئے تاک جھانک کرتے ہیں انہیں دیکھ اور سمجھ لینا چاہیے کہ ایک حیادار اور باوفا بیوی کے وجود میں خون کیسے کھولتا ہے کہ مردے میں جان پڑ جاتی ہے۔ عورت کو ایسی آزمائش سے بچانا اونچے درجے کی نیکی ہے۔ ”عورت ایک پہیلی“ میں سارہ کی خوداعتمادی پر حیران بیٹھا ہوں۔ ایک عورت ہوتے ہوئے اس نے کیسا خطرناک منصوبہ بنایا اور یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اس کی عین مرضی کے مطابق تکمیل کو پہنچ گیا۔ کو ظہیر کے پاس واپس جانا اس کی مجبوری تھی حالانکہ اس کے دل میں عمران کے لیے نرم گوشہ پیدا ہوچکا تھا وہ ظاہری صورت میں جتنی حسین اور نازک اندام تھی اندر سے اتنی ہی مضبوط اعصاب اور فیصلوں کی پابند تھی۔ دونوں نے قطع تعلق کرکے اپنی ازدواجی زندگی کو محفوظ بنالیا ہے کیونکہ اب ان کا تعلق کسی ناخوشگوار واقعہ پر جاکر ختم ہوتا۔ جیسا دونوں کا معاشرے میں مقام ہے وہ اس کے متحمل نہیں ہوسکتے تھے۔ ”وہی ہوتا ہے“ میں اپنوں کی خودغرضی دل دہلا رہی ہے۔ ہماری تو ہم پرستی کتنے المیوں کو جنم دے رہی ہے کہ رشتوں کو بھینٹ چڑھایا جارہا ہے۔ یہاں بھی ایک اتفاق نے لڑکی کی جان لے لی تو کتنی کہانیوں نے جنم لیا ہوگا آج جب ہر طرف تعلیم کا دور دورہ ہے اور میڈیا کی تیزی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے پھر بھی لوگ توہمات اور جاہلانہ خیالات پر عمل پیرا ہیں سوائے افسوس کے کیا کیا جاسکتا ہے۔ ”نہیں چاہیے“ دلچسپ اور سوچوں کے کئی در کھولنے والی کہانی ہے جسے منظر امام صاحب نے اپنی تخلیقی صلاحیت کے زور پر ترتیب دیا ہے۔ زندہ درگور، معجزاتی کہانی ہے ایسے کئی واقعات پڑھے ہیں ایک واقعہ تو بڑا دلچسپ تھا جب ایک اکلوتی لڑکی فوت ہوئی تو والدین نے اسے زیور پہنا کر دفن کردیا۔ رات کو گاؤں کے دو لالچی اور آوارہ لڑکوں نے قبر کھودی تو زیوروں کی بجائے مردہ لڑکی ان کے گلے کا ہار بن گئی۔ اللہ کی وسیع سرزمین پر کتنے عجیب، ہولناک اور سبق آموز واقعات جنم لیتے ہیں۔ آج کے اس مادہ پرست تیز رفتار دور میں لوگ

جلد بھول جاتے ہیں اور شب وروز ہنگاموں میں پڑ کر نئی دنیا کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہیں یوں کتنا بڑا واقعہ اپنی افادیت کھودیتا ہے۔ محمود احمد مودی اور نسیم جاوید سید کو واپس لے آئیں۔ یوں رونق میں اضافہ ہوجائے گا۔“

☆ شاہد جہانگیر شاہد کی پشاور سے آمد ”آپ کا تجزیہ بالکل درست ہے۔ بابائے قوم کی رہائش گاہ (زیارت ریذیڈنسی) کی دہشت گردی کے ذریعے تباہی کے واقعہ کے نتیجے میں عوام کے متوقع شدید ردعمل کی شدت کم کرنے بلکہ ختم کرنے اور عوام کی توجہ دوسری جانب مبذول کرنے کے لیے اسی دن طالبات کی بس میں دھماکا کیا گیا جس کی وجہ سے بہت سی طالبات کو جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔ یہ کیسا عذاب پاکستانی قوم پر نازل ہورہا ہے اور کون ہے اس کا ذمے دار؟ دونوں واقعات قابلِ مذمت ہیں۔ سیاست دانوں اور آمروں نے ملک کو تباہی کے دہانے پر پہنچادیا ہے۔ میں دل وجان سے جمہوریت پسند ہوں لیکن بہت افسوس سے مجھے کہنا پڑ رہا ہے کہ ایوب خان کا دورِ حکومت بہت سی خرابیوں کے باوجود ایک پُرامن دور تھا لیکن پھر سوچتا ہوں کہ ملک میں کرپشن کی بنیاد بھی انہی کے دور میں پڑی تھی۔ رشوت اور کرپشن کا جو پودا انہوں نے لگایا تھا اب وہ ایک تناور درخت بن چکا ہے جس کی جڑیں بہت دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک کی سرحدیں ان ممالک سے ملی ہوئی ہیں جنہوں نے کبھی پاکستان کے وجود کو دل سے تسلیم ہی نہیں کیا اور روزِ اول سے لے کر آج تک پاکستان کو توڑنے کی سازشوں میں لگے ہوئے ہیں اور اس میں انہیں کافی حد تک کامیابی بھی ملی ہے جس کی سب سے بڑی مثال مشرقی پاکستان کا بنگلہ دیش بن جانا ہے اور اب بھی وہ پاکستان کے مزید ٹکڑے کرنے میں مصروف ہیں۔ کوئی بھی پاکستان کا دوست نہیں ہے سب نے اپنے مفادات کی خاطر پاکستان کا استحصال کیا ہے اور جو ممالک کبھی پاکستان کی دوستی کا دم بھرتے تھے انہوں نے بھی ہمارے نااہل حکمرانوں کی غلط پالیسوں کی وجہ سے آہستہ آہستہ اپنا راستہ تبدیل کرنا شروع کردیا ہے۔ پاک چین دوستی جو کبھی ہمالیہ سے اونچی اور سمندر سے گہری تھی اب اس میں وہ پہلی سی گرم جوشی نہیں پائی جاتی۔ بھارت، چین 1962ء کی جنگ کے بعد ایک دوسرے کے دشمن بن چکے تھے اب پھر ایک دوسرے کے قریب آرہے ہیں اور پھر سے ہندی چینی بھائی بھائی کے نعرے لگ رہے ہیں اور کیوں نہ ہوں کہ بھارت اس وقت چین کے بعد دنیا بھر کی سب سے بڑی تجارتی منڈی بن چکا ہے جہاں ہر قسم کے مال کی کھپت پر ساری دنیا کی نگاہیں جمی ہوئی ہیں۔ چین کے وزیرِ اعظم جب پاکستان کے دورے پر آتے ہیں تو پہلے بھارت یاترا پر جاتے ہیں، کیوں؟ یہ ہمارے حکمرانوں کے لیے ایک لمحہ فکریہ ہے جبکہ پاکستان کی ہر قسم کی انڈسٹری گیس وبجلی کی طویل لوڈشیڈنگ کے باعث بند پڑی ہے۔ کراچی جو پاکستان کی معیشت کی شہ رگ ہے آئے دن ٹارگٹ کلنگ اور بم دھماکوں اور اس کے نتیجے میں ہونے والی ہڑتالوں کے باعث آخری دموں پر ہے۔ سعودی عرب جو کبھی پاکستان کا بہت بڑا دوست سمجھا جاتا تھا اس کے رویے میں بھی تبدیلی آچکی ہے اور عنقریب ہزاروں کی تعداد میں پاکستانیوں کو اپنے وطن سے بے دخل کرنے والا ہے۔ ان پاکستانیوں کو جنہوں نے عرب ممالک کے ریگستانوں کو اپنے خون پسینے سے لالہ زار بنایا ہے۔ یہ پاکستانی جب واپس آئیں گے تو ملکی معیشت پر مزید بوجھ بڑھے گا اور بے روزگاری میں بھی اضافہ ہوگا، اطلاعات کے مطابق پاکستانی، بنگلہ دیشی، انڈین مسلمانوں کو نکالنے کی شروعات ہوچکی ہیں ہمارے سیاست دان آخر کب یہ کاسۂ گدائی توڑیں گے؟ عزتِ نفس نام کی کوئی چیز ہے بھی ان کے پاس؟ اگر اب بھی حالات پر قابو نہ پایا گیا تو خدانخواستہ کسی قسم کا بھی کوئی بڑا سانحہ وقوع پزیر ہوسکتا ہے۔ جس کی متحمل اب پاکستانی قوم نہ ہوسکے گی۔ حکومت کو جو کچھ بھی کرنا ہے جلدی اور ہنگامی بنیادوں پر ملک کی بہتری کے لیے کرنا چاہیے۔ ہر کام کے لیے تین تین سال کی مہلت طلب کرنا درست نہیں ہے بلکہ ملک میں موجود وسائل کو کام میں لاکر خود انحصاری کی جانب قدم بڑھانا چاہیے تاکہ دنیا کی باعزت اقوام میں ہمارا اور ہمارے ملک کا شمار ہو۔ کب تک ہمارے عوام کرپشن، بجلی وگیس کی طویل لوڈشیڈنگ، مہنگائی، بے روزگاری، بدامنی، فرقہ وارانہ فسادات، علاقائی ولسانی جھگڑوں، ٹارگٹ کلنگ اور دہشت گردی جیسے عفریتوں سے دست وگریباں رہیں گے۔ کوئی دن ایسا نہیں جاتا جب وطنِ عزیز کے کسی نہ کسی گوشے سے ٹارگٹ کلنگ اور بم دھماکوں کے واقعات کی گونج سنائی نہ دیتی ہو۔ میرے اکثر دوست کہتے ہیں کہ تم تو ایک بہت زیادہ محبت کرنے والے انسان تھے پھر تمہاری تحریر میں یہ تلخی اور غم وغصہ کیسے پیدا ہوگیا۔ اب میں انہیں کیسے سمجھاؤں کہ پورے پاکستان میں آگ لگی ہو اور میں خوشی کے نغمے گاؤں؟ میں نیرو تو نہیں کہ جب پورا روم جل رہا تھا تو وہ ایسے وقت میں بھی بنسری بجا رہا تھا۔ لکھاری چاہے چھوٹا ہو یا بڑا، شاعر چاہے مشہور ہو یا غیر معروف وہ اپنے عہد کا ترجمان ہوتا ہے اور وہی کچھ رقم کرتا ہے جو وہ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے۔ ایک خوشی کی خبر ہفت روزہ فیملی میگزین لاہور میں نظر سے گزری کہ میرے ہم نام شاہد پورے والا اور رانا سجاد صاحبان کی شادی خانہ آبادی ہوگئی اور خیر سے وہ بھی اپنے گھر کے ہوگئے۔ دونوں رانا صاحبان کو میری جانب سے بہت بہت مبارک باد۔ ان کی آزادی کے دن تو اب ختم ہوگئے ہیں لیکن سرگزشت اور شہرِ خیال سے اپنا رشتہ برقرار رکھنا چاہیے اور اپنے زرین خیالات سے بھی نوازتے رہنا چاہیے۔ اب آتے ہیں شہرِ خیال کی طرف سدرہ بانو ناگوری صاحبہ، احمد خان توحیدی، محمد عمران جونانی صاحبان کا بے حد مشکور ہوں کہ ان سب دوستوں نے مجھ ناچیز کے تبصرے کو پسند فرمایا۔ طاہرہ گلزار صاحبہ کا تبصرہ خوب صورت تھا اس کے علاوہ احمد خان توحیدی بھی ایک اچھے تبصرے کے ساتھ شاملِ محفل ہوئے۔ آخر میں شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں... آپ کا کہ آپ نے دلیپ کمار کے بارے میں میرے لکھے ہوئے تبصرے کی وضاحت کردی جو کہ عزیز اللہ صاحب کے تبصرے میں کمپوزنگ کی غلطی سے شامل ہوگیا۔“

تاخیر سے موصول خطوط:

ارشد حیات، نوازش علی، باقر رضا، نثار احمد، ذیشان فاروقی (کراچی)، ایچ اکبر، منظر علی خان، توصیف احمد، منظر علی خان (لاہور) رانا فصاحت بخاری (فیصل آباد) کنور برجیس (حیدرآباد) شمیم ممتاز (مظفر گڑھ) صاحب جان (کوئٹہ) نسیم اختر (پشاور) احمد خان (راولپنڈی) احباب خان (جہلم) نیاز احمد (گجرات) محمد آفاق (ساہیوال) نذر محمد (چنیوٹ) نعیم الدین، آصف خان (دینہ) ریاض زیدی (کوٹ سیداں) احمد اشفاق (ڈی آئی خان) مشاہد محمود (خان پور) نگار قاسمی (امین پور بازار)

دیدہ ور

ڈاکٹر ساجد امجد

بے بصارتی اس کے آگے کوہ ہمالیہ بن کر کھڑی تھی لیکن اس نے انتھک محنت اور امید بھری لگن سے اس چوٹی کو سر کرنے کا ارادہ کرلیا تھا۔ اس نے ادب کے میدان کا انتخاب کیا تھا مگر خود شش جہت تھا، ہر میدان میں ایک کارنامہ انجام دے سکتا تھا۔ اس نے دکھادیا کہ بینائی کی کمی کوئی کمی نہیں ہوتی، اصل چیز ہے لگن، جستجو اور محنت۔

پنجاب کے چھوٹے سے قصبے میں پیدا ہونے والے ایک بڑے آدمی کی کتھا

آزادیِ ہند کا گجر بج چکا تھا۔ زمین کی تقسیم، آبادی کی تقسیم بنی تو دونوں طرف کے قافلے حرکت میں آگئے۔ پنجاب دو حصوں میں بٹ گیا۔ مشرقی پنجاب ہندوستان کے قبضے میں چلا گیا۔ لٹے پٹے مہاجر جانوں اور عصمتوں کی قربانی دے کر پاکستان آنے لگے۔ امرتسر سے لے کر انبالہ تک کے مسلمان سرگودھا آگئے۔ اصل حق دار آئے تو اس شہر کے ہندو اور سکھ نقل مکانی کر کے سرحد کے اُس پار جانے لگے۔ اس ردوبدل میں بقائے باہمی کا جذبہ کارفرما رہا۔ آنے والوں کا خندہ پیشانی سے خیر مقدم کیا گیا۔ جانے والوں کو غیر رسمی طور پر رخصت کیا جاتا رہا۔

کسی کو کاروبار کی کشش کھینچ کر لا رہی تھی، کسی کو یہ خوشی تھی کہ اسلامی ملک بن گیا ہے وہاں جانا چاہیے، کسی کو ہندو ذہنیت زبردستی نکال رہی تھی۔

بھارت کے شہر کرنال کے ایک بازار سے گزرتے ہوئے شیخ اللہ دیا نے اپنے ایک ہندو دوست کی دکان کھلی ہوئی دیکھی تو دکان میں داخل ہوگئے حالانکہ انہیں گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔

یہ دکان کئی دن بند رہنے کے بعد کھلی تھی لہٰذا شیخ اللہ دیا نے سوچا کہ چل کر دھرم داس کی خیریت دریافت کی جائے۔ انہیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ دھرم داس جو کبھی انہیں دیکھ کر کھل اٹھتا تھا اس وقت اس کے چہرے پر کوئی جذبات نہیں تھے۔ شیخ اللہ دیا نے خود ہی پہل کی۔

”دھرم داس کیا بات ہے دکان نہیں کھول رہے تھے، طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”شیخ جی، تم ابھی تک ہو۔ پاکستان نہیں گئے؟“ اس کے لہجے میں عجیب سا طنز تھا۔

”بھئی، میں کیوں جاؤں۔ مجھے یہاں کون سی تکلیف ہے۔“

”ہمیں تو تکلیف ہے۔“

”میری ذات سے تمہیں کیا تکلیف پہنچی ہے دھرم داس؟“

”میں تمہاری نہیں مسلمانوں کی بات کر رہا ہوں۔“

”مسلمان تو میں بھی ہوں۔“

”اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ جب ملک بنایا ہے تو جاؤ بھی۔“

"یار تم تو میرے دوست رہے ہو۔ تم تو ایسی باتیں مت کرو۔"

"دوست ہوں اسی لیے تو یہ نیک مشورہ دے رہا ہوں۔"

"اچھا دوست، اب تو کچھ سوچنا ہی پڑے گا۔"

شیخ اللہ دیا دکان سے نکلے تو وہ شہر ان کے لیے اچانک پرایا ہو گیا تھا۔ ہر چہرہ اجنبی، ہر گلی ناآشنا۔ دیواریں کھڑی تھیں دکانیں کھلی تھیں لیکن شہر کہیں چلا گیا تھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے گھر کی طرف چل دیے۔ گھر کے سامنے پہنچ کر بھی پہلے اچھی طرح اطمینان کر لیا کہ گھر انہی کا ہے اور پھر دستک دے دی۔ دروازہ کھلتے ہی ان کے دو سالہ بیٹے اقبال کے رونے کی آواز نے ان کا استقبال کیا۔

وہ جب روتا تھا تو کسی طرح چپ ہونے میں نہ آتا تھا۔ بہت دنوں تک تو میاں بیوی یہ سمجھتے رہے تھے کہ اس کے پیٹ میں درد رہتا ہے جو اسے بے چین رکھتا ہے پھر ایک مرتبہ انہیں بعض رشتے داروں کے پاس امرتسر جانا ہوا تو ایک ڈاکٹر نے تشخیص کیا کہ بچے کے پیٹ میں درد نہیں بلکہ تکلیف آنکھوں کی ہے۔ اس کی دونوں آنکھوں میں کالا موتیا ہے جو اسے تکلیف دیتا ہے۔ اس کا علاج کرانا ضروری ہے۔ انہوں نے وقتی طور پر دوا دے دی کہ جب بچہ روئے تو ایک ایک قطرہ دونوں آنکھوں میں ڈال دینا۔ سوچا تھا اسی ڈاکٹر سے علاج کروالیں گے لیکن پھر سیاسی آندھی ایسی چلی کہ امرتسر جانے کے لائق رہا ہی نہیں۔

"اقبال کے رونے کی آواز دروازے تک آرہی ہے۔ تم نے دوا نہیں ڈالی؟"

"ابھی ڈال کر آئی ہوں۔ تھوڑی دیر میں چپ ہو جائے گا۔"

انہوں نے اس کے چپ ہونے کا انتظار کیا۔ جب وہ چپ ہو گیا تو انہوں نے بازار میں گزرنے والی روئیداد بیوی کو سنائی۔

"بیگم ایسا لگتا ہے یہاں سے ہمارا آب و دانہ اٹھنے والا ہے۔"

"آپ تو ایک آدمی کی آواز سے ایسے دل برداشتہ ہو گئے۔"

"یہ ایک آدمی کی آواز نہیں پورے ہندو سماج کی آواز ہے۔"

"آپ تو بس یونہی۔"

"نہیں بیگم، زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو۔ اچھائی اسی میں ہے کہ ہم پاکستان چلے جائیں۔ امرتسر میں جتنے رشتے دار تھے وہ سرگودھا ہجرت کر چکے ہیں۔ ہم بھی وہیں چلتے ہیں۔ رشتے داروں کا بہت سہارا ہوتا ہے۔ مشرقی پنجاب کے سارے لوگ وہیں گئے ہیں۔ ایک سا ماحول ہوگا۔ نئے پن کا احساس نہیں ہوگا پھر اللہ کی بندی یہ بھی تو سوچو وہ اسلامی ملک ہوگا۔ یہاں تو اب یہی ہوگا۔ دلوں میں نفرتیں بیٹھ گئی ہیں۔ ہندو، مسلمان چین سے نہیں بیٹھ سکیں گے۔ آئے دن کے جھگڑے ہوتے ہی رہیں گے۔"

"کچھ دن اور دیکھ لو شاید حالات ٹھیک ہو جائیں۔"

"اس سے پہلے کے کوئی ہمیں نکالے ہمیں خود نکل جانا چاہیے۔"

"جب آپ نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو میں کیا کر سکتی ہوں۔" شیخ اللہ دیا فیصلہ کر ہی چکے تھے۔

سرگودھا اس وقت ایک نوآباد شہر تھا۔ اس کی ابتدائی داغ بیل ہیڈ رسول سے نکلنے والی نہر لوئر جہلم کی ایک شاخ سدرن برانچ کے بائیں کنارے پر ڈال دی گئی تھی۔

اس چھوٹے سے قافلے نے جب سرگودھا میں قدم رکھا تو ملازمت کی تگ و دو ہوئی۔ نئے آنے والوں کے لیے ملازمتوں کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ شیخ اللہ دیا کو جوئیہ جلال پور تحصیل خوشاب ضلع سرگودھا میں لوئر مڈل اسکول کا ہیڈ ماسٹر لگا دیا گیا پھر ایک سال تک گورنمنٹ ہائی اسکول حضرو ضلع اٹک میں ملازمت کرتے رہے۔ اس کے بعد گورنمنٹ ہائی اسکول خوشاب ضلع سرگودھا میں متعین کر دیا گیا۔ اب انہوں نے خوشاب میں رہائش اختیار کر لی۔ ان کا بیٹا اقبال اب پانچ سال کا ہو چکا تھا۔ ایک اور بھائی اشفاق بھی ہو چکا تھا۔

اقبال کی بینائی کمزور ضرور تھی لیکن وہ نابینا نہیں تھا۔ بچوں کے ساتھ گلی میں کھیلتا بھی تھا۔ گھر میں دھما چوکڑی بھی مچاتا تھا۔ وہ تمام کھیل کھیلتا تھا جو بچے کھیلتے ہیں۔ شیخ اللہ دیا نے اسے گھر کے قریب ہی ایک پرائمری اسکول میں داخل کروا دیا۔ وہ بڑے شوق سے اسکول گیا تھا اور پھر روز جانے لگا تھا۔ وہ دوست بنانے میں ماہر تھا اور پھر اکثر بچے وہی تھے جو اس کے محلے میں رہتے تھے۔ اسکول میں اس کا دل لگ گیا لیکن آنکھوں کی کمزوری اس کی راہ میں حائل ہو رہی تھی۔ کتابوں پر آنکھیں جمائے رکھنے سے آنکھیں درد کرنے

لگتیں۔ گھر پہنچتے پہنچتے وہ نڈھال ہو جاتا۔ اس کے اساتذہ اس کی کیفیت سے ناآشنا تھے۔ سبق اچھی طرح نہ پڑھنے سے وہ اکثر سزا کا مستحق قرار پاتا۔ کتاب ہاتھ میں لیتا تو الفاظ گڈمڈ ہو جاتے۔ کچھ سے کچھ پڑھ ڈالتا۔ اسے اس کی نالائقی تصور کیا جاتا۔ تمام لڑکوں کے سامنے اسے شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا۔ وہ پڑھنے سے جی چرانے لگا۔ بیماری کا بہانہ بنا کر اسکول کی چھٹیاں کرنے لگا پھر ایک دن اس نے عجیب حرکت کی۔ اسکول جانے کی بجائے کسی اور طرف نکل گیا اور گھوم پھر کر اسکول کی چھٹی کے وقت گھر آگیا لیکن اس کی چوری پکڑی گئی۔ اسکول کے ایک بچے نے گھر آکر بتا دیا کہ اقبال تو آج اسکول آیا ہی نہیں۔ اقبال جس قسم کا بچہ تھا اس سے یہ امید کی ہی نہیں جا سکتی تھی۔ شیخ اللہ دیا نے تعجب سے پوچھا اور تفتیش کے انداز میں اس سے پوچھا۔

"اقبال، آج اسکول میں کیا پڑھا۔" اقبال نے اپنی طرف سے بہت کچھ بتا دیا۔

"اب تم جھوٹ بھی بولنے لگے ہو۔ تم تو اسکول گئے ہی نہیں تھے۔"

اقبال کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

"ابا جی، آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں آج اسکول نہیں گیا تھا اور جاؤں گا بھی نہیں۔"

"کیوں نہیں جاؤ گے؟"

"ابا جی، میری آنکھیں کمزور ہیں۔ مجھ سے کتاب صحیح طرح نہیں پڑھی جاتی۔ سارے بچے مجھ پر ہنستے ہیں پھر میں اسکول کیوں جاؤں؟"

یہ سنتے ہی شیخ اللہ دیا کا دل دھک سے رہ گیا۔ انہیں یاد آیا امرتسر کے اس ڈاکٹر نے کہا تھا بچے کی آنکھوں میں کالا موتیا ہے۔ اس کا علاج ضروری ہے۔ ہجرت کے آزار اور تلاشِ روزگار نے اس طرف توجہ ہی نہیں ہونے دی تھی۔

وہ خود بھی استاد تھے۔ اقبال اگر پرائمری اسکول میں پڑھتا تھا تو وہ ہائی اسکول کے ٹیچر تھے۔ تعلیم سے وابستہ تمام ہی لوگ اس چھوٹے سے شہر میں ان کے شناسا تھے۔ وہ اقبال کے اسکول گئے اور اس کے کلاس ٹیچر سے ملاقات کی۔ اس ٹیچر نے بھی تصدیق کی کہ اقبال کی آنکھوں کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے۔ اسے بلیک بورڈ سے سوالات اتارنے میں بھی دقت ہوتی ہے اور کتاب پڑھتے ہوئے بھی اٹکتا ہے۔ شیخ اللہ دیا گھر واپس آئے تو بہت اداس تھے۔
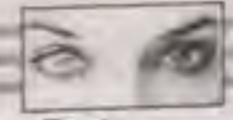
یہ اداسی کچھ دنوں سے بہت گہری اس لیے ہو گئی تھی کہ اقبال کا چھوٹا بھائی محمد اشفاق بھی ایسی ہی کسی بیماری میں مبتلا ہو گیا تھا۔ وہ بھی کم نظر آنے کی شکایت کر رہا تھا۔ انہوں نے ایک روز دونوں بچوں کو ساتھ لیا اور لاہور پہنچ گئے۔ میو اسپتال لاہور میں ماہرِ چشم ڈاکٹر محمد رمضان کی بہت شہرت تھی۔ انہیں دکھایا۔ انہوں نے اقبال کے علاج سے معذوری ظاہر کی البتہ اشفاق کے لیے امید دلائی کہ اس کا علاج ہو سکتا ہے۔

"اقبال کے سلسلے میں بہت دیر ہو چکی ہے۔ اب اس کا علاج ناممکن ہے۔ بینائی آہستہ آہستہ زائل ہوتی چلی جائے گی۔ اللہ نہ کرے یہ نابینا بھی ہو سکتا ہے ویسے اللہ کی ذات بڑی کارساز ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بینائی جتنی ہے وہیں ٹھہر جائے۔ رہی دوسرے بچے اشفاق کی بات تو میں اس کا آپریشن کر دوں گا۔ انشاءاللہ ٹھیک ہو جائے گا۔"

محمد اقبال پہلی مرتبہ لاہور آیا تھا۔ اتنا بڑا شہر وہ پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ دوبارہ اس شہر میں آئے گا ضرور لیکن اس شہر کو دیکھ نہیں سکے گا۔

محمد اشفاق کی آنکھ کا آپریشن ہو گیا اور کامیاب بھی ہو گیا لیکن ڈاکٹر نے ہدایت کر دی کہ یہ بچہ ہے بھاگنے دوڑنے سے باز نہیں آئے گا۔ احتیاط بہت ضروری ہے ورنہ بینائی جاتی رہے گی۔

شیخ اللہ دیا نے دونوں بچوں کو ساتھ لیا اور خوشاب چلے آئے۔ ان کی ایک ہتھیلی پر خوشی ایک پر صدمہ تھا۔ انہوں نے صدمے والی مٹھی چھپالی اور بیوی کو خوش خبری سنائی۔

"اپنے اشفاق کا آپریشن کامیاب ہو گیا۔"

"اور اقبال؟"

"اس کے آپریشن میں ابھی کچھ دن لگیں گے۔ ڈاکٹر کہتا ہے کچھ دن بعد آنا۔" اللہ دیا کی ہمت نہیں تھی کہ اقبال کی ماں کو سچ بات بتاتے۔ یہ بتاتے کہ اندھا پن اب اس کا مقدر بننے والا ہے۔ اس نے خوشاب کے سوا کوئی شہر نہیں دیکھا ہے اب اس کے ذہن کے نقشے پر خوشاب کے سوا کوئی شہر نہیں آئے گا۔ خوشاب بہت خوش قسمت ہے کہ یہ شہر میرے اقبال کے ذہن میں ہمیشہ محفوظ رہے گا۔

"اقبال، آج تم باہر بچوں کے ساتھ کھیلنے نہیں گئے۔ جاؤ باہر جا کر کھیل کود آؤ دل بہل جائے گا۔"

"ابا جی، آپ تو بچوں کے ساتھ کھیلنے کودنے کو منع

کرتے ہیں۔ اب خود ہی کہہ رہے ہیں۔''

''میں غلطی پر تھا۔ اب میں تمہیں کبھی منع نہیں کروں گا۔''

اجازت مل چکی تھی لیکن اقبال نے پھر بھی باپ کی طرف حیرت سے دیکھا اور گلی میں نکل گیا۔ بچے ہمیشہ کی طرح مختلف کھیل کھیل رہے تھے، وہ بھی ان میں شامل ہوگیا۔

وہ دیر سے کھیلنے نکلا تھا تھوڑی دیر میں شام ہونے لگی۔ دوسرے بچوں کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا لیکن اس کے چراغوں میں تیل کم تھا۔ آنکھیں دھندلانے لگیں، وہ گھر لوٹ آیا۔

''سب بچے آرام سے کھیل رہے ہیں میری آنکھوں کے ساتھ نہ جانے کیا مسئلہ ہے۔ آپ میرا علاج ہی نہیں کرواتے۔ میں اب کھیلنے نہیں جایا کروں گا۔''

شیخ اللہ دیا کو معلوم تھا کہ یہ کیا ہورہا ہے لیکن شیخ صاحب کو یہ بھی معلوم تھا کہ وہ ایک چھوٹے سے قصبے میں محض ایک مدرس ہیں۔ جیسے تیسے روح اور بدن کے رشتے کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ اتنا کرسکتے ہیں کہ اسے ایک مرتبہ پھر لاہور لے جائیں۔ ملک سے باہر لے جانے کا تو وہ تصور بھی نہیں کرسکتے تھے۔ کئی ڈاکٹروں نے کہہ بھی دیا تھا کہ ملک سے باہر لے جانے کا بھی کوئی فائدہ نہیں۔

رات میں سونے کا وقت آیا تو اللہ دیا نے محمد اقبال کو اپنے ساتھ ہی لٹا لیا۔ یہ بالکل نئی بات تھی لیکن ایسی نہیں تھی جسے اقبال محسوس کرتا۔

''جانتے ہو میں نے تمہارا نام کس کے نام پر رکھا ہے۔''

''جانتا ہوں، علامہ اقبال کے نام پر۔''

''یہ شاید نہ جانتے ہو کہ کیوں رکھا ہے؟''

''وہ بہت مشہور تھے۔ اس لیے رکھا ہوگا۔''

''نہیں بلکہ اس لیے کہ وہ بہت بڑے فلسفی تھے۔ عظیم شاعر تھے اور باعمل مسلمان تھے۔ تم اس نام کے اثر سے ان جیسے بن جاؤ۔''

''بس دیکھ لینا ان جیسا بن کر دکھاؤں گا اور شاعری بھی کروں گا۔ ابا جی، میرا دل بھی کبھی چاہتا ہے کہ میں بھی شاعری کروں۔ ویسی نظمیں لکھوں جیسی میری کتاب میں ہیں جیسے وہ، لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری۔''

''شاعری اچھی چیز ہے لیکن اس کے لیے بہت پڑھنا بھی پڑتا ہے۔ پہلے خوب سارا پڑھنا اس کے بعد شاعری کرنا۔''

''پڑھنا تو پہلے ہے ابا جی۔''

شیخ اللہ دیا کی محبتیں اس کے گرد رقص کرنے لگی تھیں۔ وہ اسے لے کر بازار کی طرف نکل جاتے تھے۔ دریائے جہلم کی سیر کروانے چلے جاتے تھے۔ شاید وہ تمام قابلِ ذکر مقامات اس کے حافظے میں محفوظ کردینا چاہتے تھے۔ انہیں احساس ہورہا تھا کہ اس کی بینائی تیزی سے زائل ہورہی ہے۔ اس کے چشمے تیزی سے تبدیل ہورہے ہیں۔

وہ بہ مشکل تیسری جماعت میں پہنچا تھا کہ ایک روز اس کے استاد نے قریب رکھی پنسل اٹھانے کو کہا۔ اس نے ہاتھ بڑھایا لیکن ہاتھ وہاں رکھا جہاں پنسل نہیں تھی۔ ہاتھ کو اندازے سے دوسری جگہ رکھا اور پنسل ہاتھ میں آگئی۔ اس نے ماسٹر صاحب کی طرف دیکھا۔ ایک پرچھائیں تھی جو اس کے سامنے کھڑی تھی وہ تقریباً چیخ اٹھا۔

''ماسٹر صاحب، مجھے کچھ نظر نہیں آرہا۔'' کلاس ٹیچر اس کی نیم بینائی سے واقف تھے۔ اسے ایک بچے کے ساتھ گھر بھیج دیا۔ گھر قریب ہی تھا۔ دیکھا بھالا راستہ تھا۔ دوست ساتھ تھا۔ اندھیرے میں چلتا ہوا گھر پہنچ گیا۔ ماں کی گود میں سر رکھ کر خوب رو دیا۔ تھوڑی دیر میں شیخ اللہ دیا کو بھی خبر کردی گئی۔ وہ بھی پہنچ گئے۔

''افسوس، ڈاکٹر رمضان نے جو کہا تھا اس کا وقت آگیا۔ اقبال کی ماں اس کی بینائی چلی گئی۔ ہائے ابھی تو پوری عمر اس کے سامنے پڑی ہے۔''

تھوڑی دیر نہیں گزری تھی کہ گھر میں کہرام مچ گیا۔ خاندان کے جتنے لوگ تھے اس کے گھر میں جمع ہوگئے۔ افسوس کا اظہار تو کر ہی رہے تھے لیکن اکیلے میں کچھ اور ہی باتیں ہورہی تھیں۔ خصوصاً عورتیں سرگوشیاں کررہی تھیں۔

''بچوں کا کیا قصور۔ بڑوں کے گناہ ہوتے ہیں جو بچوں کے آگے آتے ہیں۔''

''اللہ دیا نے کسی کا دل دکھایا ہوگا جس کی سزا بچوں کو ملی ہے۔''

''چاچی کو بھی کم نہ سمجھو۔ صرف اللہ دیا کا قصور نہیں ہوگا۔''

''اے بہن، سنا ہے دوسرے بچے کا بھی آپریشن

ہوا ہے۔ بھلا بتاؤ اتنے سے بچوں کے کوئی آپریشن ہوتے ہیں۔''

''ان کے گھر میں ضرور کوئی آسیب ہوگا۔ بچوں کی آنکھوں کے پیچھے پڑ گیا ہے۔''

''اس گھر میں تو بچوں کو لانا بھی نہیں چاہیے۔''

''ہاں بہن، میں تو اپنے بچوں کو منع کردوں گی۔ اس کے ساتھ کھیلنے نہ آئیں۔''

''اب یہ بتاؤ یہ اندھا بچہ کرے گا کیا؟''

''ہائے، ہائے، بھیک مانگ کر اپنا گزارہ کرے گا۔''

''بس بہن اللہ سب کو محفوظ رکھے۔''

خوشاب چھوٹی سی جگہ تھی۔ چھوٹے چھوٹے ذہن تھے۔ تعلیم کا رواج بھی ایسا نہیں تھا۔ خود اقبال کے خاندان میں کوئی میٹرک بھی نہیں تھا۔ عوام الناس سمجھتے تھے آنکھیں گئیں تو جہان گیا۔ کوئی اگر اندھا ہوجاتا تو یہ خیال بھی نہیں آتا تھا کہ وہ کوئی کام بھی کرسکے گا یا پڑھ لکھ سکے گا۔ اس کی منزل صرف اتنی تھی کہ قرآن پاک حفظ کرلے۔ اقبال کی فیملی کا بھی یہی خیال تھا لیکن اللہ دیا ایک پڑھے لکھے باہمت انسان تھے۔ وہ اس فکر میں غلطاں تھے کہ اقبال کے لیے کس طرح تعلیم کا بندوبست کیا جائے۔

بینائی سے محروم ہوتے ہی اقبال ایک دنیا میں رہتے ہوئے کسی دوسری دنیا میں پہنچ گیا۔ یہ دنیا تھی تنہائی کی دنیا جہاں اس کے سوا کوئی نہیں تھا۔ کبھی کبھی آوازوں کا شور پھول کھلا دیتا تھا۔ وہاں اور بھی ہیں جہاں میں ہوں۔ وہ دوست جن کے ساتھ وہ گھنٹوں گزارتا تھا اب ان کے لمس کو ترسنے لگا تھا۔ شاید ان کی ماؤں نے منع کردیا تھا کہ اقبال کے ساتھ مت کھیلنا کہیں اقبال کا مرض تمہیں بھی نہ لگ جائے حالانکہ نابینائی اُڑ کر لگنے والا مرض نہیں۔ بینائی کھو جانے کے بعد وہ حساس بھی ہوگیا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر جھنجلانے بھی لگا تھا۔ وہ بہت کچھ دیکھ کر اندھا ہوا تھا اس لیے جب صبح ہوتی اور چڑیوں کے چہچہانے کی آوازیں اس کے کانوں میں پہنچتیں تو وہ انہیں دیکھنے کے لیے بے چین ہوجاتا۔ اس کا جی چاہتا تھا صبح طلوع ہوتے ہوئے دیکھے۔ وقت کا اندازہ کرتا۔ اس وقت تو مجھے اسکول جانا تھا اب کیسے جاؤں گا۔ اسکول کا خیال آتے ہی کئی چہرے تصور میں ابھر آتے۔ یہ ان دوستوں کے چہرے تھے جو اس کے ارد گرد رہا کرتے تھے۔ انہیں دیکھنا تو در کنار اب وہ اس کے پاس ملنے بھی

سوانحی خاکہ

نام: شیخ محمد اقبال

ولدیت: شیخ اللہ دیا

پیدائش: 15 مارچ 1945ء کرنال (بھارت)

تعلیم: پرائمری بلائنڈ اسکول لاہور، میٹرک (پرائیوٹ) انٹر (جوہر آباد کالج)، بی، اے (گورنمنٹ کالج، سرگودھا)، ایم، اے انگریزی (فیصل آباد ڈگری کالج)۔ ایم، اے اردو، ایم فل، پی، ایچ، ڈی 2002ء

اہلیہ: رفعت حمید

اولاد: کوکب اقبال، کشور اقبال، تابش اقبال

ملازمت: گورنمنٹ کالج، سرگودھا۔ پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔ سرگودھا یونیورسٹی۔

نہیں آتے تھے کہ ان کی آواز ہی سن لے۔ ذہن کی سنسنان راہگزر پر دور دور تک دھول اُڑ رہی تھی۔

اسے معلوم نہیں تھا کہ صرف وہی تنہا نہیں رہ گیا ہے بلکہ گھر کا گھر تنہا ہوگیا ہے۔ اس پر تو یہ عقدہ اس دن کھلا جب اس کے والد اور والدہ کے درمیان کسی بات پر جھگڑا ہوا اور والد صاحب نے غصے میں آکر کہہ دیا۔

''اندھے بچے کی ماں ہو کر مجھ سے اکڑتی ہو۔'' عام طور پر مائیں اپنے بیٹوں پر اکڑتی اور اتراتی ہیں۔ شیخ اللہ دیا نے یہ جملہ اسی تناظر میں کہہ دیا تھا۔

اقبال نے اس کا مطلب یقیناً یہ نکالا کہ اس کی والدہ اس کے بغیر تنہا ہوگئی ہیں۔ اس کی بینائی ہوتی تو یہ فقرہ انہیں کیوں سننے کو ملتا۔ وہ اتنا تنہا تھا کہ کوئی چہرہ اس کے مقابل نہیں تھا۔ ماں کا چہرہ بھی نہیں۔

اسے یہ تنہائی کبھی کبھی اس وقت ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوتی جب اس کی ماں اسے سینے سے لگاتی یا والد شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرتے یا اسکول سے واپسی میں کوئی چیز اس کے لیے لے کر آتے۔

محبتوں کی یہ پھوار اسے نہ جانے کب تک بھگوئے رکھتی کہ اچانک گھر کا ماحول ایک سنگین مذاق میں تبدیل ہوگیا۔ چھوٹا بھائی اشفاق بھی بینائی کی نعمت سے محروم

ہوگیا۔

یہ حادثہ اقبال کے لیے تو اتنا روح فرسا نہیں تھا لیکن اللہ دیا بری طرح ٹوٹ پھوٹ گئے۔ کہنے والوں کی زبانیں اور لمبی ہوگئیں۔ اب وہ اسے حادثہ کہنے کو تیار نہیں تھے۔ ان کے خیال میں یہ تو اللہ دیا کے گناہوں کی سزا تھی جو اُن کے بیٹوں کو مل رہی تھی۔ اس میں یہ افسوس ضرور شامل تھا کہ بچوں کا کیا قصور۔

"بیٹے جیسی چیز اور دونوں اندھے ہوگئے۔ چلو قرآن حفظ کر کے والدین کی بخشش کا سامان تو کریں گے۔" یہ طعنے اور طنز صرف باہر تک محدود نہیں تھے۔ گھر میں بیٹھے ہوئے دادا بھی اپنے بیٹے پر ناراض ہوتے تو اکثر کہہ اٹھتے۔

"دیکھا تمہاری کرنی آگے آئی۔"

شیخ اللہ دیا دن رات طعنے سن رہے تھے۔ اپنی محدود آمدنی پر بھی نظر تھی۔ بچوں کا علاج کرواؤں تو کیسے۔ یہ پوری زندگی نابینا رہیں گے اور میں انہیں دیکھتا رہوں گا۔ کبھی کسی اندھے فقیر کو دیکھ لیتے تو سر سے پاؤں تک کانپ اٹھتے۔ انہیں اپنے دونوں بچوں کا خیال آجاتا۔ لاحول پڑھتے اور منہ دوسری طرف پھیر لیتے۔

کوئی مہذب معاشرہ ہوتا تو حوصلہ دلانے والے بہت ہوتے۔ خوشاب کے چھوٹے سے قصبے میں ہمدردی کے دو بول کہنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ جہاں جاتے دل شکن الفاظ ہی کانوں میں پڑتے۔ گھر میں بھی ہر دوسرے دن یہی صورتِ حال پیش آتی۔

شیخ اللہ دیا پنج وقتہ نمازی تھے لیکن حالات ایسے ہوگئے کہ ایمان ڈانواں ڈول ہوگیا۔ اسے مایوسی کی انتہا ہی کہا جاسکتا تھا۔

اندھیری رات تھی۔ وہ بستر پر لیٹے تھے اور لامحالہ دونوں بچوں کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ خیالوں کے رتھ پر سوار نہ جانے کتنی دور نکل گئے۔ خیالوں ہی خیالوں میں بچے جوان ہوگئے۔ کیا مجھے ان کی معذوری دیکھنے کے لیے زندہ رہنا چاہیے؟ میں کیسے دیکھ سکوں گا۔ اللہ دیا تو اپنی زندگی ختم کرلے۔ جب تو ہی نہیں ہوگا تو پھر جو بھی ہو۔ شیطان کا داؤ چل گیا۔ اللہ دیا دریائے جہلم قریب ہے۔ رات کا وقت ہے کوئی دیکھنے اور بچانے والا بھی نہیں ہوگا۔ تو اپنی زندگی دریا میں ڈوب کر ختم کرلے شاید تیرے گناہ دھل جائیں اور یہ بچے صحت یاب ہوجائیں۔ بڑے بڑے پابندِ شریعت بہک جاتے ہیں۔ اللہ دیا بھی بہک گئے۔ خدا کی ذات سے مایوس ہوگئے۔ رات کا وقت تو تھا ہی۔ سب سو رہے تھے، وہ بستر سے اٹھے، پاؤں میں چپل ڈالی اور دروازے کی طرف بڑھے۔ دروازے کی کنڈی کھول ہی رہے تھے کہ کھٹکے سے بیوی کی آنکھ کھل گئی۔ شاید روز روز کی پریشانیوں سے انہیں اندازہ ہوگیا تھا کہ شوہر کوئی بھی قدم اٹھا سکتا ہے۔ وہ دوڑتی ہوئی گئیں اور میاں سے لپٹ گئیں۔

"آپ اس وقت کہاں جارہے ہیں؟"

"اپنی زندگی ختم کرنے۔ ایسی زندگی کا کیا فائدہ کہ اندھے بچوں کے سوا میں تمہیں کچھ نہ دے سکا۔ اس سے تو اچھا ہے جہلم میں ڈوب کر اپنی جان دے دوں۔"

"آپ کے بعد ہمارا کیا ہوگا۔ ہمیں بھی قتل کردیں۔" اس شور شرابے میں بچوں کی آنکھ کھل گئی۔ اقبال اس طرح باپ کی طرف دوڑا جیسے اس کی آنکھوں میں روشنی آگئی ہو۔

"ابا، میرا گلا گھونٹ دیں۔ اس کے بعد جہاں جانا ہو چلے جائیں۔" اللہ دیا کے دل میں رحم آگیا۔ سب کھینچ کر انہیں واپس لے آئے۔ سب رو رہے تھے۔ بے بسی اور مجبوری کے آنسو سب کی آنکھوں میں تھے۔

اللہ دیا دوبارہ بستر پر لیٹے تو ان کا ضمیر ان کے سامنے کھڑا تھا۔ اللہ دیا کیا تمہارا ایمان اللہ پر نہیں رہا جو یہ حرکت کرنے جارہے تھے۔ یہ تمہاری کوئی نیکی تھی جو اس ارادے کی تکمیل نہ ہوسکی۔ ابھی تو پھر بھی تم موجود ہو تمہارے بعد ان بچوں کا کیا ہوگا۔ اٹھو اور فجر کی نماز کے لیے کھڑے ہوجاؤ۔ اللہ کوئی نہ کوئی راستہ نکالے گا۔

اللہ دیا نے بستر چھوڑا وضو کیا اور مسجد چلے گئے۔ مسجد میں ایک دوست سے ملاقات ہوئی جو کئی دن سے مسجد نہیں آرہے تھے۔ اللہ دیا نے ان کی خیریت دریافت کی۔

"کیوں بھائی مسجد نہیں آرہے تھے، خیریت تو تھی؟"

"ہاں خیریت تھی، کسی کام سے لاہور گیا ہوا تھا۔ کل رات ہی آیا ہوں، آپ کے لیے ایک اچھی خبر لے کر آیا ہوں۔ اگر آپ سے یہاں ملاقات نہ ہوتی تو یہ خبر پہنچانے گھر آتا۔"

"کوئی اچھی خبر ہے تو ضرور سنائیں۔"

"میں لاہور میں تھا تو مجھے پتا چلا کہ شیرانوالہ گیٹ، لاہور میں گورنمنٹ کا نابیناؤں کا ایک پرائمری اسکول ہے

جہاں بریل رسم الخط میں تعلیم دینے کے علاوہ دستکاری بھی سکھائی جاتی ہے اور بچوں کے لیے میوزک کلاسز بھی ہیں۔ میری مانو تو بچوں کو وہاں داخل کروادو۔ کچھ پڑھ لکھ بھی جائیں گے اور ہنر بھی ہاتھ میں آجائے گا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن میں خوشاب میں رہتا ہوں اور وہ اسکول لاہور میں ہے۔"

"اسکول میں ہوسٹل بھی ہے۔ بیرونِ لاہور کے بچے بھی وہاں رہتے ہیں۔ آپ کا بچہ آرام سے رہے گا۔ چھٹیوں میں گھر آجایا کرے گا۔"

"آپ کی مہربانی جو آپ نے میرا اتنا خیال رکھا۔ میں ابھی گھر جاکر بات کرتا ہوں۔" اللہ دیا پڑھے لکھے تھے، اسکول ماسٹر تھے۔ تعلیم کی اہمیت کو بخوبی سمجھتے تھے۔ یہ سن کر خوش ہوگئے کہ پرائمری تک ہی سہی ان کے بچے پڑھ تو لیں گے۔

گھر پہنچتے ہی انہوں نے یہ خبر اقبال کی والدہ کو سنائی۔ وہ سمجھ رہے تھے وہ بھی ان ہی کی طرح خوش ہوں گی لیکن نابینا بیٹے کو اتنی دور بھیجنے پر تیار نہیں تھیں۔ وہ بھی قصبے کی دوسری عورتوں کی طرح یہ سمجھے بیٹھی تھیں کہ بچہ نابینا ہوگیا اب یہ حافظِ قرآن بننے کے سوا کچھ نہیں بن سکتا۔ بیوی کو سمجھانے میں کئی دن لگ گئے۔

"دیکھتی نہیں ہو بچوں کی زندگی بے کیف ہوکر رہ گئی۔ وہاں اپنے جیسے دوسروں بچوں کے ساتھ مل جل کر رہیں گے، وہ سمجھیں گے وہ اکیلے نہیں ہیں جو اس حادثے سے دوچار ہوئے ہیں۔ ان کی طرح اور بھی ہیں۔ ان کی ہمت بندھے گی اور پھر وہ چھٹیوں میں تمہارے ساتھ رہیں گے۔"

"پھر ایک بات آپ میری مانیں۔ میرے اشفاق کو میرے پاس رہنے دیں۔"

"چلو یہ کرلیتے ہیں۔ میں پہلے اقبال کو داخل کروادیتا ہوں۔ اگر اسکول قاعدے کا ہوا اور اقبال کو کوئی فائدہ پہنچا تو پھر اشفاق کو داخل کروادوں گا۔ ابھی اقبال کو جانے دو۔"

وہ اس پر تیار ہوگئیں۔ اللہ دیا نے اقبال کو ساتھ لیا اور لاہور چلے گئے۔ اسکول میں موسیقی بھی سکھائی جاتی تھی اور دستکاری بھی۔ کرسیاں، چارپائی وغیرہ بُننا سکھایا جاتا تھا۔ اقبال نے باپ سے کہا وہ موسیقی سیکھنا چاہتا ہے۔ اسے موسیقی کی کلاس میں داخل کروایا جائے۔ اللہ دیا نے فارم میں موسیقی کا مضمون درج کردیا۔ اس کے لیے انٹرویو ضروری تھا۔ اللہ دیا اسے لے کر موسیقی کے استاد کے پاس پہنچ گئے۔

موسیقی کے استاد نے اقبال سے کہا۔ "کچھ گا کر دکھاؤ۔"

بات اقبال کی سمجھ میں نہ آسکی۔ وہ یہ سمجھا کہ اشعار سنانے کے لیے کہا جارہا ہے۔ وہ تحت اللفظ میں اشعار پڑھنے لگا۔

"بچے کا گلا نہیں ہے۔" بات سمجھانے کے بجائے حکم صادر کردیا۔ اس طرح یہ مضمون اسے نہ مل سکا اور اس کی جگہ منج کی کلاس اسے دے دی گئی یعنی بان کو درست کرنا، بان بنانا، چارپائیاں بنانا وغیرہ۔

اللہ دیا اسے چھوڑ کر آگئے۔ وہ مزید اندھیروں میں اتر گیا۔ ارد گرد کوئی شناسا آواز نہیں تھی۔ جو طلبہ پہلے سے موجود تھے کہیں زیادہ ہوشیار تھے۔ وہ اپنی ہوشیاری کے تیر اس پر چلا رہے تھے۔ وہ سب ایک ہوگئے تھے۔ وہ اکیلا تھا۔ کبھی اس کی کوئی چیز چھپا دیتے تھے، کبھی غلط راستے پر ڈال دیتے اور وہ کلاس کی تلاش میں بھٹکتا پھرتا۔ گھنٹوں بیٹھ کر روتا رہتا، اسے لگتا تھا کسی جہنم میں آگیا ہے۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اگر باپ اسے نہیں لے گئے تو وہ یہاں سے خود بھاگ جائے گا پھر ایک روز ایک لڑکا اس کے پاس آیا اور

اعزازات

حکومتِ پاکستان کی طرف سے میدانِ شاعری میں ایوارڈ۔ ایم فل میں پہلی پوزیشن پر گولڈ میڈل۔ اسکاؤٹنگ میں پہلی پوزیشن پر صدارتی ایوارڈ۔ سماجی خدمات کے اعتراف میں پنجاب سوشل سروسز ایوارڈ۔ نشانِ خدمت منجانب ینگ سرونٹس ویلفیئر سوسائٹی۔ پنجاب انجم ایوارڈ۔ شیلڈ، گولڈ میڈل، شاہین ایوارڈ۔ تین شیلڈز منجانب پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔ دو شیلڈز منجانب گورنمنٹ کالج سرگودھا۔ شیلڈ منجانب قائداعظم لا کالج سرگودھا۔ قائداعظم گولڈ میڈل۔ راوٴ منان ایوارڈ۔ شیلڈ برائے خدمتِ انسانیت۔ پوئٹری ایوارڈ، انگلش لٹریری سوسائٹی، لاہور۔

اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ وہ اقبال سے کچھ ایسا متاثر ہوا کہ دوسرے لڑکوں سے اس کی تعریف کی۔

"اقبال ایسی نرم گفتگو کرتا ہے کہ دل موہ لیتا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم اتنے دنوں تک ایسے اچھے دوست کو ضائع کرتے رہے۔"

دوسرے لڑکے بھی اس کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کا دل بہلنے لگا۔ گھر کی یاد کچھ کم ہوئی اور اس نے بریل سیکھنا شروع کردی۔ نقطوں کا ایک گورکھ دھندا تھا جس میں وہ پھنس گیا تھا۔ لکڑی کی تختیوں پر ریٹھوں اور بٹنوں کے ذریعے بریل کے نقطوں کی شناخت کروائی جاتی تھی۔ چیزوں کو چھو کر محسوس کرنے کی قوت ابھی زیادہ نہیں بڑھی تھی لہٰذا اس کے لیے ریٹھوں اور بٹنوں کی پہچان بڑی مشکل تھی۔ اس کی قوتِ ارادی کمال کی تھی۔ اس نے رفتہ رفتہ اس مشکل پر قابو پالیا۔ بریل سیکھنے میں اسے حیرت انگیز کامیابی ہوئی۔ تمام لڑکوں میں اسے امتیازی حیثیت حاصل ہوگئی۔ اسے مہمانوں کے سامنے مثال اور نمونے کی طرح پیش کیا جانے لگا۔ اس درس گاہ میں اکثر لوگ آیا کرتے تھے یہ دیکھنے کے لیے کہ یہ نابینا کیسے پڑھتے اور لکھتے ہیں۔ اس موقع پر اقبال کو بلایا جاتا۔ اسے اتنی دور بھیج دیا جاتا جہاں اس کی آواز نہ پہنچ سکے پھر ایک شخص کوئی جملہ لکھواتا یا کوئی شعر لکھواتا۔ ایک طالب علم اسے بریل پر لکھ لیتا پھر اقبال کو بلایا جاتا۔ وہ بریل پر اس تحریر کو نقطوں کی مدد سے انگلیوں کے سہارے روانی سے پڑھ لیتا۔ حاضرین تالیوں سے اس کی حوصلہ افزائی کرتے۔

کوئی کہہ اٹھتا۔ "اس بچے میں کچھ کر گزرنے کا جذبہ موجود ہے۔"

یہ آوازیں اس کے کانوں تک بھی پہنچتی تھیں لیکن وہ اس وقت یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ وہ کیا کچھ کر گزرنے کا جذبہ رکھتا تھا البتہ وہ کبھی کبھی یہ ضرور سوچا کرتا تھا کہ وہ ایسے تمام کام کرے گا جو آنکھوں والے کرتے ہیں۔ وہ اپنی اس کمی کو کبھی جواز نہیں بنائے گا۔

اس کی اسی محنت اور لگن نے نہ صرف اس کی قابلیت میں اضافہ کیا بلکہ جو لڑکے اس سے دور بھاگتے تھے اس کی شہرت کو دیکھ کر اس کے قریب آنے لگے۔ اساتذہ بھی شفقت سے پیش آنے لگے۔ ایسے دوست جو کچھ سیکھنا چاہتے تھے اس کے زیادہ قریب ہوگئے۔ سب مل کر بریل پر دستیاب کتب پڑھنے لگتے۔

اس کے یہاں آنے کے ایک سال بعد ہی اس کا بھائی بھی یہاں آگیا تھا۔ اس کے آنے کے بعد تو ماحول بالکل ہی تبدیل ہوگیا۔ اجنبی ماحول شناسائی میں بدل گیا۔

اس درس گاہ میں اس کا دوسرا سال تھا کہ طلبہ میں اسے ایک خاص مقام مل گیا۔ اساتذہ سمیت سب ہی اس کی عزت کرنے لگے۔ وہ دوسرے طلبہ پر اس طرح حکم چلاتا تھا جیسے وہ ان کا استاد ہو۔ اس پر پہلی مرتبہ یہ انکشاف بھی ہوا تھا کہ اس میں دل جیتنے کی صلاحیت خداداد ہے۔

اللہ دیا نے جب یہ دیکھا اور استادوں سے سنا کہ وہ بڑی تیزی سے ترقی کر رہا ہے تو انہوں نے اسی درس گاہ کے ایک نابینا استاد سید باقر علی سے اس کی ٹیوشن کا بندوبست کردیا۔ انگریزی اور اردو میں انہوں نے اس کی بے پناہ رہنمائی کی۔ اسے لاتعداد اشعار یاد ہوگئے۔ صرف اشعار یاد نہیں ہوئے بلکہ طبیعت میں ادبی ذوق پیدا ہوگیا۔ یہ ذوق آیندہ رنگ دکھانے والا تھا۔

ان کی تربیت کا یہ اثر ہوا کہ وہ بریل پر انگریزی کتب پڑھنے لگا۔ انگریزی اور اردو کے مضامین بڑی جماعتوں کے تھے لیکن وہ ان دو مضامین پر بھی حاوی ہوگیا۔ اس نے اپنے ایک دو دوستوں سے انگریزی بولنا شروع کردی۔ دو تین سو انگریزی کے جملے یاد تھے انہی کو توڑ مروڑ کر اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ تعطیلات میں گھر جاتا تو اللہ دیا اسے انگریزی پڑھاتے۔ گویا دن رات پڑھنا لکھنا ہی اوڑھنا بچھونا ہوگیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے پاس انگریزی الفاظ کا اچھا خاصا ذخیرہ ہوگیا۔ اس دوران چھٹی، ساتویں اور آٹھویں کی کتابیں وہ ختم کر چکا تھا۔

اب وہ اپنے اسکول میں ہر فن مولا مشہور ہونے لگا۔ موسیقی اس کے نصاب میں نہیں تھی لیکن دوسرے بچوں کو دیکھ دیکھ کر خوش الحانی پیدا ہوگئی۔ غزلیں سننا، غزلیں پڑھنا اس کا معمول سا بن گیا۔ اس کے ساتھی طالب علم حیران ہوتے تھے کہ اسے موسیقی کے اتار چڑھاؤ سے واقفیت کیسے ہوگئی۔

کچھ کر گزرنے کا ذوق ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ اس نے ایک خیالی حکومت بنائی۔ کابینہ میں تیرہ چودہ طالب علم شامل تھے۔ وہ خود اس کا صدر بنا۔ اس کے احکام صادر ہوتے رہے اور طلبہ اس پر عمل کرنے کے پابند تھے۔ حکم جاری ہوتا، تمام طلبہ باقاعدگی سے نماز پڑھیں گے۔ حکم جاری ہوتا، تمام

طلبہ ورزش کیا کریں گے۔"

اس کی طبیعت میں ایک سرگرمی، بے قراری اور سیمابیت بہت موجود تھی جو اپنا رنگ دکھاتی رہتی تھی۔ درس گاہ کے ماحول نے اسے سب سے بڑا فائدہ یہ پہنچایا کہ اس کا اعتماد پہاڑوں کی بلندیوں کو چھونے لگا۔ اس نے جب یہ دیکھا کہ بینائی سے محروم طلبہ ایک پل کو بھی یہ نہیں سوچتے کہ وہ بینائی سے محروم ہیں، ہر مشغلے میں شریک ہوتے ہیں۔ نارمل بچوں کی طرح ہنستے بولتے اور شرارتیں کرتے پھرتے ہیں تو وہ بھی اپنی نابینائی کو بھول گیا۔ یہ عزم پیدا ہوگیا کہ وہ ترقی کی دوڑ میں بیناؤں سے بھی آگے نکل جائے گا۔ مایوسی کے اندھیرے دور ہوگئے۔ بھرپور زندگی اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

اس زندگی سے لطف اٹھاتے اٹھاتے اسکول کی زندگی کے چار سال مکمل ہوگئے۔ اب وہ پندرہ سال کا نوجوان تھا کہ فارغ التحصیل ہو کر خوشاب پہنچ گیا۔

اس نے اسکول میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔ پہلی پوزیشن حاصل کرنے کے سو فیصد امکانات تھے لیکن دستکاری میں عدم دلچسپی نے اس کے نمبر کم کردیے۔

بلائنڈ اسکول کی اس کامیابی نے اس کے حوصلے بلند کردیے۔ وہ اب واقعی کچھ کر گزرنا چاہتا تھا۔ اب اگر بھولے سے بھی کوئی کہتا تھا کہ وہ نابینا ہے تو اسے برا لگتا تھا۔ معاشرے کے خلاف جنگ کرنے کا جذبہ موجزن ہوگیا تھا۔ وہ دنیا کو بتا دینا چاہتا تھا کہ "آنکھیں نہیں تو جہاں نہیں" کا مقولہ ہی غلط ہے۔ کبھی کبھی اس کے اندر یہ آواز اٹھتی تھی کہ ابھی تک نابیناؤں سے سابقہ تھا، اب بینا لوگوں سے واسطہ پڑے گا۔ یہ مقابلہ آسان نہیں ہوگا۔ اس موقع پر اس کے والد کا ٹیچر ہونا اس کے لیے معاون و مددگار رہتا۔

"اقبال، اب تم میٹرک کرلو۔" ایک دن انہوں نے کہا۔

"میں تو خود آپ سے یہی کہنا چاہتا تھا لیکن سوچتا تھا اس راہ کی مشکلات سے آپ کو کیوں نڈھال کروں۔"

"میرے لیے کیا مشکل، تم میرے اسکول چلو اور دسویں جماعت کا امتحان دینے کی تیاری کرو۔" وہ اقبال کو اپنے ساتھ اسکول لے گئے اور اس سیکشن میں لے جا کر بٹھا دیا جو لائق بچوں کے لیے الگ سے بنایا گیا تھا۔ اس سیکشن کے بچوں کو پوزیشن لانے کی تیاری کروائی جاتی تھی۔ اس سیکشن میں ایک اور لائق بچے کا اضافہ ہوگیا۔

اس کا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ وہ تو اپنے اندھیروں میں یہ سوچا کرتا تھا کہ بینا طالب علم مجھ نابینا کو کیا اہمیت دیں گے لیکن ہوا اس کے برعکس۔ سب نے بھرپور ساتھ دیا۔ انہوں نے کسی نابینا طالب علم کو پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا تھا لہٰذا اب اسے حیرت سے دیکھتے تھے۔

کئی طلبہ نے دستِ تعاون بڑھایا۔ وہ گھر آتے اور اسے کتابیں پڑھ کر سناتے۔ وہ انہیں ذہن نشین کرلیتا۔ اس کے ذخیرۂ الفاظ میں حیرت انگیز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

"کچھ کر گزرنے کا جذبہ" اب بھی باقی تھا بلکہ کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا تھا۔ اس نے بلائنڈ اسکول لاہور میں ایک خیالی حکومت بنائی تھی اسی طرز کی خیالی حکومت کی بنیاد اس نے خوشاب کے اسکول میں رکھی۔ کئی طلبہ اس کے ساتھ ہوگئے۔ ان میں کوئی بھی نابینا نہیں تھا۔ اس تنظیم کے تحت اس نے ایک تقریب ترتیب دی۔ سب نے مل کر پنڈال آراستہ کیا۔ لاؤڈ اسپیکر کرائے پر لیا (کسی تقریب میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال بڑی بات مانی جاتی تھی) اس تقریب میں قیامِ پاکستان کے حوالے سے تقریریں کی گئیں کیونکہ یہ 14 اگست کا موقع تھا۔ تقریب ختم ہوگئی تو بعض اساتذہ نے اس سے پوچھا۔ "آخر آپ لوگوں کی تنظیم کا مقصد کیا ہے؟"

تصانیف

شاعری

ساحلِ تشنہ لب، سوالیہ نشان، اک ہم سفر اچھا لگا، تلاوت دل، یہ کافر دل نہیں مانا، Love's no crime

تنقید

جان ڈن شخصیت اور شاعری، اقبال بحضور اقبال۔ جان کیٹس شخصیت اور شاعری۔

نثر

ذوقِ تماشا، جہان مہ و پروین، دیدۂ دل، کب رات بسر ہوگی، آشوب آگہی۔ مقالہ برائے پی، ایچ ڈی۔

Impact of leritish poets on Iqbal

”نابیناؤں کی بھلائی اور ان کی تعلیم و تربیت کے لیے۔“

اس موقع کی مناسبت سے یہ جواب قطعی موزوں نہیں تھا اس لیے کہ یہاں اس کے سوا کوئی نابینا نہیں تھا۔ اس کے لاشعور کی آواز تھی جو شعور میں آگئی تھی۔ وہ آیندہ زندگی میں نابیناؤں کے لیے بہت کچھ کرنے والا تھا۔

جب اس کی تیاری مکمل ہوگئی تو اس کے والد نے اس کا داخلہ پرائیوٹ طور پر بھجوادیا۔ اسے امتحان دینے کی اجازت مل گئی تو رائٹر کا مرحلہ پیش آیا کیونکہ وہ خود تو لکھ نہیں سکتا تھا۔ (نابینا طالب علم کو رائٹر رکھنے کی اجازت ہوتی ہے جو اس کے ساتھ امتحان گاہ میں ہوتا ہے۔ سوالوں کے جواب طالب علم لکھواتا جاتا ہے اور رائٹر لکھتا جاتا ہے)

رائٹر کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اس سے کم کلاس میں ہو جس کا امتحان دیا جارہا ہے۔ اقبال دسویں کا امتحان دے رہا تھا لہٰذا رائٹر کو نویں کلاس کا ہونا چاہیے تھا۔ نہایت تگ و دو کے بعد ایک متوسط طالب علم نویں جماعت کا رائٹر رکھا گیا۔

اقبال نے تمام پرچے کامیابی سے دیے۔ رزلٹ آیا تو اس نے فرسٹ ڈویژن میں میٹرک پاس کیا تھا۔

بینا طالب علم سارے سال محنت کرتے ہیں اور پچھلے دس سال کا تعلیمی پس منظر ہوتا ہے تب جاکر پاس ہوتے ہیں اور ان میں سے بھی کتنے فرسٹ ڈویژن آتے ہیں۔ اقبال نے صرف چھ ماہ کی محنت سے فرسٹ ڈویژن میں میٹرک پاس کرلیا۔ یہ اس کی عظیم الشان کامیابی تھی۔ شدید محنت کا ثمر تھا۔

اس سے پہلے پاکستان بھر میں کوئی پانچ سات میٹرک پاس نابینا حضرات تھے۔ اس تناظر میں یہ کامیابی بہت عظیم تھی۔ اب امید ہو چلی تھی کہ اقبال نے شاہراہِ کامیابی پر پہلا قدم رکھ دیا ہے۔

اسکول کے بعد جو راستہ کالج کی طرف جاتا تھا وہ بہت دشوار اور طویل تھا۔ خوشاب میں کوئی کالج نہیں تھا۔ خوشاب سے چار میل دور جوہر آباد میں کالج تھا۔ ایک نابینا کے لیے روزانہ اتنی دور جانا اور آنا کوئی ہنسی کھیل نہیں تھا۔ خاندان میں دور دور تک کوئی ایسا نہیں تھا جو کالج جاتا ہو۔ محلے میں بھی کوئی ایسا نہیں تھا جو کالج جاتا ہو اور جس کے ساتھ اقبال بھی چلا جائے۔ خاندان والے ساتھ دینے کی بجائے باتیں بنا رہے تھے۔ اس نے میٹرک کرلیا تھا۔ حسد کی زبانیں دراز ہورہی تھیں۔ بعض بے درد تو یہ تک کہہ دیتے تھے کہ ایک پڑھے لکھے فقیر کا اضافہ ہوگیا بس اور کیا چاہیے۔

یہ باتیں سن کر اور اقبال کی معذوری کا خیال کرتے ہوئے خود اللہ دیا کے دل میں یہ خیال پیدا ہوگیا تھا کہ لوگ ٹھیک کہتے ہیں۔ اقبال کوئی ہنر سیکھے اور اپنی روزی پیدا کرے۔ پہاڑ کاٹنے کے بعد بھی دودھ کی نہر نہ نکلی تو کیا ہوگا۔

انہی دنوں ان کا لاہور جانا ہوا۔ وہ عبدالحمید خاں، صدر پنجاب مسلم لیگ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

”اللہ دیا، میں کیا کروں تمہاری تعلیم کم ہے کسی اعلیٰ عہدے پر نہیں لگوا سکتا۔“ بس یہ بات اللہ دیا کے دل میں اتر گئی۔ وہ لاہور سے واپس آئے تو یہ ارادہ کر چکے تھے کہ وہ اقبال کو کالج ضرور بھیجیں گے۔

اقبال بھی پہاڑ جیسا حوصلہ رکھتا تھا۔ اس نے بھی معذوری کو بالائے طاق رکھا اور مصمم ارادہ کرلیا کہ اگر پیدل جانا بھی پڑا تو وہ جوہر آباد ضرور جائے گا۔

ہمت بلند ہو تو آسانیاں خود بخود پیدا ہوجاتی ہیں۔ ایک ایسا طالب علم دستیاب ہوگیا جس نے ہامی بھرلی کہ اقبال اس کے ساتھ کالج جائے گا اور آئے گا۔ اقبال اپنے اندھیروں میں روشنی کرتا ہوا کالج جاتا رہا۔

نصاب کی کتب بریل رسم الخط میں نہ ملنے کی وجہ سے بڑی تکلیف اٹھانی پڑ رہی تھی۔ کتب تو کیا ملتیں بریل لکھنے کا کاغذ تک پاکستان میں دستیاب نہیں تھا۔ خوش قسمتی سے اس کی ملاقات ڈاکٹر گرانٹ نابینا سے ہوگئی۔ اس کی مدد سے اقبال کو بریل ٹائپ رائٹر اور ایک عام ٹائپ رائٹر مل گیا۔ اقبال نے والد کی مدد سے نصابی کتب کو بریل پر منتقل کیا۔

وہ صرف نصابی کتب سے بہلنے والا نہیں تھا۔ اس نے لندن، امریکا اور جرمنی کے نابینا اداروں اور بریل کتب بنانے والے پریس سے رابطے کیے۔ ان اداروں سے اسے مشہور ترین ناول، ڈرامے وغیرہ بریل رسم الخط میں ملتے رہے۔

اقبال نے کالج آنے سے پہلے کسی باقاعدہ اسکول میں تعلیم حاصل نہیں کی تھی اس لیے یہ تجربہ اس کے لیے بالکل نیا تھا البتہ میٹرک کے نتائج نے اس کی صلاحیتیں اس پر اجاگر کردی تھیں۔ اس کی قابلیت نے یہاں بھی اسے اساتذہ کا محبوب طالب علم بنادیا تھا۔ وہ جب انگریزی بولتا تھا اور اردو اشعار نہایت صحت کے ساتھ پڑھتا تو اساتذہ اسے حیرت سے دیکھتے تھے۔ اب اسے لگتا تھا مشکلیں ایک ایک کرکے آسان ہوتی جارہی ہیں۔

طلبہ نے اس کی معذوری دیکھی تو وہ بھی گھر آنے لگے۔ کتابیں پڑھ کر اسے سناتے خود بھی پڑھتے اسے بھی پڑھاتے پابندی سے تیاری ہوتی رہتی۔

کالج میں قائد ملت لیاقت علی خان کی برسی منائی گئی۔ اقبال کا کچھ کر گزرنے کا جذبہ پھر سامنے آیا۔ اس نے بھی فیصلہ کیا کہ وہ انگریزی میں تقریر کرے گا۔ اس نے تقریر خود لکھی لیکن شاید اچھی طرح تیاری نہیں کرسکا یا اسٹیج کا خوف تھا کہ اسٹیج پر پہنچتے ہی اس کے اوسان خطا ہوگئے۔ ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکلا۔

یہ اس کی پہلی ناکامی تھی لیکن آخری ثابت نہیں ہوئی۔ اس نے ہمت نہیں ہاری۔ کالج میں مباحثہ ہوا تو اس نے پھر اپنا نام لکھوایا۔ کچھ حوصلہ ہوا پھر وہ ان مباحثوں میں باقاعدگی سے حصہ لینے لگا۔ آہستہ آہستہ وہ اسٹیج سے مانوس ہونے لگا۔

کالج میں ہونے والے اردو اور انگریزی کے... فی البدیہہ مضمون نگاری کے مقابلوں میں حصہ لیا اور دونوں میں اول آیا۔ آہستہ آہستہ اس کی خود اعتمادی بڑھتی گئی۔

یہ کامیابیاں اسے تساہل کا شکار بھی بنا سکتی تھیں لیکن اس میں مسابقت کا جذبہ بڑھتا ہی گیا۔ سالانہ تقسیم انعامات کی تقریب ہوئی تو اسے رول آف آنرز اور چھ اول انعامات ملے جس میں ایک انعام پابندی سے کالج آنے کا بھی تھا۔ اس کی معذوری کبھی اس کے آڑے نہیں آئی۔ وہ پابندی سے کالج آتا رہا۔

تقسیم انعامات کی اس تقریب میں سرگودھا ڈویژن کے کمشنر حماد رضا تھے۔ انہوں نے اس کی تعلیمی کارکردگی دیکھی تو اسے اسی وقت اپنے پاس بلایا۔ ”آپ کو کبھی کوئی دقت ہو تو میرے پاس چلے آیئے گا۔“

اتنی حوصلہ افزائیوں کے بعد اسے یقین ہونے لگا تھا کہ میں جتنی زیادہ کوشش کروں گا مجھے اتنا ہی فائدہ ہوگا۔ نابینائی کا خیال پیچھے کہیں رہ گیا تھا۔

اسے معلوم تھا کہ اچھی نوکری کے لیے اچھی انگریزی درکار ہوتی ہے۔ اسے انگریزی پر عبور ہوچکا تھا لیکن بولنے کی مشق نہیں تھی۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ کسی سے انگریزی میں بات کی جائے۔ خوشاب میں کوئی ایسا دوست نہیں تھا جس سے وہ انگریزی بولتا چنانچہ ایک روز اس نے یہ اہتمام کیا کہ ایک علیٰحدہ کمرے میں چلا گیا۔ کرسی پر بیٹھ گیا دیوار سامنے تھی۔ خود ہی کوئی سوال کیا اور خود ہی جواب دیا۔ یہ سلسلہ گھنٹوں چلتا رہا اور پھر یہ روز کا معمول ہوگیا۔

لاتعداد انگریزی مضامین سنے، نئے الفاظ سیکھے۔ ذخیرۂ الفاظ اتنا جمع ہوگیا کہ کسی طالب سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔

صرف انگریزی پر منحصر نہیں۔ اس نے ہر مضمون میں اتنی ہی محنت کی۔ ایک مضمون اسلامیات بھی تھا۔ اس مضمون میں اتنی معلومات ہوگئیں کہ مساجد میں جاکر تقریریں کرنے لگا۔

اسی جانکاہ محنت کے ساتھ اس نے ایف، اے پاس کرلیا۔ رول آف آنر لیا اور وظیفہ حاصل کیا۔ رائٹر اچھا نہیں ملا تھا لہٰذا فرسٹ ڈویژن تو نہ آسکی لیکن کالج میں اس کی دوسری پوزیشن تھی۔

گورنمنٹ کالج جوہر آباد کیونکہ انٹر کالج تھا لہٰذا اب ایک اور مشکل اس کے سامنے تھی۔ بی، اے کرنے کے لیے سرگودھا جانا پڑتا۔ جاتا تو رہتا کہاں؟ اسے کمشنر حماد رضا کی پیش کش یاد آئی۔

”کبھی کوئی دقت ہو تو میرے پاس آجایئے۔“ اس نے باپ کو ساتھ لیا اور سرگودھا حماد رضا کے پاس چلا گیا۔

”سر، آپ نے فرمایا تھا کہ کبھی کوئی دقت ہو تو میرے پاس آجایئے۔ مجھے دقت پیش آگئی ہے۔“

”فرمایئے کیا دقت پیش آئی ہے۔ میں کیا مدد کرسکتا ہوں۔“

”دقت یہ ہے کہ جوہر آباد کالج میں بی، اے کی کلاسز نہیں ہوتیں۔ مجھے بی، اے کرنے کے لیے سرگودھا جانا ہوگا۔ آپ میرے والد صاحب کا ٹرانسفر سرگودھا کروا دیں تاکہ میں یہاں رہ کر اطمینان سے تعلیم حاصل کرسکوں۔“

”آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ یہ کوئی کام ہے ٹرانسفر ہوجائے گا۔“

اس کے والد نے سرگودھا سیٹلائٹ ٹاؤن میں پہلے ہی مکان بنوالیا تھا۔ ٹرانسفر ہوگیا اور اپنی فیملی کے ساتھ

سرگودھا شفٹ ہوگئے۔ اقبال کا داخلہ گورنمنٹ کالج میں ہوگیا۔

سرگودھا اپنی تمام تر بے سروسامانی کے باوجود مشرقِ بعید کا بغداد کہلاتا تھا۔ ڈاکٹر وزیر آغا، جوہر نظامی، عبدالرشید اشک، غلام جیلانی اصغر جیسے اکابر موجود تھے۔ مشاعروں کا زور تھا۔ ملک بھر کے شاعر یہاں آتے رہتے تھے۔ ادبی فضا تروتازہ تھی۔ یہی وہ شہر تھا جہاں اقبال کی ادبی صلاحیتیں پروان چڑھنے والی تھیں۔

داخلے کے بعد پھر وہی مسئلہ سامنے آیا جو خوشاب میں پیش تھا۔ اس مسئلے کا حل یوں نکل آیا کہ اقبال نے اپنے ہم جماعتوں کو ٹیوشن کا لالچ دیا۔ اس کی انگریزی بہت اچھی تھی اس لیے یہ طلبہ صبح صبح اس کے گھر آجاتے۔ اس سے انگریزی پڑھتے اور پھر اپنے ساتھ کالج لے کر چلے جاتے۔ اس کا چھوٹا بھائی بھی نابینا تھا جو اسی اسکول میں داخل ہوگیا تھا جہاں اس کے والد پڑھاتے تھے۔ وہ ان کے ساتھ اسکول چلا جاتا تھا۔

اقبال نے ابتدا میں تاریخ اور اسلامیات کو اختیاری مضمون کے طور پر اختیار کیا تھا لیکن جب اسے یہ معلوم ہوا کہ کالج میں انگریزی ادب کی کلاسیں بھی شروع ہو رہی ہیں تو اسے اپنی انگریزی دانی کا لحاظ کرتے ہوئے یہ خیال ہوا کہ وہ انگریزی ادب میں داخلہ لے۔ اس نے والد کو مجبور کیا اور وہ اسے ساتھ لے کر پرنسپل کے پاس پہنچ گئے۔

”جناب میرے بچے کے پاس تاریخ اور اسلامیات کے مضامین ہیں۔ میں چاہتا ہوں اسلامیات کی جگہ انگریزی کا مضمون لے۔“

”یہ تو نابینا ہیں۔“

”جی ہاں، اللہ کی مرضی۔“

”اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔ آپ اس کے ساتھ کیوں دشمنی کر رہے ہیں۔ انگریزی تو بہت مشکل مضمون ہے۔ اسلامیات رہنے دیں۔ اس میں یہ رٹ رٹا کے پاس ہوجائے گا۔ آپ اسے کیوں مشکل میں ڈال رہے ہیں۔“

”جناب میں نہیں، یہ مجھے مشکل میں ڈال رہا ہے۔“

اقبال نے بھی اپنی سفارش خود کی۔ پرنسپل سے انگریزی میں بات کی۔ وہ اس کی پُرکشش انگریزی سن کر بہت خوش ہوئے اور اسے داخلہ مل گیا۔

انگریزی مضمون اختیار کرنے سے قبل ہی انگریزی کو اس نے اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا۔ لفظوں سے کھیلتا تھا لفظ اس کے ساتھی بن گئے تھے۔ انگریزی میں داخلے کے بعد تو جیسے اسے پرواز مل گئی۔ وہ کوئی کتابی کیڑا نہیں تھا لیکن باقاعدگی سے روزانہ پڑھتا تھا۔ ایسے دوست اسے میسر ہوگئے تھے جو اس کے گھر آکر اسے کتابیں سناتے تھے۔ اس میں ان لڑکوں کا ہی فائدہ تھا۔ وہ اسے سناتے ہوئے ڈکشنری کی زحمت سے بچ جاتے تھے۔ اقبال کی یادداشت میں ذخیرۂ الفاظ اتنا تھا کہ ان طلبہ کو ہاتھ کے ہاتھ الفاظ کے معانی مل جاتے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے لاتعداد ناول، کئی ڈرامے اور بے شمار نظمیں پڑھ ڈالیں۔ ان میں سے بہت سی اسے ازبر بھی ہوگئیں۔

اس کا گھر ایک درس گاہ بنا ہوا تھا۔ طلبہ اپنی اپنی مشکلات لے کر اس کے پاس آتے اور وہ انہیں حل کرتا۔ کوئی کسی کتاب کی سمری لکھوا رہا ہے۔ کوئی کسی نظم کی تشریح لکھوا رہا ہے۔

اس محنت ہی کا نتیجہ تھا کہ وہ ماہانہ امتحانات میں اول آنے لگا بلکہ کالج والوں کو اس سے بڑی امیدیں وابستہ ہوگئیں۔ بعض سینئر اساتذہ کے نزدیک تو یہ کوئی معجزہ تھا جو رونما ہونے والا تھا۔

کچھ کرگزرنے کا جذبہ یہاں بھی اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ اب وہ بچہ نہیں رہا تھا کہ خیالی حکومتیں بنا کر خوش ہوجاتا۔ اب وہ کوئی تعمیری اور فلاحی کام کرنا چاہتا تھا۔

وہ خود نابینا تھا اور کوئی نابینا کن مشکلات سے گزرتا ہے اس سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔ ان کی سہولتوں کے لیے کیا کچھ کیا جاسکتا ہے، اس سے بھی وہ اچھی طرح واقف تھا۔ اس لیے یہی منصوبہ بنایا کہ کوئی ایسی تنظیم بنائی جائے جو نابیناؤں کی بحالی اور تعلیم کے لیے کام کرے۔

اس نے کئی دوستوں کا ایک گروپ تیار کیا اور ایک تنظیم ”نیشنل ایسوسی ایشن فار دی بلائنڈ“ کے نام سے رجسٹرڈ کروائی۔ کئی اجلاس بھی منعقد کیے۔ ان اجلاسوں میں سرگودھا کے معروف لوگوں نے شرکت کی اور اس کی کوششوں کو سراہا۔

اس وقت اس کے ذہن میں یہ خیال ضرور موجود تھا کہ وہ نابیناؤں کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک اسکول ضرور قائم کرے گا لیکن ابھی یہ خواہش تھی نصب العین نہیں بن سکی تھی کیونکہ اس کے لیے جتنا وقت درکار تھا وہ ابھی اس کے پاس نہیں تھا۔ وہ ابھی بی، اے کی تیاری کر رہا تھا البتہ اپنے اجلاسوں کے اخراجات پورے کرنے کے لیے اس نے دل سوز اپیلیں شروع کردی تھیں۔ ایک بڑا اجتماع منعقد کیا اور ایسے پروگرام سے لوگوں کو آگاہ کیا پھر گھر جا کر لوگوں سے اپیلیں کرنے لگا۔ لوگوں کو تعجب ہوتا تھا کہ وہ نابینا ہونے کے باوجود یہ سب کیوں کر رہا ہے۔ لوگ ہر طرح کے ہوتے ہیں۔ بعض یہ باتیں بھی بناتے تھے کہ سب کمائی کا دھندا ہے۔ وہ جو کچھ کر رہا ہے اپنے بھائیوں کے لیے کر رہا ہے۔

امتحان سر پر تھے۔ اسے کچھ دنوں کے لیے ایسوسی ایشن کے کام کو روکنا پڑا۔ اقبال جی جان سے محنت کر رہا تھا۔ روزانہ آٹھ سے دس گھنٹے پڑھنا اس کا معمول تھا۔ کسی دوست کے ذریعے یا والد صاحب کے ذریعے کتابیں سنتا رہتا اور بریل میں نوٹ لیتا رہتا۔ لندن سے بریل کتب بھی ملتی رہیں۔

اس نے اعلیٰ نمبر لے کر بی، اے پاس کرلیا۔ انگلش لٹریچر میں اس کے امتیازی نمبر تھے۔ موسم گرما کی تعطیلات تھیں لیکن وہ وقت ضائع کرنے کا قائل نہیں تھا۔ اس نے ایم، اے (تاریخ) کی کتابیں خریدیں اور مطالعہ شروع کردیا۔ مطالعہ کیا وہی کہ کوئی پڑھ کر سناتا اور وہ سنتا۔ بریل پر نوٹ لیتا رہتا۔ ارادہ یہی تھا کہ تاریخ میں ایم، اے کیا جائے۔ اس کی نابینائی کسی سہولت کی منتظر تھی۔ تاریخ صرف یاد کرنے کا مضمون تھا۔ اس میں اسے بڑی سہولت ہوجاتی لیکن وہ مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔ آخر اس نے والد سے بات کی۔ ”ابا جی، یہ مضمون میرے لیے مناسب نہیں رہے گا۔“

”کیوں بھئی، اس میں تو کچھ ہے ہی نہیں۔ تھیوری ہے یاد کرتے رہو۔“

”وہ تو ٹھیک ہے، میں آیندہ کا سوچ رہا ہوں۔ تاریخ میں ایم، اے کرنے سے کوئی مالی فائدہ نہیں ہوگا۔ کوئی ٹیوشن نہیں آئے گی۔ مجھے چاہیے کہ میں انگلش میں ایم، اے کرلوں تاکہ ٹیوشن پڑھا کر اپنا وقت گزار سکوں۔ میری معذوری کی وجہ سے سرکاری ملازمت تو مجھے ملنے سے رہی۔“

”مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے لیکن سوچ لو بی، اے کی بات اور تھی ایم، اے کرنا مشکل ہوجائے گا۔ تم ایسا کرو اپنے اساتذہ سے بات کرو۔“

انتخاب شاعری : شیخ محمد اقبال

کیا کم ہیں مجھے میرے مقاصد کے اجالے
طوفاں مرے رستے کا ہر ایک دیپ بجھا دے

...

میں دو حصوں میں بٹتا جا رہا ہوں
نظر کو دل، مرے دل کو نظر دے

...

آبسی جو آنکھ میں صورت دل و جاں بن گئی
جو لگا اچھا ہمیں وہ عمر بھر اچھا لگا

...

ترے وجود کی نس نس سے آنکھ جھانکے گی
اگر ہے ذوقِ نظارہ نظر کی بات نہ کر

...

چل پڑتے ہیں اندازوں کی انگلی کو پکڑ کر
ہم آنکھ میں موجود نظر بھول گئے ہیں

...

روشنی نے ایسی آنکھیں کھول دیں
میں اندھیروں سے بھی گھبراتا نہیں

...

اسی نے آنکھ دی مجھ کو مرا قصور نہیں
وہ جس نے آپ کو یہ شکل پھول سی دے دی

...

کوئی بتائے کہ روؤں کہ اس پہ اتراؤں
مرے خدا نے مجھے چشمِ آگہی دے دی

...

جلووں سے بھر لیں میری نگاہوں نے جھولیاں
دل مطمئن کہاں تھا مگر شام ہوگئی

...

اک چشمِ التفات نے دیکھا جو ایک بار
کتنے حسین لوگ مجھے یاد آگئے

...

بس اک ہلکی سی دستک پر اٹھا اور در پہ جا پہنچا
میں اس پل جاگتا تھا زندگی برباد تھی ورنہ

...

کئی پھول ہیں جو کھلے نہیں کئی خار ہیں جو چبھے نہیں
ابھی دل میں کتنی ہیں خواہشیں ابھی زندگی کا جواز نہیں

...

سوچ کر میں نے چنی ہے آخری آرام گاہ
میں تھا مٹی اور مجھے مٹی کا گھر اچھا لگا

...

ان کا جنگل تھا اور ان کا قانون تھا
جس طرح جی میں آیا بدلتے رہے

اس نے اپنے پروفیسر سے بات کی جواب حسبِ منشا نہ ملا۔

”ہرگز ایسا مت کرنا۔ تم نابینا ہو انگلش تو بہت مشکل مضمون ہے۔“

”اگر کوئی اور کرسکتا ہے تو میں بھی کرسکتا ہوں۔“

”دیکھ لینا ایک سال گنوانے کے بعد پھر تاریخ کی طرف آنا پڑے گا۔“

”انشا اللہ ایسا نہیں ہوگا۔“

ہجرت کا عفریت پھر سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ سرگودھا میں ایم، اے انگریزی کی سہولت نہیں تھی۔ اس کے لیے اسے فیصل آباد جانا پڑتا۔ ایک مرتبہ پھر کمشنر سرگودھا کام آئے۔ اس کے والد نے اپنا ٹرانسفر فیصل آباد کروالیا۔

گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں ایم، اے انگریزی کی کلاسز کو شروع ہوئے دو سال ہوئے تھے۔ تعلیمی ریکارڈ کوئی شاندار نہیں تھا۔ چند طلبا تھرڈ ڈویژن میں پاس ہوسکے تھے۔ اساتذہ بھی نو آموز تھے۔ لائبریری میں کتابیں بھی بہت محدود تھیں۔

تمام حالات حوصلہ شکن تھے لیکن اسے انہی حالات سے کام لینا تھا۔ اگر وہ کسی دولت مند گھرانے کا چراغ ہوتا تو بیرونِ ملک بہت سی درس گاہیں اس کا انتظار کررہی تھیں۔ اس کے وسائل تو اسے پنجاب کے چند شہروں تک لے کر گھوم رہے تھے۔ اسی دشت میں اسے پھول کھلانے تھے۔ یہی صحرا اس کا مرغزار تھا۔

انگریزی میں ایم، اے کرنا اس کا خواب تھا۔ اس خواب کی تعبیر کے لیے اس نے سخت محنت شروع کردی۔ پندرہ سولہ گھنٹے تواتر سے پڑھنا اس کا معمول بن گیا۔ رشتے داروں سے ملنا تقریباً چھوڑ دیا۔ صرف وہ دوست اس سے مل سکتے تھے جو اس کے ساتھ بیٹھ کر پڑھتے تھے۔ ڈاکٹر گرانت اب پہلے سے بھی زیادہ اس کی مدد کررہی تھیں۔ اقبال کا ایم، اے کرنا غالباً ان کے لیے بھی چیلنج بن گیا تھا۔ اللہ دیا بھی باپ ہونے کا بھرپور کردار ادا کررہے تھے۔ لاہور جاکر طرح طرح کی کتابیں تلاش کرتے تھے۔ اساتذہ نے نوٹس فراہم کردیے۔

بریل میں نوٹس لینا کارِ محال ہوتا ہے۔ بریل ٹائپ رائٹر کے بٹن کو ہاتھ سے پریس کرنا پڑتا ہے۔ بار بار پریس کرنے سے ہاتھ تھک جاتے ہیں لیکن کئی کئی گھنٹے لکھتے رہنے سے اسے کچھ ایسی مشق ہوگئی تھی کہ تھکتا ہی نہ تھا۔

امتحان نزدیک آگئے۔ رائٹر کا مسئلہ پھر درپیش تھا۔ ایک ایسا تیز رفتار لکھنے والا جو امتحان گاہ میں اس کے بولے ہوئے جوابات اس کی کاپی پر تحریر کرسکے۔ بڑی تلاش کے بعد ایک پادری جو سینئر کیمبرج تھا میسر آیا۔ اس کی تعلیمی قابلیت چونکہ کم تھی اس لیے یہ ضمانت دینی پڑی کہ نقصان کے ذمّے دار ہم خود ہوں گے۔

یہ پادری نہایت کاہل ثابت ہوا۔ اندازہ ہوا کہ تیز لکھنے کا عادی نہیں۔ ادب اس نے پڑھا نہیں تھا اس لیے ادب کی اصلاحات اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔ بہرحال اقبال نے جیسے تیسے تمام پرچے نمٹادیے۔

☆☆☆

وہ تلاشِ علم کی لذت میں سرشار فیصل آباد آیا اور ایم، اے انگلش کرنے میں مشغول ہوا تو تھوڑے دنوں کے لیے بلائنڈ ایسوسی ایشن کا خیال دل سے نکل گیا جس کی داغ بیل سرگودھا میں رہ کر پڑچکی تھی لیکن اس پودے کو شجر بننا تھا کہ اس کی ملاقات ایک جواں سال اور باہمت شخص مشیت الرحمٰن سے ہوئی جو چند سال پہلے فوج کی سروس کے دوران اپنا ایک بازو اور بینائی کھوچکے تھے۔ ان سے مل کر احساس ہوا کہ ابھی انہوں نے اپنی نابینائی کو قبول نہیں کیا ہے۔ سخت ناامیدی کی باتیں کرتے تھے۔ گویا آنکھیں نہیں تو کچھ بھی نہیں پر کاربند تھے۔ اقبال نے ان سے مل کر انہیں حوصلہ دلایا اور کوشش کی کہ قنوطیت سے رجائیت کی دنیا میں قدم رکھیں پھر اس نے اس ایسوسی ایشن کی طرف توجہ دلائی جس کی داغ بیل وہ سرگودھا میں رکھ چکا تھا۔ مشیت الرحمٰن نابیناؤں کی بحالی اور تعلیم کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔

اقبال نے آہستہ آہستہ مشیت الرحمٰن کو اپنا ہم خیال بنالیا اور اپنے ایک دوست اشفاق صدیقی کو فیصل آباد آنے کی دعوت دی۔

اشفاق صدیقی ”پاکستان ایسوسی ایشن آف بلائنڈ ویسٹ ونگ“ کے صدر تھے۔ اقبال نابیناؤں کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا۔ سرگودھا کے قیام کے دوران وہ ایک تنظیم قائم بھی کرچکا تھا۔ فیصل آباد میں بھی دوستوں کا ایک گروپ اس کے ساتھ شامل ہوگیا تھا جس کے مرکزی کردار مشیت الرحمٰن تھے جو اب خود بھی نابینا ہوچکے تھے۔

فیصل آباد کے احباب کے ساتھ مل کر اس نے ”پاکستان ایسوسی ایشن آف دی بلائنڈ“ سرگودھا ڈویژن کی بنیاد ڈالی جو پاکستان کی فعال اور متحرک تنظیموں میں شامل رہی۔ وہ چونکہ ایم، اے انگریزی کررہا تھا اس لیے اس کی مصروفیات کے باعث نائب صدر بنایا گیا تاکہ اسے زیادہ کام نہ کرنا پڑے۔ مشیت الرحمٰن صدر بنائے گئے۔ اسی طرح دوسرے عہدے داروں کا انتخاب عمل میں آیا۔ آہستہ آہستہ یہ ایک مثالی تنظیم بنتی گئی۔

امتحانات سے فارغ ہونے کے بعد وہ فیصل آباد سے سرگودھا آگیا۔ رزلٹ آنے کا انتظار تھا کہ ایک روز پاکستان ٹائمز میں چھپنے والی یہ خبر سب نے پڑھی۔

”ایک نابینا نے ایم، اے انگریزی میں سیکنڈ ڈویژن حاصل کرلی۔“ اس خبر کے ساتھ اقبال کی تصویر بھی شائع ہوئی تھی۔

اس زمانے میں انگریزی میں تھرڈ ڈویژن لینا بھی بڑی بات سمجھی جاتی تھی جبکہ اقبال نابینا تھا۔ وہ سیکنڈ ڈویژن ضرور تھا لیکن کالج میں اس کی اول پوزیشن تھی اور یونیورسٹی آف دی پنجاب میں پانچویں۔ اس کی اس کامیابی پر لوگ انگشت بدنداں تھے۔ جلنے والے جل بھی رہے تھے اور اس کی کامیابی کو اس کی قابلیت کی بجائے کسی اور قسم کا ہتھکنڈا قرار دے رہے تھے۔ پنجاب یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے تو صاف کہہ دیا۔

”یہ سب کچھ رائٹر کی مہربانی ہے۔“ یہ باتیں یقیناً اقبال کے کانوں میں بھی پڑرہی تھیں۔ وہ معاشرے کی بے حسی پر قنوطیت کا شکار ہونے کی بجائے باپ سے مخاطب ہوا۔

”لوگ جو کہتے ہیں انہیں کہنے دیجیے۔ ان کے کہنے سے میرا عزم متاثر نہیں ہوگا۔ ایم، اے انگریزی میری طالب علمانہ زندگی کا اختتام نہیں۔ میں اس سفر کو روکوں گا نہیں۔ میں اب پی، ایچ، ڈی کروں گا۔“

ایک نابینا کا ایم، اے انگریزی کرنا ایسا واقعہ تھا جس کی شہرت دور دور تک تھی۔ (اقبال سے پہلے کسی نابینا نے انگریزی میں ایم، اے نہیں کیا تھا)

☆☆☆

موضع موتی شریف، ضلع اوکاڑہ میں وہاں کے ایم پی اے میاں محمد بشیر کے سامنے ”پاکستان ٹائمز“ رکھا تھا۔ ان کے پاس اس وقت حافظ محمد شفیعؒ بیٹھے تھے۔ میاں بشیر اخبار پڑھتے پڑھتے ایک دم سے رک گئے۔
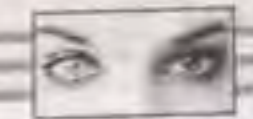
”حافظ صاحب، یہ خبر آپ نے پڑھی؟“

”میاں صاحب کون سی خبر؟“

”ایک نابینا نے انگریزی میں ایم، اے کیا ہے اور وہ بھی سیکنڈ ڈویژن میں۔“

”جی جناب خبر کا پڑھنا کیا یہ خبر تو میرے گھر کی ہے۔ نابینا اقبال میرا بھانجا ہے۔“

”آپ کا بھانجا ہے۔ بھئی پھر تو مبارک باد میں آپ کو دیتا ہوں۔ آپ اپنی بچیوں کی طرف سے پریشان رہتے ہیں۔ ایسا لائق فرزند آپ کے گھر میں ہے۔ کسی بچی کی شادی اس سے کیوں نہیں کردیتے۔“

”بیٹی کا باپ ہوکر کیسے کہوں۔ ہر ماہ بہن کے پاس جاتا ہوں۔ اس سلسلے میں انہوں نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔“

”وہ تم سے کیا کسی لڑکی والے سے بھی نہیں کہہ سکیں گی کیونکہ ان کا لڑکا نابینا ہے۔ سوچتی ہوں گی نابینا کو لڑکی کون دے گا۔ یہ کام تو آپ کو کرنا ہوگا۔“

”سوچنا یہ بھی ہوگا کہ ایک نابینا کے لیے معاش کے ذرائع کیا ہوں گے۔“

”اس کی قابلیت سے مجھے احساس ہورہا ہے کہ اگر وہ ٹیوشن بھی پڑھائے گا تو ہزاروں کمالے گا اور اگر وہ نوکری کرنا چاہے گا تو میں اس کی مدد کروں گا۔“

”میاں صاحب مسئلہ یہ بھی ہے کہ میری لڑکی بھی مانتی ہے یا نہیں۔“

”ہاں یہ سوچنے والی بات ہے۔ اس سے بھی بات کرکے دیکھ لو۔ شاید وہ یہ قربانی دینے کو تیار ہوجائے اور زندگی بھر ثواب کماتی رہے۔“

حافظ محمد شفیع مناسب وقت دیکھ کر سرگودھا آئے۔ شام کا کھانا کھا کر وہ بہن کے پاس بیٹھے تھے۔ اللہ دیا بھی اس وقت موجود تھے کہ حافظ صاحب نے اپنی بہن یعنی اقبال کی والدہ کو مخاطب کی۔

”آپا، اب تو اقبال نے ایم، اے کرلیا ہے اس کی شادی کے بارے میں کچھ سوچا؟“

”کون ماں ہوگی جو بیٹے کے سر پر سہرا دیکھنا نہیں چاہے گی لیکن اقبال نابینا ہے۔ اسے کون اپنی لڑکی دے گا

حالانکہ میرا بچہ لاکھوں میں ایک ہے۔"

"اِدھر اُدھر نظر دوڑایئے، شاید کوئی لڑکی آپ کو نظر آجائے۔"

"محمد شفیع، بیٹی تو تمہاری بھی ہے۔ اپنی بھتیجی کو چھوڑ کر کیوں کسی اور طرف دیکھوں۔"

"خدا کی قسم! میری دو لڑکیاں ہیں دونوں تمہاری ہیں۔ جس پر ہاتھ رکھ دو تمہاری۔"

"مجھے تو رفعت پسند ہے۔"

شیخ اقبال کا اس سلسلے میں یہ بیان ہے۔

"سال ہا سال کی تھکن دور کرنے کے لیے چند عزیز و اقارب سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کیا۔ ان ملاقاتوں میں سے ایک ملاقات نے سرتاپا اسیر کرلیا۔ اس ملاقات نے رشتۂ ازدواج کی صورت اختیار کرلی۔

ماموں نے تو کہہ دیا تھا کہ اپنی بیٹی رفعت احمد کی شادی اقبال سے کردیں گے لیکن اقبال کی والدہ کے دل میں یہ کھٹکا ضرور تھا کہ رفعت مانتی بھی ہے یا نہیں۔

حافظ شفیع ملتان میں رہتے تھے۔ اقبال کی والدہ کے سگے بھائی نہیں تھے۔ اقبال کی فیملی کبھی ان کے گھر گئی بھی نہیں تھی لیکن اب اقبال کی والدہ نے سوچا کہ ملتان جا کر ان کا گھر بار دیکھا جائے۔ رفعت بھی اقبال کو دیکھ لے گی۔ جو کچھ ہوگا اس کی مرضی سے ہوگا۔

اقبال اپنی والدہ اور والد کے ساتھ ملتان آگیا اور محسوس کیا کہ یہ لوگ تنگ نظر نہیں اور قدر کرنے والے ہیں۔ اس کی ملاقات رفعت سے کروائی گئی۔ وہ دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن اسے اندازہ ہوا کہ لڑکی خوش اخلاق ہے اور اس سے متاثر ہوئی ہے۔ رفعت نے اس وقت ایف، اے کا امتحان دیا تھا۔ یہ لوگ چند روز کے قیام کے بعد سرگودھا آگئے۔

رفعت کا رزلٹ آیا تو وہ انگلش میں فیل تھی۔ اس کے والد نے اسے سرگودھا بھیج دیا تاکہ اقبال اسے انگریزی کی تیاری کرواسکے۔ اس کے پیچھے یہ جذبہ بھی یقیناً ہوگا کہ دونوں کچھ عرصہ ایک ساتھ رہیں گے تو ایک دوسرے کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ وہ سرگودھا آگئی اور اقبال اسے پڑھانے لگا۔ اقبال کے جوہر اس پر کھلے تو اس کی پسند لفظوں میں ڈھلنے لگی۔ اقبال تو علم کا سمندر تھا۔ انگریزی تک محدود نہیں تھا۔ اردو ادب کا دروازہ بھی اس پر بند نہیں تھا۔ آدمی کیا تھا لائبریری تھا۔

ایک ماہ بعد وہ سرگودھا سے رخصت ہوئی تو لگتا تھا بہت زیادہ متاثر ہوئی ہے۔ اس کا ثبوت اس طرح ملا کہ اس نے ملتان جاتے ہی خط لکھا۔ اقبال نے اس کا جواب دیا پھر یہ سلسلہ باقاعدگی سے چلنے لگا۔

☆☆☆

ایم، اے کا رزلٹ آتے ہی وہ ملازمت کے بارے میں سوچنے لگا۔ یہ بہت بڑا چیلنج تھا جو اسے درپیش تھا۔ بینائی نہ رہے تو بینائی والے کام کیسے کیے جائیں۔

وہ جب ایم، اے ہسٹری کی بجائے ایم، اے انگریزی کرنے پر آمادہ ہوا تھا اسی وقت اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ تدریس کا شعبہ اختیار کرے گا کیونکہ انگریزی میں اسکوپ زیادہ ہے لیکن اب محسوس ہو رہا تھا کہ گورنمنٹ ملازمت کا حصول نہایت مشکل ہے۔ دور دور تک ایسی مثال نہیں ملتی تھی کہ کوئی نابینا گورنمنٹ ملازم ہو۔

وہ مایوس ہونے لگا تھا لیکن اس نے اپنی حالت یہ سوچ کر سنبھالی کہ حصولِ تعلیم کے بعد تو بینا افراد بھی بے روزگاری کے آسیب سے دوچار ہوتے ہیں۔ بہت سے خواب دیکھتے ہیں جس میں دو چار ہی پورے ہوتے ہیں۔ کچھ دنوں کی بات ہے میرا یہ خواب بھی پورا ہو جائے گا۔

جب آدمی حوصلہ مند ہو تو قدرت بھی اس کی مدد کرتی ہے۔ وہ گھر میں بیٹھا بہتر مستقبل کے لیے راہیں تلاش کر رہا تھا کہ اس کے انگریزی کے استاد ایم، ٹی، ناز اس سے ملنے آئے۔ وہ یہی سمجھا کہ مبارک باد دینے آئے ہوں گے لیکن وہ اس کا ایک خواب پورا کرنے آئے تھے۔

"میں انگریزی کی تدریس کے لیے ایک اکیڈمی قائم کر رہا ہوں۔ اس کے لیے مجھے ٹیوٹر کی ضرورت ہوگی۔ تم سے بہتر کون ہوگا۔ میرے ساتھ مل کر تدریسی عمل انجام دو۔ تنخواہ میں زیادہ نہیں دے سکتا لیکن اس لیے قبول کرلو کہ تمہیں تجربہ حاصل ہوگا جو آئندہ کام آئے گا۔ تمہاری جھجک نکلے گی، اعتماد آئے گا۔"

اقبال نے ان کی پیشکش قبول کرلی اور پڑھانا شروع کردیا۔ اس کے شاگردوں میں بی، اے کے طلبہ بھی تھے اور ایم، اے کے طلبہ و طالبات بھی۔

اس کے پڑھانے کا انداز اور انگریزی پر عبور ایسا تھا کہ اس نے طلبہ و طالبات کے دل جیت لیے۔ داخلوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ ڈیڑھ دو مہینے بعد ہی ناز صاحب کو اندازہ ہوگیا کہ ان کی اکیڈمی چلانے کے لیے اقبال ناگزیر ہے۔ ادھر اقبال کا اعتماد بھی آسمان پر پہنچ گیا تھا۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ اگر وہ اپنا ادارہ قائم کرے تو اس سے بہت زیادہ کما سکتا ہے۔ اس کی کچھ سن گن ناز صاحب کو بھی پہنچ گئی۔ انہوں نے پیشکش کی۔

"تم علیحدگی کا مت سوچو۔ میرے ساتھ کام کرتے رہو۔ میں تمہیں کل آمدنی کا چالیس فی صد دوں گا۔ تنخواہ بھی بڑھا دوں گا۔"

اقبال کی منزل چالیس فی صد نہیں تھی بلکہ آگے سے آگے بڑھنا تھا۔ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا تھا۔

اس نے "شاہین کالج" کے نام سے گھر پر ہی ایک تدریسی ادارہ قائم کرلیا۔ اپنے ایک دوست جاوید اختر کو ساتھ لیا اور ایک تانگے میں بیٹھ کر گلی گلی اعلان کرنے نکل کھڑا ہوا۔

"آپ کے شہر سرگودھا کے سیٹلائٹ ٹاؤن 736/A میں شاہین کالج کی کلاسز شروع ہو چکی ہیں۔ طلبہ و طالبات جو انگریزی کی تیاری کے خواہاں ہیں رجوع کریں اور شیخ محمد اقبال کی قابلیت سے فائدہ اٹھائیں۔

دو چار دن شہر کے چکر کاٹنے کے بعد وہ ایک سینما گھر پہنچ گیا تاکہ اپنے ادارے کے اشتہار پردۂ سیمیں پر چلا سکے۔ منیجر اس کے جذبے سے اتنا متاثر ہوا کہ کسی معاوضے کے بغیر سلائڈ چلانے پر تیار ہوگیا۔ شہر کے تمام سینما گھروں میں سلائڈیں چلنے لگیں۔ اشتہار بھی چھپوائے جو تانگے میں بیٹھ کر شہر میں تقسیم کردیے۔

یہ کالج کیا تھا گھر کا ایک کمرا تھا جس میں بیس کرسیاں رکھ دی گئی تھیں۔ اس کا نام تو ہو ہی چکا تھا۔ سب اسے جاننے بھی لگے تھے۔ طلبہ آنے لگے اور وہ انہیں شفٹوں میں پڑھانے لگا۔ دن میں آٹھ آٹھ گھنٹے تدریسی عمل جاری رہتا۔

رفعت سے خط کتابت کا سلسلہ جاری تھا۔ وہ بھی اس کی کوششوں کو سراہ رہی تھی اور بہت خوش تھی۔

"آپ نے تو بینا افراد سے بڑھ کر کام کر دکھایا ہے۔ وہ بھی تھک کر بیٹھ جاتے ہیں لیکن آپ نے تو تھکنا سیکھا ہی نہیں۔ مجھے آپ پر ناز ہے اور یقین ہے کہ اگر ہم ایک ہوگئے تو بہتر مستقبل ہمارا منتظر ہوگا۔" ایسے خطوط اقبال کے لیے مہمیز ثابت ہو رہے تھے۔ آسمان سے ستارے اتار لانے کا جذبہ پیدا ہو رہا تھا۔ اسے پہلی مرتبہ معلوم ہو رہا تھا کہ عشق میں کتنی گہرائی اور گیرائی ہے۔
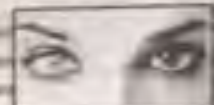
وہ رفعت کو اپنے گھر لانے سے قبل بہتر مستقبل کے حصول کے لیے تگ و دو کرنے لگا۔ اس نے ملازمت کے لیے محکمہ تعلیم کو درخواست داغ دی۔

اب وہ سفر شروع ہونے والا تھا جس میں ہر قدم قوتِ ارادی کے بل بوتے پر اٹھتا ہے اور یہ ثابت کرتا ہے قوتِ ارادی دراصل قوتِ خداوندی ہے۔

وہ گورنمنٹ کالج سرگودھا کے پرنسپل رفیع اللہ خاں کے پاس گیا۔ وہ اس کی زندگی کی جدوجہد سے واقف ہی نہیں معترف بھی تھے۔ انہوں نے اس کی طرف سے بھرپور سفارشی خط بھی تحریر کردیا۔

"جب تک تمہاری درخواست کا جواب نہیں آجاتا یہاں کلاسیں پڑھاؤ تاکہ میں تمہارا گواہ بھی بن جاؤں اور تمہیں کچھ تجربہ بھی ہو جائے۔" اسے تھرڈ ائیر کلاس پڑھانے کو دی گئی۔

اسے یہ تجربہ پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اس نے اس کامیابی سے کلاس لی کہ پرنسپل صاحب ہی نہیں طلبہ بھی اس کے گواہ بن گئے۔ اس نے اس کلاس کو پندرہ دن پڑھایا۔

شعبۂ انگریزی کے صدر غلام جیلانی اصغر بھی یہ ماننے کو تیار نہیں تھے کہ بینائی سے محروم کوئی فرد ادارے کے لیے مفید ہو سکتا ہے اور تدریسی فرائض ایسے انجام دے سکتا ہے جس طرح کوئی بینا فرد۔ انہوں نے یہ رائے پرنسپل کو ارسال بھی کردی لیکن پرنسپل نے اس رائے سے اتفاق نہیں کیا۔

جس معاشرے میں یہ تک تصور کرنا مشکل تھا کہ بینائی سے محروم فرد جی بھی سکتا ہے۔ جس کے خیال میں بینائی کا ضائع ہو جانا زندگی کا خاتمہ تھا۔ پرنسپل رفیع اللہ خاں نے روشن خیالی کا ثبوت دیا اور ڈائریکٹر تعلیمات راول پنڈی کو درخواست بھجوا دی۔

اب دیکھیں قدرت کس طرح مدد کرتی جا رہی تھی۔ اس وقت ڈائریکٹر تعلیمات اس کے استاد اور جوہر آباد کے سابق پرنسپل تھے جو اقبال کی تعلیمی کامیابیوں سے بھی آگاہ تھے اور اس کے حالات بھی جانتے تھے۔ انہوں نے اس کا کیس بھرپور سفارشات کے ساتھ سیکریٹری ایجوکیشن کو بھیج دیا۔

وہ جب فیصل آباد میں تھا اور بلائنڈ ایسوسی ایشن کے

قیام کے سلسلے میں کیپٹن مشیت الرحمٰن سے اس کی دوستی ہوئی تھی اس وقت سے کیپٹن صاحب سے اس کی خط کتابت چلی آرہی تھی۔ یہ موقع آیا تو اس نے پھر کیپٹن صاحب کو یاد کیا اور ان کے توسط سے اسکواڈرن لیڈر شربت علی چنگیزی تک پہنچ گیا جو ان دنوں سرگودھا بیس میں تعینات تھے۔ انہوں نے اقبال کا کیس گورنر تک پہنچایا اور کامیابی کی امید دلائی۔

وہ درخواست دے کر جواب کے انتظار میں وقت ضائع کرنے کے حق میں نہیں تھا۔ اسے معلوم ہوا کہ انبالہ مسلم کالج سرگودھا میں اسامی خالی ہے۔ اس کالج کو ایک پرائیوٹ تنظیم چلا رہی تھی اور اس کے سرپرست ڈپٹی کمشنر سرگودھا تھے۔

اس نے اس کالج میں ملازمت کے لیے درخواست دے دی۔ اس کی درخواست منظور بھی ہوئی اور اسے انٹرویو کے لیے طلب بھی کرلیا گیا۔

اس نے انٹرویو میں بالکل درست جواب دیے تھے۔ اسے امید بھی تھی کہ اسے کامیابی ملے گی لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وہ منتخب نہ ہوسکا حالانکہ وہ درخواست گزاروں میں اول قرار پایا تھا۔

اس کی اس ناکامی میں ڈپٹی کمشنر کا ہاتھ تھا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ نابینا ہوتے ہوئے اپنے فرائض کیسے سرانجام دے گا۔

دیکھا جائے تو کمشنر کا خیال غلط نہیں تھا۔ ایسی کوئی مثال ہی نہیں تھی کہ کسی نے اپنی معذوری پر فتح پالی ہو۔ انہوں نے معذوری کو مجبوری بنتے تو دیکھا تھا۔ اندھوں کو بھیک مانگتے یا کرسیاں بُنتے تو دیکھا تھا کسی اعلیٰ عہدے پر متمکن نہیں دیکھا تھا۔ وہ یہ تصور ہی نہیں کر سکتے تھے کہ انسانی ذہن کتنی توانائیوں اور قوتوں کا سرچشمہ ہے۔ ان قوتوں کو کام میں لاکر معذوری کے بت کو توڑا جاسکتا ہے۔ ان لوگوں نے یقیناً ڈاکٹر طٰہٰ حسین اور ہیلن کیلر کو..... پڑھا ہوگا لیکن وہ یہ بھی سوچتے ہوں گے کہ امریکا اور مصر میں تو یہ ممکن ہوسکتا ہے پاکستان میں نہیں۔ وہ یہ ماننے کو تیار نہیں تھے کہ شیخ محمد اقبال بھی عزم و ہمت کی تاریخ رقم کر رہا ہے۔ نامساعد حالات کے باوجود یہاں تک پہنچا ہے۔ اس کی پذیرائی ہونی چاہیے اسے مواقع عطا کرنے چاہئیں۔ اسے رول ماڈل بنانا چاہیے۔ بیناؤں کے لیے بھی نابیناؤں کے لیے بھی۔ اسے پاکستان کا طٰہٰ حسین سمجھنا چاہیے۔

اس ناانصافی نے اس پر ماضی کے کئی دریچے کھول دیے تھے۔ اسے یاد آیا جب وہ لاہور کے نابینا اسکول میں پڑھ رہا تھا تو اسکول کے سپرنٹنڈنٹ نے اس کے والد کو تسلی دیتے ہوئے کہا تھا۔

”ماسٹر صاحب، گھبرائیے نہیں۔ آپ کا بچہ یہاں سے فارغ ہوکر ہماری ورکشاپ میں کام کرے گا۔“ دنیا اب بھی بضد تھی کہ وہ ورکشاپ میں کام کرے۔ اسے یہ گوارا نہیں تھا کہ بچوں کو پڑھائے اور پروفیسر بنے جبکہ وہ تو اس سے بھی آگے کچھ بننا چاہتا تھا۔

اسے وہ واقعہ بھی یاد آیا جب اسکول میں وزیرِ تعلیم تشریف لائے تھے اور انہوں نے نابیناؤں کو پڑھتے ہوئے دیکھ کر حیرت سے کہا تھا۔ ”یہ بے چارے پڑھ کر کیا کریں گے۔“

کسی استاد نے فقرہ اچھالا تھا۔ ”کم از کم خواندہ فقیر تو ہوں گے۔“

یہ کسی استاد کا ذاتی فقرہ نہیں تھا اجتماعی سوچ تھی جو اَب تک چلی آرہی تھی۔ بینا افراد یہی سمجھ رہے تھے کہ وہ ہماری دنیا میں قدم رکھ ہی نہیں سکتا۔ بینا افراد کا احساسِ برتری تھا جو اس کی راہ میں رکاوٹ بن رہا تھا۔

وہ مشکلات کے کوہِ گراں سے ٹکراتا رہا۔ اس کے والد اس کی آنکھیں بن کر اس کا پوری طرح ساتھ دے رہے تھے۔ وہ انہیں لے کر کئی مرتبہ لاہور گیا اور سول سیکریٹریٹ کے چکر کاٹتا رہا کہ اس کی درخواست کا کیا بنا۔

17 ستمبر 1968ء کو ایک خط اسے ملا جس میں اطلاع دی گئی تھی کہ اسے گورنمنٹ کالج سرگودھا میں تعینات کردیا گیا ہے۔ یہ سب کچھ اتنا حیرت انگیز تھا کہ یقین ہی نہیں آتا تھا۔ اس سے پہلے کوئی ایسی مثال نہیں ملتی تھی کہ کوئی نابینا، بینا افراد کے کالج میں پڑھا رہا ہو۔

اس نے جب سرگودھا کالج جوائن کیا تو کالج انتظامیہ کے سامنے بھی یہی مسئلہ تھا کہ ایک نابینا شخص سے کام کس طرح لیا جائے۔ انہیں یقین نہیں تھا کہ وہ کلاسز کو سنبھال سکے گا۔ اس کا حل اس طرح نکالا گیا کہ اسے انگریزی ادب کی ایف، اے اور بی، اے کی جماعتیں دے دی گئیں جن میں طلبہ کی تعداد بہت کم ہوتی تھی۔ کسی کلاس میں پانچ، کسی میں سات اور کسی میں دو تین۔

ان طلبہ کو ویسے تو پڑھانا بہت آسان تھا لیکن اقبال نادان نہیں جو چند کلیوں پر قناعت کرلیتا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اسے چند طلبہ تک محدود کردیا گیا ہے۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے معذور سمجھا جا رہا ہے جبکہ وہ خود کو نابینا تصور کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ اس کا مطالبہ تھا کہ اسے انگریزی (لازمی) کی کلاسز دی جائیں۔ اس کے لیے اسے اپنی انتظامی صلاحیتیں ثابت کرنے کی ضرورت تھی۔ انتظامیہ کو یہ بتانا تھا کہ وہ سو ڈیڑھ سو طلبہ کی کلاس کو بھی سنبھال سکتا ہے۔

اس نے کالج جوائن کرتے ہی انگریزی لٹریری سرکل کی صورت میں ایک ادبی تنظیم قائم کردی۔ اس تنظیم کے تحت طلبہ غیر نصابی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے۔

اسی تنظیم کے تحت اس نے کالج میں ایک مباحثہ منعقد کروایا جس میں شہر کے تمام اسکولوں اور کالجوں کو مدعو کیا۔ ان میں طالبات بھی شامل تھیں۔ طالبات کی شمولیت کالج کی تاریخ میں پہلی بار ہوئی تھی۔ اس تقریب میں تقریباً تین ہزار طلبہ و طالبات شریک ہوئے اور نظم و ضبط کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا۔

وہ اس طرح انتظامات میں مشغول تھا جیسے اس کی آنکھوں میں روشنی آگئی ہو۔ اساتذہ اس کی لگن اور طلبہ میں اس کی مقبولیت دیکھ کر حیران تھے۔ وہ ایک ایک طالب علم کا نام لے کر مختلف کام ان کے سپرد کر رہا تھا۔ کبھی اسٹیج پر جاکر مائیک سنبھال لیتا تھا۔

اس کی سرگرمیاں دیکھ کر اساتذہ میں چہ میگوئیاں شروع ہوگئی تھیں۔ کچھ من چلے تو یہ تک کہہ رہے تھے کہ اقبال کو سب نظر آتا ہے۔ یہ ڈراما کرتا ہے کہ نابینا ہے کچھ یہ سوچنے پر مجبور ہوگئے تھے کہ اسے کچھ نہ کچھ تو نظر آتا ہوگا۔

اس کامیاب تقریب کا نتیجہ یہ ہوا کہ پرنسپل نے اسے بلایا اور اس کی تعریف کی۔ ”مجھے خوشی ہورہی ہے کہ میں نے تمہارے بارے میں جو سفارشات کی تھیں وہ درست ثابت ہوئیں۔ تم نے مخالفین کے منہ بند کردیے۔ مجھے اور سرگودھا کالج کو تم پر فخر ہے۔“

اس کے بعد اسے جنرل کلاسز دے دی گئیں۔ ہر کلاس میں سو سے زیادہ طالب علم ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ پھر اس کے مخالفین کو منہ کھولنے کا موقع مل گیا۔

”اب آیا ہے اونٹ پہاڑ کے نیچے۔ اتنی بڑی کلاس کو سنبھالنا ہمیں مشکل ہوتا ہے۔ اقبال بے چارہ کیا ہے۔“

”کون کس وقت اٹھ کر چلا گیا۔ اسے تو معلوم بھی نہ ہوسکے گا اور کلاس خالی ہوجائے گی۔“
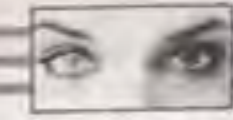
”ایک سے ایک شریر طالب علم ہے، بے چارہ اقبال کیا کرے گا۔“

اساتذہ اپنی جگہ ٹھیک ہی سوچ رہے تھے لیکن وہ کوئی عام نابینا نہیں تھا۔ شیخ محمد اقبال تھا جس کی اب تک کی تمام زندگی عزم و ہمت کی عظیم داستان تھی۔ اس نے وہ سب کچھ کر دکھایا جسے اس کے ساتھی ناممکن سمجھتے تھے۔ کارِ محال گردانتے تھے اور دیوانے کی بڑ کہتے تھے۔

اس نے سرگودھا کالج میں ایسی داستان رقم کی جس کے چرچے ہوتے تھے۔ ان طلبہ کے منہ بھی بند کردیے جو اس کے نابینا ہونے کا فائدہ اٹھانے کی تاک میں رہتے تھے۔

سب سے بڑا مسئلہ درست حاضری کا تھا۔ طلبہ اپنے غیر حاضر دوستوں کی حاضری لگوادیا کرتے تھے۔ یہ نابینا کیا بینا اساتذہ کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ استاد کی نظر حاضری رجسٹر پر ہوتی ہے اور کہیں سے آواز آجاتی ہے ”یس سر“ دو چار دن کی حاضری کے بعد اسے آوازوں کی پہچان ہوگئی۔

اس وقت طلبہ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ گئے جب ایک لڑکے نے اپنے دوست کے نام پر ”یس سر“ کہا اور اقبال نے اسے ٹوک دیا۔

”تم تو اپنی حاضری لگوا چکے ہو۔ دوستوں کے خیر خواہ کیوں بنتے ہو۔ خبردار! ہر لڑکا اپنے نام پر بولے گا۔“

پھر اس نے یہ انتظام کیا کہ تین مانیٹر مقرر کردیے۔ جب حاضری مکمل ہوگئی تو اس نے مانیٹرز سے کہا گنتی کریں۔ اگر طلبہ کی تعداد کم ہوئی اور حاضری زیادہ تو حاضری دوبارہ کی جاتی۔ طلبہ سمجھ گئے کہ چوری پکڑی جاتی ہے تو انہوں نے جعلی حاضری لگوانے سے توبہ کرلی۔

بعض لڑکے تھے کہ لیکچر کے دوران دبے قدموں سے باہر نکلنے کی کوشش کرتے تھے۔ اقبال کو اللہ نے ایسی حس دی تھی کہ دبے قدموں سے چلنے کی آواز بھی سن لیتا تھا۔ فوراً گرجدار آواز میں ڈانٹتا تھا۔

”یہ کون ہے جو باہر جا رہا ہے؟“

رفتہ رفتہ طلبہ پر اس کا رعب بھی طاری ہوگیا اور اس سے مانوس بھی ہوگئے۔ سب سے بڑا فائدہ ان طلبہ کو یہ ہوا کہ اقبال ان کے لیے رول ماڈل بن گیا۔ ان میں سے بعض

سوچتے ضرور تھے کہ وہ اندھا ہوکر اتنی تعلیمی صلاحیتیں رکھتا ہے تو ہماری تو پھر آنکھیں ہیں۔

عام طور پر تاثر یہ تھا کہ نابینا استاد تحریری کام نہیں کرواسکتا لیکن اقبال نے اس تاثر کو غلط ثابت کردیا۔ وہ کلاس میں نوٹس لکھواتا تھا یا گرامر کے اصول تحریر کرواتا تھا اور پھر طلبہ کی کاپیاں گھر لے آتا تھا۔ کسی سے سن کر ان کی غلطیاں درست کرتا تھا۔ یہ اس کی سخت محنت تھی جو اس سے یہ کام کراتی تھی۔ اس کی کلاس کا ڈسپلن مثالی تھا۔

جب وہ برسرروزگار ہوگیا اور روزگار بھی ایسا باعزت تو گھر والوں کو اس کی شادی کی فکر ہوئی۔ لڑکی پہلے ہی تلاش کی جاچکی تھی۔ رفعت سے اس کی خط وکتابت مسلسل جاری تھی۔ اس کا علم دونوں گھرانوں کو تھا۔ دونوں کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ رفعت خود بھی چاہتی تھی کہ اس کی شادی اقبال سے ہوجائے۔

26 دسمبر 1968ء کو اس کی شادی ہوگئی۔ شادی کے ابتدائی دنوں میں اچھے اچھے تساہل کا شکار ہوجاتے ہیں۔ نئی بیوی میں مشغول ہوکر اپنے فرائض تک سے غافل ہوجاتے ہیں لیکن اقبال تو کسی اور ہی مٹی سے بنا تھا۔

چند مہینے بعد ہی ایک نئے عزم سے آگے بڑھنے کو تیار ہوگیا۔ اس مرتبہ اس کی منزل تھی پی، ایچ، ڈی کا حصول۔ اسے ایک آبرومند ملازمت مل گئی تھی۔ معاشی مسئلہ بھی حل ہوگیا تھا۔ زندگی کا ساتھ بھی مل گیا تھا۔ معذوری اس کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ اب تو اسے چاہیے تھا کہ آرام کرتا۔ جو کچھ مل گیا تھا اسی پر تکیہ کرتا لیکن پھر کچھ کرگزرنے کے جذبے کا کیا ہوتا۔

ان دنوں انگریزی میں پی، ایچ، ڈی پاکستان میں رہ کر ممکن نہیں تھی۔ کسی کو یہ توفیق بھی نہیں کہ سرکاری خرچ پر اسے باہر بھیجنے کا انتظام کرتا۔ اس نے تھک ہار کر اردو میں پی، ایچ، ڈی کرنے کا ارادہ کرلیا۔ مختلف یونیورسٹیوں سے معلومات حاصل کیں تو معلوم ہوا انگریزی کی بنیاد پر اردو میں پی، ایچ، ڈی نہیں کیا جاسکتا۔ اردو میں پی، ایچ، ڈی کے لیے ضروری ہے کہ اردو میں ایم، اے کیا جائے۔ ایک نابینا کے لیے پہلا ایم، اے کرنا ہی پہاڑ کاٹ کر چشمۂ شیر نکالنے کے مترادف تھا اور اب اس سے کہا جارہا تھا ایک ایم، اے اور کرو۔ کوئی اور ہوتا تو تھک کر بیٹھ جاتا۔ قناعت اختیار کرلیتا لیکن وہ تن کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے اپنی بے نور آنکھوں کی پُتلیاں اِدھر اُدھر گھمائیں اور بیوی سے مخاطب ہوا۔

”کیا تم میرا ساتھ دوگی؟“

”میں تو آپ کی سفید چھڑی ہوں۔ آپ کا ساتھ دینے ہی تو آئی ہوں۔“

”جب میں نے پہلا ایم، اے کیا تو اباجی نے میرا بہت ساتھ دیا تھا۔ کتابوں کے حصول اور انہیں پڑھ کر سنانے میں۔ اب وہ بھی تھک گئے ہوں گے۔ مجھ میں ادبی شعور اسی وقت سے رچا بسا ہوا ہے جب میں لاہور کے بلائنڈ اسکول میں تھا۔ بس اس شعور کو مطالعہ کی ترتیب میں لانا ہے۔ کیا تم مجھے کتابیں پڑھ کر سنا سکوگی؟“

نئی نئی شادی ہوئی تھی اور ابھی یہ ممکن تھا کہ اس کی شریکِ حیات اس کی خواہش کا احترام کرتی۔ اس نے ہمت بندھائی اور وعدہ کرلیا کہ وہ اسے کتابیں پڑھ کر سنایا کرے گی۔

اس نے تیاری شروع کردی۔ اس کے شاگردوں نے بھی کتابوں کے حصول میں اس کی مدد کی۔ کتابیں آتی رہیں اور وہ سنتا رہا۔ بریل میں نوٹس محفوظ کرتا رہا۔

ایک طرف کالج کی مصروفیات تھیں دوسری جانب ایم، اے کی تیاری۔ وہ آٹھ آٹھ گھنٹے مطالعہ میں محو رہتا۔ کالج سے آتے ہی بریل لے کر بیٹھ جاتا یا بیوی کو مجبور کرتا کہ وہ کوئی کتاب پڑھ کر سنائے۔

کچھ دنوں بعد ہی اسے محسوس ہونے لگا کہ وہ اس تھکا دینے والے عمل سے بےزار ہوتی جارہی ہے۔ کتابیں اسے اپنی سوکن نظر آنے لگی ہیں۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ ہم دونوں میں ذہنی ہم آہنگی کا فقدان ہے لیکن وہ کوئی جھگڑا نہیں چاہتا تھا۔ خاموشی سے اپنا کام کرتا رہا اور بالآخر ایم، اے اردو کا امتحان پاس کرلیا۔

اس ایم، اے سے اسے یہ فائدہ پہنچا کہ اب وہ ادب کے دونوں سرچشموں سے فیض یاب ہوسکتا تھا۔ اردو، انگریزی کا تقابلی مطالعہ اس کے لیے بھی مفید تھا اور اس کے شاگردوں کے لیے بھی۔

اس نے پی، ایچ، ڈی کے لیے ڈاکٹر وحید قریشی سے رجوع کیا۔ ڈاکٹر صاحب اس وقت اورینٹل کالج لاہور میں شعبہ اردو کے صدر نشیں تھے۔ ایک طویل بحث کے بعد انہوں نے نظیر اکبرآبادی کا نام تجویز کیا۔

”آپ کے لیے کسی شخصیت پر کام کرنا آسان ہوگا۔ آپ شخصیت تک محدود رہیں گے۔ کام زیادہ پھیلے گا نہیں۔ نظیر اکبرآبادی پر مواد بھی بہت مل جائے گا۔ میں آپ کی پوری مدد کروں گا۔ میرا کتب خانہ حاضر رہے گا۔“

وہ اتنے خلوص سے ملے تھے کہ اقبال نے وہاں سے آتے ہی کام شروع کردیا تھا لیکن گھریلو حالات نے اس کے خلاف ایسی ہوا چلائی کہ ایک عرصے تک پی، ایچ، ڈی کا خیال، خواب بنا رہا۔

اس کے مقاصد، سماجی و ادبی تھے، اور رفیقۂ حیات محض ایک گھریلو روزمرہ زندگی کی قائل تھی۔ اسے نہ تو اس کے خوابوں سے دلچسپی تھی اور نہ ٹوٹ کر چاہنے والی محبت سے۔ وہ تو عامیانہ اور روزمرہ زندگی گزارنے کی قائل تھی۔ جب یہ عالم ہو تو فکری اور نظری ہم آہنگی کبھی پیدا نہ ہوسکتی۔ اس کے والد جو بے پناہ محبت اور لگن سے اس کے ہم سفر تھے روایتی خاندانی تعصبات کا شکار ہوگئے اور خانگی ناچاقی نے جنم لے لیا۔ حالات ایسے بگڑے کہ پھر بڑی مشکل سے سنبھلے۔

ان حالات نے اس کی جیتی جاگتی زندگی کو موت میں تبدیل کردیا۔ اس کے پاس اب دو ہی راستے تھے یا تو حالات سے سمجھوتا کرلے یا موجودہ بیوی کے ہوتے ہوئے ایک ایسی شریکِ حیات منتخب کرلے جو اس کے خوابوں، خیالوں اور تمناؤں کی تکمیل میں اس کی ہم سفر ہو۔ اس سلسلے میں اس نے کچھ ادھوری کاوشیں بھی کیں لیکن اسے یوں لگا جیسے یہ فیصلہ کرنا اس کے لیے دشوار ہے۔ یہ پہلا موقع تھا جب وہ کچھ نہ ہوا جو اس نے چاہا پھر اس نے یہ فیصلہ کرلیا کہ اپنی جنگ اسے خود لڑنی ہوگی۔

ان حالات سے گھبرا کر اسے اپنا بھولا ہوا خواب یاد آیا۔ بلائنڈ ایسوسی ایشن سرگودھا کی بنیاد ڈال ہی چکا تھا۔ اسی تنظیم کے تحت اس نے نابینا افراد کے لیے ایک ادارہ قائم کردیا۔ ان کے قیام وطعام اور تدریس وتعلیم کا اہتمام کرنے کے لیے چندے جمع کرنا بہت بڑی آزمائش تھی۔

اس نے کوئی تعلیمی ادارہ، کوئی دفتر، کوئی گھر نہیں چھوڑا جہاں جاکر یہ فرض یاد نہ دلایا ہو کہ بصارت سے محروم بچے بھی انہی کے بچوں جیسے ہیں اور ان پر اخلاقی ذمّے داری ہے کہ وہ ان کی تعلیم وتربیت کے لیے ہمارا ساتھ دیں۔

ان دنوں اس کا عجیب حال تھا۔ ایک جنونی کیفیت تھی جو اس پر طاری تھی۔ ایک ساتھی کو لے کر آٹھ آٹھ گھنٹے سائیکل پر گھومتا رہتا تھا۔ کبھی اس بازار میں کبھی اس دکان پر۔ کبھی کسی اسکول میں جاکر تقریر کررہا ہے، کبھی کسی مکان کا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔

بعض اوقات اسے اور اس کے ساتھیوں کو نہایت حوصلہ شکن حالات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس کی اس کاوش کو بعض لوگ دولت کمانے کا ذریعہ تصور کرتے تھے۔

”خود نابینا ہے اور نابیناؤں کے نام پر روپے بٹور رہا ہے۔“ اچھے برے لوگ سب جگہ ہوتے ہیں۔ انہی میں ایسے بھی تھے جو اس کی کوششوں کو سراہتے تھے اور اعانت کے لیے ہاتھ بڑھاتے تھے۔ اس کی حمایت میں آواز بلند کرتے تھے۔

”اگر اسے پیسا کمانا ہوتا تو گداگری کا پیشہ اختیار کرتا۔ اس نے جانفشانی سے تعلیم حاصل کی اور اب لیکچرر ہے۔ اگر اس کا خلوص اس کے شاملِ حال نہ ہوتا تو کیوں گلی گلی گھومتا۔“

اس کی کوششوں سے سیکڑوں بے بصر احباب زیورِ علم و ہنر سے آراستہ ہوئے۔ بیسیوں برسرروزگار ہوئے۔ ان میں جینے کی سکت پیدا ہوئی۔

اس نے اپنی کوششوں کو بارآور کرنے کے لیے سیمینار اور تقریبات منعقد کیں جنہیں کام میں لاکر بین الاقوامی تحریک میں بڑھ چڑھ کر شرکت کرتا۔ اسے شاندار انگریزی آتی تھی جس کی بدولت دنیا بھر میں اپنا کردار ادا کرسکتا تھا لیکن اس نے کبھی ملک سے باہر جانا پسند نہیں کیا۔ اس کے دستخطوں سے سیکڑوں نابینا ملک سے باہر چلے گئے لیکن وہ نہیں گیا۔

اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ صرف اس ادارے ہی سے وابستہ ہوکر رہنا نہیں چاہتا تھا۔ نہ وہ اسے اپنی آمدنی کا ذریعہ بنانا چاہتا تھا۔ اس نے تنظیمی اثاثوں، سہولتوں اور ذرائع سے ایک پل کے لیے بھی استفادہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔

☆☆☆

وہ مصروفیات کے انبار تلے دبا ہوا تھا لیکن پی، ایچ، ڈی کرنے کی خواہش بار بار سر ابھار رہی تھی۔ وہ ہر مرتبہ تھپک کر سلا دیتا تھا لیکن وہ اس خواب کو بھولا نہیں تھا۔ اگر

بھول بھی گیا تھا تو اس کے ایک شاگرد نے اسے یاد دلا دیا۔ ”علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی نے اردو اور اقبالیات میں ایم فل کا پروگرام مشتہر کیا ہے۔“

”موقع تو اچھا ہے، کیا خیال ہے میں خود کو Enrol کرالوں۔“

”سر، کوئی حرج نہیں بس یہ دیکھ لیں کہ یہ ایک تحقیقی کام ہے اور آپ کی مصروفیات بہت ہیں۔ اتنا وقت نکال سکیں گے۔“

”انسان کے پاس وقت اس کی مصروفیات سے زیادہ ہوتا ہے اگر وہ اسے ضائع نہ کرے۔ میرے پاس بہت وقت ہے۔ تم مجھے فارم وغیرہ لادو۔“ اسے اس سلسلے میں کئی مرتبہ لاہور جانا پڑا۔

لوگ کام کرنے والوں کے ساتھ کتنے ظلم کرتے ہیں اس کا احساس اسے اس وقت ہوا جب وہ لاہور گیا ہوا تھا اور کچھ دن اسے وہاں رکنا بھی پڑ گیا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں مخالفوں نے یہ افواہ اڑادی کہ اقبال کسی جواں سال لڑکی کے ساتھ فرار ہوگیا ہے۔ کسی نے یہ سوچنے کی زحمت ہی نہیں کی کہ وہ لڑکی کون ہے۔ لڑکی کے خاندان والوں سے بھی تو پوچھا جائے۔

جب اقبال واپس آیا تو سرگودھا میں چرچے ہی دوسرے سنے۔ وہ وضاحتیں دیتے دیتے تھک گیا لیکن سرگوشیوں میں یہ چرچے برابر ہوتے رہے۔

تاہم کارِ خیر میں بہت سے شر کے نمائندے سدِّراہ ہوجاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے صورتِ حال بہتر بناتا رہتا ہے۔

اسے ایم۔فل میں ریسرچ کے لیے جو موضوع ملا وہ تھا ”اقبال پر انگریزی رومانی شعرا کے اثرات“ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اس کے گائڈ مقرر ہوئے جو حسنِ اتفاق سے اس کے پڑوسی بھی تھے۔ ان کی رہنمائی میں مقالے کی تکمیل ہوئی۔

مقالے کی تکمیل اور امتحانی مراحل سے گزرنے کے بعد اسے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ وہ اول تھا۔ اسے گولڈ میڈل اور سرٹیفکیٹ سے نوازنے کے لیے اسلام آباد بلایا گیا۔

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے پاس اس وقت کوئی پی، ایچ، ڈی کا پروگرام نہیں تھا۔ وہ انتظار کرتا رہا اور جونہی پروگرام مشتہر ہوا اس نے اپنے آپ کو Enrol کروالیا۔ پی، ایچ، ڈی کا محنت طلب کام شروع ہوگیا۔

اس کا کمرا اکیڈمی بنا ہوا تھا۔ رسائل وجرائد میز پر پڑے ہوئے تھے۔ سنانے والا کوئی کتاب پڑھ کر سنا رہا ہے۔ اقبال اپنے موضوع کے حوالے سے ٹک مارک کرواتا جارہا ہے اور پھر بریل میں نوٹ کررہا ہے۔

ایک شخص لکھتا تھا ایک شخص کتاب تلاش کرتا تھا اور ایک تحریر کرواتا تھا۔ جب یہ مددگار رخصت ہوجاتے تھے تو اس کی اہلیہ اور بچے مقالہ لکھنے اور کتابیں پڑھ کر سنانے میں اس کی مدد کرتے تھے۔

یہ کام ایک دو دن کا نہیں تھا۔ انگریزی شعرا کے ہزاروں صفحے کے دواوین پڑھنا (سننا) پڑے۔ علامہ اقبال کی اردو، فارسی، شاعری، خطبات، خطوط اور مختلف بیانات اور ان پر تحریر کردہ سیکڑوں مقالوں اور مضامین کا مطالعہ کرنا پڑا۔

ماہرینِ اقبالیات سے بھی رہنمائی کی صورتیں نکالیں اور بالآخر اس نے اپنا مقالہ مکمل کرلیا اور اسے ڈگری تفویض کردی گئی۔ اس کا یہ خواب بھی پورا ہوا۔

نابینائی نے اس سے سب کچھ چھین لیا تھا۔ تعلیم نے اسے سب کچھ لوٹا دیا۔

☆☆☆

اس کی جمالیاتی حس بچپن ہی سے بہت بیدار تھی۔ وہ پیدائشی نابینا نہیں تھا۔ سات آٹھ سال کی عمر تک اس نے آسمان میں تیرتے ہوئے بادل بھی دیکھے تھے، ستاروں کی برات بھی دیکھی تھی۔ شگفتہ پھول، تبسم ریز کلیاں بھی دیکھی تھیں، اپنی عمر کی بچیاں بھی دیکھی تھیں پھر اچانک یہ سب مناظر اندھیرے میں تبدیل ہوگئے۔ اب خواب دیکھنا ہی اس کا مقدر تھا اور دراصل خواب ہی تو اصل زندگی ہوتے ہیں۔

جب یہ کیفیت بدلی تو وہ آوازوں کی دنیا میں آگیا۔ چڑیوں کی چہکار، اچھی آوازیں، دلکش گیت اسے اپنی طرف کھینچنے لگے۔ اس کی جمالیاتی حس اسے مجبور کرتی تھی کہ وہ ان آوازوں کو سنے، ان گیتوں میں کھوجائے۔ جب اور آگے بڑھا نصاب سے واسطہ پڑا سیکڑوں اشعار ازبر ہوگئے۔ اس کے اندر ایک شاعر چھپا ہوا تھا جو بار بار اس سے کہتا تھا ایسے ہی اشعار تم بھی کہو لیکن ابھی اسے یہ معلوم

نہیں تھا کہ شعر کیسے کہتے ہیں یا وہ شعر کہے تو کیوں کہے۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ اسے ایسا ماحول میسر نہیں تھا۔

گھر میں ریڈیو آگیا تو بہت بڑی تفریح اس کے ہاتھ آگئی۔ ریڈیو پر مشاعرے بھی ہوتے تھے جنہیں وہ بڑے غور سے سنا کرتا تھا۔ وہ ایف، اے میں تھا کہ اس کے اندر چھپا ہوا شوق لفظوں میں ڈھلنے لگا۔ اس نے اپنی دانست میں کچھ غزلیں کہیں اور کالج کے ایک استاد یوسف سودائی کو سنائیں۔ انہوں نے اس سے تو کچھ نہیں کہا لیکن اس کے دوست کو بتایا کہ اقبال کی غزلیں وزن سے عاری ہیں۔

بات آئی گئی ہوگئی۔ وہ اس وقت شاعر نہ بن سکا۔ کوئی ایسا جنون بھی نہیں تھا۔ کرنے کو اور بہت سے کام تھے۔

”یار، جب تم شعر کہتے ہی ہو تو الطاف مشہدی بہت بڑے شاعر ہیں تم ان کے باقاعدہ شاگرد بن جاؤ۔“ اس کے ایک دوست نے کہا۔

”شاعروں کے بڑے نخرے ہوتے ہیں، نہ جانے مجھ سے مل کر وہ کیا محسوس کریں۔“

”میں تمہیں ان کے پاس لے جاؤں گا۔“

پھر کچھ ایسے حالات ہوئے کہ وہ الطاف مشہدی کے پاس نہ جاسکا۔ اس دوران سرگودھا میں ہونے والے مشاعرے میں شریک بھی ہوا لیکن بطور سامع۔ اس شرکت کا نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ ایک مرتبہ پھر شوق نے ہوا باندھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے قدرت خود لانے میں کوشاں ہے۔
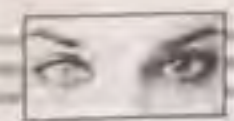
ایم، اے انگریزی کرنے لگا تو انگریزی شاعری نے دل موہ لیا۔ اس دوران اس شعلۂ عشق نے بھی دل کے دروازے پر دستک دی جس سے شاعری کی کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ اپنی ایک کزن سے ملاقات ہوئی (بعد میں رشتۂ ازدواج میں تبدیل ہوئی) ان ملاقاتوں کو وہ غزلوں کے روپ میں ڈھالتا رہا۔

جب بھی کوئی حسین ہم سفر مل گیا
یہ زمیں ساتواں آسماں بن گئی

☆☆

مری غزل کا ہر اک رنگ تیرے حسن کا رنگ
میں لکھ رہا ہوں تجھے بار بار بس یوں ہی
ہزاروں حسن مری جان کا عذاب بنے
تمہارے حسن پہ کچھ اعتبار بس یوں ہی

☆☆

آج ہو اور ابھی ابھی دستِ حنائی پر رقم
کوئی حسیں داستاں دل کی عجیب خواہشیں

☆☆

کیا اک پھول پر آنکھیں جمالیں
تجھیں گلشن پہ مرنا چاہیے تھا

☆☆

ایم، اے اردو کیا تو اردو شاعری سے بہت قریب کی ملاقات ہوئی پھر یہ ہوا کہ گھر کے حالات جھگڑوں اور مناقشوں میں تبدیل ہوگئے۔ اس نے راہِ فرار اختیار کی اور سرگودھا میں ہونے والے مشاعروں میں شریک ہونے لگا۔ اس کے اشعار لوگوں تک پہنچنے لگے۔

قلب و نظر میں بزم سجا کر چلا گیا
کیا دل نشیں خواب دکھا کر چلا گیا

☆☆

میری پلکوں پہ سرِ شام چراغاں ہمدم
راحتِ سوز نہاں ہے مجھے معلوم نہ تھا

☆☆

زخم بھر جائیں گے اور دل بھی بہل جائے گا
دیکھتے دیکھتے نقشہ ہی بدل جائے گا

☆☆

کیا کم ہیں مجھے میرے مقاصد کے اجالے
طوفاں مرے رستے کا ہر ایک دیپ بجھادے

☆☆

وہ تو جو کام کرتا تھا بھرپور کرتا تھا۔ اس نے صرف مشاعرے پڑھنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنی رہائش گاہ پر ایک شاندار مشاعرہ بھی کرڈالا۔ صدارت کے لیے وزیر آغا کی خدمات لیں۔ مرتضیٰ برلاس مہمانِ خصوصی تھے۔ شہر کے کم و بیش چالیس شعرا شریک ہوئے جن میں شاعرات بھی تھیں۔

جو لوگ مشاعرے آرگنائز کرتے ہیں شعرا حضرات ان سے خوش ہی ہوتے ہیں۔ شاعروں میں اس کا امیج بھی بہتر ہونے لگا۔ وہ اپنے گھر پر ماہانہ محافلِ شعر سجانے لگا۔ نابیناؤں کا عالمی دن منایا جارہا تھا۔ اس موقع پر بھی اس نے ''جناح ہال سرگودھا'' میں ایک مشاعرہ برپا کیا جس میں لاہور اور سرگودھا کے شاعر شریک ہوئے۔

شاعری کی دیوی ایسی مہربان ہوئی تھی کہ اٹھتے بیٹھتے غزلیں ہونے لگیں اور ایک سال کے اندر اندر مجموعۂ کلام تیار ہوگیا۔ بس یہیں سے صورتِ حال تبدیل ہوگئی۔ اس وقت سرگودھا کے بہت کم شعرا کے مجموعے شائع ہوئے تھے۔ اس لیے اس کی سبک رفتاری پر لوگ کچھ زیادہ خوش نہیں تھے۔

جب اس مجموعۂ کلام ''ساحل تشنہ لب'' کی تقریبِ رونمائی ہوئی تو بہت سے لوگ کھل کر سامنے آگئے۔ پروفیسر غلام جیلانی اصغر نے اپنے خطاب میں کہا۔

''شیخ محمد اقبال سمیت کوئی بھی نابینا شخص اچھا شاعر نہیں بن سکتا۔'' دوسرے لوگوں نے بھی مقالات پڑھے لیکن وہ بھی دل ہی دل میں ناخوش نظر آرہے تھے۔

غلام جیلانی کی اس رائے کی شاید وجہ یہ تھی کہ نابینا افراد بصارت سے محرومی کی وجہ سے فطرت کا حسن کائنات کی رنگینیاں اور ارض وسماں کے رنگ و آہنگ کا تجربہ نہیں کرسکتے حالانکہ اقبال کے بارے میں یہ رائے غلط تھی۔ وہ پیدائشی نابینا نہیں تھا۔ وہ اپنی عمر کے ابتدائی آٹھ سال دنیا کے رنگ و روپ اور روشنی و تاریکی کے امتزاج کا تجربہ کرتا رہا تھا۔ اس کے کلام میں چاند، سورج، آسمان، چراغ اور اس قسم کے دیگر بصری استعارے کثرت سے استعمال ہوئے تھے۔

مرے دل میں آس کا چاند ہے شب تار ہے تو ہوا کرے
ابھی ٹمٹماتی ہیں کوششیں، ابھی زندگی کا جواز ہے

☆☆

دل نشیں یادوں کی روشنی ہے تاروں میں
چاند جگمگاتا ہے اب بھی نام پر تیرے

☆☆

جو اندھیرے میں مجھ کو چھوڑ گیا
اب اسے ماہتاب کیا لکھنا

☆☆

اگر سب کچھ اندھیرا ہے اگر سب کچھ ہے تاریکی
ہجومِ روشنی کیا ہے خدا جانے خدا جانے

☆☆

مظاہرِ فطرت کی عکاسی اس سے بہتر کیا ہوسکتی ہے۔

ابھی کلیوں کے ہونٹوں پر تبسم کی لکیریں ہیں
ابھی گل مسکراتے ہیں تمہیں جانے کی جلدی ہے

آنکھیں نہ رہتے ہوئے بھی اس کی قوتِ باصرہ (دیکھنے کی قوت) اتنی توانا تھی کہ چہرے پر پڑے کیل، مہاسے اور دھبے تک دکھائی دیتے تھے۔

یہ کیا کیلیں مہاسے داغ دھبے
رخِ انساں نکھرنا چاہیے تھا

کسی کو معلوم نہ ہو تو کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ ایک ایسے شاعر کے شعر ہیں جو بصارت سے محروم ہے۔

اسی تقریب میں ڈاکٹر وزیر آغا نے اقبال کا دفاع کرتے ہوئے کہا۔

''ہر شاعر کا ایک عقبی دیار ہوتا ہے لہٰذا اگر نابینا شاعر کا بصارت کے واسطے کائنات سے رابطہ منقطع ہوتا ہے تو اس کا عقبی دیار وا ہو جاتا ہے۔''

''ساحل تشنہ لب'' کی رسمِ پذیرائی کے سلسلے میں واپڈا آڈی ٹوریم لاہور میں ایک تقریب منعقد ہوئی۔ جس میں حکومت پاکستان کی طرف سے توصیفی سرٹیفکیٹ اور نقد ایوارڈ دیا گیا۔

سرگودھا تعلیمی بورڈ نے اساتذہ کی کتب کے سلسلے میں ایک مقابلہ منعقد کروایا۔ اس مقابلے میں ''ساحل تشنہ لب'' کو دوم قرار دیا گیا۔

اتنی پذیرائی کے بعد اس کی حوصلہ افزائی ہونی ہی تھی۔ شعر ہی شعر ہونے لگے۔ دوسرا مجموعۂ کلام ''سوالیہ نشان'' کے عنوان سے سامنے آیا۔ نعتیہ مجموعہ ''تلاوتِ دل'' اشاعت پذیر ہوا۔

نعت کہنا کوئی آسان کام نہیں۔ اس کے لیے ایمان کی مضبوطی اور عشق کے ساتھ ساتھ تن من دھن کی صفائی ضروری ہے۔ قلب و ذہن میں ذرا سی آلودگی ہو تو یہ عملِ خیر نہیں ہوسکتا۔ نعت کہنے کے لیے آنکھوں کی نہیں دل کی آنکھوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اقبال کے دل کی آنکھیں روشن تھیں۔

مرے عشق کی رگوں میں ہے رواں دواں مدینہ
میں جہاں بھی دیکھتا ہوں ہے وہاں وہاں مدینہ
کبھی شہرِ دل میں روشن کبھی روح کے نگر میں
مری زیست کے جہاں میں ہے کہاں کہاں مدینہ

ایک مجموعہ ''اک ہم سفر اچھا لگا'' منظرِ عام پر آیا پھر انگریزی میں بھی شعر ہونے لگے۔ انگریزی کلام ''Love's no Crime'' کے نام سے شائع ہوا۔

دوستوں کے کہنے پر پنجابی میں بھی غزلیں کہیں اور لاتعداد کہیں۔ فارسی میں بھی غزلیں ہونے لگیں۔ 2007ء میں چوتھا شعری مجموعہ ''یہ کافر دل نہیں مانا'' شائع ہوا۔

ابھی شیخ محمد اقبال بقید حیات ہیں۔ ابھی نہ جانے کتنے اور مجموعہ ہائے شعر منظرِ عام پر آئیں گے۔

☆☆☆

وہ اپنے تدریسی فرائض نہایت احسن طریقے سے انجام دے رہا تھا۔ پرنسپل کم و بیش سب کے سب اس سے خوش تھے۔ طلبہ اور ان کے والدین بھی اس کی قدر کرتے تھے۔ کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو مشاورت کے لیے اس کے پاس آتے۔ اس کے سماجی کاموں کی شہرت بھی اسے ہر دل عزیز بنائے ہوئے تھی۔

وہ خود بھی پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ معذور ہے۔ مسئلہ کوئی بھی درپیش ہو تو یہی سمجھا جائے گا کہ وہ دیکھ نہیں سکتا اس لیے یہ مسئلہ پیش آیا۔

اتنی احتیاط کے باوجود وہ اپنے رفقائے کار میں بہت سوں کو مطمئن نہیں کرسکا۔ اکثر و بیشتر درپردہ اس کی شدید مخالفت ہوتی رہی۔ اسے رقابت کا شدید جذبہ بھی کہا جاسکتا تھا۔ بینا اساتذہ لاشعوری طور پر یہ قبول ہی نہیں کرسکتے تھے کہ ایک بینائی سے محروم استاد اتنی صلاحیتیں رکھتا ہے کہ پورا شہر اس کے گن گا رہا ہے۔

بہت سوں کو اس سے پیار تھا لیکن بہت سوں کو اس کی کوئی علمی ادبی ضرورت نہیں تھی۔

یہ اور اس جیسی دوسری بہت سی باتیں تھیں جن کی بدولت وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ سروس کو تیس سال ہوچکے اب اسے ریٹائر ہوجانا چاہیے۔ اس نے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی۔

اس کے ریٹائر ہوتے ہی پرائیوٹ تعلیمی اداروں کے اربابِ اختیار اس کی خدمات حاصل کرنے کے لیے دوڑ پڑے لیکن اگر اسے نوکری ہی کرنی تھی تو گورنمنٹ کالج سرگودھا کی آٹھ نو سال کی بقیہ سروس کیوں چھوڑتا۔ اس نے سب سے انکار کردیا۔ اس کے پاس کرنے کو بہت کچھ تھا۔

ماہنامہ ''سفید چھڑی'' کا اجرا کرچکا تھا۔ اس ماہ نامے کا مقصد اداریوں اور مضامین کے ذریعے عوام الناس کے ذہنی رویّوں میں تبدیلی لانا تھا۔ اس جریدے میں وہ خود بھی مضامین لکھتا تھا اور دوسروں کی تحریروں کو سن کر انہیں شائع کرنے اور نہ کرنے کا فیصلے بھی کیا کرتا تھا۔

نابیناؤں کی بحالی اور آبادکاری بذاتِ خود ایک کارِ محال تھا جسے وہ ساتھیوں کے ساتھ مل کر انجام دے رہا تھا۔ بلائنڈ ایسوسی ایشن کے معاملات تھے جن سے نمٹنا پڑتا تھا۔ تنظیموں میں بعض وہ احباب بھی شامل ہوجاتے ہیں جو مخلص نہیں ہوتے۔ ان پر نظر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان احباب سے بھی نمٹنا پڑتا تھا۔ نابیناؤں کے لیے اسکول قائم کیا تھا اس کی نگرانی بھی اس کے فرائض میں شامل تھی۔ گھریلو مسائل تھے۔ بچوں کی دیکھ بھال تھی۔ تصنیف وتالیف کے لیے وقت نکالنا ہوتا تھا، شاعری تھی۔ غرض ہزار جھنجٹ تھے۔ اب تو وہ یہ سوچنے لگا تھا کہ اگر گورنمنٹ سروس نہ کی ہوتی تو وہ زیادہ کام آسانی کے ساتھ کرسکتا تھا۔

وہ اب نوکری کرنے کے حق میں نہیں تھا لیکن علم کی پیاس نہیں بجھی تھی۔ اس نے ہومیوپیتھی کالج میں داخلہ لے لیا اور ساتھ ہی موسیقی سیکھنی شروع کردی جو اَب تک جاری ہے۔ ہومیوپیتھی کا طرزِ علاج اسے پسند نہ آیا۔

وہ سرگودھا سے لاہور منتقل ہوگیا۔ ملازمت کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن وہاں پہنچتے ہی کرنل مسعود سے ملاقات ہوگئی جو پنجاب یونیورسٹی میں رجسٹرار تھے۔ انہوں نے اسے پیشکش کی وہ پنجاب یونیورسٹی کا ''شعبۂ خصوصی'' جوائن کرلے۔

وہ ملازمت کا ارادہ ترک کرچکا تھا لیکن کرنل مسعود کا کہا ٹال نہ سکا۔ بات یہاں بھی لیکچر دینے تک کی تھی۔ کم از کم کرنل مسعود نے اس سے یہی کہا تھا لیکن تعیناتی کا جو خط اسے ملا اس پر ''ریسرچ آفیسر'' لکھا ہوا تھا۔ تحقیق سے اس کا رشتہ پرانا تھا لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس یونیورسٹی میں تحقیق کی نوعیت کیا ہوگی۔ اس لیے اس نے صدرِ شعبہ سے یہ گزارش کی کہ وہ اسپیشل ایجوکیشن کی تدریس کے فرائض تفویض کریں۔

''آپ معذوری کے بہت سے پہلوؤں سے واقف ہیں لیکن درسیات کے معاملات مختلف ہوتے ہیں۔ آپ کے لیے پڑھانا مشکل ہوجائے گا۔'' صدرِ شعبہ نے کہا۔

''آپ مجھے کلاس دے کر تو دیکھیں۔ بہت سی کتابیں ہیں جن سے تیاری کرکے پڑھایا جاسکتا ہے۔ باقی اساتذہ بھی یہی کرتے ہیں۔ میں بھی کتابوں سے نوٹس لے کر پڑھا سکتا ہوں۔''

اقبال نے بہت کوشش کی لیکن وہ انہیں قائل نہیں کرسکا۔ وہ یہی کہتے رہے کہ آپ نے ابھی تک بینا افراد کو پڑھایا ہے اسپیشل ایجوکیشن کی اصطلاحات، مسائل اور سیاق وسباق سے آپ واقف نہیں۔

''آپ فی الحال یہ کریں کہ اسپیشل ایجوکیشن سے متعلق ایک کتاب کا ترجمہ کریں۔ اس سے آپ کو آگاہی بھی ہوگی اور اردو میں ایک کتاب بھی وجود میں آجائے گی۔''

اسے ایک کتاب Introduction to the study of special Education ترجمہ کرنے کو دے دی گئی۔

اس نے ترجمہ شروع کردیا۔ ترجمے کے دوران اس پر انکشاف ہوا کہ خصوصی بچوں کی تعلیم واقعی ایک الگ موضوع ہے۔ اس کے تجربات تو بہت ہیں لیکن اس بارے میں اس نے پڑھا نہیں ہے۔ ایک مرتبہ وہ پھر طالب علم بن گیا۔ لائبریری میں امریکی اور برطانوی مصنفین کی دو سو کتب خصوصی تعلیم کے بارے میں موجود تھیں۔ اس نے ایک ایک کرکے سب پڑھ ڈالیں بلکہ یہ کہا جائے کہ پڑھوا کر سن لیں۔

ان کتابوں کے مطالعے کے بعد وہ اتنا جان چکا تھا کہ بہ آسانی کلاس لے سکتا تھا۔ اس نے پھر صدرِ شعبہ سے ملاقات کی اور اپنی کارکردگی کی رپورٹ ان کے سامنے رکھ دی۔

''میں لائبریری میں موجود تقریباً تمام کتب پڑھ چکا ہوں جو خصوصی تعلیم کے بارے میں ہیں۔ اب مجھے امید ہے کہ میں کلاسز لے سکتا ہوں۔''

''آپ نے تو کمال کردیا۔ یہ تو بینا افراد بھی نہیں کرتے جو آپ نے کر دکھایا۔ آپ کی محنت دیکھ کر تو میں کچھ اور ہی سوچ رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں آپ طلبہ وطالبات کو اپنی زندگی کے مختلف مراحل پر لیکچرز دیں تاکہ وہ آپ کو ماڈل بنائیں اور ان میں بھی حصولِ علم کی لگن پیدا ہو۔ اس کے بعد جب آپ انہیں پڑھائیں گے تو ایک ایک بات ان کے دل میں اترتی چلی جائے گی۔''

اقبال نے بھی یہ آئیڈیا پسند کیا۔ اس نے لیکچرز دینے شروع کردیے۔ یہ لیکچرز اس کی کامیابیوں اور عزم وہمت کی داستانیں تھیں۔ اس کی کہانی ایسی محیر العقول تھی کہ طلبہ اسے انسان سے ہٹ کر کوئی چیز سمجھنے لگے۔ نہ صرف اس سے متاثر ہوئے بلکہ اس کے قریب آتے چلے گئے اور یہ عہد بھی کرتے تھے کہ وہ بھی اس جیسا بننے کی کوشش کریں گے۔

پورا سیشن اس نے اپنی زندگی طلبہ کے حوالے کرنے میں گزار دیا۔ چیئرمین کا حکم نامہ اسے موصول ہوا۔

''میں مطمئن ہوگیا ہوں۔ آپ ایم، اے کی کلاسز لے سکتے ہیں۔'' اسے ایم، اے خصوصی تعلیم کا پہلا پرچہ پڑھانے کے لیے کہا گیا۔

اس کا تعلق چونکہ عملی طور پر نابیناؤں کی بحالی اور تعلیم وتربیت سے تھا۔ شعروادب سے بھی گہری وابستگی تھی۔ طلبہ جو کچھ نصاب میں پڑھ رہے تھے اس کی زندگی اس کا عملی نمونہ تھی لہٰذا طلبہ میں اس کو وہ مقبولیت حاصل ہوئی جو کسی اور استاد کے حصے میں نہیں آئی۔

چیئرمین کو یہ معلومات ملتی رہتی تھیں۔ وہ اس سے اتنے خوش ہوئے کہ خصوصی تعلیم کے اساتذہ کے ریفریشر کورسز بھی اس کے حوالے کردیے۔ شعبۂ خصوصی تعلیم سے جریدہ نکلتا تھا۔ اس کا ایڈیٹر بھی اسے مقرر کردیا گیا۔

اس ملازمت کے دوران ایشیائی ممالک کی ایک کانفرس بھی منعقد ہوئی۔ اقبال کو ٹیکنیکل کمیٹی کا چیئرمین مقرر کیا گیا۔ یہ اس کے لیے بہت بڑا اعزاز تھا۔ کانفرنس میں پیش کیے جانے والے تمام مقالات کی منظوری اسے دینا تھی۔ اسے محققین کے بھیجے ہوئے مقالات پڑھنے کا موقع ملا اور ایشیائی ممالک کے اسپیشل طلبہ وطالبات اور عام افراد کے مسائل سے آگاہی ہوئی۔

پنجاب یونیورسٹی کا شعبۂ خصوصی تعلیم کئی حوالوں سے ایک پالیسی ساز ادارہ بھی تھا۔ یہیں مختلف اداروں اور تعلیمی درجوں کے لیے پالیسی مرتب ہوتی تھی اور نصاب کا فیصلہ کیا جاتا تھا۔ اسے ان تمام امور میں شرکت کا موقع ملا۔ یہ تجربات اس کے مشن میں بہت مفید ثابت ہوئے اور ثابت ہوتے رہیں گے۔

یہ فیصلہ کیا جاچکا تھا کہ پی، ایچ، ڈی کی تدریس میں بھی اسے شامل کیا جائے گا لیکن اسے تو چلتے رہنا تھا۔ وہ ایک مرتبہ پھر سرگودھا جانا چاہتا تھا۔ اس نے استعفیٰ دے دیا۔ چیئرمین نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن سرگودھا میں

رے چارلس

رے چارلس نابینا تھا۔ وہ 1930ء میں جارجیا میں پیدا ہوا۔ اس نے میوزک انڈسٹری میں افریقی امریکن کے طور پر اپنا راستہ بنایا۔ وہ امریکا کا عظیم گیت نگار تسلیم کیا جاتا ہے جس نے موڈرن میوزک کا چہرہ تبدیل کیا۔

رے چارلس کی گرتی ہوئی بینائی سات سال کی عمر میں قطعی نابود ہوگئی۔ یہ چارلس کا کریڈٹ ہے کہ اس نے موسیقی کی اختراعی شکل نکالی۔ جاز، گوسپل، اور بلیوز کا امتزاج کیا۔

بینائی سے مکمل محرومی کے بعد اس نے بلائنڈ اسکول میں داخلہ لیا تاہم پندرہ سال کی عمر میں پڑھائی چھوڑ دی اور خود پر انحصار کرتے ہوئے موسیقی کی دنیا میں طوفان اٹھاتا رہا۔ ''اٹلانٹک ریکارڈز'' والوں کے ساتھ اس کی ڈیل تہلکہ خیز تھی۔ جہاں اس کے گیتوں نے ایک دنیا کو مست کردیا جیسے۔

"I've Got a Woman"
"Hit the Road, Jack"
"Georgia on my Mind"

رے کے بیشتر البم ''ملٹی پلاٹینم'' تھے۔ (یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ سرٹیفکشن سسٹم کے تحت سلور، گولڈ، پلاٹینم، ڈبل پلاٹینم اور ٹرپل پلاٹینم کا تعین فروخت پر کیا جاتا ہے۔

رے چارلس نے 13 گریمی ایوارڈ جیتے اور 1987ء میں لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ حاصل کیا۔ اس نے اپنی معذوری کو کامیابیوں کی راہ میں کبھی رکاوٹ نہیں بننے دیا۔ رے نے کالے گورے پر مبنی تعصب کی دیوار بھی گرائی۔

یہ انوکھا فنکار 2004 میں اس جہان فانی سے رخصت ہوا۔

مرسلہ: گلزار حسین، بھکر

بہت سے کام اس کے منتظر تھے۔
"ہمیں آپ کی بہت ضرورت ہے لیکن آپ نے سوچ سمجھ کر ہی فیصلہ کیا ہوگا۔ اس لیے میں اصرار بھی نہیں کرسکتا۔ تاہم آپ سے ہمیں بڑی توقعات تھیں۔" چیئرمین نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور وہ الوداعی تقریب میں شرکت کرکے سرگودھا آگیا۔

ایک کشش اور بھی تھی جو اسے سرگودھا کھینچ لائی تھی اور وہ یہ تھی کہ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی بن گیا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ یونیورسٹی آف سرگودھا سے وابستہ ہوجائے۔ سرگودھا میں رہنے کا موقع بھی مل جائے۔ سرگودھا کی کشش اسے لاہور میں رہنے نہیں دے رہی تھی۔

چیئرمین شہباز عارف سے ملاقات کی۔ وہ اسے جانتے تھے کیونکہ پنجاب یونیورسٹی سے سرگودھا آکر تعینات ہوئے تھے۔ انہوں نے خوش آمدید کہا۔ درخواست بھی لے لی اور وعدہ کیا کہ وہ اسے رکھ لیں گے لیکن دوسری ملاقات میں ان کا رویّہ بدل گیا۔

"مسٹر اقبال، یہاں سمسٹر سسٹم ہے۔ آپ اسائنمنٹ کیسے چیک کریں گے اور پھر یہ کہ آپ نے دیر کردی۔ ایم، اے کی کلاسز تو اساتذہ کو الاٹ ہوچکیں۔"

ان کے اس رویّے نے اسے حیران کردیا۔ معاً اسے خیال آیا کہ خفیہ ہاتھ کام کر گئے۔ وہ خاموشی سے اٹھا اور گھر چلا آیا لیکن یہ سوچتے ہوئے کہ میری کوششوں کے باوجود نابیناؤں کے بارے میں سماجی رویّے تبدیل نہیں ہوئے۔

اس کے بعد اس نے یونیورسٹی میں قدم نہیں رکھا۔ وقت گزر گیا۔ چیئرمین شہباز عارف سے ملاقات نہیں ہوئی۔ اسے خیال بھی نہیں آیا کہ ملاقات کی جائے۔

کم و بیش پانچ سال بعد 2007ء میں اس کے شعری مجموعے "یہ کافر دل نہیں مانا" کی تعارفی تقریب منعقد ہوئی۔ اس تقریب میں وائس چانسلر سرگودھا یونیورسٹی بھی شریک تھے۔ اقبال نے جب ان کی آمد کا اعلان سنا تو اپنی تقرری کا ناکامی کا خیال آگیا اور اس نے سوچ لیا کہ ان کی موجودگی کی فائدہ اٹھا کر کچھ باتیں دہرائے گا۔ جب اقبال تقریر کرنے کے لیے کھڑا ہوا تو دل کی بات زبان پر آگئی۔

"تمام تر کوششوں کے باوجود عوامی رویّوں میں کوئی تبدیلی نہیں آسکی ہے۔ عوام تو عوام خواص کے ذہن بھی تبدیل نہیں ہوئے۔ اب اسی کو دیکھ لیجیے کہ میں جس کالج میں تیس سال پڑھاتا رہا ہوں وہاں کی تقریبات تک میں مجھے نہیں بلایا جاتا۔ میں جب درخواست دیتا ہوں تو میرا تقرر یہ کہہ کر نہیں کیا جاتا کہ میں نابینا ہوں سمسٹر سسٹم میں چل نہیں سکتا۔ میں نے تحقیقی مقالہ تحریر کرکے پی، ایچ، ڈی کی ڈگری حاصل کرلی اور چیئرمین فرماتے ہیں میں اسائنمنٹ چیک کیسے کروں گا۔ مجھ سے یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ میں نااہل ہوں۔ قابلیت نہیں رکھتا لیکن افسوس کہ میری نابینائی کو جواز بنایا گیا جبکہ میں تو یہ بھی بھول چکا ہوں کہ میں نابینا ہوں۔ میری معذوری میرے کسی کام میں حارج نہیں ہوئی۔"

وائس چانسلر اس کے بارے میں پڑھے جانے والے مقالات بھی سن چکے تھے اور اب اس کے خیالات بھی سنے چنانچہ جب انہیں دعوتِ خطاب دی گئی تو اقبال کا قصیدہ ان کی زبان پر تھا۔

"میں حیرت زدہ ہوں کہ یونیورسٹی نے پروفیسر ڈاکٹر شیخ اقبال جیسی فعال اور متحرک علمی شخصیت سے استفادہ کیوں نہیں کیا۔ ہم انہیں شعبہ انگریزی میں تدریس کے لیے ایک کنٹریکٹ آفر کریں گے اور یہ ہمارے ہر علمی، ادبی پروگرام میں شرکت کریں گے۔"

چلتے چلتے انہوں نے وعدہ لے لیا۔ "آپ باقاعدہ درخواست تیار کریں اور مجھ سے میرے دفتر میں آکر ملیں۔"

وائس چانسلر صاحب کے اس اعلان کی گونج پنڈال تک محدود نہیں رہی تھی۔ یہ آواز یونیورسٹی پہنچی تو مخالفوں کے کان کھڑے ہوگئے۔ مخالفت کی ہوا پھر چلنے لگی۔

اقبال ابھی درخواست تیار کر ہی رہا تھا کہ گورنمنٹ کالج سرگودھا کے سابقہ پرنسپل صاحبزادہ عبدالرسول اس کے گھر ایک اہم اطلاع دینے آئے۔

"میں آپ کو ایک اہم اطلاع دینے آیا ہوں تاکہ اس روشنی میں آپ کوئی فیصلہ کریں۔"

"مجھے معلوم ہے یہ اطلاع کیا ہوگی پھر بھی آپ فرمائیں۔"

"شعبۂ انگریزی کے اساتذہ نہیں چاہتے کہ آپ ڈپارٹمنٹ سے پھر منسلک ہوں۔"

"شعبے کا چیئرمین تو میرا اپنا شاگرد ہے۔"

"میں نے جو بتانا تھا بتا دیا۔"

"مجھے بھی کوئی دلچسپی نہیں لیکن میں وائس چانسلر سے ملاقات ضرور کروں گا۔"

"آپ کی مرضی۔"

اقبال نے درخواست تیار کی اور اس طرح وائس چانسلر سے ملا جیسے اسے کچھ معلوم ہی نہیں۔

"سر، میں نے آپ کے حکم کے مطابق درخواست تیار کرلی ہے۔"

"بھئی، بات یہ ہے کہ میں نے اعلان تو کردیا تھا لیکن اب تک شعبۂ انگریزی کے اساتذہ سے گفتگو نہیں کرسکا ہوں۔ مجھے ازخود ہی خیال آیا کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کی تعیناتی پر شعبۂ انگریزی کے احباب ناپسندیدگی کا اظہار کریں۔ اب میں یہ چاہتا ہوں آپ شعبۂ اردو جوائن کرلیں۔ ہم آپ سے مغربی ادب اور اقبالیات کے حوالے سے استفادہ کرسکتے ہیں۔"

اقبال کو معلوم تھا کہ بات کیا ہوئی ہے لیکن اس نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا کریدنے کی کوشش نہیں کی۔ اسے اردو (ایم، اے) کے طلبہ کی تدریس کے لیے جزوقتی استاد کے طور پر مقرر کردیا گیا۔ پروفیسر ڈاکٹر اقبال نے پڑھانا شروع کردیا اور یہ سلسلہ تاحال جاری ہے۔

☆☆☆

سرگودھا میں کوئی باقاعدہ تنظیم نہیں تھی۔ کم از کم 1968ء تک کوئی تنظیم نہیں تھی۔ انفرادی کاوشوں سے مشاعرے منعقد ہوجاتے تھے۔ کبھی کسی کالج میں، کبھی اسکول میں، کبھی کسی کے گھر پر۔ اقبال نے جس وقت ادبی دنیا میں قدم رکھا اور مشاعروں میں شرکت شروع کی تو گورنمنٹ کالج سرگودھا میں اسٹڈی سرکل کے تحت ادبی پروگرام منعقد کرائے۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنی رہائش گاہ پر بھی ادبی محافل کا انعقاد شروع کیا۔ جب یہ محافل باقاعدہ آراستہ ہونے لگیں اور شہرت ہونے لگی تو وہ سوچنے لگا کہ باقاعدہ تنظیم قائم کی جائے اور اس کے تحت صرف علم و ادب ہی نہیں بلکہ تمام فنونِ لطیفہ کے فروغ کے لیے کوشش کی جائے۔

یہ خیال عرصے تک خیال رہا۔ تنظیمی امور کو چلانے کے لیے احباب کا تعاون ضروری تھا پھر نوجوان کا ایک گروپ اسے دستیاب ہوگیا۔ سرگودھا کے ابھرتے ہوئے نوجوان جو علم و ادب کا ذوق رکھتے تھے اس سے منسلک ہوگئے۔ اس میں ہر قسم کے نوجوان تھے، کچھ علم و ادب کے

گیلیو گیلیلی

گلیلیو کو "جدید سائنس کا باپ" کہا جاتا ہے۔ وہ اٹلی میں 1564ء میں پیدا ہوا۔ موجد اور فلاسفر تھا۔ وہ منفرد خیالات رکھتا تھا۔ اس کی بینائی متاثر ضرور تھی تاہم مکمل نابینا وہ "ہاؤس اریسٹ" کے دوران ہوا۔ باوجود اس کے اس نے لکھنے پڑھنے اور ایجادات کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس کے قوانینِ حرکت نے جدید سائنس کی تشکیل میں بہت مدد کی۔ کائنات میں زمین کے مقام کا تعین کیا اور یہی انکشاف کیتھولک چرچ سے برداشت نہ ہوا۔ گلیلیو کا کہنا تھا کہ سورج اور سیارے زمین کے گرد نہیں چکر لگا رہے بلکہ زمین اور سیارے سورج کے گرد چکرا رہے ہیں۔

اس دریافت نے ہمیشہ کے لیے خلائی تحقیق کا راستہ بدل دیا جبکہ چرچ نے اسے جرم قرار دیا اور گلیلیو کو مجبور کیا کہ وہ اپنے نظریات کی نفی کرے۔ اس نے جیل سے بچنے کے لیے خانہ محصوری کو ترجیح دی۔

اس کی مشہور ایجادات میں ٹیلی اسکوپ، تھرمامیٹر، اور کمپاس ہیں۔ 1642 میں فلورنس میں جب وہ گھر میں قید تھا، اس کا انتقال ہوا۔

مرسلہ: کفیل احمد، لاہور

رسیا، کچھ موسیقی سے شغف رکھنے والے، کچھ کا تعلق ڈرامے سے تھا چنانچہ ”بزمِ فکر و خیال“ کے نام سے ایک تنظیم وجود میں آگئی۔ بس پھر کیا تھا ہر مہینے اجلاس ہونے لگے۔ ہر اجلاس کا دورانیہ ساڑھے تین گھنٹے ہوتا تھا جس میں خاص طور پر ایک مجلسِ مذاکرہ منعقد کی جاتی تھی۔ سرگودھا کے لیے یہ ایک نئی چیز تھی۔ علمی ادبی تخلیقات بھی تنقید کے لیے پیش کی جاتی تھیں۔ حلقہ اربابِ ذوق کی تنقیدی نشستوں کا لطف سرگودھا میں آگیا۔ محافلِ موسیقی اور محافلِ مشاعرہ بھی برپا کی جانے لگیں۔

اس تنظیم کو سرگودھا کے گمنام فنکاروں تک ہی محدود نہیں رکھا گیا بلکہ بڑے بڑے قد آور شعرا کو بھی وقتاً فوقتاً مدعو کیا گیا۔ سید ضمیر جعفری، پروفیسر پریشان خٹک، ڈاکٹر وزیر آغا، حفیظ تائب، طفیل ہوشیار پوری، خالد اقبال یاسر، عرش صدیقی جیسے قد آور شریک ہوئے۔

سیکڑوں تنظیمیں بنیں اور ٹوٹیں لیکن بزمِ فکر و خیال کا چراغ بدستور روشن ہے۔ پروفیسر اقبال کے الفاظ میں۔

”ابھی چند روز پہلے 14 اگست 2009ء کو اس کا اجلاس 121 منعقد ہوا۔ ہم نے بہت سے لکھنے والوں کو متعارف کروایا ہے اور بہت سے ایسے احباب جو پردۂ گمنامی میں چلے گئے تھے ان میں پھر ایک نئی زندگی بھر دی ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ سرگودھا میں یہ میری ادنیٰ سی علمی ادبی کاوش ہے جو میرے لیے طمانیت کا باعث ہے۔ اس کاوش نے مجھے کئی پُرسکون لمحے دیے ہیں اور میری اس خواہش کی تکمیل کی ہے کہ ہمیں کچھ نہ کچھ انفرادی کاوش کرتے رہنا چاہیے۔

بزمِ فکر و خیال سرگودھا ایک ادارہ ہے اور میری خواہش ہوگی کہ اسے مضبوط تر ہونا چاہیے۔ میری زیادہ خواہشیں پوری ہوئی ہیں شاید اس لیے کہ میں نے عمل کو وظیفۂ حیات بنائے رکھا ہے اور محض خیالی طوطے مینا بنانے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنی خواہشوں کی تکمیل کے لیے وہ سب کچھ کیا ہے جو میں کرسکتا ہوں۔“

☆☆☆

پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال اپنی نجی زندگی بھی نہایت کامیابی سے گزار رہے ہیں۔ اہلیہ سے ان کی فکری ہم آہنگی نہیں ہوسکی لیکن اس نے گھر کو خوب سنبھالا اور بچوں کی تربیت میں ہاتھ بٹایا۔

ان کی بڑی بیٹی سرگودھا کے ایک گورنمنٹ اسکول میں ٹیچر ہے اور چھوٹی بیٹی گورنمنٹ ڈگری کالج فار ویمن ماڈل ٹاؤن، لاہور میں انگریزی کی لیکچرار ہے اور بیٹا تابش اقبال کلر کہار میں ایک ملٹی نیشنل فرانسیسی کمپنی لفارج کی سیمنٹ فیکٹری میں سینئر انجینئر ہے اور بہو نازیہ تابش ڈاکٹر ہے۔

”زندگی کے سفر میں میری اہلیہ مشرقی خاتون کا بھرپور کردار ادا کرتی رہیں۔ گو میں انہیں اپنا ہم خیال اور ہم مشرب نہ بنا سکا لیکن انہوں نے گھریلو نظم و ضبط میں میری بے پناہ اعانت کی۔ بچوں کی تربیت میں بہت سے مسائل حائل ہوتے ہیں لیکن الحمد للہ سب خوش اسلوبی سے حل ہوئے۔ بھائی بہن زندگی کے جھمیلوں میں الجھے رہے۔ رشتے دار اپنے کاموں میں منہمک رہے۔ والد صاحب نے تعلیمی زندگی میں بے پناہ کردار ادا کیا لیکن پھر بہت سی غلط فہمیوں نے خوف ناک صورت اختیار کرلی پھر آہستہ آہستہ سب کچھ نارمل ہوگیا اور دس پندرہ سالوں سے والد صاحب کی دعائیں پھر مجھے حاصل ہیں۔“

☆☆☆

دیکھا جائے تو پروفیسر شیخ محمد اقبال اور مصری دانشور ڈاکٹر طٰہٰ حسین میں بے پناہ مماثلت دکھائی دیتی ہے۔ فرق ہے تو اتنا کہ وہ ایک ایسی قوم میں پیدا ہوا جس نے اس نابغہ روزگار پر تحسین و اعتراف کے پھول برسائے جبکہ ہمارے سماجی رویوں کے باعث ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کی خاطر خواہ پذیرائی نہ ہوسکی۔ اس نے جو کام کیے وہ بینا لوگوں نے بھی نہیں کیے۔ شاید کسی کو خیال آئے۔

شاید کوئی بندۂ خدا آئے
صحرا میں اذان دے رہا ہوں
(سلیم احمد)

☆☆

عمر بھر رنگ زندگی میں بھرے
میرے نقاد بے بصر نکلے
(شیخ محمد اقبال)

شیخ محمد اقبال ابھی زندہ ہیں اور ہمیں ان سے مزید امیدیں ہیں۔ اللہ انہیں مزید ہمت دے۔ (آمین)

ماخذات

پردۂ سیمیں سے، پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال
مری دستک (جنوری، فروری 2008ء)
پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال نمبر

بینائی نہ ہوتے ہوئے بھی اس نے مشعلِ راہ بن کر دکھایا

ابن کبیر

مشعلِ راہ

اپنے اسی شہر کراچی کے ایک نوجوان کا تذکرہ جس نے معلوماتِ عامہ میں ملک گیر شہرت حاصل کی اور بینا افراد کو ہر قدم پر شکست دی۔ اس نے ایسے علمی کارنامے انجام دیے جنہیں دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ انسان میں لگن ہو عزمِ مصمّم ہو تو کوئی رکاوٹ آڑے نہیں آسکتی۔ پی ٹی وی کے مشہورِ زمانہ کوئز پروگرام نیلام گھر میں کار جیت کر اس نے ثابت کردیا تھا کہ وہ معلومات کا چلتا پھرتا خزانہ ہے۔

بلا کی گرمی۔ حبس ایسا کہ دم گھٹنے لگتا۔ تپش ایسی کہ بدن پر کوڑے برستے محسوس ہوتے۔

یہ سندھ کے قدیم شہر سکھر کا ذکر ہے، جہاں موسم گرما میں تپتا سورج شہر پر طلوع ہوتا اور موسم سرما میں کمبل ٹھنڈ سے محفوظ رکھنے میں ناکام رہتے ہیں۔ سکھر کے باسی موسموں کی شدت کے عادی ہیں، موسمی حملے ان کی زندگی کا حصہ ہیں، مگر اُس دوپہر... سورج کے ارادے مختلف تھے۔ وہ اُن کی عادت کی پختگی کا امتحان لینا چاہتا تھا۔ اِسی لیے کچھ نیچے اتر آیا۔

دوپہر کیا آئی، شہر تنور بن گیا۔ تپش نے بازار ویران کر دیے۔ گھر کی دیواروں کو حدت سے بھر دیا اور شہریوں کو ایک ایسی کیفیت میں دھکیل دیا جسے اکتاہٹ ہی کہا جاسکتا ہے۔

ایسی گرمی میں گھنے درختوں کی چھاؤں کسی نعمت سے کم نہیں۔ اور اگر درختوں کی قطار کے ساتھ دریا بہتا ہو تو انسان خود کو جنت میں محسوس کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ کئی شہری دریا کی سمت چلے آئے تھے جہاں پُرسکون چھاؤں تلے وہ گرمی کو بھلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ کئی بچے بھی وہاں تھے جو کنارے پر بیٹھے چھینٹیں اُڑا رہے تھے۔

دس سالہ نسیم بھی بچوں کی اس ٹولی میں شامل تھا۔ اس کی نظریں پانی پر جھلملاتی روشنیوں پر ٹکی تھیں جن میں رنگ تیر رہے تھے اور سماعتوں میں دریا کی گنگناہٹ رس گھول رہی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر گھنے درخت کی سمت دیکھا جس کی توانا شاخوں پر پرندے چہچہا رہے تھے۔

خوشی کا غیر مرئی مگر توانا احساس اس کے بدن میں ہمکنے لگا۔ چہرے پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ وہ مسرور تھا کیونکہ وہ دیکھ سکتا تھا۔ قدرت کی رنگینیاں سامنے تھیں۔

اگرچہ اس نے شعور کی دہلیز عبور کرنے کے بعد کبھی بے نگہی کا تجربہ نہیں کیا تھا مگر اِسے علم تھا کہ پیدائش کے وقت وہ ایک المیے کا شکار تھا۔

معصوم شاہ کے مینار سے کچھ دور وہ سرکاری اسپتال تھا جہاں نسیم نے یکم جولائی 1962 کو آنکھ کھولی۔

آنکھیں... آہ یہی تو اُس کا المیہ تھا۔ معالجین کی تشخیص سے پتا چلا کہ نومولود کی آنکھیں ایک مرض کا شکار ہیں۔ ایسا مرض جو دھیرے دھیرے بینائی چھین لیتا ہے۔

یہ خبر نسیم کے والد سید صلاح الدین پر بجلی بن کر گری مگر خود کو سنبھالنا ان کے لیے لازم تھا۔ یہ وقت تقدیر پر رونے کا نہیں بلکہ تدبیر کرنے کا تھا۔

صلاح الدین کا تعلق بھارتی صوبے بہار کے ایک شہر بہار شریف سے تھا۔ ہجرت کے بعد اُن کے اہلِ خانہ نے کراچی میں ڈیرے ڈالے، مگر معاش کی تلاش اُنہیں لاڑکانہ لے آئی جہاں سے انہوں نے سکھر کا رخ کیا۔ ابتداً ایک ڈسپنسری میں کام کرتے رہے، پھر ایک نجی ادارے میں اکاؤنٹنٹ ہو گئے۔ خدا نے اُنہیں تین بیٹوں، تین بیٹیوں سے نوازا۔ نسیم اُن کی چھٹی اولاد تھی، سب سے چھوٹا بیٹا۔

متوسط گھرانے کے سربراہ پر کتنی ذمّے داریاں ہوتی ہیں۔ گھر چلانا، بچوں کی پرورش، دیگر ضروریات... ایسے میں بیماری کسی افتاد سے کم نہیں ہوتی مگر صلاح الدین ایک باہمت انسان تھے۔

اُنہوں نے نسیم کے علاج پر خصوصی توجہ دی۔ ڈاکٹروں کے مشوروں پر عمل کیا۔ دوا وقت پر دی۔ اور دھیرے دھیرے اِن کوششوں کے نتائج سامنے آنے لگے۔ پھر اُن کی معالج کے روپ میں ایک فرشتے سے ملاقات ہوئی۔

ڈاکٹر ایم پی منہاس ایک جانے مانے ماہر امراضِ چشم تھے۔ خدا نے ان کے ہاتھ میں شفا دی تھی۔ کراچی کے ایک اسپتال میں انہوں نے ننھے نسیم کے کئی آپریشنز کیے جس سے اُس کی بینائی پوری طرح لوٹ آئی۔

الغرض جب شعور کی آنکھ کھولی، دنیا تمام تر رنگینوں کے ساتھ اُس کے سامنے دمک رہی تھی۔ زندگی اس کی دوست تھی جس نے اسے اپنے شہر کے گلی کوچوں سے آشنائی بخشی۔

کھیتوں کھلیانوں کے درمیان آباد سکھر گو ایک شہر تھا مگر اس کے ماحول میں سادگی کی خوشبو تھی۔ دیہی بے ساختگی تھی۔ وہاں ہندوستان سے ہجرت کرنے والوں کی اکثریت آباد تھی۔ بیش تر افراد تجارت پیشہ تھے۔ البتہ ملازمت کرنے والوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ مکانات کشادہ تھے۔ گلیاں کھلی کھلی تھیں اور سڑکیں پکی اور صاف جن پر تانگے چلا کرتے۔

اور جب بھی سڑک پر گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز گونجتی، سفر کی خواہش نسیم کے دل میں مچلنے لگتی۔ متعدد بار اس نے تانگے کا سفر کیا جس سے جڑی حسین یادیں ذہن میں نقش ہو گئیں۔

چونکہ عزیز و اقارب کراچی میں تھے، اس لیے ہر برس شہر قائد کا ایک چکر ضرور لگتا۔ اور یہ سفر بہ ذریعہ ریل طے ہوتا، جس کے پٹری پر دوڑتے پہیوں کی گڑگڑاہٹ اور کھڑکی سے دکھائی دینے والے مناظر دل میں جگہ بنا لیتے۔

نسیم شرارتی اور فعال تو تھا ہی، بذلہ سنج بھی واقع ہوا تھا۔ باتوں میں کوئی اس سے جیت نہیں پاتا۔ لمحوں میں محفل کو زعفران بنا دیتا۔ پُراعتماد ایسا کہ کوئی سامنے نہیں ٹھہر سکتا۔ البتہ متحرک ہونے کے باوجود اس نے تہذیب کی حد کبھی عبور نہیں کی۔ کبھی کسی سے بدتمیزی نہیں کی۔ بزرگوں کا ہمیشہ احترام کیا۔ یہی وجہ ہے کہ شرارتوں نے کبھی شکایات کی شکل اختیار نہیں کی۔ کبھی کسی شخص نے اس کے والد کو راستے میں روک کر اُن کے سپوت کے کارناموں سے آگاہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ نسیم اپنی فعال طبیعت اور جملے بازی کے باوجود سزا کی عفریت سے محفوظ رہا۔

مختصر یہ کہ زندگی پوری طرح سانس لے رہی تھی جس سے لطف اندوز ہونے کے لیے وہ اس دوپہر جب تپش بدن پر کوڑے کی طرح برستی تھی، دوستوں کے ساتھ دریا کی سمت چلا آیا۔ اور اب گھاٹ پر بیٹھا فطرت کے رنگوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اِس بات سے لاعلم کہ ایک سانحہ اُس کی سمت بڑھ رہا ہے۔

☆☆☆

73ء کا سال اُس کی جیون کہانی پر تاریکی کی مہر ثبت کر گیا! موسم گرما میں اسے شدید بیماری نے آلیا۔ کمر بستر سے لگ گئی۔ جسم گھلنے لگا۔ شرارتیں کافور ہو گئیں۔

تشخیص سے پتا چلا کہ وہ ٹائیفائڈ میں مبتلا ہے۔ اس مرض کا تو علاج ہو جاتا مگر یہ تنہا نہیں آیا تھا، اس کے ساتھ تاریکی کا پھنکارتا ناسور بھی تھا۔

بیماری کے دنوں میں نسیم کی آنکھوں میں تکلیف رہنے لگی۔ روشنی گھٹنے لگی۔ ڈاکٹروں نے انکشاف کیا کہ وہ دھیرے دھیرے اندھے پن کی سمت بڑھ رہا ہے۔

"آنکھوں میں کالا پانی (گلوکوما) اتر آیا ہے۔" ڈاکٹر نے اس کے والد سے کہا۔ "دواؤں سے بھی علاج ہو سکتا ہے مگر یہ بہت وقت طلب ہے۔ میں آپریشن کا مشورہ دوں گا۔"

اس خبر نے اہلِ خانہ پر یاسیت طاری کر دی۔ فوراً ڈاکٹر منہاس سے رابطہ کیا گیا جو ان دنوں بہت ضعیف ہو چکے تھے۔

"آپریشن مت کروائیں۔" انہوں نے کھانستے ہوئے کہا۔ "دوا استعمال کرتے رہیں۔ بینائی جہاں ہے، وہیں رک جائے گی۔"

نسیم کے والدین اس مشورے پر عمل کرنے کو تیار تھے کہ ناصح بیچ میں آگئے۔ کسی اور ماہرِ چشم سے رابطہ کرنے کا مشورہ دیا گیا۔

ڈاکٹر منہاس کے برعکس دیگر معالجین کا خیال تھا کہ آپریشن سود مند ثابت ہوگا۔ بالآخر اُس کے والد نے رضامندی ظاہر کر دی۔

ننھا نسیم آپریشنز کے مراحل سے گزرا، جن میں سے آخری آپریشن کراچی کے ایک بڑے اسپتال میں ہوا جس نے اس کی زندگی پر تاریکی کی دبیز چادر ڈال دی۔

آپریشن کے بعد جب اس کی آنکھوں سے پٹی ہٹی، اُس کی دنیا بے نور ہو چکی تھی۔

"اف، یہ کیا ہو گیا!" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

اہلِ خانہ دکھی تھے، بے حد دکھی۔ مگر انہیں اپنا غم چھپائے رکھنا تھا۔ نسیم کو سنبھالنا تھا۔

باپ نے آگے بڑھ کر بیٹے کا ہاتھ تھام لیا۔

"انسان کو جواں مردی کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرنا چاہیے۔" سید صلاح الدین نے اپنا غم چھپاتے ہوئے کہا۔ "ہر مرحلے پر۔"

نسیم چپ رہا۔ بالکل چپ۔

☆☆☆

گو آنکھوں کے آگے تاریکی چھائی تھی مگر سماعت محفوظ تھی۔ اور جب قرآنی آیات سماعتوں میں اترتیں تو اسے زندہ ہونے کا احساس ہوتا۔ ایسا احساس جو قرآن حفظ کرنے کی خواہش کے لیے مہمیز کا کام کرتا۔

نسیم نے اِس پاکیزہ سلسلے کا آغاز اوائل عمری میں کر دیا تھا۔ اُس زمانے میں جب آنکھوں میں روشنی تھی۔

دراصل اس کے والدین کی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا قرآن پاک کا حافظ بنے۔ یہی خواہش اُسے مدرسہ مدینتہ العلوم لے گئی جہاں اسے حافظ سکندر علی کی راہ نمائی میسر آئی۔

حفظ کے قوائد کے مطابق سفر جاری تھا کہ بینائی سے محرومی کا سانحہ پیش آگیا۔ کوئی اور ہوتا تو شاید ٹوٹ جاتا، مگر باہمت نسیم نے بڑی جرأت کے ساتھ یہ سفر جاری رکھا۔ گھر والوں نے بھرپور ساتھ دیا، اساتذہ کی سرپرستی بھی جاری رہی۔ ہاں، اب طریقۂ تدریس بدل گیا تھا۔ پہلے دیکھ کر پڑھا کرتا تھا، اب دوسروں سے سن کر آیات ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتا۔ خوش قسمتی سے استاد بھی انتہائی نفیس تھے جنہوں نے سختی برتنے کی بجائے محبت اور شفقت سے کلام اللہ پڑھایا۔ خدا نے اچھی یادداشت دی تھی۔ یوں وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھتا رہا اور 28 جون 1976 کو حفظِ قرآن کا خوش گوار مرحلہ بھی طے ہو گیا۔

کس قدر مسرور دن تھا وہ۔ گھر میں شادمانی کا سماں تھا۔ ہر چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ سید صلاح الدین کی آنکھوں کی چمک تو دیدنی تھی۔ آج اُن کی خواہش پوری ہو گئی تھی۔

شاید یہی منظر دیکھنے کے لیے وہ زندہ تھے۔ جوں ہی نسیم نے حفظِ قرآن کا مرحلہ طے کیا... اُنہوں نے رخصتی کا سامان

باندھ لیا۔

☆☆☆

وہ 30 جولائی کی خاموش صبح تھی۔ حفظِ قرآن کی خوش کن تقریب کو تقریباً ایک ماہ ہی گزرا تھا۔ صلاح الدین ہاتھ منہ دھو کر غسل خانے سے نکلے تو نظر سامنے والے زیرِ تعمیر مکان پر پڑی، جس کے مزدوروں نے ملبا ان کے گھر کے آگے ڈال دیا تھا۔ انہوں نے مزدوروں کو مخاطب کرتے ہوئے ملبا ہٹانے کے لیے کہا۔ ”ابھی یہاں سے لوگ آئیں گے جائیں گے، انہیں پریشانی ہوگی۔“

مزدوروں کے لیے یہ بات حیران کن تھی۔ گلی میں زیادہ چہل پہل نہیں تھی، پھر محلے میں کسی تقریب کا اہتمام بھی نہیں کیا گیا تھا، لوگوں کی آمد لگ بھگ غیر متوقع تھی مگر صلاح الدین صاحب کی بات درست ثابت ہوئی۔

ناشتا کرتے ہوئے انہوں نے سینہ تھام لیا۔ گھر والوں کے اوسان خطا ہوگئے۔ فوراً ڈاکٹر کو بلوایا گیا، جس کا معائنہ اچھی خبر نہیں لایا۔ ان کا انتقال ہو چکا تھا۔

اور تب گلی میں کام کرنے والے مزدوروں پر یہ عقدہ کھلا کہ سید صلاح الدین کے الفاظ کا کیا مطلب تھا۔

باپ سے جدائی کا غم کس قدر گہرا ہوتا ہے، اس کا اندازہ تو کرب سہنے والا ہی لگا سکتا ہے۔ الفاظ میں یہ کرب بیان نہیں ہو سکتا۔ نسیم پر اس واقعے نے گہرے اثرات مرتب کیے۔ سایۂ پدری سے محرومی کے بعد آنکھوں کے سامنے چھائی تاریکی مزید گہری ہوگئی۔ ہر احساس غم کے آنسوؤں سے بھیگ گیا، مگر پھر... اُسے اپنے والد کی نصیحت یاد آئی۔ ”انسان کو جواں مردی کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرنا چاہیے۔“

یادوں کا نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہوگیا۔ وہ دن یاد آئے، جب بینائی سے محرومی کے بعد باپ نے اس کا کاندھا تھپکا تھا، حوصلہ افزائی کی تھی۔

آنسو تھم گئے۔ اب اسے حالات کا مقابلہ کرنا تھا، جو بلاشبہ کٹھن تھے مگر وہ بھی عام انسان نہیں تھا۔ قدرت نے اسے آگے بڑھنے کی حیران کن قوت عطا کی تھی۔

☆☆☆

سربراہ رخصت ہو جائے تو کنبہ غم میں ڈوب جاتا ہے اور اسی غم کے بھنور سے معاشی مسائل جنم لیتے ہیں۔ ایسے مسائل جن کی شدت انسان کو توڑ دیتی ہے۔ یاسیت کی کھائی میں دھکیل دیتی ہے۔

نسیم کے گھرانے کو بھی اسی قسم کی صورتِ حال درپیش تھی۔ کفالت کی ذمے داری اب بڑے بھائی پر آن پڑی تھی جس نے کچھ عرصے قبل عملی زندگی میں قدم رکھا تھا اور ان دنوں سعودی عرب میں مقیم تھا۔

والد کے انتقال کا سانحہ ہی ہجرت کا سبب بنا۔ سید صلاح الدین کے خاندان کو سکھر چھوڑنا پڑا کہ اب وہاں اپنا کوئی نہیں تھا۔ سارے رشتے دار کراچی میں تھے، مناسب یہی تھا وہاں سکونت اختیار کی جائے۔

سامان باندھا گیا۔ ٹرین کے ٹکٹ بک کروائے گئے اور نم آنکھوں کے ساتھ 5 اگست 1976 کو سکھر کو الوداع کہہ دیا گیا۔

نسیم پہلے بھی متعدد بار ٹرین کا سفر کر چکا تھا۔ ٹرین سکھر سے روانہ ہوتی تو مختلف جنکشنوں سے ہوتی ہوئی کراچی کے کینٹ اسٹیشن پہنچتی تھی، مگر یہ سفر ماضی کے ہر سفر سے مختلف تھا۔ اس میں جدائی کا احساس تھا، اس موسم سے محرومی کا غم تھا جس کی شدت انسان کو نڈھال کر دیا کرتی ہے۔

ٹرین سیٹی بجاتی ہوئی پٹری پر دوڑ رہی تھی۔ سکھر پیچھے رہ گیا تھا، بہت پیچھے۔ کراچی قریب آتا جا رہا تھا اور نسیم کے ذہن کے پردے پر ایک فلم چل رہی تھی۔ ایسی فلم جسے وہ دیکھ سکتا تھا... آنکھیں ضرور بے نور ہو چکی تھیں لیکن تخیل تو روشن تھا۔ وہ اپنے لیے نئی دنیا تخلیق کر سکتا تھا۔ ایسی دنیا جہاں رنگ ماند نہیں پڑتے، جہاں دریا کے پانی پر روشنی جھلملاتی، معصوم بچے پانی میں چھینٹیں اڑاتے۔

کراچی آمد کے بعد اس گھرانے نے فیڈرل بی ایریا میں رہائش اختیار کی۔

نیا ٹھکانا، نیا ماحول۔ اگرچہ اس وقت کراچی آج کی طرح گنجان نہیں تھا۔ فضا بھی آلودگی سے پاک تھی، البتہ اس کا سکھر کی آب و ہوا میں تیرتے دھیمے پن سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا تھا، جہاں کھیت کھلیانوں کی چہک کھلی کھڑکیوں سے مکانوں میں در آتی، علی الصباح پرندے گیت گاتے۔ تانگے میں سوار ہوتے ہی فاصلے مٹ جاتے۔ اب تو وہ سب قصۂ پارینہ بن چکا تھا۔ اب اسے اپنی زندگی ایک بڑے شہر میں گزارنی تھی جہاں فاصلے میلوں طویل تھے، جس کی فضاؤں میں آلودگی کی سیلن تھی، جہاں درختوں کی جڑیں دھیرے دھیرے سکڑ رہی تھیں۔

مگر نسیم کے پاس حالات سے سمجھوتا کرنے کے سوا کوئی

چارہ نہیں تھا۔

☆☆☆

وہ حافظِ قرآن تھا، خدا نے زبردست یادداشت عطا کی تھی، پھر تخیلاتی پرواز کی قابلیت بھی تھی، ضرورت فقط صحیح راہ چننے کی تھی۔ ایسی راہ جو اسے تاریکی سے نکال کر روشنی میں لے آئے۔

تخیل کی دنیا میں اس نے روشنی کا تعاقب شروع کیا، جس نے اسے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی راہ سجھائی۔ ارادہ باندھ لیا تو قدرت بھی مدد کرنے کے لیے آگے بڑھی۔

اُس کے ایک پھوپا تھے، جن کا اپنا بھائی نسیم الدین کے مانند نابینا تھا۔

اُن صاحب نے اپنے بصارت سے محروم بھائی کو ہندوستان میں نابینا افراد کے لیے مخصوص ایک درس گاہ سے تعلیم دلوائی تھی۔ جب ان کے کانوں میں نسیم کے ارادوں کی بھنک پڑی تو انہوں نے اس نوجوان کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

پھوپا ہی کے توسط سے نسیم کو نمائش کے علاقے میں واقع، انگریز سرکار کے زمانے میں قائم ہونے والے آئیڈا ریو نامی اسکول میں داخلہ ملا۔

اس ادارے کی بنیاد 1922 میں نابینا افراد کے لیے رکھی گئی تھی اور یہ اس وقت کے کمشنر کراچی کی بیوی کے نام سے موسوم تھا۔ بعد میں دیگر معذور بچوں کی تدریس کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا۔ جب 1979 میں نسیم نے اُس ادارے میں قدم رکھا، وہاں فقط نابینا بچے ہی زیرِ تعلیم نہیں تھے، بہرے اور گونگے طلبا بھی اکتسابِ علم کر رہے تھے۔

وہاں انوکھے تجربات منتظر تھے۔ ذہین وہ تھا، پھر عمر بھی سترہ برس تھی۔ پہلی جماعت میں داخلہ لینے کی ضرورت نہیں تھی۔ ابتدائی جماعتوں کی اس نے خود ہی تیاری کر لی۔ ٹیسٹ بھی پاس کر لیا۔ اسکول میں اسے آٹھویں جماعت میں داخلہ ملا۔

گو فرانس سے تعلق رکھنے والا لوئی بریل 19 ویں صدی کے اوائل میں نابینا افراد کی تدریس کے لیے ایک منفرد نظام وضع کر چکا تھا، جسے بریل سسٹم کہا جاتا ہے، مگر ترقی یافتہ ممالک کے برعکس ترقی پذیر ممالک اِس منفرد ایجاد سے بھرپور انداز میں استفادہ نہیں کر سکے۔ پاکستان بھی ان ممالک کی فہرست میں شامل تھا۔ بریل سسٹم خاصا مہنگا تھا۔

آئیڈا ریو اسکول میں بھی تمام کتابیں بریل سسٹم میں نہیں تھیں۔ لیکن وہ کہتے ہیں ناں، ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ اس مسئلے کا حل نکال لیا گیا تھا، جو کچھ یوں تھا کہ

اساتذہ بہ آوازِ بلند بچوں کو کتابیں پڑھ کر سنایا کرتے۔ پھر طلبا پورے پورے اسباق ریکارڈ بھی کروا لیتے، جنہیں وہ بعد میں گھر پر بیٹھ کر ٹیپ پر سنا کرتے۔

پڑھائی کے ساتھ نسیم کے لیے بسوں کا سفر بھی کم دلچسپ نہیں رہا۔ اب تو ٹریفک خاصا بے ہنگم ہو چکا ہے۔ نابینا افراد کے لیے یہ ایک پُرخطر راہ ہے، مگر اُس وقت ٹریفک کا دباؤ خاصا کم تھا۔ لوگ بھی ملنسار تھے، پھر نسیم کے حوصلے بلند تھے۔ پہلی بار اس نے تنہا ہی سفر کیا، جس کے دوران خوف حملہ آور نہیں ہوا کہ اس کے ہاتھ میں اعتماد کی ڈھال تھی۔

مشق سے دھیرے دھیرے پختگی آتی گئی۔ بھاگ کر بس میں سوار ہونے کا ہنر اس نے سیکھ لیا۔ چلتی ہوئی گاڑی سے اترنے میں بھی مہارت حاصل کر لی۔ سماعت اور چھٹی حس بھی اتنی ترقی یافتہ ہوگئی کہ منزل کے قریب پہنچ کر احساس ہو جاتا کہ بس سے اترنے کا وقت آن پہنچا ہے۔

بسوں کے سفر نے تاریکی میں گھرے نسیم کو حقیقی زندگی سے جوڑ دیا۔ ہر طرح کے لوگ ملے اُسے۔ چند ایسے جو ہمدردی کا اظہار کرتے، حوصلہ افزائی کرتے اور چند ایسے جو نابینا شخص کو دیکھ کر بھی سیٹ چھوڑنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔

نسیم نے ان باتوں کا کبھی برا نہیں منایا۔ اگر وہ یونہی جلتا کڑھتا رہتا تو آنکھوں کے سامنے چھائی تاریکی کی چادر اور بھی دبیز ہو جاتی۔

بسوں کا سفر اور حادثات کا چولی دامن کا ساتھ ہے، مگر خوش قسمتی سے نسیم حادثات سے محفوظ رہا۔ ہاں، ایک بار صدر کے علاقے میں بس سے اترتے ہوئے ڈرائیور کی پُرخطر جلد بازی کی وجہ سے اس کا پیر رپٹ گیا تھا۔ اگلے ہی لمحہ وہ سڑک پر تھا۔ اس سے پہلے کہ کچھ سمجھ پاتا، توانا ہاتھوں نے گھسیٹ کر پیروں پر کھڑا کر دیا۔ بعد میں پتا چلا کہ اس کے اور بس کے پہیے میں فقط چند انچ کا فاصلہ تھا۔

ایک لمحے کی بھی دیر ہو جاتی تو وہ اس جہانِ فانی سے کوچ کر چکا ہوتا۔

☆☆☆

بس میں لٹک کر اسکول پہنچنے کا عمل جہاں تجربات سے بھرپور تھا، وہیں اسکول کا ماحول بھی تجسس کو بڑھاوا دیتا۔ اپنے جیسے لوگ۔ سانجھا غم، سانجھی خوشیاں۔

نسیم نے دل لگا کر پڑھائی کی۔ بریل طرزِ تحریر کو سمجھنے

میں تین دن لگے۔ جلد ہی اس سے دوستی ہوگئی۔ چند ہی روز میں بریل میں نوٹس بھی بنانے لگا۔

اساتذہ کے لیکچرز اور ریکارڈ کردہ کتابیں سن سن کر دھیرے دھیرے سماعت کی بھی تربیت ہوگئی۔ اب جو سنتا، ذہن میں بٹھالیتا۔

وقت تیزی سے گزرتا رہا اور امتحانات سر پر آگئے۔ مگر یہ مرحلہ بھی نسیم نے بہ آسانی طے کرلیا۔ امتحانات میں نابینا امیدواروں کو بورڈ کی جانب سے "رائٹر" ملا کرتا تھا، جو امتحان دینے والے کی ذہنی استعداد سے کم درجے کا ہوتا۔

جس برس نسیم نے امتحان دیا، حکومت کی جانب سے نابینا افراد کو یہ سہولت دی گئی تھی کہ وہ پرچے پر "بلائنڈ امیدوار" لکھ دیں، تاکہ پرچے چیک کرنے والا املا کی غلطیاں درگزر کر دے، مگر یہ فیصلہ فقط ایک برس برقرار رہا۔

سبب واضح تھا۔ رجسٹرڈ نابینا طلبا کی تعداد صرف دو یا تین ہی تھی اور ڈیڑھ ہزار پرچوں پر "نابینا امیدوار" کے الفاظ دمک رہے تھے۔ یوں تن آسانی کے خواہش مند چند کاہل افراد کی وجہ سے نابینا افراد ایک بڑی سہولت سے محروم ہوگئے۔

اس فیصلے کی منسوخی کے بعد نسیم نے سوچا۔ "کیا ہی اچھا ہوتا کہ امیدوار کی بجائے ممتحن خود پرچے پر نابینا امیدوار لکھ کر اس پر سرکاری مہر لگا دیتا۔ جھگڑا ہی ختم ہوجاتا۔"

بدقسمتی سے اربابِ اختیار نسیم جتنے ذہن نہیں تھے۔ اس لیے اس جانب توجہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔

82ء میں اس نے کراچی بورڈ سے میٹرک کا مرحلہ طے کیا۔ کتنا خوشگوار لمحہ تھا۔ وہ انتہائی مسرور تھا۔ ہواؤں میں اُڑ رہا تھا۔ ایک دشوار گزار گھاٹی عبور ہوچکی تھی۔

☆☆☆

حصولِ علم کی خواہش قابلِ تحسین ہے مگر انسان کے ساتھ پیٹ بھی تو لگا ہوا ہے۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ ہو تو غریب آدمی کے لیے تعلیم جاری رکھنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

نسیم خوش قسمت تھا کہ اسے اچھے لوگ ملے جنہوں نے اس کے جذبے کی قدر کی۔ بھرپور تعاون کیا۔

میٹرک کے فوراً بعد اُسے سابق ایڈیٹر جاسوسی ڈائجسٹ پبلیکیشن صفیہ ملک کے توسط سے اکاؤنٹنٹ جنرل سندھ میں ٹیلی فون آپریٹر کی ملازمت مل گئی۔

اب وہ پانچویں گریڈ کا ملازم تھا۔ دن کرسی پر بیٹھ کر گزرنے لگے۔ میز پر اسٹینو ٹیلی فون دھرا ہوتا۔ فون بجتا تو ریسیور اٹھالیتا۔ ہدایت ملتی تو نمبر ڈائل کر دیتا۔

اُس کی تنخواہ 670 روپے تھی جو اس وقت کافی معلوم ہوتی۔ ایک حصہ والدہ کے حوالے کر دیتا۔ فیس کی ادائیگی بھی اسی رقم سے ہوتی، دوستوں کے ساتھ سیر سپاٹے کا موقع مل جاتا۔ اِس کے باوجود مہینے کے آخر میں تیس چالیس روپے بچ ہی جاتے۔

ملازمت کے ساتھ تدریس کا عمل جاری رہا۔

داخلہ تو گورنمنٹ نیشنل کالج کراچی "مارننگ" میں لیا تھا، مگر ملازمت اختیار کرنے کے بعد "ایوننگ" پروگرام کا حصہ بن گیا۔ یعنی صبح ٹیلی فون پر پیغامات وصول کرتا اور شام میں خود کو نصابی کتب کے حوالے کر دیتا۔

☆☆☆

1987 میں گریجویشن کا مرحلہ طے کرنا نسیم کی زندگی کا خوش گوار ترین لمحہ تھا۔ منزل قریب آتی جا رہی تھی۔

اب اس نے جامعہ کراچی میں داخلہ لے لیا۔ انتخاب مطالعہ پاکستان کے ڈیپارٹمنٹ کا کیا جس کا سبب قائداعظم اور پاکستان سے بے پناہ محبت تھی۔

جامعہ کراچی زندگی سے بھرپور تھی۔ بہت ہی اچھا وقت گزرا وہاں۔ دوست بھی کئی بنے۔ 1990 میں اس نے ماسٹرز کی سند حاصل کی۔

ان ہی دنوں پبلک سروس کمیشن کی جانب سے لیکچرر کی اسامیوں کا اعلان ہوا۔ نسیم نے بھی درخواست جمع کروائی۔ چند ہی روز میں انٹرویو لیٹر لیے ڈاکیا دروازے پر پہنچ گیا۔ اُس زمانے میں پبلک سروس کمیشن کے تحت ٹیسٹ کی بجائے امیدوار کا براہِ راست انٹرویو ہوا کرتا تھا۔

وہ ایک اہم موقع تھا جسے وہ کسی طور گنوانا نہیں چاہتا تھا۔

اس نے انٹرویو کی بھرپور تیاری کی۔ اساتذہ سے، دوستوں سے مدد لی، مگر پھر راستے میں ایک رکاوٹ حائل ہوگئی۔

سندھ پبلک سروس کمیشن کے طریقۂ کار کے مطابق انٹرویو والے روز امیدواروں کو اصلی ڈگری پیش کرنی ہوتی ہے۔ نسیم ماسٹرز کا تھیسس بروقت جمع نہیں کروا سکا تھا، اسی وجہ سے اُسے ڈگری نہیں ملی تھی۔

اس نے خاصی دوڑ دھوپ کی، مگر ڈگری حاصل نہیں

کر سکا۔ البتہ ہمت نہیں ہاری۔ انٹرویو والے روز مقررہ وقت پر پہنچ گیا۔ جب ڈگری کی بابت استفسار ہوا تو اس نے افسر کو پوری روداد سنا دی۔ ساتھ ہی درخواست کی کہ اس کا انٹرویو لے لیا جائے، ڈگری وہ کل جمع کروا دے گا۔

اُن صاحب نے سرکاری افسران کی روایت کے عین مطابق درخواست رد کردی مگر نسیم اور ڈاکومینٹس سے محروم دیگر امیدواروں کو یہ موقع ضرور فراہم کر دیا کہ وہ تین روز بعد دوبارہ حاضر ہوں۔ اُنہیں قسمت آزمانے کا ایک اور موقع دیا جائے گا۔ مگر ساتھ ہی تنبیہ کی۔ "اگر اس بار کاغذات پورے نہیں ہوئے، تو پھر کوئی موقع نہیں ملے گا۔"

پبلک سروس کمیشن کے دفتر سے نسیم سیدھا یونیورسٹی گیا۔ ڈگری تیار تھی۔

تین دن بعد وہ پھر افسران کے سامنے بیٹھا تھا۔

انٹرویو ایک گھنٹے پر محیط تھا۔ متعدد سوالات کیے گئے۔ نسیم پوری طرح تیار تھا۔ اس نے ہر سوال کا درست جواب دیا۔ بالآخر ایک افسر نے زچ ہوکر کہا۔ "سائیں کوئی غلطی بھی تو کرو۔ تم تو کوئی غلطی ہی نہیں کر رہے۔"

جواب میں وہ مسکرا دیا۔

افسران اس نابینا نوجوان کی صلاحیت سے اتنے متاثر ہوئے کہ نسیم کے بعد جتنے بھی امیدوار انٹرویو پینل کے سامنے آئے، ان سے یہی تقاضا کیا گیا کہ میاں انٹرویو دینا ہے تو حافظ نسیم کی طرح انٹرویو دو، ورنہ راستہ ناپو۔

جلد ہی نتائج کا اعلان کردیا گیا۔ نسیم نے اپنے مضمون میں صوبے میں ٹاپ کیا تھا۔

سرکاری ملازمت کا خواب جو کبھی ناممکن معلوم ہوتا تھا، اب اپنی تعبیر پا چکا تھا۔ اُسے تدریس کے پیشے کے لیے چن لیا گیا۔

☆☆☆

"حافظ صاحب تم اندر نہیں جا سکتا۔" دو ٹوک انداز میں کہا گیا۔

"مگر کیوں؟" نسیم نے سوال کیا۔

"او بھائی یہ لڑکیوں کا کالج ہے، لڑکیوں کا۔" پشتون لہجے میں اسے سمجھانے کی کوشش کی گئی۔

"بھائی میرا اپائنٹمنٹ ہوا ہے۔ میں یہاں پڑھاؤں گا۔" اس نے جواب دیا۔

"کیا پڑھائے گا تم؟ بچیوں کو قرآن پاک پڑھائے

حضرت آسیہ

وہ خاتون جنہوں نے حضرت موسیٰؑ کی پرورش کی تھی۔ قرآن میں انہیں صرف فرعون کی بیوی کہا گیا ہے۔ نام نہیں لیا گیا (القصص 9,8) مفسرین کا کہنا ہے کہ ان کا نام آسیہ تھا اور وہ اسرائیلی خاتون تھیں۔ بائبل کے مطابق فرعون کی بیوی نے موسیٰؑ کو دریا کے کنارے سے اٹھایا تھا اور اسی نے آپ کو پالا لیکن نام کے بارے میں بائبل بھی خاموش ہے۔ البتہ یہودی کہتے ہیں اس کا نام باسیہ تھا۔ اگر فرعون (رامسیس دوم) کا زمانہ 1500-1400 ق م مان لیا جائے تو آسیہ کا زمانہ بھی اسی کے لگ بھگ ہوگا۔

مرسلہ: نگہت غفار، لاہور

گا؟" سوال کیا گیا۔

الجھنے کی بجائے نسیم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہاں!"

جواب دینے والے کے لہجے میں بےزاری تھی۔ "خدا کا واسطہ بھائی، یہاں قرآن پاک نہیں پڑھاتے۔"

وہ خاتون پاکستان گرلز کالج کے سامنے کھڑا تھا۔ جوائننگ لیٹر ہاتھ میں تھا، مگر دروازے پر کھڑا چوکیدار اسے اندر جانے کی اجازت دینے کے لیے کسی طور تیار نہیں تھا۔ نسیم کے لاکھ سمجھانے کے باوجود اس کی گردن نفی میں ہل رہی تھی۔

اتفاق سے کالج کی ایک پروفیسر کی نظر نسیم پر پڑ گئی۔ وہ اُسے جانتی تھیں۔

"حافظ صاحب، آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

جب نسیم نے جوائننگ لیٹر دکھاتے ہوئے اپنی بپتا سنائی تو وہ خاتون چوکیدار کو ڈانٹنے لگیں۔ "انہیں دروازے پر کیوں روک رکھا ہے۔ ان کی یہاں پوسٹنگ ہوئی ہے۔ اگر انہوں نے اوپر شکایت کردی تو تمہاری نوکری چلی جائے گی۔"

چوکیدار کی اکڑ کافور ہوگئی۔ وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ معافی مانگنے لگا۔

نسیم نے محبت سے اس کا کاندھا تھپتھپایا۔ "کوئی بات

نہیں۔کوئی بات نہیں۔"

دوپہر میں جب نسیم کالج سے باہر آیا تو چوکیدار نے جھک کر سلام کیا۔اسی روز دونوں کی دوستی کا آغاز ہوگیا جو اگلے کئی برس قائم رہی۔

تدریس کا تجربہ شان دار رہا۔ساتھی اساتذہ،غیر تدریسی عملہ، طالبات، سب اس باہمت شخص سے بے حد محبت اور احترام سے پیش آتے۔البتہ وہاں کچھ حاسدین بھی تھیں جنہیں نسیم کی مقبولیت کھلتی تھی مگر نسیم نے کبھی ان کی جانب توجہ نہیں دی۔خاموشی سے اپنے کام میں مگن رہا۔سفر جاری رکھا۔

2003 میں اس کا سترہ سے اٹھارہ گریڈ میں ترقی کے ساتھ دوسرے کالج میں تبادلہ ہوگیا۔

نئے ماحول سے ہم آہنگ ہونے میں تھوڑی دقت پیش آئی، وہاں کے پرنسپل نے بھی مشکلات پیدا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی مگر نسیم کی نظر تو آسمانوں پر تھی، راستے میں آنے والی رکاوٹوں کی اسے کہاں پروا تھی۔ ہنستے مسکراتے ہوئے،غم دھوئیں میں اُڑاتے ہوئے وہ آگے بڑھتا رہا۔علم کی شمعیں روشن کرتا رہا۔

بینائی سے محروم حافظ نسیم الدین کا ماسٹرز کر کے تدریس کا پیشہ اختیار کرنا ایک بڑا کارنامہ تھا، بلاشبہ وہ قابلِ تقلید ہے۔مگر.... یہ اس کا اکلوتا کارنامہ نہیں۔ اس کی زندگی میں تو کارناموں کی بہتات ہے۔ایسے کارنامے جنہوں نے اُسے ملک گیر شناخت عطا کی۔

☆☆☆

نسیم، حافظ نسیم الدین کیسے بنا؟ شہرت کس طرح اُس کی جھولی میں آئی؟ تحقیق کے میدان میں اُس نے کیوں کر قدم رکھا؟

ان سوالات کا جواب تلاش کرنے کے لیے ہمیں 76-77 میں جانا ہوگا، جب حکومتِ پاکستان نے قائداعظم اور علامہ اقبال کا صد سالہ جشن منانے کا فیصلہ کیا۔

یہ وہ زمانہ تھا، جب نسیم خود کو کراچی کے ماحول سے ہم آہنگ کرنے میں مصروف تھا۔ریڈیو اور ٹی وی کی افادیت کا وہ اُس وقت سے قائل تھا، جب پہلی بار اسے ادراک ہوا کہ سماعتوں میں اترنے والے الفاظ اس کے ذہن کے پردے پر لمحوں میں رنگ برنگی تصویریں کھینچ دیتے ہیں، مگر ان سائنسی ایجادات کی اصل اہمیت اس وقت آشکار ہوئی، جب ریڈیو اور ٹی وی نے مذکورہ جشن کے حوالے سے پروگراموں کا تانتا رکنے والا سلسلہ شروع کیا جن میں کوئز پروگرام بھی شامل تھے۔

معلوماتِ عامہ کا میدان نسیم کو اپنی جانب کھینچتا تھا۔اس نے ان پروگراموں میں خصوصی دلچسپی لی۔دل میں یہ خواہش پنپنے لگی کہ وہ بھی اس قسم کے مقابلے میں حصہ لے۔

اس خواہش کے تعاقب کے لیے زیادہ سے زیادہ معلومات کا حصول شرط تھی۔اس ضمن میں بھی ریڈیو اور ٹی وی ہی کام آئے۔ نصابی کتب اور اخبارات بھی معاون ثابت ہوئے۔"ریڈرز" کی مدد سے معلومات حاصل کرتا رہا۔سماعت چونکہ تربیت یافتہ تھی، اس لیے جو کچھ سنا، ذہن نشین کرلیا۔

ریڈیو اور ٹی وی سے دوستی وقت کے ساتھ گہری ہوتی گئی، یہاں تک کہ 1980 آگیا، جب اس نے پہلی بار ریڈیو کے ایک پروگرام میں شرکت کی۔جلد ہی اس سلسلے میں تسلسل آگیا۔ ریڈیو نشریات میں اس کی آواز سنائی دینے لگی۔مگر کوئز کے میدان میں خود کو منوانے کے لیے اُسے انور علی رومی کی تنظیم نیشنل اکیڈمی فور سوشل ایکٹیوٹیز (ناسا) کے تحت ہونے والے "برین آف کراچی" نامی مقابلے کا انتظار کرنا پڑا۔

اس زمانے میں نوجوان کوئز پروگراموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے تھے۔مقابلہ سخت ہوتا۔

"برین آف کراچی" کا اعزاز اپنے نام کرنے کے لیے بھی ساڑھے تین سو طلبا و طالبات میدان میں اتر آئے۔ اپنے زمانے کے نامی گرامی نوجوان ان میں شامل تھے جو کوئز کی دنیا میں اپنا سکہ جما چکے تھے۔

نسیم بھی اس ہجوم کا حصہ تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب وہ کسی بڑے پروگرام میں حصہ لے رہا تھا۔ راستے کی دشواریوں کا اسے اندازہ تھا، مگر اپنی قابلیت پر بھی یقین تھا جس نے اس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ ایک کے بعد ایک مرحلہ طے کرتے ہوئے اس گمنام نابینا نوجوان نے فائنل مقابلے تک رسائی حاصل کرلی۔

اس دن گھمسان کا رن پڑا۔کڑا مقابلہ ہوا۔جب نتائج کا اعلان ہوا، وہ دوسرے نمبر پر تھا۔مگر یہ ناکامی نہیں تھی۔ قطعی نہیں۔یہ تو کامرانیوں کے سفر کا آغاز تھا۔نسیم کو خاصا حوصلہ ملا اس مقابلے سے۔

1981 میں پھر اسی مقابلے کا انعقاد کیا گیا۔نسیم پوری تیاری سے میدان میں اترا۔گزشتہ برس کی طرح ایک کے بعد ایک راؤنڈ طے کرتے ہوئے اس نے ایک بار پھر فائنل میں

جگہ بنالی۔ بدقسمتی سے اس بار بھی وہ پہلی پوزیشن اپنے نام کرنے میں ناکام رہا۔ منصفین نے بھی تھوڑی زیادتی کی۔مگر اُسے اِس بات کا غم نہیں تھا۔وہ تو خود کو فاتح تصور کررہا تھا۔ اوروں کی رائے بھی یہی تھی۔ ایک نابینا شخص کا کسی بینا کے مقابلے میں اترنا ہی بڑا کارنامہ تھا۔

"برین آف کراچی" میں ملنے والی کامیابی نے راہ کا تعین کردیا۔اب وہ باقاعدگی سے شہر میں ہونے والے کوئز مقابلوں میں شرکت کرنے لگا۔

یہی قابلیت اسے پی ٹی وی لے گئی، جہاں اس نے "ذوقِ آگہی ، میزان ، ذوق وشوق اور یونیورسٹی چیلنج" جیسے پروگراموں میں حصہ لیا۔ریڈیو کے سامعین نے اُسے "آزادی کوئز ، بزرگان سلف ، رحمت اللعالمین"، ذہانت شرط ہے اور منزل" کے طفیل پہچانا۔

انٹرکالجیٹ اور انٹریونیورسٹی مقابلوں کے پلیٹ فارم کو بھی اس نے بھرپور انداز میں استعمال کیا۔ تمام کوئز مقابلوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔کئی ٹرافیاں اپنے کالج کے نام کیں۔ البتہ ضیا دور میں جب طلبا تنظیموں پر پابندی عائد ہوئی، تب یہ سرگرمیاں کچھ سکڑنے لگیں، جس کا نسیم کو قلق تھا۔ وہ ان کا عادی ہوچکا تھا اور انہیں وقت گزاری کا بہترین مصرف خیال کرتا تھا۔

اس وقت نسیم کو قطعی اندازہ نہیں تھا کہ قدرت اُس کے لیے ایک انوکھا منصوبہ مرتب کرچکی ہے۔ شہرت دبے پاؤں اس کی سمت بڑھ رہی ہے۔

☆☆☆

وہ چودہ شعبان کا دن تھا۔نسیم دوستوں کے ساتھ اپنے دفتر میں بیٹھا تھا۔ پی ٹی وی کا مشہور زمانہ پروگرام "نیلام گھر" موضوعِ گفتگو بنا ہوا تھا۔ اور یہ متوقع تھا۔ ہر دوسرا شخص اسی پروگرام کے بارے میں بات کررہا تھا اُن دنوں۔ دراصل نیلام گھر نے ایک ایسے کوئز مقابلے کا اہتمام کیا تھا جس کا فاتح ایک چمکتی دمکتی کار اپنے ساتھ گھر لے جانے والا تھا۔

واضح رہے کہ نئی نویلی کار اُس زمانے میں ایشیا کی سطح پر کسی بھی کوئز مقابلے کا سب سے بڑا انعام تھا۔

پی ٹی وی کا پروگرام نیلام گھر 75ء میں شروع ہوا تھا جو 82ء میں بند ہوگیا۔

85ء میں اِس پروگرام کا پھر آغاز ہوا۔"دیکھتی آنکھوں سنتے کانوں کو طارق عزیز کا سلام"... یہ جملہ پھر کروڑوں افراد کی سماعتوں میں پڑنے لگا۔

نسیم کے دوستوں کا خیال تھا کہ اُسے بھی اِس شو میں قسمت آزمانی چاہیے۔ انہیں یقین تھا کہ وہ کامیاب ٹھہرے گا۔

نسیم کے خیالات مختلف تھے۔ وہ اِس پروگرام کے فارمیٹ کے متعلق زیادہ نہیں جانتا تھا، اس لیے تاحال کوئی حتمی فیصلہ نہیں کرسکا۔

خیر، گفتگو تمام ہوئی۔ڈیوٹی کا وقت پورا ہوا اور وہ گھر کی جانب چل پڑا۔

عام طور سے نسیم دفتر سے یا تو کالج چلا جاتا یا پھر لائبریری۔مگر اس روز وہ سیدھا گھر چلا آیا۔شب برات تھی۔ سوچا تھوڑا آرام کرلے تاکہ رات عبادت میں صرف کرسکے۔

گھر پہنچے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

"کون ہے؟" نسیم نے سوال کیا۔

"عاصم علی قادری۔" باہر سے جواب آیا۔

نسیم نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ عاصم علی قادری کوئز ایکسپرٹ کے طور پر پہچانے جاتے تھے۔اُنہیں نیلام گھر میں پہلی موٹر سائیکل جیتنے کا اعزاز حاصل تھا۔کوئز مقابلوں کے توسط سے نسیم کی اُن سے دوستی تھی۔

جب عاصم علی قادری نے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا تو نسیم کو حیرت نے آلیا۔"یہ لو بھئی، یہ نیلام گھر کے پاس ہیں۔ دو گھنٹے بعد ریکارڈنگ ہے۔فوراً پہنچو۔"

"مگر اتنی جلدی؟" نسیم متعجب تھا۔ذہن میں یہ خیال گھوم رہا تھا کہ کچھ ہی گھنٹے قبل وہ دوستوں کے ساتھ بیٹھا اسی پروگرام میں شرکت سے متعلق بات کررہا تھا اور اب ایک شخص پاس لیے سامنے کھڑا ہے۔

"ہاں بھئی۔" عاصم علی قادری کی آواز اسے خیالات کی دنیا سے واپس لے آئی۔"طارق عزیز صاحب نے کہا ہے کہ کوئز کے لوگوں کو پروگرام میں بھیجو۔"

نسیم نے اللہ کا نام لیا۔اپنے کزن کا ہاتھ تھاما اور تاج محل ہوٹل پہنچ گیا۔

گو وہ دیکھ نہیں سکتا تھا مگر اس کی چھٹی حس بتارہی تھی کہ آج کچھ انوکھا ہونے کو ہے۔

اسٹیج سج چکا تھا۔ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔پچھلے حصے میں چند نشستیں خالی تھیں۔نسیم وہیں بیٹھ گیا۔

اور پھر اس کے کانوں سے طارق عزیز کی سحر طاری

کردینے والی آواز ٹکرائی۔ ”جو لوگ مقابلے کی تیاری کر کے آئے ہیں وہ ہاتھ کھڑا کریں۔“

نسیم نے سوچا۔ ”میں اتنا پیچھے بیٹھا ہوں۔ اگر ہاتھ اٹھایا بھی تو طارق عزیز کی نظر مجھ پر نہیں پڑے گی۔“

یہ سوچ کر اسے اپنی سفید چھڑی کا خیال آیا جو ہر برے وقت میں اس کا سہارا بنتی تھی۔

اُس نے چھڑی ہوا میں لہرائی۔

جب طارق عزیز نے پچھلی صفوں سے ہاتھ کی جگہ چھڑی بلند ہوتے دیکھی تو فوراً اس سمت چلے آئے۔

چند سوالات کیے گئے جن کا درست جواب دے کر نسیم نے اسٹیج تک رسائی حاصل کرلی۔

وہاں ڈیپارٹمنٹل اسٹور کا مرحلہ درپیش تھا جس میں ٹی وی، واشنگ مشین اور اے سی جیسے بڑے انعامات تھے۔

اُس مرحلے کے لیے نسیم سے مزید سوالات ہوئے۔ اس بار بھی اس نے ٹھیک ٹھیک جواب دینے کی روایت برقرار رکھی۔ انعامات کی تعداد بڑھتی گئی۔ جو دیگر افراد اس کے مقابلے پر اترے، اس نے انہیں بہ آسانی پچھاڑ دیا۔

آخرکار پورا ڈیپارٹمنٹل اسٹور نسیم کے نام ہوگیا جس کا مطلب تھا کہ وہ کار کے مرحلے میں داخل ہوگیا ہے۔

اب اس کا گزشتہ پروگرام کے فاتح سے مقابلہ ہونا تھا۔ وہ صاحب ایئرکموڈور تھے۔ خاصے ذہین، سلجھے ہوئے نستعلیق آدمی تھے وہ۔ گھمسان کا رن پڑنے کی توقع تھی، مگر اُنہوں نے نسیم کے حق میں دستبردار ہونے کا اعلان کردیا۔

نسیم کو یہ منظور نہیں تھا کہ اس کی معذوری کی بنا پر اس سے ہمدردی برتی جائے۔ اس نے ان صاحب سے مقابلے میں شرکت کی درخواست کی جنہوں نے یہ کہہ کر انکار کردیا۔ ”میں آپ کی معذوری کی وجہ سے پیچھے نہیں ہٹ رہا، دراصل میں آپ کی ذہانت کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔“

طارق عزیز کے سمجھانے پر بھی وہ راضی نہیں ہوئے۔ یوں نسیم کو فاتح قرار دے دیا گیا۔

5 اور 6 مئی کی درمیانی شب ریکارڈ ہونے والا وہ پروگرام 16 مئی کو پی ٹی وی سے نشر ہوا جس نے لمحوں میں اس نابینا نوجوان کو کروڑوں افراد کی توجہ کا مرکز بنا دیا۔

16 مئی کی رات (پروگرام نشر ہونے کے بعد) نسیم ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے گیا تو ہر شخص کی نظریں اس پر ٹکی تھیں۔ سرگوشیاں کانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ ”دیکھو، وہی ہے۔ نیلام گھر والا... ہاں ہاں وہی ہے حافظ نسیم۔“

سچ تو یہ ہے کہ اس شام حاضرین اسٹیج پر بیٹھے شعرا کو کم اور اسے زیادہ دیکھ رہے تھے۔ اور یہ سلسلہ آنے والے دنوں میں بھی جاری رہا۔ وہ جہاں جاتا، لوگ اسے گھیر لیتے۔ اس کی کامیابی کے لیے نیک جذبات کا اظہار کرتے۔

اگلے راؤنڈز بھی اس نے کامیابی سے طے کرلیے۔

فائنل مقابلہ 4 اور 5 جون کو ریکارڈ ہوا۔ وہ رمضان کا بابرکت مہینا تھا۔ دعاؤں اور قابلیت سے لیس نسیم اپنی فتح کے لیے پُر امید تھا۔

قدرت نے اُسے مایوس نہیں کیا۔

ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ حاضرین کھڑے ہوگئے۔ اُن کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ چہرے دمک رہے تھے۔ ماحول میں توانائی دوڑ رہی تھی۔ اور وہ اسٹیج پر کھڑا تھا۔ خوشی سے جسم پر لرزا طاری تھا۔ ایک ہاتھ فضا میں بلند تھا جسے نیلام گھر کے میزبان طارق عزیز نے مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ دوسرے ہاتھ میں سفید چھڑی تھی۔ آنکھوں پر سیاہ عینک تھی جس کے پیچھے مسرت کی نمی تھی۔

اگلے کئی لمحوں تک تالیاں بجتی رہیں۔ حاضرین کھڑے رہے اور یہ ردِعمل متوقع تھا۔ سو فیصد متوقع۔

وہ رمضان کا مہینا تھا۔ 4 جون کی شب تھی۔ پی ٹی وی کراچی اسٹیشن میں یہ انوکھا واقعہ رونما ہوا تھا کہ ایک نابینا نوجوان نے ایشیا کا سب سے بڑا انعام اپنے نام کرلیا تھا!!

وہ رات اس کے نام رہی۔ ایک نئی تاریخ رقم ہوئی اور ایشیا کا سب سے بڑا انعام اس کے حصے میں آگیا۔

جب طارق عزیز نے فاتح کا اعلان کیا، ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ حاضرین کے چہرے دمک رہے تھے۔ ان کا جذبہ دیدنی تھا۔

وہ پل مسرت سے لبریز تھے جنہوں نے اس کے ذہن پر ان مٹ نقوش چھوڑے۔

نسیم اس نئی نویلی کار میں سوار اپنے ایک دوست کے ہمراہ گھر لوٹا۔

گرمیوں کا زمانہ تھا۔ سورج جلدی طلوع ہوجاتا اور تین چار بجے سحری کی تیاری کے لیے لوگ بستر چھوڑ دیتے۔

جب چمکتی دمکتی کار محلے میں داخل ہوئی، ہر شخص جاگ رہا تھا۔ خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے علاقے میں پھیل گئی۔ ہر شخص کی زبان پر ایک ہی بات تھی۔ ”حافظ نسیم نیلام گھر کی کار اپنے نام کرچکا ہے۔“

5 جون کی دوپہر دروازے پر دستک ہوئی۔

باہر ایک رپورٹر کھڑا تھا جو نسیم کا انٹرویو کرنے آیا تھا۔ وہ بخوشی راضی ہوگیا۔

یہ انٹرویو 7 جون کو شائع ہوا۔ جس اخبار میں انٹرویو چھپا، اس کی سرکولیشن بہت زیادہ نہیں تھی، اسی وجہ سے ملک کے کروڑوں افراد میں یہ تجسس برقرار رہا کہ کار کس کے حصے میں آئی ہے۔

4 جون کو ریکارڈ ہونے والا پروگرام 13 جون کو نشر ہوا۔ اس سے ایک دن قبل پاکستان کے ایک مؤقر اخبار میں اس کا تفصیلی انٹرویو شائع ہوچکا تھا۔ الغرض ملک گیر شہرت اس کے حصے میں آچکی تھی، جسے 13 جون کے پروگرام نے مہمیز کیا۔

نیلام گھر کی شہرت تو ہمیشہ نسیم کے ساتھ رہی مگر وہ کار فقط ایک ماہ اُس نے اپنے پاس رکھی۔

65 ہزار میں وہ کار فروخت ہوئی، جس پر پی ٹی وی کے ایک پروڈیوسر نے غصے سے کہا۔ ”یار تم نے بڑی بیوقوفی کی۔ وہ تو ڈیڑھ لاکھ میں بھی بک جاتی!“

نسیم مسکرا کر رہ گیا۔ وہ صاحب درست ہی کہہ رہے تھے۔

☆☆☆
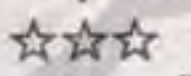
زندگی تنہا نہیں گزرتی۔ انسان کو ایک ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسا ساتھی جو غم میں کاندھا تھپتھپائے، خوشیوں میں ساتھ جشن منائے۔ اِسی فطرتی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے دو انسان رشتۂ ازدواج میں بندھ جاتے ہیں۔

نسیم کی شادی 95ء میں ہوئی۔ یہ ارینج میرج تھی۔ اُسے فقط ”ہاں“ کرنے کا اختیار تھا اور یہ اس نے بخوشی کردی۔

شادی نے اس کی زندگی پر انتہائی مثبت اثرات مرتب کیے۔ زندگی میں ترتیب در آئی۔ اُس کی بیگم شاکرہ نے ہر موڑ پر ساتھ دیا، حوصلہ افزائی کی۔ ضرورت پیش آنے پر رہنمائی بھی کی۔

بیگم سے نسیم کی بڑی اچھی نبھی۔ خانگی زندگی خوشیوں سے بھر گئی۔ البتہ وہ اولاد سے محروم رہا، مگر اسے اس بات کا قلق نہیں رہا۔ بس یہ سوچ کر صبر کرلیا کہ اس میں بھی اللہ کی کوئی مصلحت ہوگی۔

کلاڈ مانٹ

آرٹ کی دنیا کا انتہائی معتبر اور موثر فرد شمار ہوتا ہے۔ اس نے 1840ء میں پیرس میں جنم لیا۔ ابتدائی عمر سے ہی باغی تھا۔ اس نے ”ریئل ازم“ کے مقابل ”امپریشنٹ“ تحریک کی بنیاد رکھی۔ اس قسم کی پینٹنگ میں روشنی، حرکت اور جذبات کو اہمیت دی جاتی ہے۔ اس کے ہم خیال آرٹسٹ مثلاً پیارو، اور ری نوائر وغیرہ بھی اس کے ساتھ شریک ہوگئے۔

کلاڈ خود کو کلاس روم تک محدود نہیں رکھتا تھا۔ وہ باہر نکل جاتا اور قدرتی مناظر کو پینٹ کرتا۔ اس نے قدرتی مناظر کی منظر کشی میں تجربات کیے۔ اس کا اسٹائل منفرد تھا، وہ پیچیدہ چھوٹے برش سے اسٹروک لگاتا، وہ بڑے سائز کی پینٹنگ کرتا تھا۔

آندرے بوسیلی
Andrea Bocelli

یہ نابغہ روزگار شخص مکمل طور پر نابینا تھا۔ 1958 میں لاجاتیکو، اٹلی میں آنکھ کھولی اور دنیا کا مقبول ترین اوپیرا سنگر کہلایا۔

آندرے نے معذوری کے ساتھ زندگی میں آنے والی متعدد دشواریوں پر قابو پایا اور اپنی آواز کو اس طرح پہچان بنائی کہ دنیا بھر میں گھر گھر اس کی آواز گونجنے لگی۔

عجیب بات ہے کہ موسیقی کو اس نے بہت دیر سے اپنایا۔ ابتدا میں وہ وکالت کرتا تھا اور موسیقی اس کا مشغلہ تھا۔ ایک پارٹی میں کسی قدردان نے اسے سنا اور اس کے ساتھ ایک بڑا معاہدہ کرلیا۔

یورپ اور امریکا میں آندرے نے متعدد ملٹی پلاٹینم البم دیے۔ اس کی ریشمی آواز اور متاثر کن شخصیت نے دنیا بھر میں اس کے لاتعداد پرستار پیدا کیے۔ اس کا کہنا تھا کہ ”زندگی میں ارادہ ہی سب کچھ ہے۔“

مرسلہ: طیب شاہین، کھیالہ شیخاں

☆☆☆

بہ قول شخصے "کتاب ہی انسان کو زندہ رکھتی ہے!"
نسیم کو اس بات کا پوری طرح ادراک تھا۔ مگر تصنیف و تالیف کے میدان میں قدم رکھنے کا اکلوتا سبب زندہ رہنے کی خواہش نہیں تھی، یہ تو تحقیق کا جذبہ تھا۔ علم بانٹنے کی سلگتی ہوئی آرزو تھی۔

محقق بلاشبہ ایک معتبر انسان ہوتا ہے، کیونکہ وہ اپنے شب و روز ایک مقصد کے تعاقب میں صرف کر دیتا ہے۔ حقائق تک رسائی کے لیے خون پسینا ایک کر دیتا ہے۔ جن بھاری پتھروں کو چوم کر چھوڑ دیا جاتا ہے، ان کا بار اپنے سر لیتا ہے۔ الغرض تحقیق ایک مشکل اور صبر آزما کام ہے۔ ایسے میں اگر آپ بینائی سے بھی محروم ہوں، تو یہ عمل لگ بھگ ناممکن لگنے لگتا ہے، مگر بے نگہی نسیم کی راہ میں رکاوٹ بننے کی قوت نہیں رکھتی تھی، اس کی منور سوچ تاریکی کو خاطر میں لانے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی۔

کمر کس کر وہ تحقیق کے میدان میں کود گیا۔ بہ ظاہر معلوماتِ عامہ کو ادبی میدان کا ثانوی موضوع سمجھا جاتا ہے لیکن نسیم جانتا تھا کہ یہ خیال غلط فہمی پر مبنی ہے۔ موتی تلاش کرنے کے لیے اُسے ایک ایسے سمندر میں غرق ہونا پڑے گا جو غصیل ہے۔ ایسی راہوں کا انتخاب کرنا ہوگا جو کانٹوں سے بھری ہیں۔

کئی برس اس نے تحقیق کے صحرا کی خاک چھانی۔ تنخواہ پر ایک ریسرچ اسسٹنٹ ساتھ رکھا جو اسے مواد پڑھ کر سناتا، اس کے الفاظ کو تحریر کی شکل دیتا۔

محنت رائگاں نہیں گئی۔ پاکستان کی گولڈن جوبلی کے موقع پر اس کی پہلی کتاب "پاکستان کے پچاس سال، معلومات کے آئینے میں" شائع ہوگئی۔

آہ... وہ ایک پُرمسرت لمحہ تھا۔ بے حد حسین۔ بے حد روشن۔
وہ جانتا تھا کہ یہ کتاب ریفرنس بک کی حیثیت اختیار کر لے گی، طلبا و طالبات اس سے استفادہ کریں گے، یہ کتب خانوں کی زینت بڑھائے گی اور یوں اس کا کام زندہ رہے گا۔

کامیابی کے نشے نے اُسے مدہوش نہیں کیا۔ وہ فوراً ہی اگلے منصوبے میں مصروف گیا۔
اس کی دوسری کتاب "حیات مادرِ ملت، ایک نظر میں" 2003 میں منظرِ عام پر آئی۔ دراصل اُس برس کو حکومتِ پاکستان نے فاطمہ جناح کے سال کے طور منانے کا اعلان کیا تھا، اِسی مناسبت سے نسیم نے یہ کتاب مرتب کی۔ اِسے بھی ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

اس منصوبے کی تکمیل کے ساتھ ہی وہ عادتاً نئے میدانوں کی سمت نکل گیا۔
ایک بار پھر وہ تحقیق میں لگا تھا۔ اور اس بار اس کے شب و روز مصروفیت کے تیز رو دریا میں اتر چکے تھے۔ وہ معلومات کا تعاقب کر رہا تھا۔

یہ کوشش رائگاں نہیں گی۔ محنت کا صلہ ملا۔ اس کی تیسری کتاب کسی کارنامے سے کم نہیں تھی۔ قارئین نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا، ناقدین نے اِسے معلوماتی سرمائے میں سودمند اضافہ قرار دیا۔

922 صفحات پر مشتمل وہ منفرد کتاب "پاکستان کے ماہ و سال" کے زیرِ عنوان شائع ہوئی، جس میں نسیم نے اگست 47ء سے جولائی 2005 تک کے واقعات کو بڑی مہارت سے کالموں کی صورت، تاریخ وار، سوال و جواب کی طرز پر مرتب کیا تھا۔

2005 میں منظرِ عام پر آنے والی اس کتاب کی تقریب رونمائی کراچی اور لاہور میں منعقد ہوئی۔ لاہور میں احمد ندیم قاسمی نے تقریب کی صدارت کی، جو نسیم کے لیے ایک اعزاز تھا۔ یاد رہے کہ وہ بہ طور صدر قاسمی صاحب کی آخری تقریب تھی۔

آنے والے برسوں میں تدریسی سرگرمیوں اور کوئز مقابلوں کے ساتھ نسیم نے ریسرچ کا سلسلہ جاری رکھا۔ یوں تو سامنے کئی موضوعات تھے، مگر پاکستان میں ہونے والے انتخابات کا موضوع فہرست میں سب سے اوپر تھا، جو اَب اُسے ہمہ وقت مصروف رکھنے لگا۔

پاکستان کی انتخابی تاریخ مرتب کرنا آسان نہیں تھا۔ انتھک محنت درکار تھی۔ پھر کتب خانے اور اخبارات تمام تفصیلات فراہم نہیں کرتے تھے۔ معلومات تک رسائی مشکل تھی۔ الیکشن کمیشن آف پاکستان کے پاس بھی پورا ریکارڈ نہیں تھا۔ مگر یہ رکاوٹیں اُس کی راہ میں بند نہیں باندھ سکیں۔ کٹھن حالات پیروں میں بیڑیاں نہیں ڈال سکے۔

چھ برس کی عرق ریزی کے بعد 2013 میں اُس کی چوتھی کتاب "الیکشن سے الیکشن تک: پاکستان کا انتخابی انسائیکلو پیڈیا" منظرِ عام پر آئی، جو ایک منفرد کاوش تھی۔ قبل از انتخابات اشاعت نے تو اُس کی اہمیت کو دوچند کر دیا۔

مذکورہ کتاب کا آغاز 46-1945 میں ہونے والے انتخابات سے ہوتا ہے، جو قیامِ پاکستان کا باعث بنا۔ کتاب میں 2013 تک کا احاطہ کیا گیا تھا۔

چاروں کتابیں نسیم نے خود ہی شائع کیں۔ کسی ادارے یا حکومت سے مدد یا تعاون کی اپیل نہیں کی۔ گو یہ سراسر گھاٹے کا سودا تھا، مگر شوق نے اسے متحرک رکھا۔ اپنی جیب سے پیسے خرچ کیے، مگر کبھی اس بات کا غم نہیں منایا، بلکہ ایک خاص نوع کی مسرت محسوس کی۔ کیونکہ یہ کتاب ہی تو ہے، جو انسان کو زندہ رکھتی ہے!

☆☆☆

نسیم کو قلق تھا کہ پڑھنے لکھنے کا رجحان گھٹ رہا ہے اور ہم نصابی سرگرمیاں دم توڑ رہی ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ طلبا و طالبات اِس قسم کی سرگرمیوں کے خواہش مند ہیں مگر اربابِ اختیار اس ضمن میں سنجیدہ نہیں۔

اِن ہی خیالات سے پاکستان کوئز سوسائٹی نے جنم لیا۔
واضح رہے کہ پاکستان کوئز سوسائٹی کے نام سے 74ء میں عاصم علی قادری نے ایک تنظیم کی بنیاد رکھی تھی۔ اس سوسائٹی نے جلد ہی اپنی جڑیں پھیلا لیں۔ اس کے پلیٹ فارم سے شہرِ قائد میں کئی برس تک کوئز مقابلوں کا انعقاد کیا جاتا رہا۔ 80ء میں کوئز مقابلوں کے دلدادہ نسیم کی اِس تنظیم سے وابستگی ہوئی۔ اس نے اس پلیٹ فارم سے کئی پروگراموں میں حصہ لیا۔

جون 98ء میں عاصم علی قادری نے پاکستان کو خیرباد کہہ دیا اور لندن میں سکونت اختیار کر لی۔ چیئرمین کے جانے کے بعد یہ تنظیم ختم ہوگئی، جس کا نسیم کو قلق تھا۔ وہ کوئز سرگرمیوں کی تجدید کا آرزومند تھا۔ اِس خواہش کے طفیل دھیرے دھیرے اس کے ذہن میں ایک تنظیم بنانے کا خیال پنپنے لگا۔
یہ 2003 کا ذکر ہے۔
شام سرمئی تھی۔ مشرق سے صحت بخش ہوا چل رہی تھی۔ ہاتھ میں چائے کا کپ تھا۔ اردگرد دوست بیٹھے تھے اور یہ خیال زیرِ بحث تھا کہ تنظیم کو کیا نام دیا جائے۔
"پاکستان کوئز سوسائٹی کیسا رہے گا؟" کسی نے مشورہ دیا۔
"مگر وہ تو عاصم علی قادری کی تنظیم تھی۔" نسیم نے فوراً کہا۔
"ہاں مگر وہ تنظیم رجسٹرڈ نہیں تھی۔ اس نام کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔"
بات نسیم کے دل کو لگی۔ رات سوچ بچار میں صرف ہوئی۔ صبح کاذب کے وقت موذن کی آواز فضاؤں میں گونجی، وہ فیصلہ کر چکا تھا۔

کوئز مقابلوں کے فروغ اور طلبا کو صحت مند سرگرمیوں کی جانب مائل کرنے کے لیے نسیم نے پاکستان کوئز سوسائٹی بنانے کا اعلان کر دیا۔

وہ عاصم علی قادری سے مسلسل رابطے میں تھا۔ انہیں بھی مطلع کیا گیا۔ قادری صاحب نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔
سوسائٹی تو قائم ہوگئی، لیکن اسے فعال بنانا سہل نہیں تھا۔ موبائل فون اور انٹرنیٹ کی دنیا میں مگن طلبا و طالبات کو کتابوں کی سمت لانا ایک مشکل مرحلہ تھا، لیکن نسیم مشکلات کا مقابلہ کرنے کا عادی تھا۔ محنت اس کا ہتھیار تھا اور اعتماد اس کی ڈھال، نظر افق پر ٹکی تھی۔

اس نے درس گاہوں کے دوروں کا سلسلہ شروع کیا۔ اساتذہ سے بات کی۔ اسٹوڈنٹس کو متحرک کیا۔ انہیں معلوماتِ عامہ کی اہمیت سے آگاہ کیا۔

آگسٹس

63Augustus ق م۔ 14ق م

آکٹیوین آگسٹس۔ روم کا شہنشاہ، جولیس سیزر کی بہن کا پوتا۔ باپ کی وفات کے بعد جولیس سیزر نے اسے اپنا بیٹا اور وارث بنا لیا۔ سیزر کے قتل 44 ق م پر روم آیا اور انتونی اور لیپی ڈس کے ساتھ مل کر مجلس اربابِ ثلاثہ بنائی۔ 42ق م انتونی کے ساتھ مل کر بروٹس کو شکست دی، 40ق م میں اپنی بہن او کٹاویا کی شادی انتونی سے کی۔ بعد میں انتونی سے بھی ٹھن گئی۔ چھوٹی چھوٹی لڑائیوں کے بعد آخر 31 ق م میں انتونی اور قلوپطرہ کو شکست دی۔ 27 ق م میں رومن سینٹ کی طرف سے آگسٹس نے واجب التعظیم کا خطاب پایا، زرعی اصلاحات کیں اور چند مفید قوانین بھی نافذ کیے۔ اس کے دور کو لاطینی ادب کا سنہری دور کہا جاتا ہے۔ ورجل ہورلیس اور لیوی جیسے عظیم شعراء اس کے ہم عصر تھے۔ وہ خود بھی ادیب تھا۔ حضرت عیسیٰؑ اسی کے عہد میں پیدا ہوئے۔ اگست کا مہینا اسی کے نام سے منسوب ہے۔

مرسلہ: نوشین اختر، کراچی

کوشش کا مثبت نتیجہ سامنے آیا۔ نوجوانوں نے ان سرگرمیوں میں دلچسپی ظاہر کی۔ یوں کوئز مقابلوں کے انعقاد کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

گو ہمارے دانشور علم سے دوری اور مطالعے کے گھٹتے رجحان کا رونا روتے ہیں، مگر اِس تنظیم کو شاندار پذیرائی ملی۔ نوجوانوں کا جوش و خروش دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ کالج اور یونیورسٹیوں میں مقابلے ہونے لگے۔ حوصلے کے سہارے نسیم آگے بڑھتا رہا۔ 2007 میں اس نے یہ تنظیم رجسٹرڈ کروالی۔

آنے والے برسوں میں بھی شہر کے دگرگوں حالات کے باوجود پاکستان کوئز سوسائٹی کے تحت پروگراموں کا سلسلہ بڑی کامیابی سے جاری رہا۔ سال میں چار پانچ بڑے مقابلے منعقد ہوتے۔

2012 میں عاصم علی قادری کی پاکستان آمد کے موقع پر حافظ نسیم اور پاکستان کوئز سوسائٹی کی جانب سے اُنھیں لائف ٹائم اچیومینٹ ایوارڈ سے نوازا گیا۔

وہ تقریب ایک نجی درس گاہ کے سیمینار ہال میں منعقد ہوئی، جہاں عاصم علی قادری کی جانب سے بھری محفل میں اٹھائے جانے والے ایک اعتراض کی وجہ سے کچھ بدمزگی ہوگئی۔

نسیم کو اس بات سے شدید صدمہ پہنچا، مگر اُس نے خاموش رہنے کا فیصلہ کیا۔ اختلافات کو ہوا دینا اُس کا مزاج نہیں تھا، جھگڑوں سے دور رہنا عادت تھی۔ بس اس بات کا قلق تھا کہ اگر عاصم صاحب کو کوئی شکایت تھی تو بھری محفل کی بجائے ایک دوست کی حیثیت سے تنہائی میں اس کا اظہار کرتے۔

نسیم کی خاموشی کے باوجود اِس جھگڑے نے طول پکڑا، جس کا بنیادی سبب چند مفاد پرست لوگ تھے، جنھوں نے اِس موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی، مگر نسیم کے ٹھنڈے مزاج نے معاملے کو سنبھال لیا۔

☆☆☆

نابینا ہونے کے باوجود نسیم نے ایک بینا شخص سے زیادہ فعال زندگی گزاری۔ کئی تنظیموں سے اُس کی وابستگی رہی۔

اب سے 34 برس قبل وہ پاکستان ایسوسی ایشن آف دی بلائنڈ (PAB) کا رکن بنا۔

PAB ایک ملک گیر تنظیم ہے، جو نابینا افراد کی فلاح و بہبود کے لیے سرگرم ہے۔ کراچی کی سطح پر اِس کے ارکان کی تعداد آٹھ سو کے قریب ہے۔ 2004 تا 2010 نسیم اِس ادارے کا چیف الیکشن کمشنر، سندھ رہا۔

"سوشل اسٹوڈنٹس فورم" کے رکن کی حیثیت سے بھی فعال کردار ادا کیا۔ اِس تنظیم کی صدارت پر فائز رہا۔ ایک اور تنظیم "فرزندانِ پاکستان" کے صدر کی حیثیت سے بھی اس نے ذمے داریاں نبھائیں۔

جب 97-96 میں پاکستان کی گولڈن جوبلی تقریبات کا سلسلہ شروع ہوا تو کراچی کی 150 سے زائد سماجی تنظیموں پر مشتمل ایک متحدہ ادارہ "پیامِ پاکستان" تشکیل دیا گیا۔ نسیم اس کی ایگزیکٹو کمیٹی کا رکن رہا۔ اس کے پاس آرٹس کونسل آف پاکستان، کراچی اور یونی کیریئنز کی رکنیت بھی ہے۔

تصنیف و تالیف کے علاوہ اُس نے مختلف علمی، ادبی اور سماجی اداروں اور ٹی وی، ریڈیو چینلو کے تحت ہونے والے کوئز مقابلوں کے لیے بھی سوالات مرتب کیے۔ پرائیویٹ چینلز سے نشر ہونے والے اُس کے تیار کردہ سوالات پر مشتمل پروگرامز "الیکشن کوئز 2008" "دینی معلوماتی پروگرام" "ا۔ل۔م" اور "ماہر" بہت پسند کیے گئے۔

کئی ایوارڈز بھی اس کے حصے میں آئے۔ 85ء میں اُسے UNO یوتھ ایوارڈ ملا۔ روٹری انٹرنیشنل ایوارڈ اور PQS کی جانب سے قائداعظم یوتھ ایوارڈ اُس کے حصے میں آیا۔ اس باہمت شخص نے سندھ کے چار گورنروں سے مختلف اداروں کی جانب سے دیے جانے والے ایوارڈز وصول کرنے کا اعزاز حاصل کیا۔ پاکستان ایسوسی ایشن آف دی بلائنڈ کی جانب سے دیا جانے والا ایوارڈ لیفٹننٹ جنرل (ر) جہاں داد خان کے ہاتھوں وصول کیا۔ اِس کے علاوہ اشرف ڈبلیو تابانی، میاں محمد سومرو اور معین الدین حیدر کے ہاتھوں ایوارڈز وصول کیے۔

ماہ نامہ "اسپیشل چلڈرن" کی جانب سے لوئی بریل ایوارڈ سے نسیم کو نوازا گیا۔ انجمن اتحاد المسلمین پرتاب گڑھ (اودھ) اور فرزندانِ پاکستان کی جانب سے 98ء میں اعترافِ خدمت ایوارڈ، اعترافِ کمال ایوارڈ ملا۔ علامہ شبیر احمد عثمانی ایوارڈ، العلم ایوارڈ اور روشن مثال ایوارڈ کے علاوہ لاتعداد اعزازات بھی حصے میں آئے۔

پرائیویٹ اداروں کی جانب سے تو متعدد اعزازات سے نوازا گیا، لیکن سرکاری سطح پر تا حال کوئی ایوارڈ نہیں ملا۔ ہاں انٹر بورڈ کراچی اور سرسید انجینئرنگ یونیورسٹی کی جانب سے اُن کے اعزاز میں تقاریب ضرور منعقد کی گئیں۔

ماضی قریب کے ایک بہت بڑے شاعر کی روداد

باغی شاعر

آصف ملک

اس کے پاس علم وعقل کی دولت وافر تھی مگر دولتِ بینائی سے محروم تھا۔ صلصل وبلبل کے گیت سنتا اور سوچتا جب معمولی پرندے خوش نوائی میں یہ خوبی حاصل کرسکتے ہیں تو میں اشرف المخلوق ہوں، خدانے مجھے بھی علم وعرفان ودیت کیا ہے تو میں اسے کام میں کیوں نہ لائوں۔ بس اس نے اپنے حافضے کو آزمایا، آگ برساتی نظموں کو یاد کیا، پھر خود بھی کہنے لگا۔ اس کی شہرت فلک گیر بنی، ایک عالم میں دھوم مچی مگر بادشاہانِ وقت کو کب علمِ بغاوت کی بلندی پسند ہے۔ بس وہ سزاوار ٹھہرا۔

جنگ کے بادل
رات کی سیاہ چادر کی طرح
اُن کے سروں پر چھا گئے
جب ہماری تلواریں لہرائیں
جیسے روشنی کی لہریں
جیسے آسمان پر ٹوٹتے تارے
جیسے بجلی کڑکتی ہوئی

یہ اشعار عربی زبان کے ایک قدیم شاعر بشار ابن برد

کی ایک نظم سے ہیں۔ بلند خیالی اور تخیل ہمیشہ سے عربی شاعری کا خاصہ رہی ہے۔ لیکن تعجب کی بات ہے کہ اس قدر وسیع تخیل کے ساتھ جنگ کے منظر کو بیان کرنے والا بشار ابن برد پیدائشی نابینا تھا۔ جس شخص نے آنکھوں سے دنیا کو دیکھا ہی نہ ہو وہ زمین پر برپا ہونے والے سب سے اثر انگیز منظر کو کیسے بیان کر سکتا ہے؟ بشار ابن برد کی شاعری اسی طرح بلند خیالی اور تخیل سے بھرپور تھی اور یہ حقیقی تخیل تھا کیونکہ اس نے جو بیان کیا اسے صرف سوچا تھا، دیکھا نہیں تھا۔ اس نے زندگی میں کبھی ایک لفظ نہیں پڑھا۔ اس نے کتاب کو صرف چھوا، اسے پڑھا نہیں۔ اس نے قلم کو صرف پکڑا اس سے کچھ لکھا نہیں۔ اس نے کسی سے کچھ نہیں سیکھا۔ جو سیکھا اپنی کوشش اور لیاقت سے سیکھا۔ وہ شاعروں اور عالموں کی صحبت میں رہا لیکن اس نے کسی کی تقلید قبول نہیں کی۔ اس نے اپنی راہ الگ نکالی تھی۔ اس کی شاعری میں تلخی اور کیسلا پن تھا۔ معاشرے، مذہب اور رسم و رواج سے اس کی کم بنتی تھی۔ دوسرے لفظوں میں وہ باغی تھا۔

جب عرب کے میدانوں سے اٹھنے والی توحید کی صدا نے ایرانیوں کے دل میں گھر کیا اور وہ نصف صدی کے اندر اسلام لا کر امتِ مسلمہ کا ایک حصہ بن گئے۔ تب بھی بہت سارے ایرانیوں کے دل میں ایران کی پرانی شان و شوکت اور ایرانی تہذیب کی برتری قائم رہی تھی۔ اگرچہ اسلام نے صرف مذہبی حالت بدلی تھی اور ایرانی تہذیب سے تعرض نہیں کیا تھا بلکہ بعد میں ایرانی تہذیب نے اسلامی تہذیب کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ البتہ دوسری صدی ہجری میں یہ کشمکش بہت واضح تھی۔ عرب غالب تھے اس لیے ان کی زبان بھی غالب آئی۔ اس زمانے میں عرب سے متصل ایرانی سلطنت کے علاقوں میں عرب قبائل آباد تھے۔ ان کے اثر سے یہاں رہنے والے ایرانی بھی عربی بولنے لگے تھے۔ فتح ایران کے فوراً بعد عرب سے مزید قبائل آ کر موجودہ عراق میں آباد ہونے لگے تو چند دہائیوں کے اندر یہاں کا ماحول بدل کر رہ گیا۔

کثرت سے نئے شہر آباد ہوئے جیسے کوفہ، بصرہ، موصل اور سب سے اہم شہر بغداد تھا۔ اس خطے میں جو ایرانی آباد تھے وہ بھی عرب تہذیب و زبان میں گم ہو کر رہ گئے۔ بعد میں وہ عرب قبائل میں اس طرح خلط ملط ہوئے کہ اپنی شناخت ہی کھو بیٹھے۔ اسلام کے رشتے نے سب کو ایک لڑی میں پرو دیا تھا۔ موجودہ عراق اور ایران میں آباد کئی ایسے قبیلے ہیں جو عربی زبان اور معاشرت رکھتے ہیں لیکن اصل میں وہ ایرانی النسل ہیں۔ پہلی صدی ہجری بہت پُر ہنگام دور تھا۔ سیاسی لحاظ سے یہ بہت بڑی تبدیلی لے کر آیا تھا۔ سادہ ترین طرزِ حکومت جس میں خلیفہ عوام کا خادم ہوتا تھا اور اس کا طرزِ زندگی کسی غریب مزدور سے مختلف نہیں ہوتا تھا۔ یکا یک دنیا کے دوسرے خطوں کی طرح بادشاہت میں بدل گیا۔ خلیفہ خادم نہیں رہا بلکہ حکمران ہو گیا۔ زمین، ملک اور خزانہ اس کی ذاتی ملکیت بن گیا۔ عظیم الشان محلات تعمیر ہونے لگے۔ اچھی اور زرخیز زمینیں حکمرانوں کی ملکیت بننے لگیں اور اسی طرح درجہ بہ درجہ امرا اور فوجی حکام کا زمینوں پر قبضہ ہونے لگا۔ اس سے ایک بڑا جاگیر دار طبقہ وجود میں آ گیا۔ عام لوگوں کے حصے میں صرف محنت مزدوری کا کام آیا۔ اسلام نے جن لوگوں کو آزاد کیا تھا وہ دوبارہ سے رعایا بن کر محکوم ہو گئے تھے۔

بصرہ عراق میں عرب تمدن اور عرب علوم کا گڑھ بنا ہوا تھا۔ یہاں اکثریت عربوں کی تھی لیکن ساتھ ہی کچھ ایرانی قبائل بھی آباد تھے۔ کچھ ایسے گھرانے بھی تھے جو جنگ کے دوران قیدی بن کر یہاں آئے اور ان کی اگلی نسلیں آزاد ہو کر ان قبیلوں کی حلیف بن گئیں جہاں وہ رہ رہے تھے۔ 714ء کے آس پاس ایسے ہی ایک گھر میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ اسے بشار ابن برد کا نام دیا گیا اور پیار کا نام ال موراتھ تھا۔ اس بچے کا دادا مجوسی سلطنت کی طرف سے لڑتے ہوئے جنگ میں گرفتار ہوا اور غلام بنا کر بصرہ لایا گیا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد وہ آزاد غلام کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اس وقت آزاد غلام اگرچہ کسی کے ماتحت نہیں ہوتے تھے لیکن ان کو مکمل شہری حقوق بھی حاصل نہیں ہوتے تھے اور ان کو کسی نہ کسی صاحبِ حیثیت خاندان یا قبیلے کی پشت پناہی درکار ہوتی تھی۔ بشار کا دادا اوقائل قبیلے میں قیدی بن کر آیا تھا اور پھر یہیں اس نے آزاد شخص کی حیثیت اختیار کی۔ اس نے یہیں شادی کی اور اس کے بیٹے یعنی بشار کے باپ برد نے آزاد حیثیت حاصل کر لی۔ وہ مکمل شہری تھا اور اسے وہی حقوق حاصل تھے جو کسی جدی پشتی آزاد شہری کو حاصل ہوتے ہیں۔

بشار پیدائشی نابینا تھا۔ اس کی آنکھیں بجھی ہوئی اور ناقص تھیں۔ وہ بدصورت بھی تھا اور شاید اس کی وجہ اس کی ناقص آنکھیں بھی تھیں۔ ماں باپ اور خاندان والوں کے لیے یہ بڑا صدمہ تھا کہ ان کی نرینہ اولاد دیکھنے سے قاصر تھی۔ دوسرے لفظوں میں وہ کسی کام کی نہیں تھی۔ آج کے جدید دور میں بھی نابینا ہونے کا مطلب دنیاوی زندگی کے لحاظ سے بیکار ہو جانا ہے۔ اس وقت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نابینا افراد کی کیا اہمیت ہوگی۔ بہت ہوا تو وہ حافظ اور قاری بن جاتے تھے اور اسی سے اپنی روزی کماتے تھے۔ غالباً بشار کے گھر والوں نے اسے حافظ بنانے کا سوچا ہوگا۔ مگر بشار نے کبھی حافظ یا قاری بننے کی کوشش نہیں کی۔ ورنہ ہمیں تاریخ میں اس بارے میں کچھ نہ کچھ ملتا۔ آج تاریخ بشار ابن برد کو صرف ایک شاعر کے طور پر یاد رکھتی ہے۔ ایسا شاعر جس نے اپنے بعد آنے والی ایک پوری نسل کو متاثر کیا اور اس نے عربی شاعری میں جدید رجحانات کی بنیاد رکھی۔

شاعری عربی زبان کا جوہر تھی۔ طلوع اسلام سے پہلے جب عرب جہالت کی اتھاہ گہرائیوں میں گھرے ہوئے تھے۔ علوم اور فنون سے نا آشنا ان میں لکھنے کا فن بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔ حد یہ کہ مکّہ میں رسول اللہ ﷺ نے نبوت کا اعلان کیا اور قریش کو اسلام کی دعوت دی تو پورے قریش میں کل سترہ افراد پڑھے لکھے تھے۔ اس وقت بھی قریش قبائل کی تعداد ہزاروں میں تھی۔ ان میں سے صرف سترہ کا لکھا پڑھا ہونا عربوں کی علوم سے دل چسپی کو ظاہر کرتا تھا۔ حروف تہجی کسی بھی علم کی ترویج کے لیے لازمی حیثیت رکھتے ہیں۔ کوئی قوم لکھنا پڑھنا سیکھے بغیر علم حاصل کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اسلام نے سب سے زیادہ زور لکھنے پڑھنے پر دیا اور اولین وحی الٰہی میں رسول اکرم ﷺ کو پڑھنے کا حکم دیا گیا۔ مدینہ کی اولین اسلامی ریاست میں سب سے زیادہ توجہ تعلیم پر دی گئی تھی۔ حتیٰ کہ جنگِ بدر کے قیدیوں پر فدیہ لگایا گیا کہ وہ دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں تو انہیں آزادی مل جائے گی۔ جب تعلیم کو اولین ترجیح دی گئی تو محض ایک عشرے کے اندر مدینہ میں تعلیم کا تناسب نوّے فیصد سے بھی اوپر چلا گیا۔ ہر مرد اور عورت پڑھنا اور لکھنا جانتے تھے۔

لیکن جب عرب تعلیم سے قطعی نا آشنا تھے تب بھی وہ زبان آوری میں اتنا آگے تھے کہ اپنی زبان کے سامنے باقی عالم کو اتنا ہیچ سمجھتے تھے کہ وہ عرب کے علاوہ باقی دنیا کو عجم یعنی گونگا کہتے تھے۔ یہ فخر بے جا نہیں تھا۔ صرف زبانی ہونے کی وجہ سے عربی نے اتنی ترقی کی کہ اس وقت الفاظ کے لحاظ سے یہ دنیا کی سب سے بڑی زبان بن گئی تھی۔ بعض چیزوں جیسے اونٹ اور تلوار کے لیے عربی زبان میں سیکڑوں نام رائج تھے۔ الفاظ سے منظر کشی کرنا اور چھوٹے جملوں میں پورا منظر کھینچ کر رکھ دینا اتنا عام تھا کہ بچہ بچہ اس فن میں طاق تھا۔ وہ اس فن میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی پوری کوشش کرتے تھے۔ زبان دانی کا فطری نتیجہ یہ نکلا کہ عرب میں شاعری کو رواج ہوا۔ ایک دوسرے کے مقابلے نے شاعری کو فروغ دیا۔ شہروں میں آباد اچھے خاندان کے افراد شاعری کرتے تھے۔ صحراؤں میں مویشی چرانے والے بالکل جاہل اور ان پڑھ بدو بھی ایسے شعر کہتے جو فن کے لحاظ سے اعلیٰ ترین کہے جا سکتے ہیں۔ صرف شاعری کی زبان میں بات کرنے کا فن عربوں کی ایجاد ہے۔ یعنی ساری گفتگو شاعری میں کی جائے۔ اس میں دوسروں کی شاعری بھی استعمال ہوتی تھی اور صاحبِ فن موقع کی مناسبت سے خود بھی شعر کہتے تھے۔ بعثتِ رسول ﷺ کے وقت تک عربی شاعری اپنے عروج پر پہنچ گئی تھی۔

لیکن جب اسلام کی آمد سے نثر اور تحریر کو فروغ ملا تو شاعری کے ساتھ ساتھ دوسرے علوم کی ترویج بھی ہونے لگی تھی۔ اسلامی علوم کے علاوہ فطری علوم بھی رواج پانے لگے۔ خاص طور سے جب فتوحات کا تسلسل ایران اور روما کی سلطنت کو بہا لے گیا تو مسلمان نئی قوموں کے ساتھ نئے علوم سے بھی آشنا ہوئے تھے۔ اسی طرح دوسری اقوام اسلام اور اسلامی علوم کے ساتھ عربی زبان اور شاعری سے واقف ہوئیں۔ خاص طور سے جزیرہ نما عرب اور عراق میں دوسری قومیں جلد عرب زبان اور تہذیب میں ضم ہو کر رہ گئیں۔ اگرچہ ان کی نسلی شناخت برقرار رہی تھی لیکن ظاہری قطع وضع اور زبان میں وہ جلد عربوں سے مشابہ نظر آنے لگے۔ اس لیے جب ایرانی نسل سے تعلق رکھنے والے بشار ابن برد نے ہوش سنبھالا تو اس نے اپنے اطراف میں عرب زبان اور عرب تمدن پایا۔ بصرہ اس وقت تک علوم و فنون کا گہوارہ بن چکا تھا۔ اسلامی علوم کو اولیت حاصل تھی۔ ایک سے بڑھ کر ایک عالم اس وقت عالمِ اسلام میں موجود تھا۔ صحابہ کرام کے بعد تابعین اور پھر تبع تابعین نے علوم کی ایسی شمعیں روشن کی تھیں جن کی خیرگی کا ایک عالم گواہ تھا۔

اگر مکّہ اسلام کی جائے پیدائش اور مدینہ اس کی پرورش گاہ تو بصرہ، کوفہ اور بغداد اس کی جولان گاہ بن گئے تھے۔ ایک ایک فرد اپنے سینے میں علوم کے خزانے لیے بیٹھا تھا اور پوری فراغ دلی سے یہ خزانے لوگوں میں بانٹ رہا/

تھا۔ خاص طور سے بصرہ اور کوفہ شہر نہیں بلکہ درسگاہیں بن گئے تھے ۔ یہ ایسی درسگاہیں تھیں جن میں لوگ آباد تھے۔ چاروں طرف علم کا ایسا چرچا تھا جیسے سمندر میں پانی ہوتا ہے۔ عربی شاعری جو دینی اور دوسرے علوم کے احیا کی کوششوں میں کسی قدر دب گئی تھی، ان ہی مراکز میں دوبارہ سے ابھر کر اور کھل کر سامنے آئی۔ شاعری کسی بھی دوسرے علم سے زیادہ سرپرستی مانگتی ہے۔ اچھا اور سچا شاعر بس شاعری کا ہوتا ہے۔ بنوامیہ کے دور میں درباروں میں قصیدہ خواں شاعروں کا رواج ہوا۔ انعام واکرام اور داد و دہش کا دور آیا تو شاعری پر بھی بہار آگئی تھی۔ بعثتِ اسلام سے پہلے بھی اس کا رواج تھا۔ ہر ذی حیثیت سردار اور قبیلے کا اپنا شاعر ہوتا تھا جو اس کی مداح میں قصیدے کہتا۔ اپنے قبیلے اور قوم کی بڑائی بیان کرتا۔ سرداروں اور لوگوں کی طرف سے داد و واہ واہ کے ساتھ زرِ کثیر سے بھی ان شاعروں کی قدر دانی کی جاتی تھی۔ مگر خلافتِ راشدہ کے دور میں اسے فضول خرچی قرار دیتے ہوئے ترک کر دیا گیا تھا۔

خلافت ملوکیت میں بدلی تو بادشاہوں کو پھر سے ثنا خوانوں کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ اچھے شاعر درباروں سے وابستہ ہونے لگے۔ عام لوگ تو صرف داد دے سکتے تھے لیکن اب داد سونے چاندی کی صورت میں ملنے لگی۔ عالموں کی قدر تو تھی اب شاعروں کو بھی پوچھا جانے لگا اور اس سے عوام میں شاعری کا ذوق جو ماند پڑ گیا تھا پھر سے پروان چڑھنے لگا۔ عوامی شاعری کے سوتے جو خشک پڑے تھے پھر سے رواں ہو گئے۔ قدردانی سے بددل شعرا ویرانوں میں نکل گئے تھے یا اپنی شاعری کو خود تک محدود رکھنے لگے تھے پھر سے میدان میں آ گئے۔ گلی کوچوں میں شاعری کا چرچا ہونے لگا۔

بشار نے اس ماحول میں ہوش سنبھالا۔ اشعار اس کے کانوں کو اچھے لگتے تھے کیونکہ یہ اسے اس دنیا کی سیر کراتے تھے جو اس نے دیکھی نہیں تھی اور جس سے وہ انجان تھا۔ عام الفاظ وضاحت نہیں کر پاتے تھے کہ رنگ کیا ہوتے ہیں، آسمان کیسا ہے، اس کی وسعتوں میں اڑتے پرندے اور بادل کیسے دکھائی دیتے ہیں۔ دریا اور ندیوں میں لہریں کیسی لگتی ہیں۔ مگر جب یہی سب وہ شاعر کی زبانی سنتا تو اسے لگتا وہ گویا سن نہیں رہا سب دیکھ رہا ہے۔ اس کے اندر چھپا شاعر دوسروں کی شاعری سے فیض پا رہا تھا۔ بشار نے سوچا نہیں تھا کہ وہ شاعری کرے گا۔ البتہ اسے شاعری اچھی لگنے لگی تھی۔ وہ سمجھدار نہیں ہوا تھا لیکن اس کے اندر سے کوئی کہتا تھا کہ اگر وہ کسی میدان میں آگے بڑھ سکتا ہے اور کچھ کر سکتا ہے تو شاعری ہی ہے۔ عام باتوں کے معاملے میں اس کا حافظہ کمزور تھا لیکن جہاں تک شاعری کا تعلق تھا وہ جو شعر یا نظم سنتا وہ اسے یاد ہو جاتی تھی۔

عمر کے ابتدائی چند سالوں میں تو اسے اپنی محرومی کا پتا نہیں چلا تھا۔ ماں باپ اور بہن بھائی اس کا خیال رکھتے تھے لیکن جب وہ گھر سے نکلنے والی عمر کو پہنچا اور اس کا واسطہ دوسرے لوگوں اور خاص طور سے بچوں سے پڑا تو اسے احساس ہوا کہ وہ دوسروں سے مختلف ہے۔ بچے اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ اس کی محرومی کا اور اس کی بدصورتی کا ذکر کر کے اسے چھیڑتے تھے۔ پھر بھی وہ سمجھ نہیں پایا تھا کہ دیکھنا کیا ہوتا ہے اور وہ کیوں نہیں دیکھ پاتا ہے؟ خوب صورتی کیا ہوتی ہے اور بدصورت ہونا کیسا ہوتا ہے؟ وہ اس سے بھی نا آشنا تھا مگر اسے یہ ضرور معلوم ہو گیا تھا کہ وہ دوسرے بچوں سے مختلف ہے اور اس میں کمی ہے۔ وہ ماں باپ سے اپنی کمی اور کم صورتی کا پوچھتا تو وہ اسے تسلی دیتے اور دوسرے بچوں کو برا بھلا کہتے جو اسے چھیڑتے تھے۔ بچوں کے گھر والوں سے شکایت کی جاتی تو ان کی طرف سے اپنے بچوں کو ڈانٹا جاتا لیکن اس کا اثر وقتی ہوتا تھا۔ بچے کہاں باز آتے ہیں۔ بشار جب باہر نکلتا تو اسے بچوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ وہ اسے چھیڑتے اور وہ ہمیشہ روتا ہوا گھر واپس آتا تھا۔

اس مسئلے کا حل اس نے یہ نکالا کہ باہر نکلنا بند کر دیا۔ وہ گھر میں رہتا اور اگر باہر سے کوئی آتا تو وہ اس کے سامنے بھی نہیں جاتا تھا۔ ماں باپ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ دنیا سے ڈر کر گھر میں بیٹھ جانا مسئلے کا حل نہیں ہے اسے اسی دنیا میں زندگی گزارنی ہو گی۔ اگر اسے اپنے آپ کو منوانا ہے تو اسے باہر نکلنا ہو گا اور دنیا کا سامنا کرنا ہو گا۔ مگر بشار کسی صورت باہر جانے کو تیار نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ بچے اس کا مذاق اڑاتے ہیں اور وہ کسی کام کا نہیں ہے۔ وہ بغیر سہارے کے گلی سے باہر بھی نہیں جا سکتا ہے۔ بشار کے باپ برد نے اس سے کہا کہ وہ اس کے ساتھ جائے گا اور اس کی دیکھ بھال کرے گا لیکن بشار کی انا کو یہ بھی گوارا نہیں تھا کہ دوسرے بچے تو بغیر کسی کی مدد کے آزادانہ باہر گھومتے پھرتے تھے اور وہ باپ کے بغیر باہر نہیں جا سکتا تھا اس لیے وہ اپنے انکار پر قائم رہا۔ گھر میں بھی وہ سکون سے نہیں تھا، ہمہ وقت اپنی معذوری پر وہ جلتا کڑھتا رہتا تھا۔ اس کے بہن بھائی اس کے پاس آتے تو ان سے لڑتا اور ان کو مارنے کو دوڑتا تھا۔

اولاد بدصورت یا کوئی کمی رکھتی ہو لیکن ماں باپ کے لیے ہر بچہ برابر ہوتا ہے۔ بشار سے ماں باپ کا لگاؤ عام بچوں سے زیادہ ہی تھا۔ اس کی یہ حالت ماں باپ کے لیے پریشانی کا باعث تھی اور وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح اسے معمول کی زندگی کی طرف لائیں۔ ایک دن دونوں میاں بیوی سر جوڑ کر بیٹھے اس مسئلے کا حل تلاش کر رہے تھے کہ بشار کی ماں کو خیال آیا۔ اس نے شوہر سے کہا۔ ”سنو جی، ہمارا بشار شاعری شوق سے سنتا ہے۔ کیوں نہ اسے کسی شاعر کی محفل میں لے جاؤ۔“

”کیا بات کرتی ہو ابھی یہ چھ سال کا ہے اور میں اسے کسی شاعر کی محفل میں لے جاؤں؟“

”تو کیا ہوا ہمارے ہاں تو بچے بھی شعر کہتے ہیں۔ تم ہی نے بتایا تھا کہ بصرہ کے عام مشاعرے میں بشار جتنی عمر کے بچے بھی شامل ہوئے تھے، انہوں نے شعر بھی سنائے تھے۔“

”ہاں لیکن وہ شعر کہتے ہیں۔ بشار تو شاعر نہیں ہے اسے کس حیثیت سے لے جاؤں۔“

”وہ تمہارے ساتھ جائے گا اس لیے کوئی اس کی حیثیت نہیں پوچھے گا۔ بشار دیکھ نہیں سکتا لیکن سن تو سکتا ہے۔ عالموں میں بیٹھے گا اور ان کی باتیں سنے گا تو اس کا ذہن خود کھلے گا۔ گھر میں رہ کر تو وہ گھٹ جائے گا اس کے ذہن کو زنگ لگ جائے گا۔“

بیوی کی باتوں نے برد کو سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ بشار کسی اور طرح باہر نکلنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ خود برد کو شعر و شاعری کا شوق تھا، شعر کہتا نہیں تھا لیکن اس کا ذوق اچھا تھا اور کئی اچھے شعرا سے اس کی سلام دعا تھی۔ ان میں ایک شاعر بدر بن حارث بھی تھا۔ وہ نہ صرف بہت اچھا شاعر تھا بلکہ عربی زبان کا بھی عالم تھا۔ علم الکلام اور لغت کا ماہر تھا۔ برد باقاعدگی سے بدر کے گھر ہونے والی ہفتہ واری نشستوں میں شامل ہوتا تھا۔ بدر اموی حکومت کا مخالف تھا اس لیے وہ اپنی سرگرمیاں اپنے گھر کی حد تک محدود رکھتا تھا۔ بصرہ کا گورنر اور کئی اعلیٰ سرکاری حکام اس کے مداحوں میں شامل تھے لیکن اس کے خیالات کی وجہ سے اس سے دور رہنے پر مجبور تھے۔ انہیں خوف تھا کہ اگر کہیں بدر خلافت کے عتاب میں آیا تو وہ بھی لپیٹ میں نہ آ جائیں۔ اس لیے صرف عام لوگ اور بدر کے خیالات سے اتفاق رکھنے والے ہی اس کے گھر کا رخ کرتے تھے۔ برد اپنے سیاسی خیالات کے اظہار سے گریز کرتا تھا کیونکہ وہ قائل قبیلہ اموی حکومت کا حامی تھا اور اسے یہیں رہنا تھا۔ البتہ بدر کی محفلوں میں شرکت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس کے سیاسی خیالات سے اتفاق کرتا تھا۔ بیوی کے توجہ دلانے پر برد نے اس تجویز پر غور کیا اور ایک دن بیٹے سے کہا۔

”ٹھیک ہے تم باہر گلی میں نہیں جانا چاہتے لیکن اگر میں تمہیں کسی اچھی جگہ لے جاؤں تب تو تم میرے ساتھ چلو گے نا؟“

باہر جانے کا سن کر ہی بشار بدک گیا تھا۔ ”آپ مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہیں؟“

”میں تمہیں بدر بن حارث کی محفل میں لے جاؤں گا۔“

بشار جو پہلے بدک گیا تھا اب خوش ہو گیا۔ ”وہ جنہوں نے صحرا کا چاند نامی نظم کہی ہے۔“

برد حیران ہوا تھا۔ ”کیا تمہیں وہ نظم یاد ہے۔“

بدر بن حارث کی یہ نظم اس کے سیاسی افکار کی ترجمانی کرتی تھی اور مخصوص حلقوں میں اس کی دھوم تھی۔ بشار نے کہیں باپ کے منہ سے یہ نظم سنی تھی اور اسے ایک ہی بار میں پوری نظم زبانی یاد ہو گئی تھی حالانکہ اس میں سو سے زیادہ اشعار تھے۔ برد کے پوچھنے پر بشار نے اسے پوری نظم ایک بھی غلطی کیے بغیر سنا دی۔ برد مزید حیران ہوا اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کا چھ سال کا بیٹا شاعری کا ایسا شیدائی نکلے گا۔ اسے ایک طویل اور مشکل الفاظ والی نظم پوری کی پوری یاد تھی۔ اس نے خوش ہو کر بشار کو گلے لگایا۔

”شاباش میرے بیٹے، میں اسی بدر بن حارث کی بات کر رہا ہوں۔ ہر جمعے کی شام کو اس کے گھر محفل ہوتی ہے۔ میں اکثر وہاں جاتا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ وہاں چلو اور وہاں آنے والے عالموں سے علم سیکھو۔“

”میں چلوں گا۔“ بشار نے ہامی بھری تو برد خوش ہو گیا۔

اگلے جمعے کو اس نے بشار کو نہایت اہتمام سے تیار کرایا اور اسے لے کر بدر بن حارث کے گھر پہنچا..... بدر بن حارث اسے دیکھ کر حیران ہوا کیونکہ اس کی محفل میں آج تک اتنا چھوٹا بچہ نہیں آیا تھا۔ پھر وہ نابینا بھی تھا۔ بدر بن حارث نے پوچھا۔ ”یہ تمہارا بیٹا ہے؟“

”ہاں جناب یہ میرا بیٹا ہے۔“

”اسے دکھائی نہیں دیتا ہے؟“

''جی ہاں اسے دکھائی نہیں دیتا لیکن شاعری کی سمجھ آنکھ والوں سے زیادہ ہے۔'' برد نے فخر سے کہا۔

بدر بن حارث کو تعجب ہوا۔ ''اچھا کچھ اشعار یاد ہیں؟''

''آپ کی نظم صحرا کا چاند پوری یاد ہے۔''

بدر بن حارث پھر حیران ہوا تھا کیونکہ یہ طویل نظم تو خود اسے بھی پوری طرح یاد نہیں تھی۔ نہ ہی اس کے مداحوں میں سے کسی نے اسے یاد کرنے کا دعویٰ کیا تھا۔ اس نے اپنی بیاض منگوائی اور بشار سے کہا۔ ''بیٹے تم ہمیں صحرا کا چاند سناؤ گے؟''

''کیوں نہیں چچا جان۔'' بشار نے کم عمری کے باوجود پورے اعتماد سے کہا۔ اس نے مخصوص لے اور جوش کے ساتھ نظم سنانی شروع کی۔ جب اس نے باپ کو سنائی تھی تو اس کا انداز عام سا تھا لیکن جب اس نے خود صاحب نظم کے سامنے سنائی تو اس کا انداز بدل گیا۔ وہ الفاظ کے اتار چڑھاؤ، اونچے اور دھیمے لہجے میں اس طرح اشعار پڑھ رہا تھا کہ بدر اور برد دونوں ہی اس کے سحر میں ڈوب گئے۔ بدر بن حارث کو اتنا ہوش بھی نہیں رہا تھا کہ وہ بیاض سے بشار کے سنائے گئے اشعار کا موازنہ کرتا۔ بشار جس یقین سے سنا رہا تھا اس کے بعد تصحیح کی گنجائش نہیں رہتی تھی۔ جب اس نے نظم ختم کی تو بدر بن حارث نے بے ساختہ اسے گلے سے لگا لیا۔ اس نے کہا۔

''واللہ جب یہ نظم کہی تو اتنی پُراثر نہیں تھی جتنی آج ہو گئی ہے۔ میرے بچے کیا تم اسے دوسروں کے سامنے سناؤ گے۔''

اپنی چھ سالہ عمر میں بشار کے لیے پہلا موقع تھا جب اس نے خود پر فخر محسوس کیا۔ اتنا بڑا شاعر اس سے التجا کر رہا تھا کہ وہ اس کی نظم دوسروں کے سامنے سنائے۔ وہ خوشی سے مان گیا۔ اس رات کی محفل نوعمر بشار کے نام رہی تھی۔ ایک درجن لوگوں کے سامنے اس نے کئی بار صحرا کا چاند سنائی اور سننے والوں نے اعتراف کیا کہ بشار کی زبان سے اس نظم کا اثر کئی گنا بڑھ گیا تھا۔ سننے والے تعجب کرتے تھے کہ نظم بشار کو اس طرح یاد تھی کہ کئی بار سنانے کے باوجود وہ اس میں ایک غلطی بھی نہ نکال سکے تھے۔ بدر بن حارث نے فیصلہ سنا دیا کہ بشار شاعری کے لیے پیدا ہوا ہے۔ اس رات کے بعد بشار بدر بن حارث کی محفل کا ایک لازمی حصہ بن گیا تھا۔ وہ ہر جمعے کی رات باقاعدگی سے شرکت کرتا اور اگر کسی وجہ سے برد اسے نہیں لا پاتا تھا یا گھر میں نہیں ہوتا تھا تو بدر بن حارث اپنے نوکر بھیج کر بشار کو بلوا لیتا تھا۔ کبھی کبھی بشار سارا دن اس کے ساتھ رہتا تھا اور اسے تنہائی میں بھی بدر بن حارث کے ساتھ رہنے کا موقع ملتا تھا۔ اسے بشار سے انسیت ہو گئی تھی۔ جلد اس نے محسوس کیا کہ بشار کا حافظہ اور شاعری کا ذوق ہی اعلیٰ نہیں ہے بلکہ خود اس میں شعر کہنے کی صلاحیت بھی ہے۔

بشار کم علم تھا اس کے باوجود وہ اپنی عمر کے پڑھے لکھے بچوں سے کہیں زیادہ ذہین اور صلاحیت والا تھا۔ اس کی علمی کمی دور کرنے کا بیڑا خود بدر بن حارث نے اٹھا لیا۔ وہ نہ صرف محفل میں اس کی تربیت کرتا تھا بلکہ اکثر اسے اکیلے بلا کر اس کی ذہنی آبیاری کرتا تھا۔ یہ ایک مشکل کام تھا کیونکہ بشار دیکھ نہیں سکتا تھا اور اسے سب پڑھ کر سنانا پڑتا تھا۔ اس کی یادداشت غیر معمولی تھی لیکن بعض اوقات اسے کوئی چیز کئی بار پڑھ کر سنائی جاتی تب کہیں جا کر اسے یاد ہوتی تھی۔ اشعار کے معاملے میں اس کا ذہن بہت تیز تھا لیکن جہاں تک نثر اور دوسرے علوم کا تعلق تھا بشار اتنی آسانی سے یاد نہیں کر پاتا تھا۔ مگر کوئی شخص صرف شاعری پڑھ کر یا سن کر شاعر نہیں بن سکتا.... اسے لازمی دوسرے علوم کی تعلیم بھی حاصل کرنی پڑتی ہے۔

اب تک بشار کو کسی نے دوسرے علوم کی تعلیم دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ یہ کام اتنا مشکل تھا کہ خود برد بھی اس کی ہمت نہیں کر پایا تھا اور یہ بیڑا بدر بن حارث نے اٹھایا۔ وہ ذاتی دل چسپی اور بشار سے انسیت کی وجہ سے اس پر محنت کر رہا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ بشار خود بھی شعر کہے لیکن نہ جانے کیوں وہ شعر کہنے سے ہچکچاتا تھا۔ بدر بن حارث کی کئی بار حوصلہ افزائی کے باوجود اس نے شعر کہنے کی طرف دھیان نہیں دیا۔ بعد میں اس نے اپنے چند شاگردوں کو بتایا۔ ''میں شعر کہنا چاہتا تھا لیکن مجھے خوف آتا تھا کہ کہیں میرا کلام رد نہ کر دیا جائے اسی خوف نے کم عمری میں بہت عرصے تک شعر کہنے سے باز رکھا۔ اب میں محسوس کرتا ہوں اگر میں چاہتا تو اس وقت بھی شعر کہہ سکتا تھا۔''

بدر بن حارث کی حوصلہ افزائی اور مسلسل رہنمائی رنگ لائی اور بشار نے دس سال کی عمر میں شاعری کا آغاز کیا۔ اس کا آغاز ہی چونکا دینے والا تھا۔ اس نے روایتی عشق و وصال اور لفاظی پر مشتمل عرب شاعری سے انحراف کیا اور جدید حالات اور سیاست کو اپنی شاعری کی بنیاد بنایا۔ بدر بن حارث کی تربیت نے یقیناً اس کی سیاسی اور مذہبی سوچ کی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کیا تھا لیکن اس تربیت اور سوچ کو شاعری میں استعمال کرنا بشار کا اپنا کمال تھا۔ جب اس نے بدر بن حارث کی محفلوں میں اپنی نظمیں سنائیں تو شعرا نے بدر بن حارث کو مبارک باد دی کہ اس میدان میں وہ اکیلا نہیں رہا ہے بلکہ اس کا ایک ہم عصر بھی آ گیا ہے۔ بدر بن حارث بھی خوش تھا۔ مگر اس کے خیال میں بشار کی شاعری میں کاٹ، مایوسی اور تلخی بہت زیادہ تھی۔ یہ تلخی اور مایوسی اس کی شخصیت کا ایک حصہ تھی۔ لیکن اسی تلخی اور مایوسی نے اس کی شاعری کو لافانی کر دیا۔

کم عمری، نابینا پن اور کاٹ دار شاعری نے کچھ ہی عرصے میں اسے پورے بصرہ میں مشہور کر دیا تھا۔ مگر بشار کی دوسروں کے لیے جھجک برقرار رہی تھی۔ باوجود دعوت اور اصرار کے وہ کسی محفل میں نہیں جاتا تھا۔ صرف بدر بن حارث کے گھر ہونے والی محفل میں شریک ہوتا تھا اور اب یہ محفل اس کی اپنی ہو گئی تھی۔ باذوق افراد یہاں پہنچنے لگے اور ان کے توسط سے بشار کی شاعری دوسروں تک پہنچنے لگی۔ کیونکہ بشار دیکھ اور لکھ نہیں سکتا تھا اس لیے دوسرے اس کے اشعار کو محفوظ کرنے کا کام کرتے تھے۔ یوں اس کی بیاض جمع ہونے لگی۔ مگر ذاتی طور پر شاعری اس کے لیے پرندوں کی طرح تھی۔ ان کی پرورش کر کے وہ انہیں آزاد چھوڑ دیتا تھا۔ یہ پرندے دوبارہ اس کے پاس نہیں آتے تھے۔ عجیب بات تھی کہ دوسروں کی طویل نظمیں زبانی یاد کر لینے کے باوجود اسے اپنی بہت کم شاعری یاد تھی اور جب ذاتی شاعری سنانے کا مرحلہ آتا تو اس کے پاس بہت کم ہوتا تھا سنانے کے لیے۔

بشار کی حالت دیکھتے ہوئے اس کے مداحوں نے اس کی شاعری محفوظ کرنے کا کام خود سنبھال لیا۔ کیونکہ وہ جو نظم یا اشعار کہتا ایک دو ہفتے بعد اسے یاد بھی نہیں ہوتے تھے اور اسے اس کی پروا بھی نہیں تھی کیونکہ اوائل جوانی میں اس کے ذہن رسا سے پے در پے ایسی نظمیں نکل رہی تھیں جنہوں نے بصرہ میں دھوم مچا دی تھی۔ ایک دریا تھا اشعار کا جو بہہ رہا تھا اور دریا کو گزر جانے والے پانی کی فکر نہیں ہوتی، اس کے پاس ہمیشہ تازہ پانی آتا ہے یہی حال بشار کا تھا۔ کہاں تو وہ شاعری کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا کہ اسے رد نہ کر دیا جائے اور کہاں یہ حال تھا کہ دن رات بس فکر سخن میں گزرتے تھے۔ پہلے وہ لوگوں سے جھجک کی وجہ سے کم ملتا تھا تو اب اسے لوگوں سے اس لیے الجھن ہوتی تھی کہ وہ اس کے اور شاعری کے درمیان آ رہے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ وقت شاعری کو دے۔ اسے داد اور واہ واہ کی چاہ بھی نہیں تھی۔ وہ شاعری اپنے لیے کرتا تھا۔ اپنے اندر موجود تلخی اور مایوسی کا زہر اشعار کی صورت میں کم کرتا تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو شاید یہ زہر موت سے بہت پہلے اسے مار دیتا۔

برد اُسے بدر بن حارث کے پاس یہ سوچ کر لے گیا تھا کہ وہ اپنی ذات کے خول سے باہر آئے گا۔ دنیا میں رہے گا تو آنے والا وقت اس کے لیے آسان ہوگا۔ بشار اپنے خول سے باہر آیا لیکن باہر آنے کے بعد اس نے اپنے گرد ایک اور زیادہ بڑا خول تشکیل دے لیا۔ وہ ساری عمر اس خول میں رہا اور کوئی اسے اس خول سے باہر لانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ بشار نے دنیا دیکھ لی اور اس کی تلخی اور مایوسی کم ہونے کے بجائے بڑھ گئی تھی۔ اس کا اظہار اس کے اشعار میں بھی ہوتا تھا۔ اب وہ بچہ نہیں رہا تھا کہ برد یا بدر بن حارث اس کو اپنے کہنے پر چلاتے۔ برد کو خوف تھا کہ اگر اس کی اشعار پر حکومت حرکت میں آ گئی تو اس کے ساتھ اس کے اہلِ خانہ بھی پسیں گے۔ یہ دور بہت ظالم تھا۔ گورنر سفاک ترین تھا جس کا کام ہی رعایا کو حکومت کے تابع رکھنا تھا۔ چاہے اس کے لیے اسے ظلم و جبر کا کوئی بھی حربہ استعمال کرنا پڑے۔

برد کا خوف بے معنی نہیں تھا اس کے سامنے آئے دن حکومت مخالف لوگوں پر کوڑے پڑتے تھے اور انہیں سولی یا ہمیشہ کے لیے قید کی سزا دی جاتی تھی۔ ایک خوف و دہشت کا عالم تھا جس نے سب کو سہما دیا تھا اور اس ماحول میں صرف چند آوازیں تھیں جو حق کا اظہار کر رہی تھیں ان میں سے ایک آواز بشار ابن برد کی تھی۔ وہ اس معاملے میں اتنا آگے بڑھ گیا کہ بدر بن حارث بھی پریشان ہو گیا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اپنے شاگرد کو جو سکھا پڑھا رہا ہے وہ اس میں استاد سے بھی آگے نکل جائے گا۔ وہ بہت کھل کر اور بے دریغ حکومت پر تنقید کرنے لگا تھا اور اکثر تو اس کی تنقید حد سے تجاوز کر جاتی تھی۔ جب برد کی درخواست پر بدر بن حارث نے بشار کو سمجھانے کی کوشش کی تو اس نے ماننے سے انکار کر دیا۔ ''آپ مجھے روکتے ہیں جب کہ آپ ہی نے مجھے یہ تعلیم دی ہے۔''

''میں روکتا نہیں ہوں صرف احتیاط کرنے کا مشورہ دیتا ہوں، آج کل حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ تم جانتے ہو حکومت کے خلاف زیرِ زمین تحریک چل رہی ہے اور وہ وقت دور نہیں جب بنو امیہ خاندان کی بساط لپیٹ دی جائے گی۔ مگر اس وقت قوت اس کے پاس ہے اور وہ اس قوت کا اندھا دھند استعمال کر رہی ہے۔''

بشار نے استاد کی دلیل تسلیم کرنے سے انکار کر

دیا۔ ”میں جانتا ہوں لیکن کیا حکومت کی بساط ایسے ہی لپیٹ دی جائے گی۔ کیا اس میں ان لوگوں کا خون شامل نہیں ہوگا جو اس کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں۔ اس کے بغیر انقلاب کیسے آئے گا۔“

”تم دوسروں کا نہیں اپنا اور اپنے گھر والوں کا سوچو۔“

بشار ابن برد ہنس پڑا تھا۔ ”استاد محترم یہ آج آپ مجھے کیسا سبق دے رہے ہیں۔ میں اپنے نظریات اور افکار سے نہیں ہٹ سکتا۔ ہاں یہ کرسکتا ہوں کہ گھر چھوڑ دوں تاکہ میری ذات کی وجہ سے میرے گھر والوں پر کوئی آنچ نہ آنے پائے۔“

جوان عمر بشار ابن برد ابھی تک باپ پر انحصار کرتا تھا اس کا کوئی ذریعۂ معاش نہیں تھا۔ اس کے پاس سوائے شاعری کے اور کوئی ہنر نہیں تھا۔ درباروں اور امرا سے وابستہ شاعر عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے تھے لیکن وہ قصیدہ خواں تھے۔ اپنے آقائے ولی نعمت کی وہ تعریفیں کرتے تھے جو اُن میں نہیں پائی جاتی تھیں۔ ان کی صرف درباروں میں واہ واہ ہوتی تھی۔ درباروں سے ہٹ کر ان کی شاعری کی کوئی وقعت نہیں تھی۔ بشار نے کبھی کسی کا قصیدہ نہیں کہا۔ تعریف تو دور کی بات ہے ایک وقت ایسا بھی تھا وہ ہجو کہنے میں اتنا آگے نکل گیا کہ بیک وقت دس دس شاعروں سے اس کا مقابلہ چلتا تھا۔ شاعری کی یہ صنف ناپسندیدہ اور فساد انگیز ہوتی تھی۔ قدیم عرب میں ہجو کہنے پر ایسی لڑائیاں بھی ہوئیں جو برسوں جاری رہیں اور لاکھوں افراد مارے گئے۔ اس سے اس صنف کی اثر انگیزی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ صنف بشار کے تلخ ذہن اور زبان سے ہم آہنگ تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس کی کہی ہجو اتنی پُراثر ہوتی کہ ادھر وہ منظرِ عام پر آتی اور بچے بچے کی زبان پر چڑھ جاتی تھی۔ اس کے مخالف تلملا جاتے، جوابی ہجو کہتے لیکن ان کی ہجو میں وہ کاٹ اور تاثیر نہیں ہوتی تھی جو بشار کی ہجو میں پائی جاتی تھی۔

بدر بن حارث کی سرزنش کے بعد وہ گھر والوں سے الگ ہوگیا اور اکیلے رہنے لگا تھا۔ اس موقع پر اس کے کچھ مداح اس کے کام آئے، وہ خفیہ طور پر اس کی مدد کرتے۔ اس کے لیے لباس اور کھانے پینے کے سامان کا بندوبست کرتے تھے۔ یہی مداح اس کی کہی ہوئی نظمیں اور اشعار دوسروں تک پہنچاتے تھے۔ گھر والوں اور اپنے حلقہ احباب سے الگ ہوکر بشار گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنے لگا۔ مگر اس تنہائی میں اس کی شاعری مزید نکھر کر سامنے آنے لگی۔ جیسے جیسے بنوامیہ کے خلاف بنوعباس کی تحریک کامیابی حاصل کر رہی تھی بشار کی شاعری میں تندی اور تیزی آ رہی تھی۔ وہ بعض اوقات اتنا کھل کر حکمرانوں پر تنقید کرتا کہ اس کے مداحوں اور چاہنے والوں کے لیے اس کے اشعار سرِ عام دہرانا بھی ممکن نہ رہتا تھا۔ انہیں خوف ہوتا تھا کہ یہ اشعار اگر سرکاری حکام تک پہنچ گئے تو بشار کی شامت آجائے گی۔

پھر ایسا ہی ہوا۔ اوپر تک اطلاع پہنچی کہ بشار نامی شاعر حکومت کا باغی ہے اور اس کی شاعری کی وجہ سے فساد کا خدشہ ہے۔ بصرہ کے گورنر نے بشار کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ اس کی تلاش میں اس کے گھر اور بدر بن حارث کے گھر پر چھاپے مارے گئے لیکن وہ وہاں ہوتا تو ملتا۔ لوگوں کا اس کے بارے میں بے خبری کا یہ عالم تھا کہ بہت کم لوگوں کو علم تھا کہ وہ اپنا گھر چھوڑ چکا ہے۔ چھاپوں کا علم ہوتے ہی اس کے خیر خواہوں نے اسے اس کے ٹھکانے سے ایک خفیہ مقام پر منتقل کر دیا جس کے بارے میں بس چند ہی لوگ جانتے تھے۔ یہی بشار کی شاعری محفوظ کرتے تھے۔ کیونکہ اپنے کہے اشعار سے اس کی بے پروائی برقرار تھی۔ وہ کہتا اور چند دن بعد بھول جاتا۔ اس کی کئی نظمیں جو اس نے کہیں وہ اپنے مداحوں کو لکھوانا بھول گیا اور وہ خود اسے بھی یاد نہیں رہیں بس ان کے کچھ مصرعے یاد تھے اور ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کیسی شاہکار شاعری تھی۔ اس کے بعد اس کے مداح احتیاط کرنے لگے اور ادھر وہ کوئی نظم یا شعر کہتا اور وہ فوراً اسے لکھ لیتے تھے۔ آج بشار کی جتنی بھی شاعری تاریخ میں محفوظ ہے وہ ان لوگوں کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے اپنی جان پر کھیل کر یہ خدمت انجام دی تھی۔ بشار سے کسی قسم کا تعلق خود ان کے لیے بہت بڑا خطرہ تھا اور کسی کے پاس سے بشار کی شاعری تحریر کی صورت میں نکل آتی تو یہی اس کے خلاف سب سے بڑا ثبوت بن جاتی۔

بدر بن حارث کے ساتھ رہ کر بشار نے صرف اس کے سیاسی افکار ہی نہیں اپنائے تھے بلکہ وہ مذہبی افکار میں بھی اس سے متاثر تھا۔ مذہب کے بارے میں وہ کچھ مخصوص خیالات رکھتا تھا اور اسی کی تربیت اس نے بشار کو دی تھی۔ اسے بنو عباس سے ہمدردی اور بنوامیہ سے نفرت تھی لیکن اس کی وجہ مذہبی نہیں تھی۔ وہ بنیادی طور پر بنوامیہ کو غاصب سمجھتا تھا۔ اسی بنا پر وہ بنوعباس کی تحریک سے ہمدردی رکھتا تھا لیکن عملی طور پر اس میں شامل نہیں تھا۔ بلکہ اس نے بشار کو بھی ایک حد سے آگے جانے سے روکا تھا۔ مگر بشار اس معاملے میں کسی بھی حد کا قائل نہیں تھا۔ وہ سیاسی لحاظ سے بھی حد سے آگے نکل گیا تھا اور مذہبی معاملات میں بھی اس کا رویّہ یہی تھا۔

آزاد خیالی اور متنازعہ مذہبی معاملات اس کی شاعری کا حصہ تھے لیکن جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا اس کی شاعری میں اس لحاظ سے شدت پسندی بڑھ رہی تھی۔ وہ اپنی شاعری میں ایسے موضوعات چھیڑ رہا تھا جو مذہب پسندوں کی دل آزاری کا سبب بنتے تھے۔ کئی بار اسے مناظرے کی پیشکش ہوئی لیکن اس نے انکار کیا۔ وہ لوگوں کا سامنا نہیں کرتا تھا۔ اس کی شاعری ان تک پہنچتی تھی اور اس سے نت نئے فتنے کھڑے ہوتے تھے۔ کہا جاتا تھا سرکاری حکام سیاسی خیالات کی حد تک اسے چھوٹ دیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ایک اندھے شاعر کے خلاف کوئی جسمانی کارروائی کی گئی تو اس سے حکومت کی رو بہ زوال ساکھ کو مزید نقصان پہنچے گا۔ مگر جب بشار کے مذہب کے بارے میں اشعار سامنے آئے تو وہ علما اور مذہب پسند امرا کے دباؤ پر مجبور ہوئے اور بشار کے خلاف حرکت میں آگئے۔ اس لیے اسے اپنی زندگی کے پانچ چھ برس روپوش رہ کر گزارنے پڑے تھے۔

اس وقت کے جید علما نے بشار کی شاعری کو رد کیا تھا۔ وہ اس کی آزاد خیالی کی وجہ سے مجبور ہوئے تھے۔ ان میں مالک بن دینار جیسے عظیم فقیہہ اور حسن بصری جیسے ولی اللہ شامل تھے۔ انہوں نے بشار کے خلاف فتویٰ دیا کہ اس کی شاعری خلافِ اسلام اور خلافِ اخلاقیات ہے۔ مگر بشار کو کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ اپنی روش پر قائم رہا تھا۔ اسے اس بات کی پروا بھی نہیں تھی کہ بصرہ جہاں ایک وقت میں اس کے بے شمار مداح اور ہمدرد تھے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہاں اس کے ہمدرد کم ہو رہے تھے اور مخالفین بڑھ رہے تھے۔ اسے کسی کی ضرورت نہیں تھی وہ اپنی تنہائی اور اپنے اندر کی تلخی کے ساتھ خوش تھا۔ اسے دنیاوی مال و متاع اور آسائشوں کی پروا بھی نہیں تھی۔

وہ چھ برس تک جس جگہ چھپا رہا وہ ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی جو ایک سرائے کے پچھلے حصے میں تھی اور یہاں سوائے ایک بستر اور تکیے کے کچھ نہیں تھا۔ اس کے پاس چند جوڑے کپڑے تھے اور وہ انہی کو بدل بدل کر پہنتا تھا۔ سرائے میں رہنے کے باوجود اسے بعض اوقات کئی کئی وقت کھانے کو نہیں ملتا تھا۔ شدید گرمی میں وہ باہر نہیں جا سکتا تھا اور اس بند کوٹھری کی گرمی میں پڑا رہتا۔ اسی طرح شدید سردی میں اس کے پاس سردی سے بچاؤ کا زیادہ سامان نہیں ہوتا تھا کیونکہ وہ روپوش تھا اور سرائے کے ملازمین بھی اس کے بارے میں نہیں جانتے تھے۔ اسے خوراک بھی اس کے ہمدرد مہیا کرتے تھے اور اگر انہیں آنے میں کچھ دیر ہو جاتی تو اسے فاقے برداشت کرنا پڑتے تھے۔
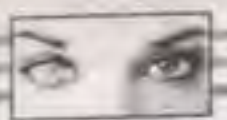
بشار ابن برد کی زندگی کا سب سے اہم واقعہ بنوامیہ کی حکومت کا خاتمہ اور بنو عباس کی حکومت کا آغاز تھا۔ 750ء میں خلیفہ مروان بن محمد دوم کی حکومت کا خاتمہ ہوا اور پہلے عباسی خلیفہ سفاح بن امام محمد نے اس طرح مسندِ اقتدار پر قدم رکھا کہ اس کے دربار میں بنوامیہ خاندان کے افراد کے لاشے بچھے ہوئے تھے۔ سفاح کی سفاکی کی انتہا تھی کہ لاشوں پر دسترخوان لگا کر کھایا گیا جب کہ بعض افراد ابھی زندہ تھے اور زخموں سے سسک رہے تھے۔ جن لوگوں نے اس تحریک کی حمایت کی تھی ان کو اندازہ نہیں تھا کہ ظلم و جبر میں آنے والے پچھلوں سے خاص مختلف نہیں ہوں گے۔ پورے ملک میں قتل و غارت گری کا ایک طوفان اٹھا۔ جو بنوامیہ کے کھلے حامی تھے ان کے لیے تو کہیں جائے پناہ نہیں تھی۔ واحد بچنے والا شہزادہ عبدالرحمٰن افریقا کے آخری کنارے پہنچ گیا لیکن جب اسے وہاں بھی خطرہ محسوس ہوا تو وہ سمندر پار کر کے ہسپانیہ چلا گیا اور وہاں اپنی حکومت قائم کرلی۔

حامی تو بچے ہی نہیں تھے لیکن جن پر ذرا سا شبہ تھا انہیں بھی بے دریغ جلا دیا قید خانوں کے حوالے کر دیا گیا۔ بدر بن حارث اور بشار جیسے حامی یہ سوچ کر آلِ عباس کی حمایت کر رہے تھے کہ وہ حکومت میں تبدیلی لائیں گے۔ ظلم ختم ہوگا اور عام لوگوں کو انصاف ملے گا۔ امیر غریب کا فرق کم ہوگا لیکن ان کی توقع پوری نہیں ہوئی تھی۔ ظلم و جبر برقرار رہا صرف فریق بدل گیا تھا جو پہلے ظالم تھا اب وہ مظلوم بن گیا تھا اور جو پہلے ظلم سہتا آیا تھا اسے اقتدار ملا تو اس نے بھی وہی شروع کر دیا جس کی وجہ سے اس کے پیشروؤں کے خلاف عوام نے اس تحریک کا ساتھ دیا تھا۔ جب نئے حکمران دشمنوں سے فارغ ہوئے تو انہوں نے ان لوگوں کا بھی صفایا شروع کیا جن کے کندھوں پر چڑھ کر وہ اقتدار کی فصیل تک پہنچے تھے۔ تاریخ میں ابومسلم خراسانی کا انجام درج ہے۔ اسی طرح بیشمار حامی جن کے بارے میں عباسی خلفا کو شک تھا کہ وہ ان کے طرزِ حکمرانی کی حمایت نہیں کریں گے ان کے خلاف بھی کارروائی شروع کر دی گئی۔ مگر ابھی آغاز تھا اور فی الحال تحریک کے حامی جشن منا رہے تھے۔

بشار زندگی میں پہلی بار بہت خوش تھا۔ بنوامیہ کی حکومت سے چھٹکارا اس کی سب سے بڑی خواہش تھی اور

اس کی یہ خواہش آج پوری ہو گئی تھی۔ وہ روپوشی کی زندگی سے نکل آیا۔ اگرچہ اب بھی اس کی تنہائی پسندی برقرار تھی اور وہ بہت کم لوگوں سے گھلنا ملنا پسند کرتا تھا لیکن اب وہ مجبور نہیں تھا کہ ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں قید رہے۔ اس کے منظرِ عام پر آتے ہی نئے حکمرانوں کی طرف سے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اسے سفاح کے مصاحبوں میں جگہ ملی۔ بیش قدر سالانہ وظیفہ اور گراں قدر انعامات سے نوازا گیا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے خوشحالی کا مزہ لیا۔ لیکن مالی خوشحالی سے زیادہ اس کے لیے اہم بات فکری آزادی تھی۔ اب اسے خطرہ نہیں تھا کہ اس کی بات پر کوئی فردِ جرم عائد کی جائے گی۔ کیونکہ آل عباس شروع سے روشن خیالی کے علمبردار تھے۔ اگرچہ بشار اور دوسرے یہ بھول گئے تھے کہ بزور اپنی بات دوسروں سے منوانے والے کبھی روشن خیال نہیں ہو سکتے...... یہ انتہا پسندی کی دوسری شکل ہوتی ہے اور آنے والے دنوں میں بشار اور اس جیسے دوسرے لوگوں کو جنہوں نے بنو عباس کی حمایت کی تھی اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑا۔ مگر فی الحال وہ خوش تھے۔

بصرہ میں علما اور شعرا کے ایک بڑے طبقے کی مخالفت کے باوجود بشار کا حلقۂ شاعری جم گیا تھا اور اس کے مداح اور چاہنے والے اس کے گرد جمع رہنے لگے تھے۔ زبانی مخالفت کی بات الگ تھی مگر اب کوئی اس کے خلاف عملی طور پر کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اسے خلیفہ کی سرپرستی اور انتظامیہ کی مکمل حمایت حاصل تھی۔ اس کے مخالفوں کا خیال تھا کہ وہ ان کے خلاف سرکاری حمایت اور مدد استعمال کرے گا۔ لیکن بشار نے کبھی کسی مخالف کے خلاف عملی طور پر کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ وہ ہمیشہ ان سے شاعری کے میدان میں نمٹتا تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ اس نے ان کی مخالفت کی پروا نہیں کی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ اسے اس کی بات کہنے کی آزادی دی جائے۔ جب اسے یہ آزادی مل گئی تو اسے کچھ اور درکار نہیں تھا۔ اس کی نظمیں اور ہجویہ اشعار بصرہ کے گلی کوچوں میں دھوم مچانے لگے تھے۔

پختہ عمری کے ساتھ بشار کی شاعری میں شباب اور پختگی جھلکنے لگی تھی۔ اگرچہ اس کی تلخی اور مایوسی والی کیفیت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ مگر اس کا فن ضرور نکھر گیا تھا۔ شاید برسوں کی تکلیف اور آزمائش کے بعد ملنے والی خوشحالی اور آرام نے اثر کیا تھا۔ شاعری سے ہٹ کر وہ دوسرے شعبوں میں طبع آزمائی کرنے لگا تھا اور اس کا دوسرا میدان مذہب تھا۔ اس کی توجہ کا مرکز ایک نیا فرقہ معتزلہ تھا۔ ان کے عقائد اسلام کے بنیادی عقائد سے کسی قدر ہٹ کر تھے لیکن ان کا سب سے خطرناک عقیدہ خلقِ قرآن تھا جس نے آنے والے دنوں میں عالمِ اسلام کو بہت بڑے فتنوں سے دوچار کیا اور بے شمار عالمِ دین اور معتبر فقیہہ اس کی مخالفت کی پاداش میں سزاؤں جیسے کوڑوں کی مار، قید و بند اور سزائے موت سے دوچار ہوئے۔ ان میں سب سے نمایاں نام امام احمد بن حنبل کا تھا۔ جو حنبلی فقہ کے بانی اور اس وقت عالمِ اسلام کے سب سے بڑے عالم تھے۔ جو خلقِ قرآن سے انکار کی پاداش میں بے پناہ تکالیف سے گزرے اور ان کے پائے استقلال میں لرزش نہ آئی۔ ان کی قربانیوں کا نتیجہ نکلا کہ یہ فتنہ ہمیشہ کے لیے دفن ہو گیا۔

معتزلہ کا عقیدہ تھا کہ قرآن اللہ کا کلام نہیں بلکہ اس کی مخلوق ہے۔ شاید اس طرح وہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ جیسے مخلوق کو بہر حال موت آتی ہے اس طرح ایک دن قرآن پاک بھی (نعوذ باللہ) مٹ جائے گا۔ بشار ابن برد نے معتزلہ فرقے کے عقائد پر تنقید کی اور اس کی ہجو میں شعر کہے۔ نتیجے میں اس خطرناک فرقے کی توپوں کا رخ بشار کی طرف ہو گیا تھا۔ اس وقت معتزلہ بنو عباس سے دور تھے لیکن کیونکہ سیاسی لحاظ سے ان کے لیے خطرناک نہیں تھے اس لیے بنو عباس نے ان کی طرف توجہ نہیں دی۔ اس سے معتزلہ کا حوصلہ بلند ہوا اور انہوں نے عباسی شہزادوں کو اپنی کوششوں کا مرکز بنا لیا۔ بنو عباس فکری لحاظ سے ترقی پسند تھے۔ ان کے دور میں اسلامی علوم اپنے اوجِ کمال کو پہنچ گئے تھے۔ حدیث مبارکہ جمع ہو چکی تھیں۔ قرآن کی تفسیر پر بہت کام ہو چکا تھا اور اب فقہ کی تدوین بھی جاری تھی۔ اس لیے بھی مسلمان علما اب دوسرے فطری اور معاشرتی علوم کی طرف توجہ دے رہے تھے۔ طب، کیمیا، جغرافیہ اور ریاضی میں بے پناہ کام ہو رہا تھا دوسری طرف فلسفے سے دلچسپی بڑھ رہی تھی اور مامون کے دور تک یونانی علوم عربی میں ترجمہ ہو چکے تھے۔ صرف فلسفہ نہیں بلکہ ہر دوسری زبان کی کتاب کا ترجمہ عربی میں ہو رہا تھا اور اس کے لیے باقاعدہ ادارہ قائم کر دیا گیا تھا جہاں علما فضلا تراجم کا کام کر رہے تھے۔ ایک ایک ترجمے کا معاوضہ ہم وزن سونے کی صورت میں ادا کیا جاتا تھا۔ اسی طرح تراجم کے مسودے خطاطی کرنے والوں کو بیش قیمت تنخواہیں دی جاتی تھیں۔ اس لیے دو صدیوں میں ساری دنیا کے مروجہ بلکہ متروک علوم بھی

عربی زبان میں منتقل ہو چکے تھے۔ صرف مامون کے دور میں ایک لاکھ کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہوا۔

ایک طرف تو ان علوم کی فراوانی نے نئے خیالات کو جنم دیا تو دوسری طرف نئے خیالات سے کچھ نئے فتنے بھی سامنے آئے۔ ان فتنوں نے بھانپ لیا تھا کہ اگر وہ کسی طرح اقتدار کے مرکز یعنی خلافت تک پہنچ جائیں تو اس کے بعد ان کا کام آسان ہو جائے گا۔ بشار ان نئے خیالات اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والے فتنوں سے بے خبر نہیں تھا۔ اس کی شاعری کی کاٹ معتزلہ کے لیے ایک بڑا خطرہ بن گئی تھی۔ عوام الناس اور علمائے کرام ویسے بھی اس فرقے کے مخالف تھے۔ اس فرقے نے دوسرے نمبر کے ولی عہد مہدی کو اپنا ہدف بنایا اور جلد وہ اسے متاثر کرنے میں کامیاب رہے۔ معتزلہ کے پیچیدہ فکری اور یونانی فلسفے سے آلودہ افکار نے مہدی کو متاثر کیا۔ مگر یہ سب اندرونِ خانہ چل رہا تھا۔ ابھی تک عوام اور خواص دونوں کو علم نہیں تھا کہ آنے والا وقت اہلِ حق کے لیے کیا مشکلات لانے والا ہے۔ جب مہدی نے مسندِ اقتدار پر قدم رکھا تو یہ فرقہ بھی کھل کر سامنے آ گیا۔

بشار کو فرصت اور آزادی ملی تو اس کی شاعری جوبن پر آ گئی تھی۔ وہ صرف شاعر نہیں تھا بلکہ ایک سلسلہ اور نظریہ فکر بن گیا تھا۔ اس کی شاعری روایت سے ہٹ کر تھی۔ عربی شاعری میں جدید نظم کا اضافہ اسی نے کیا تھا اور درحقیقت یہ بشار اور اس جیسے جدید شعرا کی فکری کوشش تھی جس نے عربی شاعری کو ایک نیا رنگ اور نیا لہجہ دیا۔ بشار اور اس سے پہلے کی شاعری میں تقریباً اتنا ہی فرق تھا جتنا اسلام سے پہلے اور بعد میں عربوں کی حالت میں فرق آیا تھا۔ پہلے پہل بشار نے رومانی شاعری سے گریز کیا تھا لیکن بعد میں وہ رومانی شاعری کرنے لگا۔ اس کی رومانی شاعری میں اس قدر اثر اور جذبات کی شدت ہوتی تھی کہ بعد میں خلیفہ مہدی نے اسے مخرب الاخلاق قرار دے کر بشار پر رومانی اشعار کہنے کی پابندی لگا دی تھی۔ عربی زبان کے کچھ جدید اسکالر بشار کو اس زبان کا پہلا جدید شاعر قرار دیتے ہیں۔ ممکن ہے یہ درست نہ ہو کیونکہ جدید عربی شاعری کے سلسلے میں ناموں کی فہرست خاصی طویل ہے لیکن بشار کا شمار یقینی طور پر جدید عربی شاعری کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ اس نے صرف خود عربی زبان کو اس جدید رجحان سے متعارف نہیں کرایا بلکہ اس نے ایسے شاگردوں کی ایک پوری نسل پیدا کی جنہوں نے اس

خوش قسمتی

برطانیہ کی ایک خاتون مسز ریٹا بیماری کے باعث اپنی بینائی سے محروم ہو گئیں۔ اس واقعے کے تھوڑے دنوں بعد اچانک مسز ریٹا کے شوہر اور بیٹی کار حادثے میں ہلاک ہو گئے۔ یہ خبر سن کر مسز ریٹا کئی گھنٹے پھوٹ پھوٹ کر روتی رہیں لیکن حیرت انگیز بات یہ تھی کہ جب ان کے آنسو تھمے تو ان کی بینائی لوٹ آئی تھی۔ یوں مسز ریٹا کا رونا ان کے لیے نعمت ثابت ہوا۔

قابل کُتّا

جرمن پولیس کے ڈیوک نامی کُتّے کو یونیورسٹی کی جانب سے (B-F) یعنی "بیچلر آف فیتھ فل نیس" کی ڈگری دی گئی۔ یہ کُتّا ایک نابینا طالب علم کو روزانہ کالج لے جاتا اور شام کو واپس لاتا تھا۔ 7 سال اس نے متعینہ چھٹیوں کے علاوہ کبھی بھی چھٹی نہیں کی۔ اسی خدمت کے صلے میں اسے بی۔ ایف کی ڈگری دی گئی۔

نابینا دانشور

فارسی زبان کے پہلے شاعر رود، انگریزی کے مشہور شاعر ملٹن، اردو کے مشہور شاعر جرات، مصر کے مشہور مصنف اور فلاسفر ابوالعلا نابینا تھے۔

............☆☆............
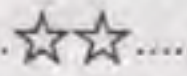
1986ء میں چین کے 39 سالہ چنگ ژونگ نامی اندھے مزدور نے 20 لاکھ الفاظ پر مشتمل ایک ناول "پچھی پا کی جھنکار" کے نام سے قلم بند کیا۔ اس سے قبل اس نے دس سے زیادہ مضامین لکھ کر سند حاصل کی تھی۔

تلاش: نبیلہ اظہر، کراچی

کے رجحان اور کام کو آگے بڑھایا۔ یہ شاگرد ہی تھے جنہوں نے بشار کی شاعری کو محفوظ کیا اور آج بھی اس کی شاعری عربی ادب کا اہم حصہ تصور کی جاتی ہے۔

بنو عباس نے خلافت حاصل کرلی تھی لیکن وہ دمشق اور زیریں عراق میں مخالفوں کی مزاحمت سے پریشان تھے۔ بنو امیہ مٹ گئے تھے لیکن ابھی ان کے حامی باقی تھے اور یہ اتنی بڑی تعداد میں تھے کہ ان کو ختم کرنا ممکن نہیں تھا۔ درحقیقت یہ لوگ مملکت کے دست و بازو تھے اور اگر ان کو ختم کرنے کی کوشش کی جاتی تو مسلمان ایک بہت بڑی خانہ جنگی سے دوچار ہوجاتے اور یہ خانہ جنگی ان کو اس قدر کمزور کردیتی کہ دنیا پر ان کا جو رعب و دبدبہ تھا وہ ختم ہوجاتا۔ اس لیے ابتدائی قتل و غارت گری کے بعد بنو عباس نے کم سے کم اوپری طبقے کے لیے نرم پالیسی اپنائی اور ساتھ ہی انہوں نے اپنا دارالحکومت بغداد لے جانے کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلے کے پسِ پشت کئی وجوہات تھیں۔ کوفہ میں حکومت کو عوام اور علما کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ یہاں بنو عباس کے لیے مقامی حمایت بہت کم تھی خاص طور سے سفاح کی پالیسیوں نے عوام اور علما کو دل برداشتہ کردیا تھا۔

جب سے انسانی تہذیب کا آغاز ہوا اور بڑی مملکتیں قائم ہوئیں تو حکمرانوں کا شروع سے یہ وتیرہ رہا ہے کہ وہ اپنا دارالحکومت عوام سے دور بنانا پسند کرتے ہیں جہاں وہ اپنی مرضی سے حکومت کرسکیں اور انہیں کسی عوامی احتجاج یا تحریک کا خوف نہ ہو۔ اسی نفسیات نے بنو عباس کو اپنا دارالحکومت بغداد لے جانے پر مجبور کیا۔ جہاں آج بغداد آباد ہے ایک زمانے میں یہاں ایک چھوٹا سا شہر ہوتا تھا۔ نوشیرواں عادل کے زمانے میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے اور نام بغداد کی وجۂ تسمیہ یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ یہاں اس کا دربار لگتا تھا اور وہ لوگوں کو انصاف مہیا کرتا تھا اسی وجہ سے یہ جگہ باغ داد کہلانے لگی اور بعد میں یہ لفظ بغداد ہوگیا۔ عباسیوں نے بہت بڑے پیمانے پر شہر کی تعمیر کرائی۔ اسے محلات اور باغوں سے سجایا۔ خلیفہ کا محل اور دفاتر ہی مربع میلوں کے رقبے پر تھے۔ پھر دوسرے دفاتر اور امرا کے محلات تھے۔ باقاعدہ آباد ہونے سے پہلے ہی بغداد کی شہرت چاروں طرف پھیل گئی تھی۔

فی الحال عوام کا داخلہ منع تھا لیکن خاص افراد کو بغداد میں آباد ہونے کی دعوت ملی تھی اور ان میں ایک بشار ابن برد بھی تھا۔ اس کا شمار دربار کے خاص شعرا میں ہوتا ہے۔ اگرچہ بشار بہت کم دربار جاتا تھا۔ کبھی کبھی خلیفہ کی طرف سے بہت اصرار ہوتا تو وہ اکیلے میں اس سے مل لیتا اور اسے اپنے کلام سے محظوظ کرتا تھا۔ اس کے کلام میں شیرینی اور چاپلوسی کا عنصر غائب ہوتا تھا۔ اکثر وہ کڑوا سچ ہی بولتا تھا مگر خلیفہ پھر بھی اسے پسند کرتا تھا۔ منصور نے بھی اسے وہی مقام دیا تھا۔ دوسرے درباری شاعر جو دن رات خلافت کی شان میں قصیدے پڑھتے تھے ان کی وہ قدر و منزلت نہیں تھی جو بشار کی اور اس کی شاعری کی تھی۔ جب منصور سے اس کا شکوہ کیا گیا تو اس نے شکوہ کرنے والوں کو جواب دیا۔ ”تم لوگ میری وہ تعریف کرتے ہو جو مجھ میں نہیں ہوتی ہے لیکن بشار میری وہ خامی بیان کرتا ہے جو مجھ میں ہوتی ہے۔ تم مجھ سے انعام کی توقع رکھتے ہو لیکن بشار نے آج تک مجھ سے کچھ نہیں مانگا۔ اب بتاؤ عزت کس کی ہونی چاہیے۔“

اعتراض کرنے والے فی الحال لاجواب ضرور ہوئے تھے لیکن انہوں نے بشار کی مخالفت اور دشمنی کا خیال دل سے نکالا نہیں تھا۔ علما اور دین دار طبقہ بشار کی شاعری اور آزاد خیالی سے بیزار تھا لیکن انہوں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ رکھا تھا۔ مگر معتزلہ اس کی تاک میں تھے۔ اس کی شاعری اور تبصروں نے اس خوفناک گروہ کو آتش زیر پا کردیا تھا اور وہ منتظر تھے کہ کب انہیں قدرت حاصل ہو اور وہ بشار اور اس جیسے دوسرے افراد سے بدلہ لے سکیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو بشار چومکھی لڑ رہا تھا۔ ایک طرف اس کا نشانہ وہ فرعون صفت سرکاری حکام تھے جو عوام کے جان و مال و عزت پر اپنا حق سمجھتے تھے۔ دوسری طرف مذہب کے علمبردار تھے جو بشار اور اس کے ہمراہیوں کی آزاد خیالی برداشت کرنے کو تیار نہیں تھے وہ اسے دین سے بغاوت قرار دیتے تھے۔ تیسری طرف معتزلہ تھے۔ درحقیقت بشار کی شاعری میں کسی کے لیے بھی کلمۂ خیر بہت کم نکلتا تھا۔ وہ تنقید اور ہجو کا بادشاہ تھا۔ اس کے منہ سے نکلے الفاظ تیر بن کر دوسروں کے دلوں میں اتر جاتے تھے اور وہ مسلسل تکلیف میں ہوتے تھے۔ وہ اس میدان میں اس کا مقابلہ نہیں کر پا رہے تھے اس لیے ایسا لگ رہا تھا کہ انہوں نے بشار سے دوسرے انداز میں نمٹنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

حلقۂ دشمناں تنگ ہورہا تھا اور اس کے شاگرد اور مداح بھی پریشان تھے۔ انہیں سب سے زیادہ خوف یہ تھا کہ کہیں بشار کی کسی بات کو بنیاد بنا کر اسے شرعی عدالت میں نہ کھینچ لیا جائے۔ بشار کے خلاف ایک نہیں درجنوں الزامات لگائے جاسکتے تھے۔ جیسا کہ بعد میں لگائے گئے اور یہ سب سچ تھے خود بشار نے اپنے اوپر لگائے گئے کسی الزام سے کبھی انکار نہیں کیا۔ ایرانی النسل ہونے کے ناتے وہ قدیم ایرانی مذہب زرتشت ازم کا قدردان تھا اور اس نے زرتشت کی مدح میں نظمیں اور اشعار کہے تھے۔ اگرچہ اس نے زرتشت کے مذہب کا موازنہ اسلام سے نہیں کیا تھا لیکن اس کی یہ جسارت بھی کافی تھی۔ پھر اس نے ایک انتہائی متنازعہ نظم لکھی۔ اس نے عرب تہذیب کو کم تر اور قدیم ایرانی تہذیب کو اس سے افضل قرار دیا۔ اس نظم نے ایک ہنگامہ برپا کردیا تھا۔ بشار پر چاروں طرف سے لعن طعن اور الزامات کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ اپنی نظم میں اس نے بہ ظاہر ابلیس اور آدم کا موازنہ کیا لیکن اس پر الحاد اور کفر کا الزام لگانے والوں کا کہنا تھا کہ اس کی آڑ میں اس نے زرتشت ازم اور اسلام کا موازنہ کیا ہے اور اس نے زرتشت ازم کو افضل قرار دیا ہے۔ اس نے اپنی نظم میں کہا۔ ”ابلیس آگ سے بنا ہے اور آدم مٹی سے... اس لیے آگ کو سجدہ بہتر ہے نا کہ مٹی کو۔“

زرتشت ازم میں آگ کی پرستش کی جاتی ہے۔ اسلام کی آمد سے پہلے ایران کا قدیم مذہب آتش پرستی تھا اور یہ آگ کو سجدہ کرتے تھے۔ اس مذہب میں بیک وقت نیکی اور بدی کے خدا ہیں اور دونوں یکساں اختیارات رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس اسلام خالص توحید پر مبنی مذہب ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذاتِ وحدانیت کا مرکز ہے۔ بشار نے اس طرف اشارہ کیا کہ مسلمان ایک پتھر اور مٹی سے بنے گھر کی طرف رخ کرکے سجدہ کرتے ہیں جب کہ آتش پرست آگ کو سجدہ کرتے ہیں۔ آگ نے کبھی مٹی کو سجدہ نہیں کیا۔ یہ اشارہ ابلیس کے آدم کو سجدے سے انکار کی طرف ہے لیکن دوسری طرف مٹی آگ کو سجدہ کرتی ہے۔ یہ اشارہ زرتشت ازم کی طرف تھا۔ جس میں آگ کو معبود قرار دے کر اس کی عبادت کی جاتی ہے۔ حالات بالکل وہی تھے جو علامہ اقبال کے ساتھ پیش آئے تھے۔ انہوں نے ”شکوہ“ کہی تو ایک زمانہ علامہ کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا تھا اور کفر کے فتوے لگنے لگے تھے۔

لوگ بشار کے افکار اور خیالات کے باوجود اس کے مداح تھے اور اسے دربار سے لے کر عام محفلوں میں سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی جب خلیفہ منصور نے اسے بغداد چلنے کو کہا تو وہ ہچکچایا تھا۔ بصرہ چھوڑنا اس کے لیے آسان نہیں تھا۔ مزے کی بات ہے کہ بصرہ ہمیشہ سے عرب حدود میں سمجھا جاتا ہے جب ایرانی اس مقام پر قابض

تھے تب بھی اسے عرب کا مقبوضہ علاقہ تصور کیا جاتا تھا۔ یہاں قدیم زمانے سے عرب آباد تھے اور وہ فارس کی سلطنت کے وفادار شمار ہوتے تھے لیکن انہوں نے اپنی عربیت برقرار رکھی تھی اور یہی وجہ تھی کہ اسلام کے قدم یہاں پہنچے تو یہ عرب کچھ ہی عرصے میں مسلمان ہو گئے تھے اور اسلامی فوج کا دست و بازو بن گئے تھے۔

اس کے مقابلے میں بغداد ...... ہمیشہ سے فارس سلطنت کا حصہ رہا تھا اور جب بغداد آباد کیا جا رہا تھا تو اس کے آس پاس زیادہ تر قدیم ایرانی باشندے ہی آباد تھے اور ان میں سے بیشتر اسلام قبول کر چکے تھے۔ مگر بشار کے لیے بصرہ میں جو کشش تھی وہ بغداد میں نہ تھی۔ وہ یہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس وقت یہ مملکتِ اسلامیہ کا سب سے بڑا علمی مرکز تھا۔ ایک طرف یہاں عالموں نے دین کی شمع روشن کی ہوئی تھی تو دوسری طرف فطری علوم کا سب سے بڑا مرکز بھی بصرہ ہی تھا۔ بشار جانتا تھا کہ بغداد میں اسے دنیا جہان کی آسائشیں ملیں گی لیکن وہاں اسے بصرہ کا علمی ماحول نہیں ملے گا۔ دوسری طرف وہ خلیفہ کو انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اس کا مربی اور سرپرست بھی تھا۔ اسی کے بل بوتے پر بشار نہ صرف ایک پُرآسائش زندگی بسر کر رہا تھا بلکہ یہ خلیفہ کا رعب و دبدبہ تھا کہ بشار کے بدترین دشمن بھی اس کے خلاف کچھ کرنے سے قاصر تھے۔ بشار نے اپنے اعتماد کے لوگوں سے اس معاملے میں مشورہ کیا تو تقریباً سب نے اسے یہی کہا کہ وہ خلیفہ کی پیشکش قبول کر لے۔ انکار کرنے سے ایک خطرہ تو یہ تھا کہ وہ شاہی عتاب کا شکار ہو گا۔ دوسرے وہ اگر خلیفہ کی سرپرستی سے محروم ہو گیا تو اپنے مخالفوں کے سامنے بے بس اور لاچار رہ جائے گا۔

اگرچہ بشار کو اس کی پروا نہیں تھی۔ اس کے اندر بچپن سے جو مایوسی اور قنوطیت تھی اس نے اسے خود سے بھی بے پروا کر دیا تھا۔ مگر جب اس کے دوستوں اور شاگردوں نے اصرار کیا تو وہ باولِ ناخواستہ بغداد جانے پر آمادہ ہو گیا۔ 762میں بنو عباس دارالحکومت بغداد لے گئے جو آنے والی پانچ صدیوں تک نہ صرف مسلمانوں کا بلکہ تمام دنیا کا دارالحکومت رہا تھا۔ اس وقت اس کی وہی حیثیت تھی جو آج واشنگٹن کی ہے۔ بلکہ یہ حیثیت یوں مزید بڑھ گئی تھی کہ بغداد صرف سیاست نہیں بلکہ علم و فنون کا مرکز بھی تھا اور تمام دنیا میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ مگر جب عباسی دارالحکومت بغداد لے گئے تب اس کی کوئی علمی حیثیت نہیں تھی۔ اسی وجہ سے بشار مجبوراً وہاں جانے پر آمادہ ہوا تھا۔ صرف بشار ہی نہیں بلکہ بہت سارے عالموں اور فضلاؑ نے بصرہ اور کوفہ چھوڑ کر بغداد جانے سے انکار کر دیا یہاں ان کے مدرسے اور علم کی مجلسیں تھیں، ساری دنیا سے علم و دین سیکھنے کے لیے آئے ہوئے ہزاروں شاگرد تھے۔ وہ بصرہ اور کوفہ کی علمی فضا چھوڑ کر جانے کو تیار نہیں تھے اور جو بشار کی طرح گئے وہ مجبوراً گئے تھے۔

بشار کو بغداد میں خلیفہ کے محل کے پاس جگہ ملی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ مصاحبینِ خاص میں شامل تھا۔ اس کا یہ مرتبہ اور مقام دیکھ کر اس کے مخالفین اور خاص طور سے معتزلہ جل گئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ بغداد دارالحکومت لے جانے کے پسِ پشت یہی فرقہ موجود تھا۔ جو بنو عباس کے خاندان اور خاص طور سے ولی عہد مہدی پر خاصا اثر و رسوخ حاصل کر چکا تھا۔ بصرہ، کوفہ اور دمشق کی علمی فضاؤں میں ان کی دال گلنی مشکل تھی اور یہاں بے شمار عالم ان کی بیخ کنی کے لیے موجود تھے۔ اس لیے ان کو ایک نئی جگہ کی ضرورت تھی جہاں وہ پوری طرح حکومت پر اثر انداز ہو سکیں اور اسی لیے بغداد کا انتخاب ہوا تھا۔ معتزلہ کا منصوبہ کامیاب رہا اور جیسے ہی عباسی خلفا علم کے مراکز سے دور ہوئے معتزلہ اور ان جیسے فتنہ انگیز خیالات رکھنے والے گروہ ان پر حاوی آ گئے۔ انہوں نے اپنے فتنہ انگیز عقائد سے خلیفہ کو متاثر کیا اور اس کی مدد سے اپنے دشمنوں پر وار کیے۔

بغداد آتے ہی ان دشمنوں نے بشار پر خطرناک وار کیا۔ اس پر الزام لگایا کہ وہ مذہب کے بنیادی عقائد کے خلاف ہے اور اسلام کے مقابلے زرتشت ازم کو پسند کرتا ہے۔ ثبوت میں اس کے اشعار پیش کیے گئے تھے۔ اسی طرح اس پر الزام لگایا کہ وہ ایرانی تمدن کو عرب تمدن سے برتر سمجھتا ہے اور عرب تہذیب کو حقیر جانتا ہے۔ ان الزامات کی ابتدا محفلوں سے ہوئی۔ رفتہ رفتہ یہ اعلیٰ حکام، امرأ اور پھر خلیفہ تک پہنچنے لگی تھیں۔ شروع میں منصور نے ان کا نوٹس نہیں لیا تھا لیکن جب ایک بات مسلسل کان میں پڑتی رہے تو آدمی نوٹس لینے پر مجبور ہو جاتا ہے اور خلیفہ کا اصل کام ہی اختلافی معاملات سننا اور ان پر فیصلے کرنا تھا۔ بشار عام دربار میں شریک نہیں ہوتا تھا اسے استثنا حاصل تھا لیکن جب ادب و شاعری سے متعلق کوئی محفل جمتی تو وہ لازمی اس میں شریک ہوتا تھا۔

دشمن عام دربار سے اس کی غیر حاضری کا فائدہ اٹھا کر منصور کو اس کے خلاف بھڑکاتے تھے۔ بشار ان الزامات اور سازشوں سے بے خبر نہیں تھا اس نے بھی جوابی کارروائی کی اور اشعار کی صورت میں معتزلہ کے مذہبی عقائد پر شدید حملے کیے۔ اس پر وہ مزید آتش زیرپا ہو گئے تھے اور ان کی مہم میں تیزی آ گئی۔ بشار کے ساتھ بدقسمتی سے اس کے چند ہی شاگرد اور خیرخواہ تھے۔ جب کہ مخالفین کا پورا ٹولا تھا اور انہیں دولت اور قوت بھی حاصل تھی۔ منصور کے کئی اعلیٰ حکام ان کی پشت پر تھے جب کہ بشار کا حامی صرف خلیفہ منصور تھا۔ جب بشار کے دشمنوں کا شور شرابا ایک حد سے بڑھ گیا تو ان الزامات کی وضاحت کے لیے منصور نے عام دربار کے بجائے بشار اور اس کے چند بڑے مخالفین کو الگ سے طلب کیا اور ان سے کہا کہ وہ ایک دوسرے پر لگائے الزامات کی وضاحت پیش کریں۔ مخالفین نے بشار پر الزام دہرائے اور کہا۔ ”یہ شخص عام مسلمانوں میں الحاد پھیلا رہا ہے۔ یہ آتش پرستی کو اسلام سے بہتر مذہب قرار دیتا ہے اور یہ عرب تمدن کی بھی تحقیر کرتا ہے۔ یہ ایرانی تمدن کو برتر قرار دیتا ہے۔ یہ شخص مجرم ہے بیک وقت مذہب کا بھی اور معاشرے کا بھی۔“

جواب میں بشار نے جو طویل جواب دیا اس کا بہت کم حصہ دستیاب ہے لیکن جو دستیاب ہے وہ لاجواب ہے۔ تمام الزامات سن کر اس نے جواب دیا۔ ”میں پرانے زرتشت ازم کا مدح ہوں لیکن میں نے کبھی اسلام کو کم تر قرار نہیں دیا۔ میں اسلام پر عمل کرتا ہوں یا نہیں یہ میرا معاملہ ہے جیسے دوسرے بہت سارے لوگ اسلام پر عمل نہیں کرتے ہیں۔ لیکن میں اسلام کے عقائد کو توڑ مروڑ کر نہیں پیش کرتا۔ مجھے مذہب کی بحث سے کبھی سروکار نہیں رہا، میرے خیال میں ہر شخص اپنے اپنے مذہب پر عمل کرنے کے لیے آزاد ہے اور بدبخت ہیں وہ لوگ جو بزور اپنا عقیدہ یا مذہب دوسرے پر ٹھونستے ہیں۔ ان کا اسلام سے کیا تعلق جب کہ قرآن میں اللہ فرماتا ہے لا اکراہ فی الدین۔

اس جواب پر مخالفین کے چہرے بگڑ گئے تھے کیونکہ وہ اپنے عقائد دوسروں پر جبراً ٹھونسنے کے قائل تھے اور جیسے جیسے وہ طاقتور ہو رہے تھے ان کے انداز میں جارحیت آتی جا رہی تھی۔ منصور بشار کے جواب سے خوش ہوا تھا اور اس نے مخالفین سے کہا۔ ”تم نے بشار کا جواب سن لیا اور مجھے اس نے مطمئن کر دیا ہے اب تم کیا کہتے ہو؟“

مخالفین تلملا گئے تھے۔ انہوں نے دوسرا الزام دہرایا۔ ”ٹھیک ہے اگر آپ مطمئن ہیں تو اس سے پوچھیں کہ اسے عرب تمدن کی تحقیر کا حق کس نے دیا ہے۔“
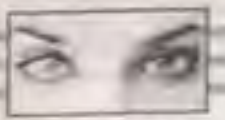
منصور نے بشار سے پوچھا۔ ”تم اس بارے میں کیا کہتے ہو؟“

”یہ الزام بھی غلط ہے کہ میں نے ایرانی تمدن کو برتر ضرور قرار دیا ہے لیکن کبھی عرب تمدن کو حقیر نہیں سمجھا کیونکہ اس کی اپنی خصوصیات ہیں اور ان ہی خصوصیات کی بنا پر آج عرب پورے ایران پر چھا گئے ہیں۔ اسی طرح ایرانی تمدن کی اپنی خصوصیات ہیں اور اس نے آنے والے عربوں کو متاثر کیا ہے۔ اگر میں کسی شخص کو امیر قرار دوں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں اس شخص کو جس کے پاس امیر سے کم دولت ہے غریب قرار دے رہا ہوں۔ اسی طرح اگر میں ایرانی تمدن کی تعریف کرتا ہوں تو اس سے عرب تمدن کم تر نہیں ہو جاتا۔ آخر میں میں خلیفہ سے گزارش کروں گا کہ وہ اپنے اور ان لوگوں کے محلات کا جائزہ لیں اور بتائیں کہ ان

میں سے کیا کیا ایرانی تمدن سے اور کیا عرب تمدن سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے بعد ایک نظر میرے غریب خانے پر بھی ڈال لیجیے گا۔ آپ کو خود پتا چل جائے گا کہ جس شخص پر عرب تمدن سے نفرت کا الزام لگایا جارہا ہے وہ کیسی زندگی بسر کر رہا ہے اور جو الزام لگا رہے ہیں وہ کیسی زندگی بسر کر رہے ہیں۔"

اس جواب نے اس کے مخالفین کے غباروں سے ساری ہوا نکال دی تھی۔ کیونکہ وہ پُر آسائش محلات میں ایرانی تہذیب و تمدن کے تحت زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کے مقابلے میں بشار سادہ پرانے انداز میں رہتا تھا اگرچہ اسے بھی تمام آسائشیں اور دولت میسر تھی۔ بشار جیت گیا تھا۔ خلیفہ نے اسے پہلے سے زیادہ عزت کے ساتھ محل سے رخصت کیا تھا۔ اس کے تلملاتے مخالفوں نے فیصلہ کیا کہ اگلی بار وہ اسے بچنے کا موقع نہیں دیں گے۔ وہ اس زاویے سے وار کریں گے کہ جس کا توڑ بشار کے بس کی بات نہیں ہوگی۔ بشار اس فتح پر خوش تھا اور اسے خبر نہیں تھی کہ اس کے دشمن اب کیا منصوبے بنا رہے ہیں۔

یہ پہلا موقع تھا کہ بشار اپنی شاعری کا دفاع اپنی نثر سے کرنے میں کامیاب ہوا تھا ورنہ یہ حقیقت ہے اس کی شاعری کا بڑا حصہ مذہبی تقابل، سیاسی افکار اور ایرانی تمدن کی برتری کے بارے میں ہے۔ مگر اس کے دکھائے آئینے نے منصور اور اس کے مخالفین کو مجبور کر دیا کہ وہ فی الحال اپنے الزامات سے دست بردار ہو جائیں کیونکہ یہ حقیقت تھی کہ عربوں کی بود و باش میں بہت تبدیلی آئی تھی۔ انہوں نے ایرانی تمدن کی بہت سی چیزوں کو اپنا لیا تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ایران و عرب تمدن کی آمیزش سے ایک نیا تمدن وجود میں آرہا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ایرانی شان و شوکت میں عربوں سے کہیں آگے تھے۔ فنِ تعمیر سے لے کر لباس اور فرنیچر سے لے کر دسترخوان تک انہوں نے ایسی ایجادات کی تھیں کہ جن کی ہمسری کا دعویٰ روما اور مصر کی تہذیب بھی نہیں کر سکتی تھی۔

دوسری طرف عرب فاتحین نے اتنی صفائی سے ایرانی تمدن کو اپنایا کہ اس میں عرب تمدن کی برتری بھی برقرار رکھی تھی۔ قرونِ وسطیٰ کا بغداد ہمیں جدید عرب تمدن کا بہترین نمونہ نظر آتا ہے۔ حالانکہ سچ یہ ہے کہ آغاز سے آج تک بغداد میں ایرانی النسل مسلمانوں کی اکثریت رہی۔ مگر اوپری طبقہ کیونکہ اصل میں عرب تھا اس لیے ثقافت میں اس کا سکہ ہی چلا۔ لباس، طرزِ معاشرت، طرزِ تعمیر، گھریلو سامان اور گلی محلے میں عرب ثقافت کا سکہ ہی چلتا تھا۔ عربی نے یہاں اپنی برتری اس طرح قائم کی تھی کہ دوسری تمام زبانیں معدوم ہو کر رہ گئی تھیں اور یہاں مشکل سے ہی کوئی دوسری زبان سنائی دیتی تھی۔ یہی صورتِ حال دسترخوان پر تھی۔ دنیا جہان کے کھانے کھائے جاتے تھے لیکن اس میں بھی عربی انداز برقرار تھا۔

عربوں کو جس شعبے میں ایران پر واضح برتری حاصل تھی وہ زبان تھی۔ عربی میں جو سلاست، روانی، الفاظ کی فراوانی اور سادگی و پُرکاری تھی فارسی زبان بے پناہ تحریری ادب رکھنے کے باوجود اس سے محروم تھی۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ فارسی دوسرے درجے کی زبان تھی۔ آج بھی قدیم فارسی کی شاعری اور نثر کی شان و شوکت پڑھنے والوں کو مسحور کر دیتی ہے۔ لیکن اپنی بہت زیادہ سجاوٹ اور پیچیدگی کی وجہ سے یہ نہ صرف نچلے طبقوں میں غیر مقبول ہوگئی بلکہ فارسی نہ بولنے والی اقوام نے بھی اسے قبول نہیں کیا۔ جیسا کہ بتایا ہے کہ عرب قبائل صدیوں سے سلطنتِ فارس کی حدود میں آباد تھے اور انہوں نے ایرانی زبان نہیں اپنائی تھی۔ اسی طرح فارس کی سلطنت کے دوسرے مقبوضات میں بھی فارسی رواج نہیں پا سکی تھی۔ ایک زمانے میں مصر اور شام کے ساتھ ساتھ وسط ایشیا کا بڑا حصہ اور یمن بھی ایران کے قبضے میں تھا۔ مگر یہاں بھی فارسی کو رواج حاصل نہیں ہوا۔ اس کے برعکس عرب جہاں گئے مقامی آبادی نے ان کی زبان اپنا لی۔ مصر، عراق، شمالی افریقا اور ایران کے شمال مغربی حصے اس کی بہترین مثال ہیں۔ آج بھی ان خطوں میں آباد نصف ایرانی نسل سے تعلق رکھنے والی آبادی عربی زبان بولتی ہے۔ افریقا کے بربر اور مراکشی افریقی قبائل ہوں یا صومالیہ اور کینیا کے حبشی ہوں وہ سب عربی بولتے ہیں۔ حد یہ کہ جو اقوام مسلمان نہیں ہوئیں ان کی زبان بھی عربی ہے۔ یہ اس زبان کی سادگی اور خوب صورتی ہے جس نے ایک عالم کو مسخر کر لیا۔ آج یہ بولنے کے لحاظ سے مینڈرین (چینی)، انگریزی وغیرہ کے بعد چھٹی بڑی زبان ہے۔

خود بشار نے ساری عمر عربی میں شاعری کی اور اس نے ایک بار بھی کسی اور زبان میں شعر نہیں کہا۔ دولت مند ہونے کے باوجود وہ سادہ اور پرانے انداز میں زندگی بسر کرتا تھا۔ اس کا لباس وہی تھا اور طرزِ زندگی میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اسی وجہ سے اس نے کھل کر مخالفین کو چیلنج کیا تھا اور ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ان میں سے کوئی عربی تمدن کے تحت زندگی گزارنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا، خود منصور خلیفہ ہوتے ہوئے یہ دعویٰ نہیں کر سکتا تھا اس لیے اس کے خلاف الزام واپس لینے میں ہی عافیت سمجھی تھی۔ بشار کا دل بغداد میں نہیں لگ رہا تھا۔ دوسرے اس کی چھٹی حس اشارہ دے رہی تھی کہ اس کے مخالف اب اس کے خلاف کوئی خوفناک منصوبہ بنا رہے ہیں۔ اس لیے اس نے خلیفہ سے اجازت چاہی کہ اسے واپس بصرہ جانے کی اجازت دی جائے۔ مگر منصور نے انکار کر دیا۔ اس نے بشار سے کہا۔ "میرے آس پاس سب جھوٹ بولنے والے ہیں اس لیے میں واحد سچ بولنے والے کو خود سے دور جانے کی اجازت نہیں دوں گا۔"

بشار اس قدر دانی پر خوش ہوا تھا اور اس نے دوبارہ بصرہ جانے کا نہیں کہا لیکن قدرت کو اس کی یہ خوشی پسند نہیں آئی تھی۔ ان ہی دنوں منصور بیمار ہوا۔ اس کی بیماری کے دوران مہدی نے کاروبارِ مملکت سنبھال لیا تھا۔ بشار کی مہدی سے قربت نہیں تھی اور نہ ہی شہزادے نے کبھی اسے کلام سنانے کے لیے اپنی محفل میں طلب کیا تھا۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ اسے بشار سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ بدقسمتی سے بشار نے اس اشارے کو سمجھا نہیں اور وہ بدستور بغداد میں مقیم رہا۔ دوسرے اس نے غور نہیں کیا کہ مہدی کی معتزلہ سے گاڑھی چھن رہی ہے اور اس کی نجی محفلوں میں یہ لوگ شریک ہوتے تھے۔ وہ مسلسل مہدی کی برین واشنگ کر رہے تھے۔ ایک طرف وہ اسے خلقِ قرآن کے عقیدے پر قائل کر رہے تھے۔ دوسرے اپنے دشمنوں کے خلاف اس کے دل میں عداوت پیدا کر رہے تھے اس لیے جب منصور کا انتقال ہوا اور مہدی نے تختِ خلافت پر قدم رکھا تو وہ پوری طرح معتزلہ کے زیرِ اثر آچکا تھا۔ اسے شعر و شاعری سے زیادہ مذہب کے بارے میں نام نہاد فلسفیانہ خیالات سے دلچسپی تھی۔

بشار منتظر تھا کہ نیا خلیفہ اسے دربار میں طلب کرے گا اس سے کلام سنے گا اور قدر دانی کرے گا لیکن مہدی منصور سے مختلف مزاج رکھتا تھا۔ سفاکی میں وہ سفاح پر گیا تھا اور منصور کی نرمی اور تحمل مزاجی سے اسے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ اس لیے بشار کی دربار میں پہلی طلبی کلام سنانے کے لیے نہیں بلکہ پرانے الزامات پر دوبارہ سے جواب طلبی کے لیے ہوئی تھی۔ بشار حیران تھا کہ اسے ایک ہی مقدمے میں دوبارہ طلب کیا گیا تھا۔ دنیا میں کسی بھی طریقۂ انصاف میں یہ اصول نہیں ہے کہ انسان کو ایک ہی مقدمے میں دوبارہ عدالت کا سامنا کرنا پڑے لیکن یہ قاضی کی نہیں حکومت کی عدالت تھی جہاں انصاف کے تقاضوں سے زیادہ صاحبِ امر کی مرضی چلتی تھی۔ اس بار یہ طلبی بھرے دربار میں ہوئی تھی۔ بشار دربار میں حاضر ہوا۔ اس پر پہلے والے الزامات دہرائے گئے اور اس نے پہلے کی طرح صفائی پیش کی۔ لیکن اس بار وہ ناکام رہا اور مہدی نے اس کی صفائی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ "تمہارے اشعار خود تمہارے خلاف گواہ ہیں۔"

بشار نے بغیر گھبرائے یا ڈرے اعتماد سے جواب دیا۔ "امیر المومنین! آپ یا الزام لگانے والے شاعری کے ماہر نہیں ہیں اس لیے اگر کوئی شاعر یہ بات کہے تو میں مان بھی لوں بہ شرط کہ وہ شاعر میرے پائے کا ہو۔"

"سنا آپ نے امیر المومنین یہ شخص آپ کو شاعری سے بے بہرہ قرار دے رہا ہے۔" ایک مخالف نے مہدی کو اکسانے والے انداز میں کہا۔ "کیا یہ حضور کی شان میں گستاخی نہیں ہے۔"

حسبِ توقع مہدی برہم ہو گیا۔ اس نے بشار سے کہا۔ "تم اس بارے میں کیا کہتے ہو؟"

"یہ بہتان ہے امیر المومنین، میں نے آپ کو شاعری سے بے بہرہ نہیں کہا ہے۔ آپ کو خدا نے تمام مسلمانوں کا

معروف افسانوی کردار

- ابینو ...... ایچنڈ رو کا کردار
- پال اتریڈیس ...... ڈونے یونیورس کا کردار
- جی کار ...... بے بی لون کا کردار
- جیورڈی لافورج ...... اسٹار ٹریک کا کردار
- پیلے فومس ...... اوڈیس کا کردار
- اوڈی فوز ...... یونانی کرداز
- ٹریسیس ...... یونانی کردار
- جمر بنسو تم ...... اندھا خانساماں مشہور فلم مرڈر بائی ڈیتھ
- ڈاکٹر میڈ نائٹ ...... کومکس کا مشہور کردار

طارق عزیز خان، رحیم یار خان

حکمران بنایا ہے اس معاملے میں کوئی آپ کی ہمسری نہیں کر سکتا ہے۔ آپ سیاست وحکومت میں کمال رکھتے ہیں اور آپ کے لیے ہر شعبے میں کمال رکھنا ضروری نہیں ہے۔ یہ کام آپ کے آدمی اور غلام کرتے ہیں۔ میں نے اسی کی طرف اشارہ کیا۔''

مہدی منصف کے بجائے مدعی کا کردار ادا کر رہا تھا اس نے بشار پر ایک نیا الزام لگایا۔ ''تم مخرب الاخلاق شاعری کرتے ہو جس سے لوگوں کا اخلاق بگڑنے کا خدشہ ہوتا ہے۔ تم خلافت سے وابستہ ہو اس سے خلافت کی بھی بدنامی ہوتی ہے اس لیے آیندہ سے تم رومانی شاعری نہیں کروگے۔''

بشار ششدر رہ گیا تھا۔ ایسی پابندی تو آج تک کسی پر نہیں لگائی گئی تھی۔ اس نے مہدی کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ ''امیر المومنین، میں آپ کے حکم پر شاعری چھوڑ سکتا ہوں لیکن کوئی مجھے یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں فلاں موضوع پر شاعری کر سکتا ہوں اور فلاں پر نہیں۔''

مخالفوں کی چال کامیاب رہی تھی اور مہدی کا مزاج بگڑ گیا تھا۔ اس نے بشار کو سخت سنائیں اور اسے دربار سے نکل جانے کا حکم دیا۔ اس نے بشار کو سزا نہیں سنائی تھی اور شاید اس کا مقصد یہ تھا کہ بشار دل برداشتہ ہو کر دربار چھوڑ کر چلا جائے۔ وہ اس نابینا شخص کو سزا دے کر اپنے دامن پر داغ نہیں لگوانا چاہتا تھا۔ مگر وہ بشار کے مزاج اور فطرت کی تلخی سے واقف نہیں تھا۔ بشار کسی کی غلط بات برداشت کرنے والوں میں سے نہیں تھا۔ مہدی کے سلوک نے اسے دشمن بنا دیا تھا اور اپنے دشمنوں کے لیے اس کے پاس ایک ہی ہتھیار تھا۔ اس نے چند دن بعد ایک نظم کہی — اس میں مہدی پر طنز کیے کہ وہ اس گدھے کی طرح ہے جس پر بوجھ لادا جاتا ہے اور وہ اس سے بے خبر ہوتا ہے کہ اس پر ریشم و کمخواب کے تھان لدے ہیں یا مٹی لادی گئی ہے۔ اسی طرح مہدی بے خبر تھا کہ اس کے مشیر اسے کیا سکھا پڑھا رہے تھے اور وہ گدھے کی طرح ان کے افکار لادے ہوئے تھا۔ یہ نظم بشار کی زبان سے نکلی اور چند دن میں بصرہ جا پہنچی تھی۔

اس نظم نے بشار کے دشمنوں کو وہ مواد فراہم کر دیا جس کی مدد سے وہ اسے موت کے دروازے تک لے جا سکتے تھے۔ جب اس نظم کا چرچا ہوا اور انہوں نے سنا تو وہ خوشی سے اچھل پڑے تھے۔ اخلاقیات، مذہب اور تمدن کے بارے میں بشار کی ساری شاعری وہ کام نہیں کر سکتی تھی جو اس چھوٹی سی نظم نے کر دیا تھا۔ حالانکہ بشار نے اس میں کھل کر مہدی کا نام نہیں لیا تھا اور نہ ہی خلافت کا حوالہ دیا تھا اس کے باوجود اس نظم کا ایک ایک لفظ چیخ چیخ کر مہدی کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ یہ شدید ہجویہ شاعری تھی جس میں بشار نے اپنے فن کا نچوڑ نکال کر پیش کر دیا تھا۔ اس نظم میں اس نے صرف اپنا فن ہی نہیں اپنی زندگی بھی پیش کر دی تھی۔ کیونکہ جیسے ہی اس کے مخالفوں نے یہ نظم نمک مرچ لگا کر مہدی کے سامنے پیش کی اس نے بلا توقف بشار کی گرفتاری کا حکم جاری کر دیا۔

بشار کے شاگرد اور مداح اس سے التجا کر رہے تھے کہ وہ روپوش ہو جائے اور مہدی کے قہر وغضب سے اپنی جان بچا لے لیکن اس نے انکار کر دیا۔ اس نے ہنس کر کہا۔ ''میں ایک نابینا شخص ہوں جو ستر سال کی زندگی گزار چکا ہے۔ ایک نابینا شخص کے لیے یہ ایک بہت طویل زندگی ہے۔ مجھے بہت کچھ نہیں ملا لیکن بہت کچھ ایسا ملا ہے جو کسی اور کو نہیں ملا۔ اگر میں چھپ جاؤں اور بچ جاؤں تب بھی کتنا جی لوں گا۔ نہیں میرے بچو اب میں قبر میں سو جانا چاہتا ہوں۔ ایسی نیند کہ جس کے بعد جاگ نہ آئے۔ میں بہت تھک گیا ہوں۔''

یہ الفاظ بالکل وہی تھے جو سقراط نے کہے تھے۔

جب مہدی کے سپاہی بشار ابن برد کو گرفتار کر کے لے جا رہے تھے تو اس کے شاگرد اور مداح دھاڑیں مار کر رو رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا وہ اسے اب زندہ نہیں دیکھ سکیں گے۔ بشار کا جرم نہایت سنگین تھا۔ اس نے خلافت پر تنقید کی تھی، اس کا مذاق اڑایا تھا اور اس کی کم سے کم سزا بھی موت تھی۔ مگر اس کے مخالفین اسے آسان موت دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اب نامعلوم یہ مہدی کا حکم تھا یا ان دشمنوں نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ ایک بوڑھے اور نابینا شخص کو جیل میں جلادوں نے تشدد کر کے موت کے گھاٹ اتارا۔ اسے تازیانوں اور لوہے کی زنجیروں سے اس وقت تک مارا گیا جب تک اس کی جان نہیں نکل گئی تھی۔ مرنے کے بعد اس کی قبر میں سونے کی خواہش بھی پوری نہیں ہونے دی گئی اور اسے دریائے دجلہ میں پھینک دیا گیا۔ بشار ابن برد دریا بُرد ہوا۔ مگر اس کی شاعری نہ دریا بُرد ہوئی اور نہ اسے موت آئی۔

مغنیِ ہند

وحید ریاست بھٹی

برصغیر کا وہ پہلا گلوکار جس نے پسِ پردہ گلوکاری کو جنم دیا اور ایک نئے طرز کی بنیاد پڑی۔ اس بارے میں بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ معروف گلوکار بینائی کی قوت سے محروم تھا مگر اس کی اداکاری ایسی تھی کہ دیکھنے والے اش اش کر اٹھتے۔ وہ اپنے وقت کا سپراسٹار تھا۔ لوگ اس کا نام سن کر سنیما ہال کا رخ کرتے۔ اس کے گائے ہوئے گیت فوراً مقبولیت حاصل کرلیتے۔ ایک ایک دن میں اس کے دسیوں ریکارڈ بکتے۔ لوگ اس کے گانے سن کر وجد میں آجاتے۔ مندروں میں اس کے بھجن گائے جاتے تو محفلِ سماع میں اس کی قوالی گونجتی، نعت سنی جاتی۔

برصغیر کے پہلے بیک گراؤنڈ سنگر کا تذکرہ

2013ء سے ٹھیک ایک سو سال پہلے 1913ء میں دادا صاحب پھالکے نے ''راجا ہریش چندر'' کے نام سے پہلی فیچر فلم بنائی۔ یہ فلم بنا کر وہ فلم انڈسٹری کے باوا آدم کہلائے۔ یہ ایک خاموش فلم تھی اور اس میں ہیروئن کا کردار ایک مرد نے کیا تھا۔

1931ء تک خاموش فلمیں بنتی رہیں، نئے نئے تجربے ہوتے رہے اور تھیٹر کی دنیا اجڑتی گئی۔

1931ء میں برصغیر کی فلمی دنیا نے ایک اور جست

بھری، خاموش فلموں کو زبان دے دی گئی۔ مسلم کلچر کے پس منظر میں عالم آرا بنائی گئی جس میں ماسٹر وٹھل اور زبیدہ نے مرکزی کردار ادا کیے تھے۔ اس فلم کے موسیقار (فیروز شاہ مستری) اور بی، ایرانی تھے۔ اس فلم میں کل ملا کے سات گانے تھے۔ پہلا گانا ایک مسلم اداکار و گلوکار ڈبلیو۔ ایم خان (وزیر محمد خان) نے گایا تھا اور دوسرا گانا زبیدہ نے' انہی دونوں پہ یہ گانے پکچرائز ہوئے تھے۔ اس فلم میں موجودہ دور کی ایک بڑی اداکارہ کرینہ کپور کے پردادا پرتھوی راج کپور، جو بولیووڈ کے معروف خاندان (کپور گھرانا) کے جد کہلاتے ہیں انہوں نے بھی کام کیا تھا اور اس فلم کے ڈائریکٹر تھے اردیشر ایرانی ان کا تعلق پارسی یعنی آتش پرست خاندان سے تھا۔

پارسی مذہب میں گانا عبادت کا درجہ رکھتا ہے اس لیے ان کے ذہن و دل پر بھی موسیقی کی چھاپ لگی ہوئی تھی۔ اس لیے انہوں نے فلم میں موسیقی کو بھی شامل کیا اور یہ تجربہ پسند کیا گیا اس لیے بھی اس تجربے نے مقبولیت حاصل کی کیونکہ کہانی، ڈائریکشن یا کوئی اور شعبہ کمزور ہو تو اچھی موسیقی اس کمی پر پردہ ڈال دے اور لوگ گانے کی وجہ سے بھی اس فلم کو دیکھنے جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ برصغیر کی فلموں میں گانے کو اہمیت دی جانے لگی۔ گویا اردیشر ایرانی عالم آرا کے ڈائریکٹر نہ ہوتے تو شاید فلمی موسیقی کا وجود نہ ہوتا۔

یاد رہے کہ عرب میں گانوں کو عوامی مقبولیت حاصل ہے اور فارس میں بھی۔ برصغیر میں تو اسے عبادت کا درجہ حاصل ہے۔ ہندو بھجن کے نام پر بھگتی گیت گاتے ہیں۔ مسلمانوں میں بھی قوالی کو عروج حاصل ہے۔ گویا عوام میں گیت پسندیدگی کی سند رکھتا ہے۔ اردشیر ایرانی نے اسی مقبولیت کو کیش کرنے کے لیے اپنی فلم میں گیت شامل کیے تھے اور بولتی فلموں میں گانوں کا رواج چل پڑا تھا۔ لوگ جوق در جوق سینما ہال میں نوٹنکی دیکھنے اور گانے سننے کے لیے آنا شروع ہوگئے۔ پہلے پہل سینما ہال کے سامنے سازندے بیٹھے ہوتے اور فلم کے ساتھ ساتھ گانے گائے جاتے پھر گانوں کی تعداد بھی بڑھنے لگی۔ ایک مایوس کن بات یہ کہ شروع کی فلمی موسیقی بس خانہ پری تھی۔ منشی ٹائپ قلمکار گیت لکھ دیتے تھے..... وہی اداکار فلم میں کام کرتے جو گانا بھی گا سکتے تھے۔ اس سے یہ نقصان ہوا کہ نہ ہی اچھے اداکار اور نہ ہی اچھے گلوکار ابتدائی دور میں ہمیں نظر آتے ہیں۔ فلموں میں گانوں کی بہتات کا آپ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ 1932ء میں بنی فلم "اندر سبھا" میں 71 گانے تھے جس کا ایک بھی گیت آج کہیں نہیں سنا جاتا۔ اسی طرح مشرقی پاکستان (اب بنگلہ دیش) کی فلم روپ بان، (1965) میں 100 گانے تھے۔

1931ء سے 1940ء تک 931 فلمیں ریلیز ہوئیں اور ان میں 9000 کے قریب گانے تھے اور ان گانوں کو گانے والوں میں ماسٹر مدن، پنکج ملک، کے ایل سہگل، ڈبلیو، ایم خان اور کے سی ڈے تھے۔

برصغیر کی فلمی تاریخ کے اس پہلے نابینا اداکار، گلوکار اور موسیقار کرشنا چندر ڈے کا جنم کلکتہ میں ہوا۔ ایک غریب خاندان کے چشم و چراغ تھے اس وجہ سے کوئی خاص تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ ابھی ان کی عمر تقریباً 14 برس تھی کہ شدید بیمار ہوگئے اور اپنی آنکھوں کے نور کو گنوا بیٹھے۔ یہ بات ہے 1907ء کی ہے اس لحاظ سے کے سی ڈے کا سال پیدائش بنتا ہے 1893ء۔

کہا یہ جاتا ہے کہ اگست 1893ء میں جنم اشٹھی کے روز وہ پیدا ہوئے۔ جنم اشٹھی کا تہوار کرشن کی پیدائش کی خوشی میں مناتے ہیں اسی لیے اس دن کو شبھ مانا گیا۔ اس کے والد کا نام شیب چندر ڈے تھا اور والدہ کا نام رتن بالا۔ والدین نے کرشن بھگوان سے عقیدت کی بنا پر ان کا نام کرشنا رکھا تھا۔ کے سی ڈے نے آنکھیں تو کھو دیں لیکن ہمت بالکل نہیں ہاری اور علم موسیقی میں دن رات محنت و ریاضت سے عبور حاصل کیا۔ ان کے اساتذہ میں سشی بھوشن ڈے۔ ستیش چٹوپادھے اور درشن سنگھ کا نام آتا ہے۔ ان کے علاوہ استاد کرامت اللہ۔ استاد بادل خان، امرناتھ بھٹہ چاریہ، زبیر خان، ستیش دتہ اور رادھارامن داس۔ موسیقی کی ابتدائی تعلیم سشی بھوشن ڈے سے حاصل کی۔ خیال استاد بادل خان، دھروپد رانی بابو اور طبلہ مہاراج بنارس والے سے سیکھا۔ 31 سال کی عمر میں یعنی 1924ء میں کلکتہ کے جاترا (بنگالی تھیٹر) سے وابستگی ہوئی اور اپنے وقت کے مشہور ڈراما نویس سیسیر بہاری کے ڈراموں سیتا اور وسنت لیلا میں اداکاری کے ساتھ ساتھ گلوکاری بھی کی۔ یہ ڈرامے الفرید تھیٹر میں پیش کیے گئے تھے جو اب گریس سینما کہلاتا ہے۔ پھر اس کے بعد مشہور اداکار اور تھیٹر کی جان رابندر موہن رائے کے ساتھ کئی ڈراموں میں

گلوکاری اور اداکاری کے جوہر دکھائے۔ 1917ء میں انہوں نے گراموفون کمپنی کے لیے پہلی بار گا کر عملی زندگی کا آغاز کیا اور وہ ریکارڈ کافی تعداد میں فروخت ہوا تھا۔

تھیٹر نے جب ترقی کی منازل طے کرتے کرتے بولتی فلموں کے دروازے پر دستک دی تو کے سی ڈے بھی کلکتہ کے مشہور فلمی ادارے نیو تھیٹرز سے وابستہ ہوگئے۔

نیو تھیٹرز نے 1932ء میں ایک فلم چنڈی داس، بنانا شروع کی جس کے ڈائریکٹر نیتن بوس تھے اور اداکاروں میں کے ایل سہگل، اوما ششی اور پہاڑی سانیال شامل تھے۔ فلم کی موسیقی آر سی بورال (رائے چند بورال) نے ترتیب دی تھی۔ یہ فلم 1934ء میں ریلیز ہوئی اور ہٹ ہوگئی۔ اسی فلم سے کے سی ڈے نے اپنے فلمی کیریئر کا آغاز کیا۔ نیو تھیٹرز میں بطور گلوکار و اداکار ملازمت اختیار کرلی اور کئی فلموں میں کام کیا، گیت گائے۔ 1933ء میں ریلیز ہونے والی فلم پورن بھگت میں کے ایل سہگل، انوری اور کمار کے ساتھ کے سی ڈے نے بھی اداکاری و گلوکاری کے جوہر دکھائے ان کی آواز میں یہ گانا کو بہت زیادہ پسند کیا گیا تھا۔ "جاؤ جاؤ رے میرے سادھو، رہو گرو کے سنگ" یہ فلم بھی ہٹ ثابت ہوئی تھی۔

کے سی ڈے 1937ء میں ایسٹ انڈیا فلم کمپنی میں چلے آئے اور فلم "نل دمتی" کی موسیقی ترتیب دی۔ ان کے گائے ہوئے گانے کافی پسند کیے گئے تھے۔ یہ ایک مذہبی فلم تھی اور اس کے ہدایت کار مشہور ڈراما نگار آغا حشر کشمیری تھے۔ اس کے بعد بھی کے سی ڈے نے اس ادارے کی کئی کامیاب فلموں کی موسیقی ترتیب دی۔ مثلاً ساوتری (1933ء)، آبِ حیات (1933ء)، قسمت کی کسوٹی (1934ء)، سیتا (1934ء)، چندر گپت (1934ء)، بدروہی (1935ء)، نائٹ برڈ (1934ء)، اور سنہرا سنسار (1936ء)۔ اسی دوران ممبئی سے دعوت آگئی اور وہ مشہور فلمساز ادارے ساگر مووی ٹون کے بینر تلے بننے والی ایک فلم "شہر کا جادو" کی موسیقی ترتیب دینے ممبئی چلے گئے۔ یہ فلم 1934ء میں بنی۔ اس فلم کے اداکار تھے کمار اور سبیتا دیوی جبکہ ہدایت کار تھے کے پی گھوش۔ ساگر مووی ٹون کی فلم گرہ لکشمی (1934ء) میں اداکاری کے ساتھ گلوکاری بھی کی۔ اس فلم کے موسیقار تھے ایس پی رائے اور ہدایت کار تھے سروتم بادامی۔

کے سی ڈے نے فلم "بدروہی" (1935ء) میں اداکاری اور گلوکاری کی تھی۔ ان کے گیت کافی مشہور ہوئے تھے مثلاً "جب سے دیکھے بانکے نین"۔ "پربھو جی نیا لگا دو موری پار"۔ "لاگ گئی پھر لاج کہاری"۔ "جگا دے اب اے صبا ان کو، پڑے جو غفلت میں سو رہے ہیں۔" ان کی موسیقی بھی کے سی ڈے نے خود ترتیب دی تھی' اس فلم کے ہیرو پشاور کے "گل حمید" تھے۔

ان کی موسیقی سے مزین ایک اور فلم "نائٹ برڈ" یادرہ جانے والی فلم ہے۔ اس فلم کے ہدایت کار دھیرن گنگولی اور ہیرو گل حمید تھے۔ کے سی ڈے کے یہ گیت نہایت دلآویز تھے۔ "جیب و دامن کے پرزے اڑائے جائیں گے"

"قصہ تمام دل کا ہو، دلبر کے سامنے"

"زباں پہ آئے نہ ہرگز گلہ جدائی کا۔" یہ گانے اپنے وقت میں بہت مقبول ہوئے تھے۔

سرزمینِ بنگال دو وجہ سے بہت مشہور ہے، ایک سُر، (موسیقی) اور دوسری وجہ سحر (جادو)۔ سرزمینِ بنگال سے تعلق رکھنے والے موسیقی کے میدان میں جہاں کھیم چند پرکاش، سلیل چودھری، ایس ڈی برمن، انل بسواس، ہیمنت کمار جیسے موسیقار فلمی دنیا کی پہچان ہیں وہیں کے سی ڈے بھی اسی سرزمین سے جنم لینے والی عظیم شخصیت ہیں۔

1935ء برصغیر کی فلمی تاریخ میں ہمیشہ یادرہ جانے والا سال ہے کیونکہ اسی سال پہلی بار پلے بیک سنگنگ کا

بغداد کا طبیب ابوالحسن اپنے وقت کا عظیم معالج تھا۔ اپنی عمر کے آخری بیس سالوں میں وہ نابینا ہونے کے باوجود کامیاب معالج رہا۔

قتادہ بن دعامہ السدوسی بصارت سے محروم ہونے کے باوجود بڑے صاحب کمال اور جامع العلوم بزرگ تھے۔ وہ جلیل القدر تابعی عالم، محدث، فقیہہ، مفسرِ قرآن اور ماہر انساب واخبار و اشعار تھے۔ عربی زبان اور لغت کے مستند امام تسلیم کیے جاتے تھے۔ لوگ روزانہ ان کے پاس علمی، لغوی اور ادبی مسائل پوچھنے کے لیے حاضر ہوتے تھے۔ امام احمد بن حنبل "بھی انہیں "احفظ اہل البصرہ" کہہ کے ان کے حافظے کی داد دیتے تھے۔ بعض نے انہیں "احفظ الناس" بھی کہا ہے۔ قوتِ حافظہ کا یہ عالم تھا کہ جو سنتے فوراً یاد ہو جاتا۔

مرسلہ: ارشد سہیل، اسلام آباد

تجربہ کیا گیا اور بے حد کامیاب رہا۔ پورا واقعہ شائقینِ موسیقی کے لیے دلچسپ ثابت ہوگا۔ ہوا یوں کہ 1935ء میں کے سی ڈے ایسٹ انڈیا کمپنی اور دیگر فلمساز اداروں سے کنارہ کش ہوکر اپنے سابقہ اور اولین ادارے نیو تھیٹرز سے دوبارہ وابستہ ہوگئے۔ 1935ء میں بنگالی فلم ''بھاگیہ چکرا'' کاری میک بنا تو اس کا ہندی نام رکھا گیا ''دھوپ چھاؤں'' نیو تھیٹرز کے بینر تلے بننے والی اس فلم کے ہدایت کار تھے نیتن بوس، جبکہ اس کی کاسٹ میں پہاڑی سنیال، اوما ششی، بی بھادری، بکرم کپور، نواب کیدار شرما، ترلوک کپور، سردار اختر اور کے سی ڈے شامل تھے۔ اس فلم کی موسیقی ترتیب دے رہے تھے آر سی بورال اور پنکج ملک۔ اس فلم میں اسٹیج پہ ایک لمبا سین تھا اور وہاں بھاری کاسٹ موجود تھی اور گانا بھی گایا جانا تھا۔ نیتن بوس کے لیے مشکل یہ تھی کہ ایک کیمرے اور ایک مائیک کے ساتھ اتنے سارے اداکاروں کی آواز ریکارڈ کرنا اور پھر گانا بھی پیش کرنا کافی مشکل کام تھا انہوں نے اس مشکل صورتِ حال کو اپنے بھائی مُکل بوس جو کہ اس فلم کے ساؤنڈ ریکارڈسٹ تھے، سے ڈسکس کیا اور دونوں بھائی فلم کے میوزک ڈائریکٹر پنکج ملک کے گھر گئے تاکہ گیت کے حوالے سے بات کریں، جب دونوں بھائی پنکج ملک کے گھر پہنچے تو وہ ایک گیت ریکارڈ پہ سن رہے تھے اور ساتھ ساتھ گنگنا رہے تھے، نیتن بوس نے وہیں سے ایک آئیڈیا لیا کہ کیوں نہ اسی طرح گیت پسِ پردہ ریکارڈ کر کے چلایا جائے اور اسٹیج پر اداکار اپنے ہونٹوں کو حرکت دیں۔ دونوں بھائیوں اور موسیقار پنکج ملک میں یہ بات طے ہوگئی اور یوں ہندی فلم انڈسٹری کا پہلا گیت بطور پلے بیک سنگرز کے سی ڈے اور گلوکارہ سپروا ساریکا کی آواز میں ریکارڈ کیا گیا۔ گویا پہلا گیت ایک دوگانہ تھا جسے کے سی ڈے اور سپروا ساریکا نے آواز دی مگر پردے پر فلمایا گیا کے سی ڈے، پہاڑی سنیال اور اوما ششی پر۔ اس گیت کے بول کچھ یوں تھے ''میرے گھر موہن آئیو، جنم جنم کے سنکھٹ سارے، سندر روپ دکھائیو'' اور یوں ہندی فلموں میں پلے بیک سنگنگ کا دور شروع ہوگیا۔

کے سی ڈے نے اس فلم کے علاوہ متعدد فلموں میں بطور اداکار و گلوکار اپنے جوہر دکھائے مثلاً دیوداس (1935ء)، انقلاب (1935ء)۔ دھرتی ماتا (1938ء)۔ مایا (1936ء)۔ سپیرا (1939ء)..... ودیا پتی (1937ء)۔ میناکشی (1942ء) وغیرہ۔

فلم دھوپ چھاؤں (1935ء) میں ان کا یہ گیت بھی بہت مشہور ہوا تھا ''تیری گٹھڑی کو لاگا چور مسافر جاگ ذرا'' اور ''من کی آنکھیں کھول رے بابا''۔ فلم ''دیوداس'' جو کہ ہٹ فلم تھی اور موسیقار تمر برن نے اس کی موسیقی ترتیب دی تھی۔ کے ایل سہگل نے اس فلم میں دیوداس کا لافانی کردار ادا کیا تھا۔ اس کے تمام گانے کے سی ڈے نے گائے تھے جو کہ سپر ہٹ ہوئے تھے۔ مت بھول مسافر تجھے دور ہے جانا اور نہ آیا میرے من کا میت۔ دیوداس کے بعد ''میناکشی'' کے گانے مقبولیت کی معراج پر نظر آئے۔ تمر برن اس کے موسیقار تھے۔ ''کوئی لے لو بھیا یہ تعویذ'' اور ''من مورکھ کہنا مان'' نے تو مقبولیت کا آسمان چھولیا تھا پھر فلم ودیا پتی (1937ء) میں ریلیز ہوئی۔ اس کی موسیقی آر سی بورال نے ترتیب دی تھی۔ اس فلم کے گیت ''پنگھٹ پہ کنہیا آتا ہے اور آکر دھوم مچاتا ہے۔'' اور ''گوکل سے گیے گردھاری، سوگئی سونی نگری ساری'' نے بھی مقبولیت کے ریکارڈ توڑ دیے۔

1937ء میں کے سی ڈے نے موتی محل تھیٹرز کے بینر تلے بننے والی فلم ''ملاپ'' کی موسیقی مرتب کی۔ اس فلم کے ہدایت کار اے آر کاردار تھے۔ اس فلم کے گانے بھی کافی پسند کیے گئے۔ انہوں نے اس کے بعد فلمساز ادارے انٹرنیشنل فلم کرافٹ کی ''پجارن'' کے لیے کئی گیت گائے جس کی موسیقی تمر برن نے ترتیب دی تھی ..... رس گھولتی موسیقی میں ان کی درد بھری آواز نے گیتوں کو مقبولیت کی معراج پر پہنچا دیا تھا۔ 1940ء میں ان گیتوں کو سرتاج قرار دیا گیا تھا۔ اسی دوران آندھی نمائش کے لیے پیش کی گئی۔ اس کی موسیقی کے سی ڈے نے ترتیب دی تھی جبکہ اس فلم کے ہدایت کار دینیش رنجن داس تھے۔ اس فلم میں کے سی ڈے کے گیت بہت پسند کیے گئے تھے۔ خصوصاً یہ دو گیت ''آکر چلا گیا طوفان'' اور ''مان نہ کر اب بجن۔''

1942ء میں کے سی ڈے کلکتہ سے بمبئی آگئے اور مشہور فلمساز ادارے لکشمی پروڈکشنز کی فلموں ''میرا گاؤں'' جس کے ہدایت کار پرافول رائے تھے اور ''تمنا'' جس کے ہدایت کار فانی موجمدار تھے، اس کی موسیقی ترتیب دی اور کریکٹر ایکٹر کے رول بھی کیے۔

فلم ''تمنا'' میں انہوں نے اپنے بھتیجے ''منا ڈے'' کے

ساتھ گلوکارہ ''ثریا'' کی آواز میں ایک دوگانہ بھی ریکارڈ کیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس وقت ''ثریا'' کی عمر صرف 9 سال تھی جبکہ منا ڈے کی عمر 23 سال۔ عمر کے فرق کے باوجود بھی آواز میں کہیں جھول نہیں تھا۔ اسی دوران کے سی ڈے نے فلمساز ادارے لکشمی پروڈکشنز کی فلم محبت (1943ء) وینس پکچرز کی فلم ''ناری'' (1942ء) اور رنجیت مووی ٹون کی فلم ''اندھیرا'' (1943ء) کے لیے اپنی آواز میں گیت ریکارڈ کرائے۔

(1943ء) میں کے سی ڈے نے اروڑا فلمز کی ایک فلم ''سنو سناتا ہوں'' کی موسیقی ترتیب دی جس کے ہدایت کار راجمار تھے اس کے بعد مشہور گلوکار ''خان مستانہ'' کے ساتھ مل کر مراری پکچرز کی ایک فلم ''بدلتی دنیا'' (1943ء) کی موسیقی ترتیب دی جس کے ہدایت کار موہن سہنا تھے۔ کے سی ڈے کے یہ گیت عوام میں کافی دلچسپی سے سنے گئے۔

''دنیا کے اس کھیل میں۔''

''اس بدلتی دنیا میں۔''

1945ء میں کے سی ڈے نے نیو مہاراشٹر پکچرز کی ایک فلم ''دیوداسی'' کی موسیقی ترتیب دی جبکہ فلم کی ڈائریکشن کے فرائض سی ایس بوس نے سرانجام دیے تھے۔ 1946ء میں کے سی ڈے نے دُرگا پکچرز کی فلم ''دور چلیں'' کی موسیقی مرتب کی جبکہ فلم کے ہدایت کار فانی موجمدار تھے، اسی فلم میں گلوکارہ ''مینا کپور'' کے ساتھ یہ دوگانے کافی پسند کیے گئے۔

- نہ رونا نہ رونا میرے آنسوؤں
- آج یہ کیسی بیا کلتا ہے
- زندگی میں نئی کہانی نئی امنگیں
- دور چلیں کہیں دور

اس کے علاوہ کے سی ڈے نے روشنی پکچرز کی ایک فلم ''انصاف'' (ہدایت کار فانی موجمدار) اور مرلی مووی ٹون کی فلم ''شرون کمار'' (ہدایت کار رام دریانی) کے لیے کئی مقبول گیت گائے۔

پربھو یہ کیسا انیائے

گاؤں سے چل دور کہیں

تقسیم ہند کے بعد کلکتہ میں ہندی فلمیں بننا تقریباً ختم ہوگئیں اور کے سی ڈے نے بنگالی فلموں طرف رخ کرلیا۔ انرباں، راکھی، پورابی، وغیرہ کی موسیقی ترتیب دی۔

مشہور شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کے ڈرامے وسارجن (Visarjan) میں کے سی ڈے نے شاندار پرفارمنس دی۔ دوسری جانب کے سی ڈے نے اپنی کامیابیوں کے سلسلے کو بڑھاتے ہوئے ''اسٹار تھیٹرز'' اور منروا تھیٹرز'' میں شاندار پرفارمنس دی۔ 11 اگست 1928ء میں منروا تھیٹرز جالندھر نے ''سندھن'' پیش کیا جس میں کے سی ڈے کے گانے بہت پسند کیے گئے۔ سرت چندرا گھوش کا ڈراما ''شری'' اور جالندھر چتویا کا ''رنگ راکھی'' 1930ء میں پیش کیے گئے۔ دونوں ڈراموں میں کے سی ڈے کی پرفارمنس اداکاری و گلوکاری کے حوالے سے یادگار رہی۔

1957ء میں ان کی آخری دو فلمیں مدھومالتی اور اکتارا ریلیز ہوئیں۔ یہ فلمیں بنگلہ میں تھیں۔

کے سی ڈے بھارت کی ریاست میسور کے راجا کرشنا راؤ وڈیار کے دربار سے بطور موسیقار وابستہ رہے۔ راجا میسور ان کا بہت بڑا قدردان تھا اور ان کی خوب خاطر مدارت کرتا۔

کے سی ڈے کو جہاں گیت، بھجن اور غزل پر عبور حاصل تھا وہیں انہوں نے نعت خوانی اور قوالی میں بھی خوب شہرت حاصل کی۔ ان کی یہ دو نعتیں زبان زدِ عام تھیں۔

عرش کا پہلا جو ستارہ ہے وہ نبیؐ

بپا ہے روزِ محشر فیصلہ ہونے کی باری ہے

ان کی گائی ہوئی یہ قوالی بھی بہت پسند کی گئی جس کے بول کچھ یوں ہیں ''کالی کملی کا ٹکڑا مجھے بھیک دے۔''

ہندی فلموں کا یہ پہلا نابینا پلے بیک سنگر ہندی سینما پر جاتے جاتے تین بڑے احسان کرگیا۔ پہلا احسان کہ خود سب سے پہلا پلے بیک سنگر بنا اور آنے والوں کے لیے رول ماڈل بنا۔ دوسرا احسان........ مہان موسیقار ایس ڈی برمن جو کہ کے سی ڈے کا شاگرد تھا ہندی سینما کو دیا اور تیسرا احسان اپنے بھتیجے ''منا ڈے'' کو فلمی دنیا میں متعارف کرایا۔ کے سی ڈے نے ساری زندگی شادی نہیں کی اور 69 سال کی عمر میں 28 نومبر 1962ء کو کلکتہ میں انتقال کرگیا۔

وہ گیت جو تم نے سنا نہیں، میری عمر بھر کا ریاض تھا!

وہ میرے درد کی تھی داستاں، جسے تم ہنسی میں اڑا گئے

فلمی الف لیلہ

علی سفیان آفاقی کی یادداشتیں

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو!
آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

ایسے نادر روزگار خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ جو نصف صدی سے علم وادب ' صحافت و فلم کے میدان میں سرگرم عمل ہوں اور اپنے روز اول کی طرح تازہ دم بھی۔ ان کے ذہن رسا کی پرواز میں کوئی کمی واقع ہو، نہ ان کا قلم کبھی تھکن کا شکار نظر آئے۔ آفاقی صاحب ہمارے ایسے ہی جواں فکر وبلند حوصلہ بزرگ ہیں۔ وہ جس شعبے سے بھی وابستہ رہے ' اپنی نمایاں حیثیت کی نشان اس کی پیشانی پر ثبت کردی۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستگی کے دوران میں انہیں اپنے عہد کی ہر قابل ذکر شخصیت سے ملنے اور اس کے بارے میں آگاہی کا موقع بھی ملا۔ دید وشنید اورمیل ملاقات کا یہ سلسلہ خاصا طولانی اور بہت زیادہ قابل رشک ہے۔ آئیے ہم بھی ان کے وسیلے سے اپنے زمانے کی نامور شخصیات سے ملاقات کریں اور اس عہد کا نظارہ کریں جو آج خواب معلوم ہوتا ہے۔

ادب وصحافت سے فلمی دنیا تک دراز ایک داستاں درداستاں سرگزشت

قسط: 218

بچپن میں ابھی پوری طرح ہوش نہیں سنبھالا تھا یا سنبھالا بھی تھا تو پوری طرح سنبھل نہ پائے تھے لیکن فلموں اور موسیقی سے دلچسپی غالباً پیدائشی تھی۔ اس زمانے میں بہت زیادہ شوقین لوگ گراموفون خریدتے تھے اور کلاسیکی گانے، سہگل کے گانے یا بہت اچھی موسیقی ہی سنتے تھے۔ اخلاق سے گری ہوئی، چلتی ہوئی بازاری شاعری کا اس زمانے میں رواج نہیں تھا۔ ہمارے بڑے بھائی ہم سے سترہ سال بڑے تھے۔ اس زمانے کے حساب سے بہت شوقین اور اعلیٰ ذوق کے مالک تھے۔ جب وہ گراموفون پر کوئی ریکارڈ بجاتے تو ہم ان کے کمرے کے آس پاس بہانے بہانے گھومتے پھرتے اور پسندیدہ گانے سنتے رہتے۔ کے۔ سی۔ ڈے، سہگل، پنکج ملک، طلعت محمود اور کلاسیکی استادوں کے گانے جو اس وقت ہم نے سنے تھے آج بھی ہمیں یاد ہیں۔

یہ پس منظر بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ایک بار

بھوپال میں نیو تھیٹرز کی ایک فلم آئی جس کا بہت شہرہ تھا۔ یقینی طور پر اس کا نام یاد نہیں رہا۔ ہمارے بڑے بھائی جنہیں ہم سب ''آ کا بھائی'' کہتے تھے، سینما جانے کے لیے تیار ہوئے تو ہم پر بھی ان کی نظر پڑ گئی۔ شاید ہماری صورت ہی سوال بن گئی تھی کہ کیا میں بھی ساتھ چلوں۔ وہ بہت اچھے موڈ میں تھے اور نیو تھیٹرز کی فلمیں انہیں پسند بھی بہت زیادہ تھیں۔ بہت صاف ستھری اور سبق آموز ہوتی تھیں۔

ہم سے انہوں نے پوچھا۔ ''فلم دیکھنے چلو گے؟''

ہم نے سر ہلا دیا۔ بولے ''بھئی یہ نیو تھیٹرز کی فلم ہے۔ بچوں کی کوئی دلچسپی اس میں نہیں ہے۔ تم کیا سمجھو گے؟''

جواب میں ہم نے آہستہ سے کہا (ان کا رعب چھوٹے بہن بھائیوں پر بہت تھا) ''دیکھیں گے تو سمجھ بھی لیا کریں گے۔''

وہ مسکرائے۔ ''اچھا... آؤ، مگر پہلے اماں کو بتا کر آؤ کہ تم میرے ساتھ سینما جا رہے ہو۔''

ہم بھاگ کر اماں کو بتانے گئے۔ انہوں نے ناپسندیدگی سے کہا۔ ''چھوٹوں کو بھی بگاڑیں گے۔'' مگر اجازت مل گئی۔

خیر... فلم تو واقعی ہماری سمجھ میں نہیں آئی مگر اچھی لگی۔ خاص طور پر اس کے گانے اب تک یاد ہیں کہ ہیروئن ساڑی پہنے ہوئے تھی۔ ہیرو سے آنکھ ملا کر بات نہیں کرتی تھی۔ بات کرتی بھی تو شرما کر، یہ شرمیلی ہیروئن ہمیں بہت اچھی لگی۔

ایک گانا بھی بہت پسند آیا۔ بہت خوبصورت مردانہ آواز میں گایا گیا تھا۔

بابا من کی آنکھیں کھول
جیون کیا ہے، ایک تماشا
چار دنوں کی جھوٹی آشا
(تیسرا شعر یاد نہیں رہا)
بابا من کی آنکھیں کھول

یہ گانا ہمیں بہت پسند آیا۔ ایک اندھے اداکار پر فلمایا گیا تھا۔

آ کا بھائی اپنے دوست سے باتیں کرتے رہے جن سے ہمیں معلوم ہوا کہ یہ گانا جس گلوکار نے گایا ہے اس کا نام کے سی ڈے ہے جو اردو اور بنگلہ کا بہت اچھا گلوکار ہے اور بے چارہ اندھا ہے۔

بعد میں ہم نے کے سی ڈے کے اور بھی بہت سے گانے سنے۔ اس گانے والے سے ہمیں ہمدردی بھی پیدا ہو گئی تھی۔ بے چارے دیکھ نہیں سکتے تھے مگر لوگوں کو مشورہ دیتے تھے کہ

بابا من کی آنکھیں کھول

کے سی ڈے کے بارے میں بہت کچھ پڑھا۔ وہ درحقیقت بہت بڑے گانے والے تھے، اس زمانے میں بھی ان کے ریکارڈ بہت فروخت ہوتے تھے۔

ہندوستان کے ایک اور نامور گلوکار رویندر جین بھی ہیں، وہ شاعر بھی ہیں اور ان کے گائے ہوئے کئی گانے خود انہوں نے ہی لکھے تھے ان کے گانے کا ایک بول یاد رہ گیا

ایک ڈال پہ توتا بولے، ایک ڈال پہ مینا

انہوں نے بھی مقبولیت کا بہت طویل دور دیکھا۔

جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے ہندوستان میں کوئی اور اداکار یا گلوکار نابینا نہیں تھا۔ البتہ فلم ''دیدار'' میں دلیپ کمار نے ایک اندھے کا جو کردار نبھایا تھا وہ یادگار ہے۔ اس فلم کی ہیروئن نرگس تھیں جو ایک روشن خیال اور ترقی پسند لڑکی تھیں۔

دلیپ کمار شہر کے نزدیک ہی ایک گاؤں میں رہتے تھے اور نمی ان سے محبت کرتی تھیں۔ جب وہ پیسا کمانے کے لیے شہر جاتے ہیں تو لتا منگیشکر کی آواز میں یہ گانا او ور لیپ کیا گیا تھا۔

لے جا میری دعائیں لے جا
پردیس جانے والے
جا کر بھلا نہ دینا، دل سے میری وفائیں
لے جا میری دعائیں

شہر کی روشن خیال اور موسیقی کی دلدادہ لڑکی نرگس نے انہیں سڑکوں پر ہارمونیم بجاتے دیکھا اور گاتے ہوئے سنا تو بہت متاثر ہوئیں اور انہیں اپنے ساتھ لے گئیں۔ ان کی خواہش تھی وہ دلیپ کمار کا علاج کرائیں تاکہ وہ ایک نارمل انسان کی طرح زندگی بسر کر سکیں۔ دلیپ کمار ان کی مہربانیوں کا کچھ اور مطلب لیتے ہیں اور ان کی محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں حالانکہ نرگس صرف ان کی گلوکاری کی مداح تھیں اور ان سے ہمدردی رکھتی تھیں۔

نرگس ان کا علاج کراتی ہیں اور ان کی بینائی واپس آ جاتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ جاں سوز خبر بھی ملتی ہے کہ نرگس کے منگیتر واپس آ گئے ہیں۔ یہ کردار اشوک کمار نے ادا کیا تھا اور ایک بہت مشکل کردار کو نہایت خوبصورتی سے نبھایا تھا۔ اس فلم کی کہانی کا خیال محبوب صاحب کی یادگار فلم ''انداز'' سے ملتا جلتا ہے لیکن پیشکش بالکل مختلف ہے۔

دلیپ کمار اور اشوک کمار کے جو مناظر فلمائے گئے تھے وہ اداکاری کا شوق رکھنے والوں کے لیے ایک سبق کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بینائی واپس آ جانے کے بعد نرگس کے ساتھ دلیپ کمار کا ایک منظر کبھی بھلایا نہ جائے گا۔

اس وقت تک دلیپ کمار کو یہ علم نہیں تھا کہ نرگس کی منگنی ہو چکی ہے اور عنقریب ان کی شادی ہو رہی ہے۔ دلیپ کمار براہِ راست تو اظہارِ محبت نہیں کر سکتے لیکن اشاروں اشاروں میں نرگس کو اپنی محبت سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔

منظر یہ ہے کہ یہ دونوں ایک کمرے میں موجود ہیں۔ دلیپ کمار کی بینائی ٹھیک ہو چکی ہے۔ وہ اپنی آنکھیں مل رہے ہیں۔

نرگس پوچھتی ہیں۔ ''کیا ہوا کوی مہاراج؟''

دلیپ کمار جواب دیتے ہیں۔ ''آنکھ میں شاید کچھ چبھ گیا ہے۔''

نرگس نے ان کے نزدیک آ کر بے تکلفی سے ان کی آنکھوں کا جائزہ لیا اور کہا۔ ''مجھے تو کچھ نظر نہیں آتا۔''

اس کے جواب میں دلیپ کمار نے بہت دلگداز انداز میں صرف ایک فقرہ ادا کیا تھا۔ ''آپ کو ان آنکھوں میں کچھ نظر نہیں آیا؟''

نرگس بے پروائی سے ''نہیں، کچھ بھی نہیں۔''

جواب میں دلیپ کمار کا مایوسی اور دل شکستگی کا ردِعمل ہے، جس میں مایوسی بھی ہے، شکایت بھی ہے اور حیرت بھی۔

(نوٹ: یہ مکالمے یادداشت کی بنیاد پر لکھے گئے ہیں)

اس میں کوئی شک نہیں کہ فلم ''دیدار'' میں دلیپ کمار نے ایک نابینا انسان کی اداکاری نہایت متاثر کن انداز میں کی تھی۔

ہندوستان میں نابینا کرداروں پر مشتمل اور بھی فلمیں بنائی گئی ہیں لیکن کوئی ایسا کردار نہ تھا جو یاد رہ جائے۔

اس کے برعکس پاکستانی فلموں میں کچھ نابینا کردار بہت خوبصورتی سے ادا کیے گئے۔ 1955-56ء میں ہدایت کار حسن طارق کی بطور ہدایت کار پہلی فلم ''نیند'' میں آغا طالش نے ایک اندھے باپ کا کردار اس خوبی سے ادا کیا تھا کہ جو واقف نہ تھے وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے شاید یہ اداکار واقعی اندھا ہے۔
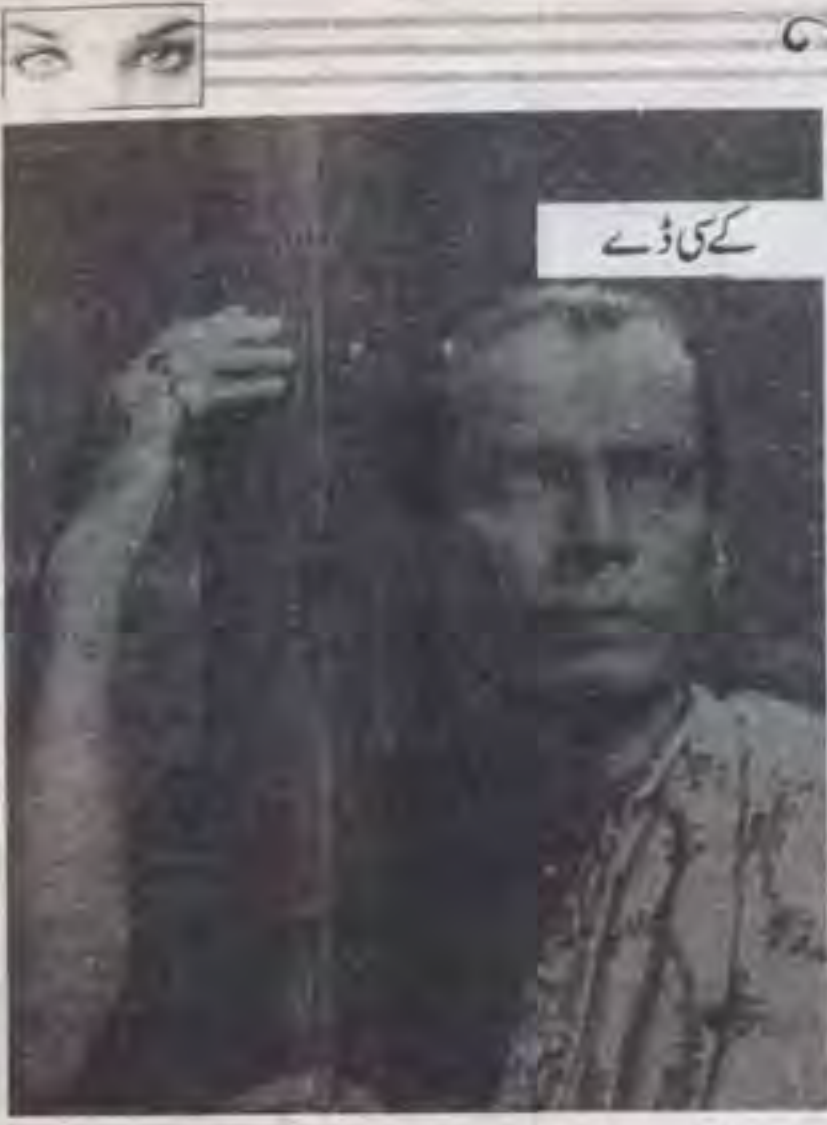
کے سی ڈے

فلم ''نیند'' میں ہیروئن کا کردار میڈم نور جہاں نے ادا کیا تھا۔ وہ اور ان کی چھوٹی بہن نیلو ریلوے لائن پر کوئلہ چنتی ہیں اور اس کو فروخت کر کے اپنا اور اپنے اندھے باپ (طالش) کا پیٹ پالتی ہیں۔ نور جہاں کی ایک کمزوری یہ ہے کہ انہیں نیند بہت آتی ہے۔ کام کرتے ہوئے کہیں بیٹھیں گی تو سو جائیں گی۔ درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھیں گی تو سو جائیں گی۔ ان کی یہی عادت ان کی تباہی کا بہانہ بن گئی۔

فلم کی کہانی کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ چھوٹا سا غریب کنبہ ناداری کے باوجود اپنی جھونپڑی میں ہنسی خوشی زندگی بسر کرتا ہے۔ گاؤں کا ایک نوجوان (علاؤالدین) ہیروئن سے محبت کرتا ہے مگر وہ اس کی جانب مائل نہیں ہے۔ دو نوجوان لڑکیوں کا نابینا باپ ہر وقت بیٹیوں کی طرف سے فکرمند رہتا ہے۔

علاقے کا ایک دولت مند اور رنگین مزاج نوجوان (اسلم پرویز) ایک دن ہیروئن کو درختوں کے سائے میں بے خبر سوئے ہوئے دیکھ کر اس کو پسند کر لیتا ہے۔ وہ ہیروئن کا بھروسا اور توجہ حاصل کرنے کے لیے اس کی مدد بھی کرتا ہے اور میٹھی میٹھی باتوں سے اس کو شادی کا لالچ دے کر شیشے میں اتار لیتا ہے۔ باپ اپنی بیٹی کے طرزِ عمل میں تبدیلی کو محسوس کر لیتا ہے اور اس کی فکرمندی اور پریشانی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ ہیروئن نے یہ بات اپنی بہن کے سوا سب سے چھپائی ہے لیکن علاؤالدین کو علم ہو جاتا ہے۔ وہ ہیروئن کو سمجھانے کی کوشش بھی کرتا ہے لیکن وہ

ولین کی لچھے دار باتوں میں گرفتار ہو چکی ہے۔

مصنوعی شادی رچانے کے بعد جب ہیروئن کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ماں بننے والی ہے تو ولین سے کہتی ہے کہ اب مجھ سے شادی کا سب کو بتاو مگر وہ ٹال دیتا ہے۔

بالآخر ہیروئن ایک بچے کی ماں بن جاتی ہے۔ ولین اس کی طرف سے آنکھیں پھیر لیتا ہے اور دھمکی دیتا ہے کہ اگر اس نے یہ واقعات کسی کو بتائے تو اس کے بچے کی زندگی محفوظ نہیں رہے گی۔ دنیا والوں کی باتوں اور اپنی رسوائی کے خیال سے ہیروئن چپ رہتی ہے مگر یہ صدمہ بالآخر اس کی جان لے لیتا ہے۔ اس کے مرنے کے بعد اس کا محروم عاشق علاؤالدین اس کے بچے کی پرورش کرتا ہے اور اس کو ایک بہت اچھے اسکول میں داخل کرا دیتا ہے۔ جبکہ بتایا جا چکا ہے یہ حسن طارق کی ہدایت کار کی حیثیت سے پہلی فلم تھی مگر بہت اعلیٰ معیاری اور خوبصورت فلم تھی۔ ماحول کی بہت خوبی سے عکاسی کی گئی تھی۔ اس کے مصنف ریاض شاہد تھے جنہوں نے اپنے قلم کی طاقت سے اس کو ایک معیاری فلم بنانے میں بہت مدد کی تھی۔ موسیقار رشید عطرے اور کیمرا مین رضا میر تھے۔

یوں تو اس حقیقت سے قریب فلم میں سبھی اداکاروں نے بہت اچھی اداکاری کی تھی مگر طالش نے نابینا باپ کے کردار میں ناقابلِ فراموش اداکاری کا مظاہرہ کیا تھا۔ یہ کردار کرنے کے لیے پہلے انہوں نے اندھوں کے پاس بیٹھ کر خاموشی سے ان کی نقل و حرکت اور بات چیت کے انداز کا مشاہدہ کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ صرف اندھے ہو کر ایک جانب ہی دیکھتے نہیں رہ جاتے تھے بلکہ اپنی آنکھوں کو ہر طرف گھماتے تھے اور قدموں کی چاپ یا دوسری آوازوں سے کسی بھی شخص کو جس طرح شناخت کرنے کے بعد ان کے چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ آجاتی تھی جو نابینا لوگوں کے چہروں پر نمودار ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے ''دیدار'' بھی کئی بار غور سے دیکھی تھی اور ''نیند'' بھی کئی بار دیکھتے رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ دلیپ کمار جیسے اداکار کے ساتھ پاکستان کے ایک کیریکٹر ایکٹر کا موازنہ کرنا مناسب نہ تھا لیکن ہمارا ذہن بار بار ہمیں ایسا کرنے پر مجبور کرتا تھا۔ کوئی حتمی رائے قائم کرنے سے پہلے ہم نے صحافی دوستوں اور فلموں کے نقادوں کے سامنے اپنی الجھن پیش کی اور ان کی رائے جاننے کی کوشش کی کہ نابینا کی حیثیت سے دلیپ کمار نے اچھی اداکاری کی ہے یا آغا طالش نے؟

کچھ نے تو اس سوال پر ہمارا مذاق اڑایا کہ عجب احمق ہو۔ دلیپ کمار جیسے عظیم اداکار سے طالش کا مقابلہ کر رہے ہو۔ کچھ دوست سوچ میں پڑ گئے۔ بولے، یار تم نے تو عجیب امتحان میں ڈال دیا ہے۔

ہم نے کہا ''تمہیں کسی امتحان میں نہیں ڈالا۔ صرف تمہاری رائے دریافت کی ہے۔'' وہ سوچتے رہے پھر بولے۔ ''اس کا جواب ذرا سوچ کر کل دیں گے۔''

لیکن دو تین صحافی اور فلمی کہانی نویس ایسے تھے جنہوں نے فوراً کہا۔ ''تم بھی بہت دور کی کوڑی لائے ہو۔ یہ سوال ہمارے ذہنوں میں بھی تھا۔ ہماری رائے میں تو طالش نے زیادہ حقیقی اور قدرتی اداکاری کا مظاہرہ کیا ہے اور خود تمہاری کیا رائے ہے؟''

ہم نے کہا۔ ''وہی جو تمہاری رائے ہے۔''

یہ حقیقت ہے کہ طالش بہت بڑے اداکار تھے۔ ہمارے ملک میں ان کی قدر نہیں کی گئی۔ اگر امریکا میں ہوتے تو ہالی ووڈ کے عظیم ترین اداکاروں کے ساتھ ان کا نام لکھا جاتا۔

اب ہم آپ کو ایک اور فکر انگیز مسئلے سے دوچار کرتے ہیں۔

دلیپ کمار نے فلم داغ میں طلعت محمود کا گایا ہوا گانا فلم بند کرایا تھا۔ اس وقت وہ شرابی کے کردار میں گلیوں میں گاتے اور بجلی کے کھمبوں سے ٹکراتے ہوئے یہ گانا گا رہے تھے۔

اے مرے دل کہیں اور چل
غم کی دنیا سے دل بھر گیا
ڈھونڈ لے گھر کوئی نیا
اے مرے دل کہیں اور چل

دلیپ کمار نے شرابی کے کردار میں ایسی روح پھونکی تھی کہ بے شمار لوگوں نے محض اس گانے کی وجہ سے بار بار یہ فلم دیکھی۔ یہ فلم بھی بہت اچھی تھی اور دلیپ کمار کی اداکاری تو یادگار تھی۔ یہ فلم بھی بہت کامیاب ہوئی اور اس کو انڈین فلموں کی یادگار فلموں کے ادارے میں بھی محفوظ کر لیا گیا۔

پاکستان میں سیف الدین نے فلم ساز کی حیثیت سے ایک فلم بنائی تھی جس کا نام ''سات لاکھ'' تھا۔ اس کے ہدایت کار جعفر ملک تھے اور موسیقار رشید عطرے۔ صبیحہ خانم اور سنتوش کمار نے فلم میں مرکزی کردار ادا کیے تھے۔ اس فلم

کے بھی گانے سپرہٹ تھے۔ فلم کی کہانی اور

نرگس، سنیل دت اور ان کی فیملی

اسکرین پلے خود سیف صاحب نے لکھا تھا۔ فلم ''سات لاکھ'' میں طالش کو بھی ایک مختصر کردار دیا گیا تھا۔ ان پر ایک غزل بھی فلمائی گئی تھی۔ اس غزل کی استھائی (یعنی ابتدائی بولوں میں)

سیف صاحب نے میر تقی میر کی مشہور غزل کا ایک شعر شامل کیا تھا

یارو مجھے معاف رکھو، میں نشے میں ہوں
اب جام دو تو خالی ہی دو میں نشے میں ہوں

گانے کے بقیہ تمام اشعار سچویشن کے مطابق خود سیف صاحب نے لکھے تھے، ادبی حلقوں کی طرف سے اس بات پر بہت اعتراض کیا گیا کہ سیف صاحب نے میر کا شعر اپنی غزل میں شامل کر لیا مگر میر کا حوالہ تک نہیں دیا۔ سیف صاحب کا کہنا تھا کہ میر جیسے عظیم شاعر پر ہم سب کا حق ہے۔ اگر میں نے ان کا ایک شعر غزل میں شامل کر لیا تو ظاہر ہے کہ فلم کے ٹائٹلز میں میر تقی میر کا نام دینا بے ادبی ہوتی۔ بہرحال یہ ایک علیحدہ قصہ ہے۔

یارو مجھے معاف رکھو میں نشے میں ہوں

کی طرز عطرے صاحب نے بہت دلنشیں بنائی تھی لیکن اصل کمال طالش کا تھا جن پر یہ گانا فلمایا گیا تھا۔ یہ منظر بھی دلیپ کمار کی فلم سے ملتا جلتا تھا۔ رات کا وقت ہے طالش صاحب نشے کے عالم میں گاتے ہوئے گلیوں سے گزر رہے ہیں۔ کبھی بجلی کے کسی کھمبے سے ٹکراتے ہیں کبھی کسی راہ گیر سے۔ قدم لڑکھڑا رہے ہیں آنکھوں میں نشے کا خمار ہے۔ اس زمانے میں 1957ء میں طالش صاحب موٹے بھی نہیں ہوئے تھے۔ صورت شکل بہت اچھی تھی اور چہرے کے تاثرات گانے کے بولوں کے عین مطابق تھے۔

ہمارا تنقیدی ذہن ایک بار پھر طالش اور دلیپ کمار کی اداکاری کا موازنہ کرنے میں مصروف ہو گیا۔ دو تین بار فلم دیکھی اور غور کرنے بیٹھ گئے۔ ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ طالش کی اداکاری اگر دلیپ کمار سے بہتر نہیں تو کم بھی نہ تھی۔ دلیپ کمار اس وقت برصغیر کے عظیم ترین اداکار تسلیم کیے جاتے تھے اور طالش بے چارے تو ایک چھوٹی سی ابھرتی ہوئی فلمی صنعت میں ایک نو وارد اداکار تھے جنہیں اس وقت تک پاکستان کے بڑے فن کاروں میں بھی شمار نہیں کیا جاتا تھا۔ ہم نے دوستوں سے رائے لی۔ اکثریت نے ہم کو حیرت سے دیکھا اور کہا۔ ''پاگل ہو گئے ہو۔ دلیپ کمار اور طالش کا کیا مقابلہ؟''

مگر شباب کیرانوی اور ہمارے مشترکہ بہترین دوست رشید جاوید نے ہماری رائے سے اتفاق کیا اور کہا۔ ''یہ سوال ہمارے ذہنوں میں بھی اٹک رہا تھا مگر دوسروں کے سامنے اظہار کرتے ہوئے ڈرتے تھے کہ وہ سب ہمارا مذاق اڑائیں گے۔ ویسے تمہارا خیال درست ہے۔''

ہم بذاتِ خود دلیپ کمار کے مداح تھے۔ اس کو ملک کا عظیم ترین اداکار خیال کرتے تھے لیکن اداکاری تو اداکاری ہے۔ کبھی کسی کا پلڑا بھاری ہو جاتا ہے تو کبھی کسی کا۔

آغا طالش کے بارے میں ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ وہ منجھا ہوا اداکاری کرنے والے واحد پاکستانی اداکار تھے۔ یہ وہ اداکار ہوتے ہیں جو فلم کے ہر منظر کو ناپ تول کر اس کی

ضرورت اور اہمیت کے مطابق پیش کرتے ہیں۔ نہ تو جذباتی ہو کر اوور ایکٹنگ کا شکار ہوتے ہیں اور نہ ہی ایکٹنگ میں کمی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کی دو نمایاں مثالیں ہم پہلے بھی پیش کر چکے ہیں۔ علاؤ الدین اور طالش دو ہم عصر اداکار تھے اور بہت اچھے اداکار تھے۔ لیکن علاؤ الدین جذباتی فلموں میں کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو جاتے تھے۔ آواز بھرا جاتی تھی۔ آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔ عام فلم بینوں کو ان کا یہی انداز پسند تھا۔ اسی طرح اداکار و ہدایت کار نذیر بہت بڑے اداکار تھے لیکن وہ بھی جذباتی مناظر میں کچھ مبالغہ کر دیا کرتے تھے جبکہ طالش نے جو بھی کردار ادا کیا ہے اس پر شروع سے آخر تک حقیقت کا گمان ہی گزرتا ہے۔ شہید اور فرنگی میں ان کی اداکاری دیکھ لیجیے۔ اس پر حقیقت کا گمان گزرتا ہے۔ لیکن ہمارے فلم بین کیونکہ ڈرامائی اور تھیٹریکل.... انداز زیادہ پسند کرتے ہیں اس لیے وہ بھی طالش کی اداکاری سے زیادہ لطف اندوز نہیں ہوتے۔ دیکھیے بات کہاں سے چلی تھی اور کہاں جا نکلی، اصل موضوع نابینا فن کار اور ان کی اداکاری تھا۔

پاکستان میں صادق صاحب پیانو بجانے میں سارے برصغیر میں مشہور تھے۔ جب یہاں معیاری فلمیں بنائی جانے لگیں تو مستقل سازندوں کی بھی ضرورت پیش آئی۔ اس سے پہلے گانوں کی صدابندی کے لیے ریڈیو اور دوسری جگہوں کے سازندے بلوائے جاتے تھے مگر ایک دن میں دو تین فلموں کے گانے کے لیے ریہرسل کرنا.... اور پھر گانا ریکارڈ کرانا ایک ہمہ وقتی کام تھا اس لیے شہر سے ریڈیو کے علاوہ دوسرے اداروں سے بھی سازندے تلاش کیے گئے۔ سازندوں کے دو "بیج" بن گئے تھے۔ ایک "اے" کہلاتا تھا اور دوسرا "بی"۔ اے بیج کے سازندوں میں اینگلو پاکستانی اور تعلیم یافتہ مہذب سازندے بھی شامل تھے۔ ان لوگوں کو گانے کی دھن کاغذ پر لکھنا بھی آتا تھا۔ "بی" بیج کے سازندے بیشتر پیشہ ور گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے مگر اپنے ہنر میں کامل تھے۔

صادق صاحب کا تعلق اے بیج سے تھا۔ بہت سے فلم ساز تو ہر صورت میں اے بیج ہی کو ترجیح دیا کرتے تھے۔ خود ہماری بیشتر فلموں میں ان ہی لوگوں نے ساز بجائے تھے۔ صادق صاحب نابینا تھے۔ ہمارا خیال ہے کہ طالش نے فلم "نیند" میں اندھے کا کردار ادا کرنے سے پہلے ان کا بھی بغور مشاہدہ کیا ہوگا۔ کیونکہ وہ بھی اپنی آنکھوں کی پتلیوں کو گھماتے رہتے تھے اور گفتگو کرتے ہوئے بھی ان کی نظروں اور چہرے کا رخ مخاطب کی طرف نہیں ہوتا۔ ان کا رنگ گہرا سانولا تھا۔ عموماً پتلون قمیص پہنتے تھے اور بہت صاف ستھرے رہتے تھے۔ فارغ اوقات میں ساتھیوں کے ساتھ ہنسی مذاق بھی کیا کرتے تھے۔ پیانو بجانے میں وہ ماہر تھے۔ موسیقار کو دوسری بار انہیں کوئی ہدایت نہیں دینی پڑتی تھی۔ ان کے بیٹے بھی اب مختلف آرکسٹرا گروپس میں شامل ہیں اور ہنر مند ہیں۔ صادق صاحب کا انتقال ہو چکا ہے۔ ویسے بھی 1973ء میں فلم سازی ترک کرنے کے بعد ہم نے اسٹوڈیو جانا چھوڑ دیا تھا اور کئی واقعات سے بے خبر تھے۔ ان کے انتقال کے بارے میں معلوم ہوا تو بہت افسوس ہوا اور ان کی باتیں یاد آتی رہیں۔

ہم نے صادق صاحب سے ایک بار پوچھا تھا کہ کیا ان کی بینائی کسی حادثے یا بیماری کی وجہ سے خراب ہوئی یا وہ پیدائشی نابینا ہیں۔ حالانکہ یہ سوال کرنے کی حاجت نہ تھی۔ ان کی آنکھیں دیکھ کر ہی معلوم ہو جاتا تھا کہ وہ پیدائشی نابینا ہیں۔

انہوں نے بتایا کہ میں ان ہی آنکھوں کے ساتھ پیدا ہوا تھا۔ میں نے دنیا کو، اس کی رنگینیوں اور رعنائیوں کو کبھی نہیں دیکھا۔ بس اندازے لگاتا رہتا ہوں۔ میں نے کسی انسان کا چہرہ بھی کبھی نہیں دیکھا یہاں تک کہ میرے ماں باپ، بہن بھائی، بیوی بچے بھی صرف میرے تصورات میں رہتے ہیں۔ بچپن میں دوسرے بچے مجھے بہت تنگ کرتے تھے مگر میں مسکراتا اور ہنستا رہتا تھا اسی لیے کبھی کسی سے میرا جھگڑا نہیں ہوا۔ دنیا اور اس کی چیزوں کے بارے میں سن کر میں دیر تک اپنے تصور میں اندازے لگاتا رہتا کہ دراصل وہ کیسی ہوگی؟

انہوں نے کہا تھا۔ "آفاقی صاحب، میں کبھی احساسِ محرومی کا شکار نہیں ہوا، اللہ نے خود بخود مجھے صبر دے دیا تھا اور میں نے اپنی اندھیری دنیا کو قبول کر لیا تھا۔ میں ہنسنے والوں کے ساتھ ہنستا اور رونے والوں کے ساتھ روتا رہا۔ قدرت انسان کو اگر کسی چیز سے محروم کرتی ہے تو اس کو دوسرے معاملات میں باصلاحیت بنا دیتی ہے، پیانو جو آج میرا ذریعۂ روزگار ہے بچپن ہی سے میرا شوق رہا ہے، میں موقع پا کر پیانو ضرور بجاتا تھا۔ گھر والوں سے میری صرف ایک ہی فرمائش ہوتی تھی کہ میرے لیے پیانو لا دیں، والد صاحب کہیں سے تلاش کر کے ایک چھوٹا سا کھلونے جیسا پیانو لے آئے مگر میری ضد تھی کہ مجھے بڑا پیانو چاہیے۔

انہوں نے کہا۔ "تم اس پر مشق کر لو۔ بڑا پیانو بھی آجائے گا۔" ہمارے گھر میں تو بڑا پیانو رکھنے کی گنجائش ہی نہیں تھی لیکن میں یہ نہیں جانتا تھا چونکہ نہ تو میں نے گھر کو دیکھا تھا نہ بڑے پیانو کو۔

جب ذرا بڑا ہوا تو والد صاحب مجھے اپنے ساتھ ریڈیو اسٹیشن لے جانے لگے۔ مگر میرے لیے تو ہر جگہ یکساں تھی، نہ دیکھ سکنے کا یہ بہت بڑا فائدہ ہے۔ والد نے مجھے ریڈیو اسٹیشن لے جا کر بڑے پیانو پر بٹھا دیا۔ وہ میرے لیے سب سے زیادہ خوشی کا دن تھا۔ اس طرح جب پیانو کی کسی کو ضرورت نہیں ہوتی تھی تو اس وقت مجھے پیانو بجانے کی اجازت تھی۔ میرا شوق اور سیکھنے کی رفتار دیکھ کر پیانو نواز بھی مجھے پیانو بجانا سکھا دیا کرتے تھے۔ اس طرح میں ایک سازندہ بن گیا۔ مجھے دوسرے ساز بھی بجانے پڑتے تھے مگر رفتہ رفتہ مجھے پیانو بجانے کی ڈیوٹی مل گئی۔ میرے دماغ اور جسم میں جتنی بھی طاقت تھی وہ میں نے پیانو سیکھنے اور بجانے میں لگا دی۔ اب سب کہتے ہیں کہ میں بہت اچھا پیانو بجا لیتا ہوں۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ یہ میرا زندگی بھر کا سرمایہ ہے۔ مجھے تو اس کے سوا اور کچھ آتا ہی نہیں۔ اس کے لیے میں اللہ کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔

یہ ہے ایک ہنر مند اور اپنے فن میں معروف سازندے کی داستان۔ جو نابینا تھا لیکن اپنی زندگی سے مطمئن تھا چونکہ اس کا پیانو بجانے کا شوق پورا ہو گیا تھا اور یہی پیانو اب اس کی عزت و شہرت کا ذریعہ بن چکا تھا۔

☆☆☆

ڈبلیو زیڈ احمد کی فلم "وعدہ" ایک بہت معیاری فلم تھی۔

صبیحہ سنتوش تاشقند فلمی میلے میں

بدقسمتی سے فلم کی تکمیل کے دوران میں فلم کو آپریٹو کے دوسرے حصے داروں کے ساتھ اختلافات پیدا ہو گئے۔ فلم کی شوٹنگ رک گئی۔ ہمالیہ والا اور چند دوسرے اداکاروں نے تعاون کرنے سے گریز کیا۔ مجبوراً فلم کو مکمل کرنے کے لیے احمد صاحب نے اسکرین پلے میں تبدیلیاں کر کے اس فلم کو مکمل کیا۔ "وعدہ" کی موسیقی جو رشید عطرے نے بنائی تھی بہت اچھی تھی۔ اس کے گانے آج بھی لوگوں کو یاد ہیں۔

جب تیرے شہر سے گزرتا ہوں

اس گانے سے متعلق یہ بتانا ضروری ہے کہ فلم میں سنتوش کمار جو اچھے بھلے آنکھوں والے تھے ایک حادثے میں بینائی کھو بیٹھے۔ فلم کی ہیروئین صبیحہ کے ساتھ اندھے ہونے کے بعد ان دونوں پر فلمایا ہوا ایک منظر ہم کبھی نہیں بھولیں گے۔

منظر یہ ہے کہ صبیحہ خانم ایک تالاب میں نہا رہی ہیں۔ سنتوش کمار جو اندھے ہو چکے ہیں تالاب کے کنارے موجود ہیں۔ لیکن مصنف اور ہدایت کار نے اس منظر میں یہ خوبصورتی پیدا کر دی ہے کہ کیمرے میں صرف صبیحہ باتیں کرتی اور کھلکھلاتی نظر آتی ہیں۔ سنتوش کمار کی صرف آواز سنائی دیتی ہے جس کی وجہ سے منظر کی دلکشی میں بدرجہا اضافہ ہو گیا ہے۔ شاید یہ منظر ہم کبھی نہ بھول سکیں گے۔

موسیقار خواجہ خورشید اور ہدایت کار مسعود پرویز کی فلم "انتظار" بھی ایک یادگار فلم ہے۔ یہ فلم ابتدائی زمانے میں

بنائی گئی تھی لیکن حیرت ہوتی تھی کہ پچاس کی دہائی میں اس قدر معیاری اور فنکارانہ فلم پاکستان میں تخلیق کی گئی تھی۔ فلم انتظار کی کہانی پہاڑی علاقے سے شروع ہوتی ہے۔ فلم کی ہیروئن نور جہاں بینائی سے محروم ہیں۔ وہ ایک بہت بڑے موسیقی کے استاد کی بیٹی ہیں۔ یہ کردار چھومہاراج نے بہت فن کارانہ نزاکت کے ساتھ نبھایا تھا۔ نور جہاں نے اس فلم میں اندھی لڑکی کا کردار ادا کیا تھا اور اس طرح کہ فلم کے مناظر پر حقیقت کا گمان گزرتا تھا۔ مسعود پرویز نے اس فلم میں ایک طلسماتی ماحول پیدا کردیا تھا۔ خواجہ خورشید انور کی بنائی ہوئی موسیقی فلم کی کہانی میں اس طرح رچ بس گئی تھی دیکھنے والے فلم میں کھو کر رہ جاتے تھے اور جب سینما گھر سے باہر نکلتے تھے تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ایک حسین اور رنگین خواب دیکھ کر آرہے ہیں۔

نور جہاں کی آواز اور نغمے سن کر ہیرو انہیں شہر لے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ تمہاری آواز ایک پہاڑی علاقے تک محدود نہیں رہنی چاہیے، شہر میں نور جہاں کو ایک شہری لڑکی اور فن کارہ کے روپ میں ڈھالا جاتا ہے لیکن وہ اپنی کھوئی ہوئی دنیا کو فراموش نہیں کرسکتی۔ شہر میں ان کی آنکھوں کا آپریشن بھی کرایا جاتا ہے اور وہ دیکھنے کے قابل ہوجاتی ہیں۔ بینائی آتی ہے تو وہ دنیا کے ہر رنگ کو دیکھتی ہیں۔

انتظار وہ فلم تھی جس کی نمائش ہندوستان میں بھی ہوئی تھی اور ہندوستان کے فلم سازوں، موسیقاروں اور فلم بینوں نے کافی عرصے بعد اپنی مقبول فن کارہ کو دیکھا اور سنا تھا۔ ''انتظار'' کے گانوں کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ ان ہی دنوں بمبئی میں فلم فیئر ایوارڈز کی تقریب منعقد ہونے والی تھی۔ فلم فیئر کے مالک اور ایڈیٹر نے لاہور میں اپنے نمائندے خورشید کے ذریعے نور جہاں کو مدعو کیا۔ انہیں بہترین قیام وطعام کی پیشکش کی گئی اور یہ بھی پیشکش تھی کہ اگر وہ رضامند ہوں گی تو ان کا لائیو شو منعقد کرکے انہیں ہندوستانی فلمی صنعت کی طرف سے خراجِ عقیدت بھی پیش کیا جائے گا۔

نور جہاں نے دریافت کیا۔ ''کیا خواجہ خورشید انور کو بھی مدعو کیا گیا ہے، ان کی موسیقی ہی میں انتظار کی جان ہے۔''

خورشید نے شرمندگی سے کہا کہ انہیں تو مدعو نہیں کیا گیا۔

میڈم نے کہا۔ ''اگر وہ مدعو نہیں ہیں تو میں بھی نہیں جاؤں گی۔''

خورشید نے بمبئی سے رابطہ کیا اور ان سے کہا گیا کہ خواجہ صاحب کو بھی اسی طرح دعوت دے دی جائے۔

ہم خورشید کو لے کر خواجہ صاحب کے پاس گئے۔ خورشید نے انہیں دعوت دیتے ہوئے حماقت سے یہ کہہ دیا کہ میڈم نور جہاں کی خواہش پر آپ کو مدعو کیا گیا ہے۔

خورشید صاحب نے یہ سن کر کہا۔ ''پھر میری طرف سے معذرت کردیجیے۔ میں کسی کی سفارش پر جانا پسند نہیں کرتا۔''

خورشید کہتے رہے مگر ہم نے اشارہ کیا کہ بات ختم کردو خواجہ صاحب کے دفتر سے باہر نکل کر ہم نے خورشید کو ان کی حماقت کا احساس دلایا اور بتایا کہ انہوں نے بنا بنایا کام بگاڑ دیا ہے۔

اس طرح میڈم نور جہاں (اور خواجہ خورشید انور) اس تقریب میں شامل نہ ہوسکے۔ ''انتظار'' میں مجموعی طور پر میڈم نور جہاں کی اداکاری بہت اچھی تھی لیکن اندھی کے کردار میں انہوں نے نمایاں اداکاری کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ لیکن اپنی تمام خوبیوں کی بدولت یہ ایک سپر ہٹ اور یادگار فلم تھی جس میں میڈم نور جہاں نے پہلی مرتبہ اندھی لڑکی کا کردار ادا کیا تھا۔

☆☆☆

''دل اور دنیا'' فلم ساز، اداکار اور ہدایت کار کی حیثیت سے رنگیلا کی پہلی فلم تھی۔ اس وقت تک رنگیلا ایک کامیڈین کی حیثیت سے مشہور تھا۔ یکا یک نہ جانے کیا سوجھی کہ ہدایت کار اور فلم ساز بننے کی ٹھان لی۔ فلمی دنیا میں جس نے بھی سنا رنگیلا کی حماقت پر ہنس پڑا۔ دوستوں نے بھی مشورہ دیا کہ تم وہی کام کرو جس میں تم نے شہرت اور مقبولیت حاصل کی ہے۔ فلم سازی اور خصوصاً ہدایت کاری تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔ رنگیلا زیادہ باتیں کرنے کا عادی نہیں تھا۔ نہ ہی اس نے اعتراض کرنے والوں کے ساتھ بحث کی، چپ چاپ ہنس کر سب کی سن لیا کرتا تھا۔

اس زمانے میں علی زیب کی فلم ''جیسے جانتے نہیں'' بھی بن رہی تھی۔ اس فلم میں رنگیلا نے مزاحیہ اداکار کی حیثیت سے حصہ لیا تھا۔ اس سیٹ پر سب اس کی ہدایت کاری کا مذاق اُڑاتے تھے۔ جواب میں رنگیلا دانت نکال کر ہنستا۔ سب کی سنتا مگر جواب نہیں دیتا تھا۔

لاہور کی فلمی دنیا میں رنگیلا کی فلم موضوع گفتگو بنی ہوئی تھی۔ فلم کا اسکرپٹ بشیر نیاز نے لکھا تھا۔ کہانی بہت

وحید مراد اور شبنم فلم ''بندگی'' میں

اچھی تھی اس کے باوجود رنگیلا کی ہدایت کاری اور ہیرو ہونے کی وجہ سے کوئی ہیروئن اس فلم میں ہیروئن کا کردار کرنے کے لیے آمادہ نہ تھی۔ ہم نے جس سے پوچھا اس ہیروئن نے کہا۔ ''آفاقی صاحب، رنگیلا کے ساتھ ہیروئن؟ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی۔''

بالآخر رنگیلا کو ہیروئن مل گئی۔ جب آسیہ نے فلم ''دل اور دنیا'' کی کہانی سنی تو بہت پسند آئی۔ یہ فلم دراصل ہیروئن کے کردار کے گرد گھومتی تھی اور ہیروئن اندھی تھی۔ آسیہ نے ایک فن کارہ کی حیثیت سے سوچا کہ یہ اس کے لیے بہت اچھا موقع ہے۔ لہٰذا وہ فلم ''دل اور دنیا'' میں رنگیلا کی ہیروئن بننے کے لیے آمادہ ہوگئی۔

رنگیلا نے اپنی فلم کی شوٹنگ کا آغاز کیا تو ہر روز فلم کے سیٹ کا کوئی دلچسپ واقعہ سننے میں آتا تھا۔ سب کہتے تھے کہ رنگیلا بہت فضول خرچی کررہا ہے۔ جو سین پسند نہیں آتا اس کو بار بار فلماتا ہے۔ اداکاروں سے اپنی مرضی کے مطابق اداکاری کراتا ہے۔ جو گانا پسند نہیں آتا فلمانے کے باوجود اس کو مسترد کرکے نئے سرے سے فلم بندی کراتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

رنگیلا فلمی دنیا کی ہنسی کا ہدف بنا رہا جب تک کہ اس کی فلم ''دل اور دنیا'' ریلیز نہ ہوگئی۔ فلم ریلیز ہوتے ہی ہٹ ہوگئی بلکہ رفتہ رفتہ سپر ہٹ ہوگئی۔ ہر ایک کی زبان پر اسی فلم کا تذکرہ تھا۔ یہ دیکھ کر صحافیوں، نقادوں اور دانشوروں نے بھی فلم ''دل اور دنیا'' دیکھی۔ جس نے بھی دیکھی تعریف کی۔ اس کے برعکس اسی روز ریلیز ہونے والی علی زیب کی فلم جس کے ہدایت کار ایس سلیمان تھے اتنی کامیابی حاصل نہ کرسکی۔ محمد علی نے بذاتِ خود کامیابی پر رنگیلا کو مبارکباد دی اور کہا ''بھئی تم تو چھپے رستم نکلے۔''

جواب میں رنگیلا کی وہی مسکراہٹ جس میں اس کی ساری بتیسی نظر آتی تھی۔

یہ فلمی صنعت والوں کے لیے ایک سبق بھی تھا اور مقام عبرت بھی۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ رنگیلا نے اس کے بعد جتنی فلمیں بنائیں وہ کامیاب ہوئیں۔ نامور ہیروئنوں نے بھی اس کے ساتھ کام کیا اور داد حاصل کی۔ رنگیلا کی کامیابیوں کا یہ سفر فلم ''کبڑا عاشق'' پر جاکر ختم ہوگیا۔ یہ ناکامی کا ایسا داغ تھا جسے رنگیلا کبھی نہیں دھوسکا لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری اور فلموں میں بلا جھجک کامیڈی کردار ادا کرنے لگا۔

آیئے فلم ''دل اور دنیا'' کی کہانی سنیے۔ اگر یہ فلم آپ نے دیکھی ہوگی تو آج بھی یقیناً آپ کو یاد ہوگی۔ اگر نہیں دیکھی تو اس وقت صرف خلاصے پر اکتفا کیجیے اور ممکن ہو تو اس فلم کی سی ڈی منگا کر ضرور دیکھیے اور لطف اندوز ہوئیے۔ آپ یہ فلم دیکھ کر حیران رہ جائیں گے کہ ایک مسخرے اداکار نے اتنی اعلیٰ درجے کی خوبصورت فلم کیسے بنادی تھی۔

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

''دل اور دنیا'' میں آسیہ نے ایک گلفروش (پھول بیچنے والی) لڑکی کا کردار کیا ہے۔ لوگ اس کی صورت شکل سے متاثر ہوکر بھی پھول خرید لیتے ہیں۔ کچھ بگڑے ہوئے امیر زادے اسے سبز باغ بھی دکھاتے ہیں لیکن ایک باکردار لڑکی ہونے کی وجہ سے وہ انہیں خاطر میں نہیں لاتی۔ آنکھوں سے محروم ضرور ہے لیکن دنیا والوں کی چالوں کو خوب سمجھتی ہے۔ آسیہ ایک بے سہارا لڑکی ہے لیکن اندھی ہونے کے

باوجود وہ ایک باشعور اور سمجھ دار لڑکی ہے اور خود کو بہت سنبھال کر رکھتی ہے۔

اس فلم میں رنگیلا ایک آوارہ گرد قسم کا نوجوان ہے۔ کبھی کام کرلیا کبھی بے کار گھومتا رہا۔ اس کا بھی دنیا میں اور کوئی نہیں ہے جو اس کی تعلیم و تربیت کا بندوبست کرتا۔

رنگیلا اندھی پھول بیچنے والی لڑکی سے محبت کرتا ہے لیکن اپنے اندر اظہار کی جرأت نہیں پاتا۔ وہ آنے بہانے اس کے آس پاس رہنا چاہتا ہے اور اس کی مدد بھی کرتا رہتا ہے۔ مدد سے مطلب مالی مدد نہیں ہے بلکہ اس قسم کی مدد کہ اگر وہ غلط راہ پر جارہی ہے تو ہاتھ پکڑ کر اس کو صحیح راستے پر ڈال دے یا سڑک عبور کرتے وقت اس کے ساتھ ساتھ چلے تاکہ وہ بحفاظت سڑک عبور کرلے۔ وہ آسیہ کی جو بھی مدد کرسکتا ہے کرتا ہے۔ آسیہ اس کے خوابوں کی دیوی ہے جسے وہ خوابوں میں بھی دیکھتا رہتا ہے۔ کئی بار وہ آسیہ کو حادثوں سے بچاتا ..... آوارہ رنگیلا ایک لحاظ سے آسیہ کا محافظ، رہنما اور دوست ہے۔ آسیہ اس کی محبوبہ بھی ہے۔ وہ دنیا میں ہر چیز سے زیادہ آسیہ سے پیار کرتا ہے لیکن کبھی محبت کا اظہار نہیں کرتا۔

ایک روز آسیہ سڑک عبور کرتے ہوئے ایک کار سے ٹکرا جاتی ہے اور شدید زخمی ہوجاتی ہے۔ جس شخص کی کار سے اس کا ایکسیڈنٹ ہوتا ہے اتفاق سے وہ ایک ڈاکٹر اور آنکھوں کا سرجن ہے۔

ڈاکٹر آسیہ کو اسپتال لے جاکر اس کی مرہم پٹی کراتا ہے۔ آسیہ کو خطرناک چوٹیں نہیں لگی ہیں۔ چند روز کے اندر ہی اس کے زخم بھر جاتے ہیں۔ ڈاکٹر کو معلوم ہوتا ہے کہ آسیہ بینائی سے محروم ہے۔ اسپتال میں قیام کے دوران میں ڈاکٹر آسیہ کو پسند کرنے لگتا ہے۔ اس کے بارے میں یہ جان کر وہ فکرمند ہوجاتا ہے کہ آسیہ کا دنیا میں کوئی بھی نہیں ہے۔ اس بھری دنیا میں وہ بالکل بے سہارا اور اکیلی ہے۔ یہ معلومات اس کو آسیہ کے مزید قریب کردیتی ہیں۔

ڈاکٹر آسیہ کی آنکھوں کا بغور معائنہ کرنے کے بعد اس کو یہ خوش خبری سناتا ہے کہ آپریشن کے ذریعے اس کی بینائی واپس آسکتی ہے۔ مگر اس میں کچھ وقت لگے گا۔ ڈاکٹر کی شخصیت اور ہمدردی کی وجہ سے آسیہ اس سے بہت مانوس ہوچکی ہے بلکہ دل ہی دل میں اس کو پسند بھی کرنے لگی ہے۔ رنگیلا اسپتال میں آسیہ کی خبرگیری کے لیے جاتا رہتا ہے اور ہر طرح اس کا حوصلہ بڑھانے اور دل بہلانے کی کوشش کرتا ہے۔ آسیہ بھی رنگیلا کی ہمدردی اور مدد کے لیے اس کی شکرگزار ہے۔

جسم کے زخم ٹھیک ہوجانے کے بعد ڈاکٹر آسیہ سے کہتا ہے کہ اب وہ تندرست ہوچکی ہے اس لیے اسپتال میں نہیں رہ سکتی۔ ڈاکٹر اس کو پیشکش کرتا ہے کہ تم میرے گھر چل کر رہو۔ میں بھی بالکل تنہا ہوں۔ تم وہاں آپریشن ہونے تک آرام سے رہ سکتی ہو۔ تم مجھ پر بھروسا کرسکتی ہو تو میری یہ پیشکش قبول کرلو۔

آسیہ ڈاکٹر کے کردار سے بخوبی واقف ہوچکی ہے اور اس کو پسند بھی کرنے لگی ہے۔ وہ ڈاکٹر کے ساتھ اس کی کوٹھی پر چلی جاتی ہے جہاں اسے ہر طرح کا آرام میسر ہے۔ لیکن رنگیلا کو یہ جان کر بہت دکھ ہوتا ہے کہ آسیہ ڈاکٹر کے بنگلے میں رہنے لگی ہے لیکن وہ اس بارے میں آسیہ سے شکایت نہیں کرتا مگر اس کے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ اگر آسیہ ڈاکٹر کے بنگلے میں رہی تو وہ اس سے آزادانہ مل نہیں سکے گا اور نہ ہی اس سے قریب ہونے کا موقع ملے گا۔

آپریشن کے بعد آسیہ کی بینائی واپس آجاتی ہے۔ وہ آنکھیں کھولنے کے بعد سب سے پہلے اپنے محسن یعنی ڈاکٹر کو دیکھتی ہے اور اس کے بعد رنگیلا پر نظر پڑتی ہے۔ آسیہ نے اپنے تصور میں رنگیلا کا جو سراپا محسوس کیا تھا وہ دیکھنے میں اس کے برعکس تھا۔ پھر بھی آسیہ اس کی مدد اور ہمدردی کے لیے اس کی شکرگزار ہے۔

آنکھیں ٹھیک ہوجانے کے بعد آسیہ دنیا اور اس کی رنگینیوں کو دیکھ سکتی ہے۔ ڈاکٹر آسیہ سے شادی کی درخواست کرتا ہے جو وہ منظور کرلیتی ہے اور دونوں کی شادی ہوجاتی ہے۔ آسیہ کی تو دنیا ہی بدل چکی ہے۔ بینائی کے ساتھ ساتھ وہ آس پاس کے مناظر اور انسانوں کو بھی دیکھ سکتی ہے اور بہت خوش ہے۔

ڈاکٹر کے ساتھ آسیہ کی شادی رنگیلا کے لیے بہت بڑا صدمہ ہے۔ اس پر غم والم کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے۔ وہ آسیہ سے ملتا تو ہے مگر حرفِ شکایت زبان پر نہیں لاتا البتہ وہ خلوصِ دل سے آسیہ کو مشورہ دیتا ہے کہ ڈاکٹر اس سے محبت نہیں کرتا۔ وہ کچھ وقت کے بعد آسیہ کو چھوڑ دے گا۔ اس طرح وہ آسیہ کے دل میں ڈاکٹر کی طرف سے شک کا بیج بودیتا ہے۔ دوسری طرف ڈاکٹر بھی رنگیلا کے ساتھ آسیہ کا میل

ملاپ دیکھ کر شک وشبہ میں مبتلا ہوجاتا ہے، وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ اپنے شوہر کی موجودگی میں بھی آسیہ رنگیلا کے ساتھ گھل مل کر باتیں کرتی رہتی ہے۔ ایک روز ڈاکٹر ان دونوں کی باتیں سن لیتا ہے اور اس کو معلوم ہوتا ہے کہ رنگیلا آسیہ کو شوہر کی طرف سے بدگمان کرنے کی کوشش کررہا ہے۔ اس کے ضبط کے بند ٹوٹ جاتے ہیں۔ وہ سامنے آکر آسیہ کو بتاتا ہے کہ یہ تمہارا ہمدرد اور دوست نہیں تمہارا دشمن ہے جو تمہاری خوشیوں کو اجاڑ دینا چاہتا ہے۔ میں تم سے دل سے محبت کرتا ہوں اور کسی لالچ کے بغیر میں نے صرف محبت کے ہاتھوں مجبور ہوکر تم سے شادی کی ہے، پھر وہ رنگیلا پر برس پڑتا ہے اور ناراضی سے کہتا ہے کہ تم تو دوست کے بھیس میں آسیہ کی خوشیوں کے دشمن نکلے۔ شاید تم اس لیے جلتے ہو کہ اب تم ہمدردی کے بہانے آسیہ کو گمراہ نہیں کرسکو گے۔ تمہیں اس کی اور میری خوشیاں برداشت نہیں ہوتیں اسی لیے تم ہم دونوں کی زندگی میں زہر گھول رہے ہو۔

ڈاکٹر رنگیلا کو بہت برا بھلا کہتا ہے۔ آسیہ بھی ڈاکٹر کی باتوں سے متاثر نظر آتی ہے۔ اپنی محبت اور خلوص کے دامن پر دھبے رنگیلا کی برداشت سے باہر ہوجاتے ہیں۔ وہ روتا ہوا ڈاکٹر کے گھر سے چلا جاتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ میں جس کی محبت کے سہارے جی رہا ہوں اس کو تو نہ اس کی خبر ہے نہ پروا۔ مجھے ان دونوں کی زندگیوں کو برباد کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ وہ اللہ سے بھی شکوہ کرتا ہے کہ آخر سارے دکھ اور ناکامیاں غریبوں ہی کے حصے میں کیوں آتی ہیں۔

یہ "دل اور دنیا" کی کہانی کا خلاصہ ہے جس سے آپ فلم کے تاثر اور خوبصورتی کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اس فلم کے کئی مناظر فلم بینوں کے دلوں کو چھو لیتے ہیں۔ ہدایت کاری اور اداکاری کا معیار بھی بہت اچھا تھا۔ فلم کی موسیقی بھی دلوں کو چھونے والی تھی۔ یہ ہر اعتبار سے ایک معیاری فلم تھی۔ ڈاکٹر کا کردار حبیب نے ادا کیا تھا۔ سب اداکاروں نے اپنے کردار بہت خوبی سے نبھائے تھے، خصوصاً آسیہ نے ایک نابینا لڑکی کے روپ میں بہت اچھی اور حقیقت سے قریب اداکاری کی ہے۔ اس فلم میں آسیہ کی اداکاری کو بہت سراہا گیا تھا۔

☆☆☆

ایک اور فلم تھی جس میں آسیہ نے اندھی ہیروئن کا کردار ادا کیا تھا۔ آسیہ جن کا اپریل 2013ء میں انتقال ہوا ہے ایک بہت باصلاحیت اداکارہ تھیں۔ وہ پنجابی اور اردو فلموں میں یکساں روانی، بے تکلفی اور اعتماد کے ساتھ کام کرتی تھیں۔

یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب ..... ہماری پنجابی فلموں میں موٹی ہیروئنوں کا داخلہ نہیں ہوا تھا۔ اس وقت کی پنجابی فلموں میں نیلو، رانی، نغمہ اور آسیہ جیسی دبلی پتلی ہیروئنوں کا راج تھا۔ اس سے پہلے مسرت نذیر پنجابی فلموں کی مقبول ترین ہیروئن رہی تھیں، وہ اپنے قدوقامت کے اعتبار سے متناسب جسم کی مالک تھیں۔ ان کے بعد نیلو نے پنجابی فلموں میں نام پیدا کیا۔ نیلو دبلے پتلے متناسب جسم کی مالک تھیں۔ وہ بھی اردو اور پنجابی فلموں میں کام کرتی تھیں اور دونوں زبانوں کی فلموں میں مقبول تھیں، اس کے بعد رانی، نغمہ اور آسیہ پنجابی فلموں کی مقبول ہیروئن تھیں۔

جب ممتاز نے پنجابی اور اردو فلموں میں اداکاری کا آغاز کیا اس وقت وہ ہر اعتبار سے بہت موزوں تھیں اور اس زمانے کی بہت سی انڈین فلموں کی ہیروئنوں سے زیادہ خوبصورت بھی تھیں اور بہت اچھی ڈانسر بھی تھیں۔ بعد میں وہ رفتہ رفتہ موٹی ہونی شروع ہوگئیں یہاں تک کہ توپ کا گولا بن گئیں۔

یہی معاملہ انجمن کے ساتھ بھی پیش آیا تھا۔ جب وہ فلمی دنیا میں آئی تھیں تو ایک متناسب جسم کی دراز قد ہیروئن تھیں۔ قد کے اعتبار سے ان کا جسمانی تناسب بھی موزوں تھا۔ انہیں چند ایسی فلموں میں کام کرنے کا موقع ملا جو سپرہٹ اور یادگار پنجابی فلمیں کہلاتی ہیں۔ پھر اس وقت کے پنجابی فلموں کے بے تاج بادشاہ سلطان راہی کے ساتھ ان کی جوڑی بن گئی اور اس قدر مقبول اور کامیاب ہوئی کہ

بایدد شاید پنجابی فلم بین وہ فلمیں دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے جن میں سلطان راہی نہ ہوں۔ اس کے بعد اس جوڑی کی موجودگی لازمی ہوگئی۔ ان کے ناموں سے فلمیں فروخت ہوتی تھیں اور خوب پیسا بھی کماتی تھیں۔ لیکن اس دور میں دوسری تمام ہیروئنیں موٹی نہیں تھیں۔

اس وقت جس فلم کا تذکرہ کرنا مقصود ہے اس کا نام ہے "پیار ہی پیار" اس فلم کے ہدایت کار راکھن صاحب تھے جو ہندوستان سے آئے تھے اور ایک تجربہ کار اور کامیاب ہدایت کار تھے۔ اس فلم کی کہانی ریاض ارشد نے لکھی تھی۔ وہ بہت اچھے مصنف تھے، بدقسمتی سے جوانی ہی میں دنیا سے چلے گئے لیکن اپنی یادیں چھوڑ گئے۔ مثال کے طور پر "سلاخیں اور پیار ہی پیار" جیسی فلموں کے وہی مصنف تھے۔ اس فلم میں آسیہ اور وحید مراد نے مرکزی کردار ادا کیے تھے۔ بنیادی طور پر یہ ایک رومانی فلم تھی لیکن اس میں مقصد بھی تھا۔ اس فلم کا پس منظر پہاڑی تھا۔ پہاڑ کے خوبصورت دامن میں اس خوبصورت کہانی نے جنم لیا۔

آسیہ اور وحید مراد (راجو) بچپن میں ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ اس کے بعد آسیہ شہر چلی گئی اور اپنے پہاڑی گاؤں اور پہاڑی لوگوں سے دور ہوگئی۔

کافی عرصے بعد وہ شہر سے اپنے گاؤں آتی ہے اور یہاں کے خوبصورت نظاروں میں کھو جاتی ہے۔ پہاڑی پگڈنڈی پر چلتے ہوئے ایک نوجوان شخص اس سے ٹکرا جاتا ہے۔ آسیہ اس پر ناراض ہوتی ہے۔ وہ معذرت کرتا ہے۔ آسیہ غصے میں کہتی ہے۔ یہ تو تم نوجوانوں کا دستور ہے کہ... کسی نہ کسی بہانے لڑکیوں سے ٹکرا جاتے ہو۔ اب تم مجھ سے ٹکرا گئے۔ بلاوجہ، کیا تم اندھے ہو۔

جواب میں وہ کہتا ہے۔ "جی، میں اندھا ہوں۔"

یہ جواب سن کر آسیہ حیران رہ جاتی ہے اور جب اس کو معلوم ہوتا ہے راجو واقعی اندھا ہے تو وہ اپنے طرزِ عمل پر نادم ہوتی ہے۔

راجو اس سے کہتا ہے۔ "میں تو خیر اندھا ہوں لیکن آپ تو دیکھ سکتی ہیں۔ آپ تو اندھی نہیں ہیں۔"

جواب میں اس کا دل رکھنے کے لیے آسیہ کہتی ہے۔ "آپ دیکھ نہیں سکتے ورنہ آپ کو معلوم ہو جاتا کہ میں بھی اندھی ہوں، دیکھ نہیں سکتی۔"

یہ سن کر راجو شرمندہ ہو جاتا ہے اور آسیہ سے معذرت کر کے اظہارِ ہمدردی کرتا ہے۔

(فلم کے مکالمے حرف بحرف نہیں لکھے گئے ہیں۔ صرف ان کا خلاصہ اور مفہوم پیش کیا جا رہا ہے)

راجو آسیہ سے دریافت کرتا ہے "میں دیکھ تو نہیں سکتا لیکن محسوس کر سکتا ہوں، جہاں تک میرا خیال ہے آپ اس گاؤں کی رہنے والی نہیں ہیں۔ شاید کہیں اور سے آئی ہیں۔" آسیہ کہتی ہے "میں بھی کسی زمانے میں اسی گاؤں میں رہتی تھی۔ بچپن میرا یہیں گزرا ہے۔ اپنے بچپن کے دوستوں کو میں آج بھی بھلا نہیں سکی ہوں۔"

اس طرح دونوں کے مابین ایک باہمی ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ گھل مل کر باتیں کرنے لگے۔

آسیہ نے پوچھا "کیا تم پیدائشی اندھے ہو یا کسی حادثے کی وجہ سے بینائی سے محروم ہو گئے؟"

راجو نے ایک آہ بھری اور بڑے تلخ انداز میں جواب دیا۔ "میں تمہیں کیا بتاؤں۔ میری بینائی تو میرے ظالم باپ کی وجہ سے گئی ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"میرا باپ جاگیردار ہے۔ اگر تم دیہات میں رہی ہو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ جاگیردار کتنے سنگدل اور ظالم ہوتے ہیں۔ جب میں بچہ تھا تو میرا باپ ذرا سی غلطی پر بھی مجھے بہت بری طرح مارا کرتا تھا۔ ایک دن کسی معمولی غلطی پر اس نے مجھے بہت بری طرح مارا۔ میرا جسم زخمی ہو گیا اور جب اس نے میرا سر زمین پر کئی بار مارا تو میری بینائی چلی گئی اور میں اندھا ہو گیا۔"

آسیہ یہ سن کر بے چین ہو گئی۔ "تو پھر تمہارے باپ نے تمہاری آنکھیں ٹھیک کرانے کے لیے تمہارا علاج نہیں کرایا؟"

"جب غصہ اتر گیا تو میرے باپ نے کہا تھا کہ میں شہر لے جا کر تمہارا علاج کراؤں گا۔ لیکن میں نے انکار کر دیا کہ میں شہر نہیں جانا چاہتا۔"

"مگر تم نے اپنے باپ کی بات کیوں نہیں مانی؟" آسیہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

راجو نے کہا "مجھے اپنے باپ سمیت تمام جاگیرداروں سے نفرت ہے جن میں انسانیت اور ہمدردی بالکل نہیں ہوتی۔ نہ ان کے سینے میں دل ہوتا ہے اور نہ رحم۔ میں اپنے باپ اور ایک جاگیردار کا احسان نہیں لینا چاہتا۔

میں ان لوگوں سے نفرت کرتا ہوں۔ میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ ہمیں ان جاگیرداروں سے نجات دلائے، یہ انسان نہیں ظالم بھیڑیے ہیں۔ یہ مطلبی لوگ ہوتے ہیں۔ یہ ہر معاملے میں صرف اپنا فائدہ دیکھتے ہیں۔ انہیں تو اپنے بچوں سے بھی پیار نہیں ہوتا۔ لیکن اگر کوئی فائدہ حاصل ہو تو یہ اپنی اولاد کے آگے پیچھے پھرتے ہیں۔"

جاگیردار کا ذکر سن کر آسیہ نے پوچھا۔ "تمہارے باپ کا نام کیا ہے؟" راجو نے اپنے باپ کا نام بتایا تو آسیہ چونک اٹھی۔ اس نے پوچھا۔ "کیا تمہارا نام راجو ہے؟"

"ہاں۔ مگر تم کیسے جانتی ہو؟"

تب آسیہ اس کو بتاتی ہے کہ بچپن میں اس کو کس نام سے پکارا جاتا تھا اور اس کو اچھی طرح یاد ہے کہ وہ راجو کے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔

راجو یہ سن کر بہت خوش ہوتا ہے کہ آسیہ بچپن میں اس کے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔ اسے بچپن کی تمام باتیں یاد آ گئیں۔ بچپن کے دوستوں کو بھلا کون بھول سکتا ہے۔ آسیہ نے راجو کو یہ بھی یاد دلایا کہ اس کا جاگیردار باپ ہمیں ایک ساتھ کھیلنے سے منع کیا کرتا تھا لیکن... دونوں باپ سے چھپ کر ملا کرتے تھے۔

راجو کہتا ہے "ہاں مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ کئی بار میرے باپ نے مجھے اس بات پر بہت مارا بھی تھا۔"

آسیہ اور راجو اب دوبارہ پرانے دوستوں کی طرح ملنے لگتے ہیں۔ آسیہ جو گاؤں سے جانے کے بعد شہر میں رہ کر تعلیم یافتہ اور بہت سمجھدار ہو چکی ہے۔ راجو کو مشورہ دیتی ہے کہ اگر باپ کے کہنے پر وہ آنکھوں کا علاج کرانے پر آمادہ نہیں تھا تو اب میرے کہنے سے شہر جا کر آنکھوں کا علاج کرائے لیکن راجو رضامند نہیں ہوتا۔ وہ کہتا ہے مجھے اس دنیا نے آج تک کوئی سکھ نہیں دیا۔ کوئی خوشی نہیں دی۔ جب میری آنکھیں دیکھ سکتی تھیں اس وقت بھی مجھے کوئی خوبصورتی دیکھنے کو نہیں ملی۔ اس دنیا کو دیکھ کر مجھے اب سوائے دکھوں کے اور کیا نظر آئے گا۔ میں جیسا ہوں وہی ٹھیک ہے۔ میں اپنی دنیا میں خوش ہوں۔ مجھے اب بینائی کی ضرورت نہیں ہے۔

راجو کے انکار کے باوجود آسیہ نے دل میں ٹھان لی ہے کہ وہ راجو کو شہر لے جا کر اس کی آنکھوں کا علاج ضرور کرائے گی۔

اس فلم میں وحید مراد نے ایک اندھے کی بہت اچھی اداکاری کی تھی۔ ان کی مجموعی اداکاری بہت مختلف اور پُراثر تھی۔ اس فلم میں انہوں نے اپنا روایتی رومانی انداز ترک کر کے حقیقت پسندانہ اداکاری کی تھی۔ جسے فلم بینوں نے بہت پسند کیا۔ وحید مراد کی آواز بہت اچھی تھی اور اس کے گانے کی آواز سن کر ہی آسیہ بے چین ہو کر اس شخص کو دیکھنے کے لیے دیوانہ وار اس طرف گئی تھی جہاں راجو اس سے ٹکرا گیا تھا۔

فلم "پیار ہی پیار" کی موسیقی بہت اچھی تھی۔ اس فلم کے متعدد گانے بہت ہٹ ہوئے تھے۔ فلم کی کامیابی میں اس کے گیتوں کا بھی نمایاں ہاتھ تھا۔ مجھے اس وقت اس فلم کا ایک گانا یاد آ رہا ہے

بہت یاد آئیں گے وہ دن
ہمیں تڑپائیں گے وہ دن
صنم تیری قسم

اس فلم میں مردانہ آواز کے گانے بہت دلکش تھے کیونکہ وحید مراد کو ایک خوش گلو گانے والے کے روپ میں دکھایا گیا تھا۔

آسیہ وحید مراد کی آواز کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرتی ہے اور جانتی ہے کہ وہ بہت خوددار ہے۔ ایک دن اس سے کہتی ہے کہ تمہاری آواز اتنی اچھی ہے اور تم اتنا اچھا گاتے ہو تم آنکھوں کا آپریشن اس لیے ہی نہیں کرانا چاہتے کہ کسی کا احسان لینا تمہیں منظور نہیں ہے۔ میں نے ایک ترکیب سوچی ہے۔"

راجو پوچھتا ہے "وہ کیا ہے؟"

"وہ یہ ہے کہ تم شہر چلو۔ میں وہاں تمہارے شو کراؤں گی۔ مجھے یقین ہے کہ شہر والے تمہارا گانا سن کر پاگل ہو جائیں گے۔ اس طرح ہم کافی روپے اکٹھا کر لیں گے اور پھر تمہاری آنکھوں کا علاج خود تمہاری کمائی سے ہو سکے گا۔"

راجو مان جاتا ہے۔ شو بھی کامیاب رہتا ہے لیکن یہ تو راجو کو شہر لے جا کر اس کی آنکھوں کا علاج کرانے کے لیے ایک بہانہ تھا۔ شہر میں اس کے شو بہت کامیاب ہوتے ہیں۔ آنکھوں کا آپریشن ہوتا ہے جس کے بعد وہ دیکھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ ایک مشہور گلوکار بھی بن جاتا ہے۔ دولت اس کے قدم چومتی ہے شہرت اس پر نچھاور ہوتی ہے۔ اس طرح یہ رومانی کہانی ایک خوشگوار انجام کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔

اس فلم کے بارے میں تفصیل بیان کرنے کی

ضرورت اس لیے پیش آئی کہ یہ ایک بہت خوبصورت رومانی فلم تھی جس میں وحید مراد کی اداکاری نے جان ڈال دی تھی۔ پاکستانی فلموں میں اندھوں کی اداکاری کے حوالے سے بھی یہ فلم ایک یادگار فلم تھی۔

☆☆☆

اندھوں کی اداکاری کے حوالے سے ایک اور فلم ”بندگی“ ایک ناقابلِ فراموش فلم ہے۔ اس فلم میں ایک حادثے میں فلم کی ہیروئن شبنم بینائی کھو بیٹھتی ہیں حادثے میں ان کے والد بھی کشتی سے گر کر ہلاک ہو جاتے ہیں۔ اس کا ذمّے دار وہ ایک بے فکرے اور کھلنڈرے امیر زادے (وحید مراد) کو قرار دیتی ہیں، وحید مراد سے انہیں شدید نفرت ہے۔ وہ نہ تو اس کا نام سننا چاہتی ہیں اور نہ ہی اس کی صورت دیکھنے کی روادار ہیں۔

فلم ”بندگی“ کے فلم ساز سلیم اشرفی تھے جو صنوبر سینما لاہور کے مالک تھے۔ ان سے پہلے ان کے والد سینما کے مالک تھے جن کا نام سیٹھ رمضان تھا۔ بڑے باوضع اور خوش اخلاق آدمی تھے۔ سلیم اشرفی ہمارے ہم عمر ہوں گے۔ وہ فلم سازی بھی کرتے تھے اور تقسیم کار بھی تھے۔ دوستوں کے دوست تھے اور ہر شام ان کے دفتر میں فلمی ہستیوں کا جمگھٹا ہوتا تھا۔

فلم ”عندلیب“ کی بے مثال کامیابی کے بعد بطور ہدایت کار فرید احمد کا شمار صفِ اول کے ہدایت کاروں میں ہونے لگا تھا۔

”عندلیب“ کے فلم ساز راشد مختار تھے جو اس سے پہلے ”توبہ“ جیسی سپر ہٹ فلم بنا چکے تھے۔ ”عندلیب“ کا اسکرپٹ بھی ہم نے ہی لکھا تھا۔ یہ بھی ایک خاتون کے ناول سے ہی اخذ کی گئی تھی مگر چند کرداروں اور واقعات کے سوا سارا اسکرپٹ اصل ناول سے مختلف تھا۔ عندلیب، فرید احمد کی ہدایت کار کی حیثیت سے پہلی کامیاب فلم تھی۔ اس سے پہلے ان کی فلم ”پہچان“ کامیاب نہ ہو سکی تھی۔ یہ وہی فلم ہے جس کی ہیروئن شاہ پارا ایرانی تھیں اور جن سے فلم کے ہیرو محمد علی کے رومان کی داستانیں بہت مشہور تھیں۔ شاہ پارا ایک حسین اور تجربہ کار ہیروئن تھیں۔ وہ ایرانی فلموں میں بھی کام کر چکی تھیں۔ اس وقت تک ایران میں اسلامی انقلاب برپا نہیں ہوا تھا۔ معاشرہ بہت آزاد اور مغرب زدہ تھا۔

”پہچان“ کی ناکامی کے بعد ”عندلیب“ کی بے پناہ کامیابی نے فرید احمد کو صفِ اول کے ہدایت کاروں میں شامل کر دیا تھا۔ وہ بہت اچھے اور تعلیم یافتہ ہدایت کار تھے ڈبلیو زیڈ احمد جیسے باکمال ہدایت کار کے بیٹے تھے۔ یہ ان کی بدقسمتی تھی کہ عندلیب سے پہلے ان کی کوئی فلم کامیاب نہ ہو سکی تھی۔ ”عندلیب“ کی کامیابی کے بعد فلمی روایات کے مطابق فلم ساز ان پر ٹوٹ پڑے۔ لیکن وہ ایک وقت میں صرف ایک ہی فلم بنانے کے قائل تھے اس لیے جب اشرفی (وہ کافی عرصے قبل مرحوم ہو چکے ہیں) نے انہیں ہدایت کاری کی پیشکش کی تو وہ رضا مند ہو گئے مگر انہوں نے کہا کہ فلم کا اسکرپٹ آفاقی صاحب سے ہی لکھوائیں۔ اشرفی کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ انہوں نے مصنف کے طور پر ہم سے معاہدہ کر لیا۔ فلم کے معاوضے کے بارے میں کچھ اختلاف رہا جس کا تفصیلی بیان ہو چکا ہے۔

فلم کی کہانی کے لیے فرید احمد کے ذہن میں ایک مرکزی خیال تھا جو انہوں نے کسی انگریزی فلم سے یا ناول سے متاثر ہو کر پسند کیا تھا۔ یہ آئیڈیا انہوں نے ہمیں سنایا۔ یہ ایک رومانی کہانی تھی ہمارے خیال میں اس پر مبنی بہت اچھی کہانی بن سکتی تھی۔

فلم ”بندگی“ کی کہانی کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے۔

وحید مراد (فلم کا ہیرو) ایک دولت مند باپ کا رنگین مزاج اور کھلنڈرا اکلوتا بیٹا ہے وہ ایک پلے بوائے جیسی شہرت کا مالک ہے۔ سارا شہر اس کو جانتا ہے۔ اسی شہر میں متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والا ایک شخص بھی رہتا ہے۔ اس کی اکلوتی اور تعلیم یافتہ بیٹی (شبنم) ایک سنجیدہ مزاج اور سمجھدار لڑکی ہے۔ وحید مراد جب اپنی قیمتی اسپورٹس کار لے کر اس کے پاس سے گزرتا ہے اور اسے گھر پہنچانے کی پیشکش کرتا ہے تو اس کی حرکتوں اور خراب شہرت کے باعث وہ مسترد کر دیتی ہے۔ وہ وحید مراد کو ناپسند کرتی ہے بلکہ اس کی اوچھی حرکتوں کی وجہ سے اس کو کئی بار جھڑک بھی دیتی ہے۔

دوسری طرف وحید مراد شبنم کے گریز اور اسے نظر انداز کرنے کی وجہ سے وہ شبنم کو پسند کرنے لگتا ہے بلکہ کسی حد تک اس سے محبت بھی کرنے لگتا ہے۔ موقع بے موقع وہ جب بھی شبنم کو دیکھتا ہے اس سے فلرٹ کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن ان حرکتوں کی وجہ سے شبنم اس کو اور زیادہ ناپسند کرنے لگتی ہے۔ بلکہ کسی حد تک اس سے نفرت بھی کرنے لگتی ہے۔

ایک روز جب شبنم اپنے والد کے ساتھ کشتی میں دریا کی سیر کر رہی ہے تو وحید مراد بھی اپنی موٹر بوٹ لے کر آ جاتا ہے اور شبنم کو متوجہ کرنے کے لیے اس کی کشتی کے آس پاس تیز رفتاری سے موٹر بوٹ گھماتا ہے جس کی وجہ سے پانی کی چھینٹیں شبنم اور اس کے والد پر بھی پڑتی ہیں۔ یہ بدنما شوخی اس کے باپ کو بھی ناگوار گزرتی ہے اور وہ کہتا ہے کہ یہ بھی کوئی بگڑا ہوا رئیس زادہ ہے۔ ہماری نئی نسل اخلاق و تہذیب سے کتنی دور ہوتی جا رہی ہے۔

اسی دوران میں وحید مراد بہت تیزی سے موٹر بوٹ چلاتا ہوا ان کی کشتی کے اتنے زیادہ قریب سے گزرتا ہے کہ کشتی ڈانواں ڈول ہو جاتی ہے اور دونوں باپ بیٹی کشتی سے پانی میں گر جاتے ہیں۔ ان دونوں کو تیرنا نہیں آتا مگر وہ زندگی بچانے کے لیے ہاتھ پیر مارتے ہیں لیکن ڈوب جاتے ہیں۔ شبنم باپ کو اور خود اپنے آپ کو بچانے کی کوشش میں کشتی کو پکڑنا چاہتی ہے مگر اس میں کامیاب نہیں ہوتی۔ اس کا سر کشتی سے ٹکرا جاتا ہے اور وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔ اسی وقت امداد کے لیے غوطہ خور آ جاتے ہیں۔ شبنم کے والد تو دریا کی موجوں کے ساتھ بہہ جاتے ہیں لیکن شبنم کو بچا لیا جاتا ہے اور اس کو فوری طور پر اسپتال پہنچایا جاتا ہے۔ اس واقعے سے وحید مراد بھی باخبر ہو جاتا ہے اور بہت شرمندہ ہوتا ہے۔ وہ اسپتال جا کر حالات کے بارے میں معلوم کرتا ہے۔ شبنم کے والد کے ڈوب کر مر جانے کی خبر سے وہ پریشان اور غمگین ہو جاتا ہے۔ وہ شبنم کے بارے میں معلوم کرتا ہے تو ڈاکٹر جو کہ اس کا دوست ہے بتاتا ہے کہ ابھی ان کے ٹیسٹ ہو رہے ہیں۔ رپورٹ دیکھنے کے بعد ہی صحیح طور پر بتایا جا سکتا ہے کہ اسے کس قسم کی چوٹیں آئی ہیں۔ مگر یہ طے ہے کہ اس کے سر پر چوٹ آئی ہے جو کافی تشویش کی بات ہے۔ وحید مراد یہ سن کر بہت شرمندہ ہوتا ہے اور اس کو احساس ہوتا ہے کہ یہ سب اس کی غلطی کی وجہ سے ہوا ہے۔ وہی شبنم کے باپ کی موت اور شبنم کی چوٹ کا ذمّے دار ہے۔

وہ ڈاکٹر سے (جو اس کا دوست بھی ہے) کہتا ہے کہ ”دیکھو، مجھے یہ احساس بہت تکلیف دے رہا ہے کہ اس حادثے کا میں ہی ذمّے دار ہوں۔ میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔ میں تو محض چھیڑ خانی کر رہا تھا مگر یہ معلوم نہ تھا اس کا نتیجہ اتنا خوفناک برآمد ہوگا۔ مجھے نہیں معلوم کہ شبنم کا کوئی اور بھی رشتے دار ہے یا نہیں۔ تم اس کے رشتے داروں کے اور اس کے گھریلو حالات کے بارے میں معلومات حاصل کرو۔ میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ شبنم کو پرائیویٹ روم میں رکھا جائے اور بہترین طبی امداد اور سہولتیں فراہم کی جائیں۔ یہ تمام اخراجات میں خود ادا کروں گا لیکن شبنم کو پتا نہ چلنا چاہئے کہ یہ سب کچھ میں کر رہا ہوں۔ اس کو یہی بتانا کہ تمام سہولتیں اسپتال کی جانب سے فراہم کی جا رہی ہیں۔“

شبنم کے ٹیسٹ کی رپورٹیں آنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دماغ میں کوئی خطرناک چوٹ نہیں آئی ہے لیکن سر کشتی سے ٹکرانے کی وجہ سے وہ اپنی بینائی کھو چکی ہے۔ یہ سن کر وحید مراد بہت پریشان اور غمزدہ ہو جاتا ہے۔ اس کا ضمیر اس کو ملامت کرتا ہے کہ ایک شریف گھرانے کی تباہی، ایک بوڑھے شخص کی موت اور ایک نوجوان لڑکی کے نابینا ہونے کا وہی ذمّے دار ہے۔

اسپتال میں چوٹوں سے صحت مند ہو جانے کے بعد اس کو گھر جانے کی اجازت مل جاتی ہے۔ اس درمیان میں ڈاکٹر باتوں باتوں میں شبنم سے اس کے بارے میں تمام معلومات حاصل کر لیتا ہے۔ شبنم بتاتی ہے کہ دنیا میں باپ کے سوا اس کا اور کوئی نہیں ہے۔ ماں بچپن ہی میں مر گئی تھی۔ کوئی اور رشتہ دار دنیا میں نہیں ہے۔ ان کا ذریعہ آمدنی مرحوم باپ کی پنشن اور چند مکانوں کا کرایہ تھا۔ اب باپ کے دنیا سے جانے کے بعد اس کا سہارا صرف چند دکانوں کا کرایہ ہے۔ آنکھوں سے معذور ہو جانے کے بعد اب زندگی کیسے گزرے گی یہ وہ نہیں جانتی۔ اللہ جو کرے گا بہتر کرے گا۔

ڈاکٹر یہ تمام واقعات وحید مراد کو بتا دیتا ہے۔ اس کو یہ حقائق سن کر بہت زیادہ دکھ ہوتا ہے۔ وہ شبنم کے مالی حالات کے بارے میں معلوم کر کے اپنی غلطیوں کا شدت سے احساس کرتا ہے۔

اگلے روز وہ کافی سوچ بچار کے بعد ایک فیصلہ کرتا ہے اور شبنم کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ وہ شبنم سے ملاقات کر کے جب اپنا نام بتاتا ہے تو وہ غصے سے بے قابو ہو جاتی ہے اور کہتی ہے کہ تم کو یہاں آنے کی جرأت کیسے ہوئی؟ میں تمہاری صورت نہیں دیکھنا چاہتی۔ تم میرے باپ کے قاتل ہو۔ میری تباہی کے تم ہی ذمّے دار ہو۔

وحید مراد اس کے سامنے شرمندگی کا اظہار کرتا ہے کہ یہ واقعی میری غلطی تھی لیکن میں دانستہ طور پر تمہیں یا تمہارے والد کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ مجھے ان واقعات کا بھی دکھ ہے لیکن خدارا مجھے معاف کر دو۔ میں واقعی تمہارا قصوروار ہوں۔ اس کا ازالہ کرنے کے لیے میں تمہیں دینے کے لیے

چیک لایا ہوں اور درخواست کرتا ہوں کہ اسے قبول کرلو۔

شبنم یہ سن کر غصے کے مارے آپے سے باہر ہو جاتی ہے اور اس پر چیختی چلاتی ہے۔ کہتی ہے کہ تم مجھے برباد کرنے کے بعد اب پھر اپنی دولت سے مجھے خریدنے آئے ہو۔ لے جاؤ اپنا یہ کاغذ کا ٹکڑا۔ میں تمہارا احسان نہیں لینا چاہتی۔ تم ایک آوارہ اور بگڑے ہوئے مغرور اور بے حس رئیس زادے ہو۔ تم میرے باپ کے قاتل اور مجھے اندھا کرنے کے ذمے دار ہو۔

معافی کس بات کی؟ کیا تم میرے باپ کو واپس لا سکتے ہو؟ کیا مجھے میری بینائی واپس دے سکتے ہو۔ غرضیکہ وہ برا بھلا کہہ کر وحید مراد کو گھر سے نکال دیتی ہے اور کہتی ہے کہ آئندہ میں تمہاری منحوس آواز نہیں سننا چاہتی۔

وحید مراد مایوس ہو کر واپس چلا جاتا ہے مگر چاہتا ہے کہ کسی طرح اس کی مدد کرے۔ وہ ڈاکٹر سے مل کر کہتا ہے کہ تم میری مدد کرو اور شبنم کے پاس جاؤ، اس کو اسپتال میں لا کر اس کی آنکھوں کا آپریشن کرنے کے لیے مجبور کرو۔ خدا کے لیے میری مدد کرو ورنہ میں اس غم اور پشیمانی کا بوجھ اٹھا کر زندہ نہیں رہ سکوں گا۔

ڈاکٹر شبنم کے گھر جا کر اس سے بات کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اسپتال کی انتظامیہ کی خواہش ہے کہ آپ کی آنکھوں کا آپریشن کیا جائے۔

شبنم: مگر میرے پاس آپریشن کرانے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔

ڈاکٹر: آپ کا ایک پیسا بھی خرچ نہیں ہوگا۔ تمام اخراجات اسپتال انتظامیہ ادا کرے گی۔

شبنم: میں حیران ہوں کہ اسپتال کی انتظامیہ مجھ پر اتنی مہربان کیوں ہے؟

ڈاکٹر: دراصل یہ اسپتال ایک پرائیویٹ ادارہ چلاتا ہے۔ ہم لوگ چاہتے ہیں کہ مستحق مریضوں کو طبی امداد بلا کسی معاوضے کے فراہم کریں چونکہ اسپتال کے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں صاحبِ حیثیت لوگ شامل ہیں جو انسانیت کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔

شبنم علاج کرانے کے لیے تیار ہو جاتی ہے اور اسپتال میں داخل ہو جاتی ہے۔ وحید مراد اب شبنم سے حد سے زیادہ محبت کرنے لگا ہے بلکہ عشق کرتا ہے۔

وحید مراد اسپتال جا کر شبنم کو دیکھتا رہتا ہے اور اس کی دیکھ بھال بھی کرتا ہے۔ ایک دن جب کمرے میں وہ گلدستہ رکھ رہا ہے تو شبنم دریافت کرتی ہے...... کون ہے؟ پہلے وحید مراد کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کرے۔ اگر بولے گا تو کہیں شبنم آواز سے اس کو پہچان نہ لے۔

شبنم کے دوبارہ پوچھنے پر وحید مراد آواز میں کچھ تبدیلی پیدا کر کے جواب دیتا ہے کہ وہ اسپتال کے اسٹاف کا ایک فرد ہے۔ مریضوں اور ان کے کمروں کی دیکھ بھال کرنا اس کا فرض ہے۔

شبنم مطمئن ہو جاتی ہے لیکن اس سے زیادہ اطمینان اور تسلی وحید مراد کو ہوتی ہے کہ شبنم اس کو آواز سے پہچان نہیں سکی۔

اس کے بعد وحید مراد کو یہ موقع مل گیا کہ وہ شبنم کے پاس جا کر اس سے باتیں کر کے ہر طرح اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ شبنم کی آنکھوں کے علاج کے سلسلے میں آنکھوں کے ٹیسٹ وغیرہ شروع ہو جاتے ہیں۔ اس دوران میں وحید مراد اپنے دوست ڈاکٹر کو اعتماد میں لے کر اس سے اجازت لے لیتا ہے کہ وہ اسپتال اٹینڈنٹ کے بھیس میں شبنم کی مدد کر سکتا ہے۔ ڈاکٹر اس بات پر رضا مند ہو جاتا ہے، اس طرح وحید مراد کو شبنم کے پاس آنے جانے کا موقع مل جاتا ہے۔ وہ اس کے پاس جاتا ہے۔ اس کے لیے چائے وغیرہ کا اہتمام کرتا ہے۔ اس سے کہتا ہے کہ آج موسم بہت اچھا ہے۔ آس پاس کا منظر بھی بہت اچھا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو سیر کے لیے باہر لے جا سکتا ہوں۔

شبنم کہتی ہے کہ میں تو کچھ دیکھ نہیں سکتی۔ باہر جا کر کیا کروں گی۔ وہ کہتا ہے کہ باہر کی تازہ ہوا سے آپ کی طبیعت میں تازگی پیدا ہوگی۔

شبنم کو وہیل چیئر پر بٹھا کر وحید مراد کمرے سے باہر لے جاتا ہے اور باغ کی سیر کراتا ہے۔ بتاتا ہے کہ آس پاس خوبصورت پہاڑ اور نیلا آسمان کتنا بھلا لگ رہا ہے۔ شبنم کہتی ہے مگر میں تو یہ سب نہیں دیکھ سکتی۔ وحید کہتا ہے میں آپ کو بتاتا رہوں گا اور کچھ دن بعد جب آپ کا آپریشن ہو جائے گا تو آپ خود اپنی آنکھوں سے یہ سب دیکھ سکیں گی۔ اس طرح وحید مراد کو شبنم کے نزدیک ہونے کا موقع ملتا رہتا ہے۔

شبنم کی آنکھوں کا آپریشن ہوا اور کامیاب ہو گیا۔ جب اس کی آنکھوں پر سے پٹی کھلنے کا وقت آیا تو اس نے خواہش ظاہر کی وہ پٹی کھلنے کے بعد سب سے پہلے اپنے

ماضی کی مقبول
اداکارہ شبنم

مسیحا اور اس ڈاکٹر کو دیکھنا چاہتی ہے جس کی بدولت وہ ایک بار پھر دنیا کو دیکھنے کے قابل ہوئی ہے۔

پٹی ہٹائی جاتی ہے۔ شبنم کو پہلے دھندلا ہیولا سا نظر آتا ہے پھر اس کو ڈاکٹر کا چہرہ بالکل صاف نظر آنے لگتا ہے۔ وہ خوشی کا اظہار کرتی ہے اور کامیاب آپریشن کرنے پر مبارکباد دینے کے علاوہ ڈاکٹر کا شکریہ بھی ادا کرتی ہے۔

ڈاکٹر کہتا ہے کہ آنکھوں کے آپریشن کی کامیابی کے لیے خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ میں تو ایک ڈاکٹر ہوں۔ میرا کام ہی آنکھوں کا آپریشن کرنا ہے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ آپ کی آنکھیں واپس لانے کا ذمے دار کوئی اور ہے۔ اسی کی کوششوں سے ہمیں یہ کامیابی ملی ہے۔ دراصل آپ کے شکریے کا مستحق مجھ سے زیادہ وہ شخص ہے۔

شبنم حیران ہو کر پوچھتی ہے "وہ کون شخص ہے؟"

ڈاکٹر کے اشارے پر وحید مراد جھجکتا ہوا کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ شبنم اس کو دیکھ کر پہلے تو حیران ہوتی ہے پھر غصے سے بے قابو ہو کر چلاتی ہے۔ "یہ، یہ شخص قاتل ہے، یہ میرے باپ کا قاتل ہے۔ اسی کی وجہ سے میں اندھی ہوئی تھی۔ اس کو کمرے سے نکال دیجیے۔ ڈاکٹر کچھ کہنے کی کوشش کرتا ہے مگر شبنم کہتی ہے کہ اس کو میری نظروں سے دور کردیجیے ورنہ میں خود اپنی آنکھیں پھوڑ لوں گی۔ اگر میری آنکھوں کے علاج میں اس کا ذرا سا بھی ہاتھ ہے تو مجھے ایسی آنکھیں نہیں چاہئیں۔ ڈاکٹر صاحب، آپ یہ آنکھیں واپس لے لیجیے۔ ایک ظالم، سنگدل اور قاتل کا احسان اٹھانا مجھے منظور نہیں ہے۔

یہ سن کر وحید مراد کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ وہ کہتا ہے۔ میں تمہارا قصوروار ہوں، تم سچ کہتی ہو۔ میں اس قابل نہیں ہوں کہ تمہیں اپنا چہرہ دکھاؤں۔ آئندہ تم کبھی یہ چہرہ نہیں دیکھو گی۔

یہ کہہ کر آنسو پونچھتا ہوا وہ کمرے سے چلا جاتا ہے۔

اس کے جانے کے بعد شبنم ڈاکٹر سے کہتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب آپ نے بھی مجھے دھوکا دیا ہے۔ ڈاکٹر جواب میں کہتا ہے کہ آپ کا غصہ کم ہو جائے تو پھر میری بات بھی ٹھنڈے دل سے سن لیجیے گا۔ یہ کہہ کر وہ جانے لگتا ہے مگر شبنم آواز دے کر اسے روک لیتی ہے اور کہتی ہے کہ میں نے شاید غصے میں آپ کے ساتھ زیادتی کردی ہے جس کے لیے میں معافی چاہتی ہوں۔

ڈاکٹر کہتا ہے کہ اگر آپ واقعی معافی مانگنا چاہتی ہیں تو پھر اس شخص سے معذرت کریں جس کو آپ نے ذلیل اور رسوا کر کے کمرے سے نکال دیا ہے۔

شبنم حیران ہوتی ہے۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب۔ شاید آپ کو معلوم نہیں کہ اس شخص نے کس سنگدلی کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہ ایک آوارہ اور بگڑا ہوا رئیس زادہ ہے۔ یہی وہ شخص ہے جو میرے باپ کی موت کا ذمے دار ہے۔ اس کی مہربانیوں نے مجھے اس حال تک پہنچایا ہے۔

ڈاکٹر کہتا ہے کہ مجھے سارے حالات کا علم ہے لیکن آپ کو اصل حالات کا علم نہیں ہے۔ پھر ڈاکٹر اس کو بتاتا ہے کہ اس کے علاج اور دیکھ بھال کا فرض وحید نے ہی ادا کیا ہے۔ اسی نے آپ کا علاج کرایا ہے اور آپ کا آپریشن کامیاب ہونے کے لیے رو رو کر دعائیں کرتا رہا ہے۔ یہ

ایک حادثہ تھا۔ وہ آپ کو چھیڑنے کی خاطر موٹر بوٹ لے کر گیا تھا مگر حادثہ ہوگیا۔ اس حادثے نے اس کی زندگی تبدیل کردی۔ وہ ایک نیک اور شریف آدمی بن گیا۔ اس نے اللہ سے توبہ کی اور عہد کیا کہ باقی زندگی انسانیت کی خدمت کے لیے وقف کردے گا۔ مس شبنم، آپ نے جس وحید کو پہلے دیکھا تھا یہ وہ آدمی نہیں ہے۔ یہ ایک دوسرا آدمی ہے۔ وہ اپنے ماضی کے تمام گناہوں کے لیے اللہ سے معافی کی درخواست کرتا رہتا ہے۔ اور جہاں تک آپ کا تعلق ہے یقین کیجیے کہ وہ آپ سے بہت محبت کرتا ہے بلکہ عشق کرتا ہے۔ اس نے اپنی بقیہ زندگی آپ کے نام وقف کردی ہے۔ وہ آپ کا نام لیے بغیر سانس بھی نہیں لے سکتا، آپ ہی اس کی زندگی ہیں۔ وہ میرے بچپن کا دوست ہے۔ میں اس کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس کی زندگی کے ہر مرحلے سے واقف ہوں۔ مگر حادثے اور آپ کی محبت نے اس کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ یقین کریں وہ آپ سے بے پناہ عشق کرتا ہے۔ ہر حالت میں آپ کو خوش دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ آپ کی پرستش کرتا ہے۔ بلکہ آپ کی بندگی کرتا ہے آپ ہی اس کے لیے سب کچھ ہیں۔ آپ کی ہر خوشی اس کی خوشی اور آپ کا معمولی سا دکھ اس کو غمگین کردیتا ہے۔

یہ درست ہے کہ وہ کبھی ایک بگڑا ہوا امیرزادہ تھا۔ لڑکیوں سے فلرٹ کرتا پھرتا تھا۔ بے فکروں کی زندگی گزارتا تھا مگر اب وہ تائب ہوچکا ہے اس کی زندگی کا مقصد صرف آپ کو خوش دیکھنا اور خوش رکھنا ہے۔

شبنم خاموشی سے یہ باتیں سن رہی ہے اور متاثر نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر کہتا ہے، مس شبنم میں اس معاملے میں دخل دینے کا حقدار تو نہیں ہوں لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ ایک خطا تو اللہ تعالیٰ بھی معاف کردیتا ہے مگر آپ اس کی ایک غلطی بھی معاف کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ انسان تو غلطیوں کا پتلا ہے۔ زندگی میں بے شمار غلطیاں کرتا رہتا ہے لیکن یہ امید بھی رکھتا ہے کہ اس کا رحم کرنے والا خدا اس کو ضرور معاف کردے گا۔ آپ نے وحید کا دل توڑ دیا ہے۔ اس کی ساری امیدیں اور ساری خوشیاں چھین لی ہیں۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اس کی زندگی چھین لی ہے۔ آگے جو آپ چاہیں کریں۔

یہ کہہ کر ڈاکٹر چلا جاتا ہے۔ شبنم کافی دیر تک خاموش بیٹھی سوچتی رہتی ہے۔ پھر اس کو وہ باتیں یاد آتی ہیں جو اس کے علاج کے دوران میں وحید کرتا رہا ہے۔ اس کی مدد کرتا ہے۔ اس کو وہیل چیئر پر بٹھا کر گھماتا ہے۔ اس کا دل بہلانے اور اس کو خوش کرنے کے لیے کیا کچھ نہیں کرتا ہے۔ پھر ڈاکٹر کی کہی ہوئی باتیں اس کو یاد آتی ہیں اور اس احساس ہوتا ہے کہ واقعی اس نے وحید کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ اس نے تو صرف ایک ہی غلطی کی تھی اور پھر اس کی تلافی کرنے کی کوششیں کرتا رہا لیکن میں کیسی سنگدل اور بے حس ہوں کہ اس کی ایک غلطی معاف نہ کرسکی اس کو ذلیل اور بے عزت کرتی رہی۔ یہ میں نے اچھا نہیں کیا۔ مجھے اس سے اپنے سلوک کی معافی مانگنی چاہیے۔

شبنم اپنے کمرے سے باہر نکل کر وحید مراد کو تلاش کرتی ہے، کوئی بتاتا ہے کہ وہ باغ کی طرف گیا تھا۔

شبنم برآمدے سے نکل کر باغ کی طرف دیکھتی ہے۔ چاروں طرف خوبصورت پہاڑی منظر بہت دل کش ہے پھر اس کی نظر وحید پر پڑتی ہے۔ پہاڑی کی چوٹی کے نزدیک وہ ایک لکڑی کی بینچ پر خاموش بیٹھا سامنے کا منظر دیکھ رہا ہے۔

شبنم کچھ سوچتی ہے۔ پھر جھجکتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ آہستگی سے اس کے پاس جاتی ہے۔ بینچ کے پیچھے کھڑے ہو کر سوچتی رہتی ہے کہ مخاطب کرے یا نہ کرے۔ مگر پھر آہستگی سے اس کا نام لے کر پکارتی ہے۔ وہ کوئی جواب نہیں دیتا نہ پلٹ کر اس کی طرف دیکھتا ہے۔ شبنم کہتی ہے، مانتی ہوں تم مجھ سے ناراض ہو، تمہاری ناراضی بے جا بھی نہیں ہے۔ وحید پھر بھی جواب نہیں دیتا۔

شبنم کہتی ہے کہ پہلے تم مجھ سے معافی مانگا کرتے تھے مگر آج میں تم سے معافی مانگنے آئی ہوں۔ میں بہت غصے میں تھی اور اپنے تمام دکھوں کے لیے تم ہی کو قصوروار سمجھتی تھی۔ مگر تمہارے دوست ڈاکٹر صاحب نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے میں اندھی تھی۔ ڈاکٹر نے آپریشن کرکے مجھے بینائی دی لیکن دراصل میری آنکھیں آپریشن نے نہیں ڈاکٹر صاحب کی باتوں نے کھول دی ہیں۔ وہ سچ کہتے ہیں اور میں بھی یہی سمجھتی ہوں کہ میں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے میں ان جانے اور غصے میں تمہیں بہت کچھ کہہ گئی، مجھے معاف کردو۔

وحید خاموش رہتا ہے۔ شبنم اس کے سامنے جا کر کہتی ہے ”دیکھو، میں تم سے معافی مانگ رہی ہوں۔ کیا مجھے معاف نہیں کروگے؟“

وحید کے جواب نہ دینے پر نظریں اٹھا کر دیکھتی ہے تو

ماضی کی مقبول اداکارہ و گلوکارہ شمشاد بیگم

وحید ساکت بینچ پر بیٹھا ہوا ہے۔ وہ مر چکا ہے۔

شبنم حیرانی اور دکھ سے اس کو دیکھتی رہ جاتی ہے۔

یہ فلم ”بندگی“ کی کہانی کا خلاصہ ہے لیکن مکالمے ہو بہو ”بندگی“ کے نہیں ہیں۔ یہ ہم نے اپنی یادداشت کے حوالے سے لکھے ہیں لیکن مفہوم بالکل وہی ہے۔

”بندگی“ میں وحید مراد نے بہت خوبصورت اور حقیقت پسندانہ اداکاری کی تھی لیکن فلم کا مرکزی کردار شبنم کا تھا۔ جنہوں نے آنکھوں سے محروم ہونے کے بعد ایک اندھی لڑکی کے کردار کو بہت خوبی سے نبھایا تھا۔ اس فلم کی موسیقی بھی بہت دلکش تھی مگر اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ فرید احمد نے فلم کی تمام شوٹنگ اصل مقامات پر کی تھی۔ مثلاً گھر، دفتر، اسپتال، کمرے، غسل خانے سب اصلی گھروں میں فلمائے گئے تھے۔ یہ پاکستان میں اپنی نوعیت کا پہلا کامیاب تجربہ تھا۔ ”بندگی“ 1971ء میں نمائش کے لیے پیش کی گئی۔ اس وقت تک اصلی گھروں اور اصلی مقامات پر فلم بندی کرنے کا کوئی تصور نہیں تھا۔ آؤٹ ڈور مناظر کے علاوہ فلم کے ہر حصے کے لیے سیٹ لگائے جاتے تھے۔ فلم کی شوٹنگ ایبٹ آباد کے گرد و نواح میں کی گئی تھی اس لیے پس منظر بھی انتہائی حسین تھا۔ اسپتال میں جب شبنم کا علاج کیا گیا تو آپریشن کا تمام طریقہ کار بغور دیکھنے کے بعد ان مناظر کی فلم بندی بھی اس طرح کی گئی تھی کہ حقیقی آپریشن کا گمان گزرتا تھا۔

”بندگی“ کو ہم اپنی لکھی ہوئی فلموں میں بہترین فلم سمجھتے ہیں۔ اس میں جو سادگی، مٹھاس، اداسی، کردارنویسی اور مکالموں کا انداز تھا اس نے ایک خواب زدہ ماحول پیدا کردیا تھا۔ اداکاری کا معیار بھی بہت اچھا تھا۔ وحید مراد نے پہلی بار ایک خالص رومانی کردار سے ہٹ کر ایک ایسے نوجوان کا کردار ادا کیا تھا جس کی زندگی میں مختلف رنگ نظر آتے تھے اور یہ سب رنگ اس نے اپنے کردار میں اتنی خوبصورتی سے بھر دیے تھے کہ وہ ایک مختلف اداکار نظر آتا تھا۔ شبنم نے بھی بہت حقیقت پسندانہ اداکاری کی تھی۔ خصوصاً اندھی لڑکی کے کردار میں ان کی اداکاری بہت فطری تھی، جن لوگوں نے فلم ”بندگی“ دیکھی ہے، اگر وہ ذہن پر زور ڈالیں تو ایک خوبصورت فلم دیکھ کر پرانی یادیں تازہ کرسکیں گے یا پھر فلم کی سی ڈی حاصل کرکے اس سے لطف اندوز ہوں اور یہ بھی اندازہ لگائیں کہ کسی زمانے میں پاکستان میں کیسی معیاری فلمیں بنائی جاتی تھیں۔

☆☆☆

گلوکارہ شمشاد بیگم، جن کا گزشتہ دنوں (اپریل 2013ء) میں 94 برس کی عمر میں انتقال ہوا ہے عرصہ دراز تک لوگوں کے لیے محض ایک آواز تھیں۔ ان کا چہرہ صرف ان ہی لوگوں نے دیکھا تھا جن کے لیے وہ گیتوں کا جادو جگاتی رہیں۔ وہ اپنی تصویر بنوانے اور ذاتی تشہیر سے گھبراتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی آواز تو برصغیر میں جادو

نابینا ہارٹ سرجن

دل کے عارضے میں مبتلا جیک کو اس کے گھر والے فوری طور پر ڈاکٹر کے پاس لے آئے۔ جس کے بارے میں انہوں نے سن رکھا تھا کہ وہ اس شہر کا سب سے بڑا ہارٹ اسپیشلسٹ ہے۔

اس ڈاکٹر کا نام ڈاکٹر جیکب بولوٹن تھا۔ اس کی شہرت شکاگو سے نکل کر دور دور تک پھیل رہی تھی۔ وہ لوگ جب ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہوئے تو ڈاکٹر جیکب کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ کیونکہ وہ نابینا تھا۔ مکمل نابینا۔

ڈاکٹر جیکب کی پیدائش 1888ء میں ہوئی تھی، مکمل نابینا۔ اس کے ساتھ بھی وہی مراحل اور وہی دشواریاں تھیں جو ان جیسے نابیناؤں کے ساتھ ہوا کرتی ہیں۔ اس کے مستقبل کی طرف سے سخت مایوسی تھی۔

کیا کرے گا آگے جا کر۔ اس کا تو کوئی مستقبل ہی نہیں ہو سکتا۔ نہ جانے کس طرح زندگی گزارے گا۔ اور وہ بھی شکاگو جیسے بے رحم شہر میں جہاں آنکھوں والے بھی روزگار کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ اپنے بارے میں اس قسم کے تبصرے خود وہ بھی سنتا رہتا تھا لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ معذور بن کر زندگی گزارنے کے لیے پیدا نہیں ہوا بلکہ وہ بہت کچھ کر کے دکھائے گا۔

اس کے والدین سمجھدار تھے۔ انہوں نے اس کا رجحان جان لیا تھا۔ اس لیے انہوں نے جیکب کو تعلیم دلوانا شروع کی...... اس کا شوق، لگن اور اس کی محنت یہ سب رنگ لاتی گئی اور وہ بہت کامیابی کے ساتھ تعلیمی مراحل طے کرتا چلا گیا۔ مقابلہ بہت سخت تھا اور خاص طور پر جیکب جیسے نابینا کے لیے۔ جس کے لیے چلنا پھرنا ہی محال تھا۔ چہ جائیکہ ڈاکٹر بن جانا۔ اور وہ بھی اس کے ارادے اور شوق کے حوالے سے دل کا ڈاکٹر۔

اسے تنقید کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ اس کی حوصلہ شکنی بھی کی جاتی۔ ''جیکب، تم کن چکروں میں پڑے ہو۔ کوئی اور کام دیکھو۔ یہ تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔''

وہ یہ سب سنتا اور مسکرا دیتا۔ وہ اس وقت بھی یہی کہا کرتا کہ وہ ایک نہ ایک دن دل کا بہت بڑا ڈاکٹر بن کر دکھائے گا اور ہوا بھی یہی۔

اس نے بہت نمایاں کامیابی حاصل کی تھی۔ اس کے اساتذہ اور دوسرے لوگ اس کی اس کامیابی پر حیران رہ گئے تھے۔ ان کے لیے یہ بہت بڑی بات تھی لیکن ابھی اس کے لیے مرحلے ختم نہیں ہوئے تھے۔

اس نے جب میڈیکل پریکٹس کے لیے لائسنس کی درخواست دی تو وہ نامنظور ہو گئی۔

بورڈ کا کہنا تھا کہ وہ ایک نابینا ہے ـــ ایسا شخص مریضوں کے لیے خطرے کا سبب بن سکتا ہے، وہ کس طرح ان کا علاج کرے گا اور وہ بھی دل کا۔ جو انسانی جسم کا انتہائی حساس عضو ہے۔

ڈاکٹر جیکب کے لیے یہ دن انتہائی اداس کر دینے والے تھے۔ وہ بچپن سے لے کر اب تک کبھی بددل نہیں ہوا تھا لیکن اب بددلی شاید اس کا مقدر ہو گئی تھی۔

اس وقت اس کے اساتذہ نے اس کی ہمت بندھائے رکھی۔ انہوں نے جیکب کی طرف سے باقاعدہ قانونی جنگ لڑی اور بالآخر جیکب کو پریکٹس کرنے کی اجازت مل گئی۔

وہ پہلا نابینا تھا جس کو سرکاری طور پر میڈیکل پریکٹشنر ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ پورے شکاگو میں اس کی دھوم مچ گئی۔ پھر جب اس نے دل کے مریضوں کا کامیاب علاج شروع کیا تو دور دور کی ریاستوں سے لوگ اس کے پاس آنے لگے۔

اس نے اپنے ارادے کو سچ کر دکھایا تھا کہ وہ بڑا ہو کر معذوروں کی زندگی نہیں گزارے گا بلکہ ایک کامیاب ڈاکٹر بنے گا اور وہ بھی دل کا ڈاکٹر۔

آج بھی اسے امریکا کی میڈیکل ہسٹری میں ایک غیر معمولی ڈاکٹر قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے نام سے نابیناؤں کے لیے ایک فیڈریشن قائم ہے۔ جس کے تحت ہر سال ایوارڈ دیا جاتا ہے۔

اس باکمال نابینا ڈاکٹر کا انتقال 1924ء میں ہوا تھا۔

جگاتی اور ہیروئنوں کی کامیابیوں کا سبب بنتی رہی لیکن ان کے بارے میں پہلا ویڈیو چند سال پہلے ریلیز کیا گیا تھا۔ یہ دراصل ایک مختصر دستاویزی فلم تھی جس میں شمشاد بیگم سادہ سی ساڑی میں ملبوس ایک بزرگ خاتون نظر آتی تھیں۔ یا پھر اب ان کی وفات کے موقع پر ان کی تصویر شائع کی گئی ہے۔ ان کی شکل وصورت اچھی تھی تو پھر تصاویر نہ بنوانے یا دنیا سے منہ چھپانے کا سبب کیا تھا؟ یہ غالباً ان کی سادگی اور فطری شرمیلے پن کا سبب تھا۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ شمشاد بیگم نے کبھی کسی موسیقی کے پروگرام میں شرکت نہیں کی حالانکہ اس طرح وہ بے پناہ دولت کما سکتی تھیں لیکن وہ کبھی کسی میوزک کانفرنس یا فلمی تقریب میں نظر نہیں آئیں۔ شمشاد بیگم کی آواز میں ایک عجیب سی کھنک کے ساتھ ساتھ صنفِ مخالف کے لیے ایک کشش بھی تھی جس سے دوسری بڑی گلوکارائیں محروم تھیں۔ نور جہاں، ثریا، لتا منگیشکر اور آشا بھونسلے کی آوازوں کی خوبصورتی سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن سیکسی آواز صرف شمشاد بیگم کی تھی۔ ان کے بعد آشا بھونسلے کی آواز میں بھی یہ خوبی اور انفرادیت شامل تھی۔

شمشاد بیگم اپنی آواز سے ہر گانے کو دلکش اور پرکشش بنا دیتی تھیں۔ 1949ء میں ایس ڈی برمن نے فلم شبنم کے لیے ان کی اور مکیش کی آوازوں میں دو گیت ریکارڈ کرائے تھے۔

پیار میں تم نے
قسمت میں بچھڑنا

ان ریکارڈوں نے سارے ملک میں دھوم مچا دی تھی۔

☆☆☆

شمشاد بیگم 16 اپریل 1919ء کو امرتسر میں پیدا ہوئی تھیں۔ بہت کم لوگوں کو علم ہو گا کہ 1932ء میں شمشاد بیگم ایک ہندو وکیل گنپت لعل کی محبت میں ایسی گرفتار ہوئی تھیں کہ گھر والوں اور والدین کی سخت مخالفت کے باوجود انہوں نے 1934ء میں گنپت لعل سے شادی کر لی تھی۔ اس وقت شمشاد بیگم کی عمر صرف 15 برس تھی۔ ان دونوں کی ایک بیٹی بھی تھی جس نے ایک ہندو کرنل سے شادی کر لی تھی۔ شمشاد بیگم کے شوہر 1955ء میں ایک حادثے میں وفات پا گئے جس کے بعد شمشاد بیگم بمبئی میں اپنی بیٹی اور داماد کے ساتھ رہتی تھیں۔ دو تین بار شمشاد بیگم کے انتقال کی خبریں بھی شائع ہوئی تھیں جو غلط اور بے بنیاد تھیں۔ بہت ممکن ہے کہ ایک ہندو سے شادی کرنے کے باعث وہ دنیا کے سامنے آنا نہیں چاہتی تھیں کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ مسلمان اس بات کو سخت ناپسند کریں گے اور شاید ان کے کیریئر پر بھی اس کا بہت برا اثر پڑے گا۔

شمشاد بیگم کی آواز سن کر پرائمری اسکول میں انہیں دعا کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ دس سال کی عمر سے وہ شادی بیاہ کی محفلوں میں گایا کرتی تھیں اور بہت پسندیدہ گانے والی بچی تھیں۔ سب ان سے اصرار کرتے تھے کہ وہ باقاعدہ موسیقی کی تربیت حاصل کریں لیکن وہ تربیت حاصل نہیں کر سکیں کیونکہ ان کے خاندان والے ان کے گانے کے سخت مخالف تھے، ان کے ایک چچا ایک دن چپکے سے انہیں ایک میوزک کمپنی میں لے گئے جہاں ماسٹر غلام حیدر آوازوں کو پرکھتے تھے۔ ماسٹر صاحب نے ان سے بہادر شاہ ظفر کی غزل

میرا یار مجھے ملا اگر

سنتے ہی ان سے بارہ گیتوں کا معاہدہ کر لیا۔ ان کے چچا نے ہی ان کے والد کو سمجھا بجھا کر رضامند کیا کہ شمشاد کو گانے کی اجازت دے دی جائے۔ والد نے مجبوراً اجازت تو دے دی لیکن یہ پابندی عائد کر دی کہ وہ برقع پہن کر ریکارڈنگ کرائیں گی اور کبھی تصویر نہیں بنوائیں گی۔ اس زمانے میں ایک گیت گانے پر پندرہ روپے ادا کیے جاتے تھے لیکن جب شمشاد بیگم کا معاہدہ ختم ہوا تو کمپنی نے انہیں پانچ ہزار روپے دیے جو اس زمانے میں بہت بڑی رقم تھی۔

ان کی مقبولیت میں اس وقت بہت اضافہ ہو گیا جب انہوں نے 1937ء میں آل انڈیا ریڈیو، لاہور اور پشاور سے گانا شروع کیا۔ سننے والے ان کی آواز کے دیوانے ہو گئے اور ریڈیو پر بھی ان کی بہت مانگ ہوئی۔ اسی زمانے میں لاہور کے فلم ساز سیٹھ پنچولی نے ایک فلم شروع کی جس میں وہ شمشاد بیگم کو ہیروئن کا کردار دینا چاہتے تھے۔ شمشاد بیگم تو رضامند ہو گئیں لیکن ان کے والد کو معلوم ہوا تو وہ بہت ناراض ہوئے اور کہا کہ اگر تم اس راہ پر چل پڑیں تو میں تمہارے گانے پر بھی پابندی لگا دوں گا۔ انہوں نے اپنے والد سے وعدہ کیا کہ کبھی کیمرے کے سامنے نہیں آئیں گی۔

ہمارے خیال میں ان کے کیمرے اور عام لوگوں کی نظروں سے دور رہنے کا ایک بنیادی سبب بھی یہی ہے۔ ماسٹر غلام حیدر نے لاہور کی فلموں پونجی، زمیندار، اور شمع میں شمشاد

بیگم کی آواز کا بہت خوبصورتی سے استعمال کیا۔ ایک تو ماسٹر غلام حیدر جیسا باکمال موسیقار، اس پر شمشاد بیگم کی آواز، ایک جادو سا ہوگیا سننے والوں پر۔ شمشاد بیگم ـــ ماسٹر غلام حیدر کے کہنے پر ہی بمبئی گئی تھیں۔ پاکستان کے قیام کے بعد ماسٹر غلام حیدر تو چلے آئے لیکن شمشاد بیگم بمبئی میں ہی رہ گئیں۔ اس زمانے میں ہر موسیقار ان کی آواز حاصل کرنا چاہتا تھا۔ 1943ء میں محبوب خان نے فلم ''تقدیر'' بنائی تو نئی ہیروئن نرگس کے لیے شمشاد بیگم ہی کی آواز کا انتخاب کیا اور اس فلم کے تمام گانے ہٹ ہوئے۔

شمشاد بیگم نے فلمی دنیا میں اتنا عروج پایا کہ آسمان کو چھولیا مگر پھر دوسری تازہ آوازوں کے آنے کی وجہ سے ان کی مانگ کم ہوگئی لیکن پھر بھی خاص گانوں اور دوگانوں کے لیے شمشاد بیگم ہی کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں۔ انہوں نے نور جہاں کے ساتھ بھی دوگانے گائے اور لتا منگیشکر کے ساتھ بھی۔ نوشاد، ایس ڈی برمن، او پی نیر کی موسیقی سے بھی استفادہ کیا۔ بابل کا گانا

ملتے ہی آنکھیں دل ہوا دیوانہ کسی کا
افسانہ میرا بن گیا افسانہ کسی کا

انہوں نے طلعت محمود کے ساتھ مل کر گایا تھا جو آج تک پہلے دن جیسا تازہ، پُرکشش ہے۔ شمشاد بیگم کے چند مشہور گانے پیش ہیں:

کچھ رنگ بدل راہی
آنا میری جان سنڈے کے سنڈے
ٹھنڈی ہوائیں لہرا کے آئیں
قسمت میں بچھڑنا
پیار میں تم نے
اب تو جی ہونے لگا
میں جان گئی تجھے
بچپن کے دن بھلا نہ دینا (نور جہاں کے ساتھ دوگانا)
سیاں تری آنکھوں میں
تھوڑا سا دل لگانا
تری محفل میں قسمت آزما کر ہم بھی دیکھیں گے
سیاں دل میں آنا رے
بوجھ میرا ناؤں رے، ندی کنارے گاؤں رے
چھلا دے جانشانی تیری مہربانی

اور بے شمار یادگار گانے ان کی یاد دلانے کے لیے ہمیشہ پہلے دن کی طرح مقبول رہیں گے۔ شمشاد بیگم نے رفیق غزنوی، امیر علی، پنڈت گوبندرام، پنڈت امرناتھ، رشید عطرے اور دیگر بھی معروف موسیقاروں کی بنائی ہوئی دھنوں پر گانے گائے ہیں۔

1955ء میں شوہر کی وفات کے بعد انہوں نے موسیقی سے بھی منہ موڑ لیا جس کی وجہ سے لتا منگیشکر کو ابھرنے کے لیے کھلا میدان مل گیا۔ کچھ عرصے بعد انہوں نے لتا کے ساتھ موسیقاروں کے اصرار پر کچھ گانے گائے۔ جن میں چند یہ ہیں۔

ڈر نہ محبت کر لے (انداز)
پیار کے جہاں کی
تری محفل میں قسمت آزما کے ہم بھی دیکھیں گے

ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ شوہر کی وفات کے بعد جب انہوں نے گلوکاری ترک کردی تھی تو ''مدر انڈیا'' کی تکمیل کے دنوں میں خود محبوب صاحب ان کے پاس گئے اور کہا کہ ''مدر انڈیا'' کے لیے مجھے آپ کی آواز کی ضرورت ہے۔ وہ رضامند ہوگئیں۔ ''مدر انڈیا'' میں ان کا گیت بے حد پسند کیا گیا جس کے بول یہ تھے

پی کے گھر آج پیاری دلہنیا چلی

وجہ یہ تھی کہ محبوب صاحب اور نوشاد صاحب کے نزدیک اس گانے سے صرف شمشاد بیگم ہی انصاف کرسکتی تھیں۔ اس گانے کے بعد کچھ اور موسیقاروں کے اصرار پر انہوں نے چند فلموں کے لیے گلوکاری کی جن میں قسمت، ہیر رانجھا، تیری میری ایک جندڑی، وغیرہ شامل ہیں۔

شمشاد بیگم کی عمر کافی ہوچکی تھی اور گلوکاری کو بالکل خیرباد کہہ کر وہ گھر تک محدود ہوکر رہ گئی تھیں۔ ان کا آخری انٹرویو 2012ء میں شائع ہوا تھا۔ اسی سال انہیں بھارتی حکومت نے اعلیٰ ترین ایوارڈ پدم بھوشن سے بھی نوازا۔ کچھ عمر کا تقاضا کچھ تنہائی اور پھر طویل بیماری۔ 23 اپریل 2013ء کو شمشاد بیگم نے وفات پائی۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اسلامی طریقے سے دفن کرنے کی بجائے انہیں ہندو مذہب کے مطابق شمشان گھاٹ میں نذرِ آتش کردیا گیا۔ ان کی زندگی ایک پیچیدہ معما تھی اور موت بھی۔

لیکن یہ حقیقت ہے کہ شمشاد بیگم جیسی دوسری آواز مشکل ہی سے سننے میں آئے گی۔

جاری ہے

حوصلہ مند

ظفر یوسفی

وہ پیدائشی بینا تھا مگر لڑکپن کی حدود پار کرتے ہی اسے قسمت نے اندھیرے کی دنیا میں دھکیل دیا۔ اسے کچھ بھی سجھائی نہیں دیتا تھا لیکن اس نے حوصلے کا دامن تھام کر ایسے ایسے کارنامے انجام دیے جنھیں دیکھ کر کئی اخبارات نے اسے اس صدی کا سب سے بڑا مہم جو قرار دے دیا۔

ایک نابینا شخص کی روداد جس نے نانگا پربت کی چوٹی سر کر دکھائی

وہ سامنے دور تک پھیلے سبز اور سنہری گھاس سے ڈھکے میدان کو دیکھ رہا تھا جس کے کچھ دور ہائی وے سے پہلے سفیدے کے بلند اور گھنے درخت قطار سے لگے تھے۔ شمال کی طرف سے ہلکی خنک ہوا چل رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ آنے والے چند ہفتوں کے بعد یہ ہوا شدید سرد ہوجائے گی اور تب اتنی آسانی سے باہر گھومنا ممکن نہیں ہوگا۔ لیکن یہ تو موسم کا چکر تھا جو ہر چند مہینے بعد بدل جاتا تھا۔ سردی آتی تھی موسم شدید ہوجاتا لیکن جیسے جیسے برف پگھلتی اور دن بڑا

ہوتا موسم بدلتا جاتا اور اپریل کے آخر تک موسم بہار کا آغاز ہو جاتا جو آنے والے اکتوبر تک برقرار رہتا تھا۔ یہ چکر انسانوں کی زندگی کا ایک حصہ ہیں۔ لیکن اس کی زندگی میں ایک ایسا چکر آنے والا تھا جو اس کی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتا۔ ایک وہ حصہ جب وہ اس دنیا کو دیکھ سکتا تھا اور دوسرا وہ حصہ جب اس کی دنیا اندھیروں میں ڈوب جاتی۔

23 ستمبر 1968ء کے دن سابق امریکی میرین ایڈ وین میٹز کے گھر پیدا ہونے والے ایرک وین میٹز کے بارے میں کسی کو نہیں معلوم تھا کہ ایک وقت آئے گا جب وہ اس دنیا کو دیکھنے سے قاصر ہو جائے گا۔ اس کے آنکھوں میں ایک پیدائشی مرض چھپا ہوا تھا جو رفتہ رفتہ اسے اندھیروں میں دھکیل دے گا۔ وہ صحت مند اور دیکھنے میں بالکل ٹھیک لگتا تھا۔ اس بیماری کو ریٹنوئی چیسس retnoichisis کہا جاتا ہے۔ مگر عام فہم زبان میں اسے گلوکوما کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ آنکھوں میں گلوکوما کی کیفیت پیدا کر کے بالآخر اپنے شکار کو مکمل طور پر نابینا کر دیتی ہے۔ ہر دس ہزار میں سے ایک بچہ اس بیماری کو لے کر پیدا ہوتا ہے۔ عام طور سے اس کا شکار بالغ عمری سے پہلے بینائی کھو دیتا ہے لیکن بعض افراد بیس بائیس سال تک کچھ نہ کچھ دیکھ لیتے ہیں۔ البتہ اس سے چھٹکارا ممکن نہیں ہے۔ ایرک اتنا خوش قسمت نہیں تھا کہ وہ تادیر دیکھ سکتا۔

بیماری کا انکشاف ہونے پر ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا کہ وہ مشکل سے بارہ تیرہ سال کی عمر تک مکمل نابینا ہو جائے گا۔ اس کی پیدائش امریکا، کنکٹی کٹ کی تھی۔ یہ چھوٹی سی ریاست نیویارک رہوڈ آئی لینڈ کے خلیجی سمندر کے ساتھ ساتھ پھیلی ہوئی ہے۔ نیویارک یہاں سے ایک سے دو گھنٹے کی ڈرائیو پر ہے۔ لیکن نیویارک کے پر ہجوم ماحول کے برعکس کنکٹی کٹ کھلی ہوئی اور قدرتی نظاروں سے بھرپور ریاست ہے۔ یہاں چھوٹے چھوٹے شہر اور قصبے ہیں۔ اس کا سب سے بڑا شہر ہارٹ فورڈ ہے۔ ایرک یہیں پیدا ہوا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی اسے بچپن سے قدرتی مناظر اور فطرت کے کھلے پن سے محبت تھی۔ ابھی وہ چھوٹا سا تھا کہ ایڈ وین میٹز کا خاندان ہانگ کانگ منتقل ہو گیا۔ کیونکہ وہ ویت نام میں امریکی فوج میں شامل تھا اور اگر اس کا خاندان امریکا میں ہوتا تو وہ شاید کئی سال بعد ہی جا کر ان سے مل سکتا تھا۔

ہانگ کانگ میں پیش آنے والا واحد قابل ذکر واقعہ ایرک کی یادداشت میں شامل نہیں تھا اسے بعد میں ایڈ نے بتایا جب وہ چودہ سال کا اور نابینا ہو چکا تھا، چینی میلے کو دیکھنے کے لیے ایڈ بیوی بچوں سمیت پہنچا تھا۔ وہاں قسمت کا حال بتانے والے ایک چینی نجومی نے ایرک کو دیکھ کر پھر کچھ حساب کتاب لگا کر بتایا کہ یہ بچہ بے شمار کامیابیاں حاصل کرے گا لیکن وہ ان کامیابیوں کو اپنی آنکھ سے نہیں دیکھ سکے گا۔ اس وقت ایڈ چینی نجومی کی بات کا مفہوم نہیں سمجھا تھا اور اصل بات یہ تھی کہ اس نے نجومی کی بات کو اہمیت بھی نہیں دی تھی۔ مگر جب ہانگ کانگ سے چند سال بعد واپسی پر ایرک کو اسکول میں داخل کرانے کا مرحلہ آیا اور اس کی آنکھوں کا معائنہ ہوا تب انکشاف ہوا کہ وہ ایک موذی بیماری میں مبتلا ہے۔ ابھی تک بیماری نے اس کی آنکھوں کو اس حد تک متاثر نہیں کیا تھا کہ وہ محسوس کرتا۔

ایڈ اور ماریا کے لیے یہ اندوہناک خبر تھی کہ ان کا بیٹا بارہ تیرہ سال کی عمر میں اس دنیائے رنگ و بو کو دیکھنے سے قاصر ہو جائے گا۔ اصل تکلیف دہ بات یہ تھی کہ وہ ایرک کی بینائی بچانے کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اس مرض کا کوئی علاج نہیں تھا۔ کیونکہ یہ آنکھ کے پردے اور اس کے عقب میں پیدا ہونے والی بیماری تھی جس کی نہ سرجری کی جا سکتی تھی، نہ اسے تبدیل کیا جا سکتا اور نہ ہی کوئی دوا اس مرض کو روک سکتی تھی۔ البتہ کچھ دواؤں سے یہ ہو سکتا تھا کہ نابینا ہونے کی رفتار کو کم کیا جا سکتا تھا اور یہی ایک کام تھا جو ڈاکٹر ایرک کے لیے کر سکتے تھے۔ ماریا نے ایڈ سے کہا کہ وہ ایرک کو اسکول میں داخل نہ کرائے مگر ایڈ نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ اس نے بیوی سے کہا۔ ”ایرک بالکل نارمل بچے کی طرح اسکول جائے گا، جب تک وہ جا سکتا ہے۔“

”لیکن نابینا ہونے کے بعد اسے مشکل ہوگی۔“ ماریا نے فکرمندی سے کہا۔ ”بہتر یہ نہیں ہے کہ ہم اسے نابینا بچوں کے اسکول میں داخل کرا دیں؟“

ایڈ کے لیے یہ بہت تکلیف دہ مرحلہ تھا۔ اسے اپنے تینوں بیٹوں سے بہت محبت تھی اور وہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ آنے والا وقت ایرک کو معذور بنا دے گا۔ اس نے کہیں پڑھا تھا کہ ایک انسان جو معلومات حاصل کرتا ہے اس کا اسی سے نوے فیصد وہ دیکھ کر حاصل کرتا ہے۔ جس میں پڑھنا اور دنیا کو دیکھنا بھی شامل ہے۔ یہ کام صرف آنکھوں کی مدد سے کیے جا سکتے ہیں۔ ایرک نابینا ہو جاتا تو وہ معلومات کے سب سے اہم ذریعے سے محروم ہو جاتا اور اس کی زندگی بھی اسی لحاظ سے محدود ہو جاتی۔ وہ بہت سے معمولی کام نہیں کر پاتا اور مختلف چیزوں کا محتاج ہو جاتا۔ وہ ڈرائیو نہیں کر سکتا تھا۔ سڑکوں اور گلیوں میں اکیلے سفر نہیں کر سکتا تھا۔ اور مروجہ طریقے سے تعلیم حاصل کرنا مشکل ہو جاتا۔ بچپن سے اسے آٹو موبائل انجینئر بننے کا شوق تھا۔ مگر نابینا فرد کے لیے انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کرنا اور پھر اسے پیشے کے طور پر اپنانا ممکن نہیں تھا۔

اگرچہ ایسی صورت حال میں بہتر فیصلہ یہی ہوتا کہ ایرک کو نابینا بچوں کے اسکول داخل کرا دیا جاتا۔ مگر ایڈ نے اسے عام اسکول میں داخل کرانے کا فیصلہ کیا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ وہ ہائی اسکول پاس کرنے سے پہلے دیکھنے سے قاصر ہو جائے گا۔ ایرک اس فیصلے سے خوش تھا اگرچہ وہ اتنا سمجھدار نہیں تھا کہ نابینا اسکول جانے یا نہ جانے کے بارے میں سوچتا مگر اسے عام اسکول میں جانا اچھا لگا تھا کیونکہ وہاں اس کی سرگرمیوں کے لیے بہت کچھ تھا اور اس نے وہاں جاتے ہی کئی دوست بنا لیے تھے۔ اس میں دوسروں کو متوجہ کرنے اور دوست بنا لینے کی قدرتی صلاحیت تھی۔ یہ چیز آنے والے مشکل دنوں میں اس کے بہت کام آئی تھی۔ چھ سال کی عمر میں اسے دیکھنے میں دشواری پیش آنے لگی تھی۔ یہ دشواری دھند کی صورت میں تھی اور کبھی کبھی دھند اتنی بڑھ جاتی کہ کچھ دیر کے لیے نظر آنا بالکل بند ہو جاتا تھا۔ ڈاکٹروں سے مشورے پر ایڈ نے ایرک کو اپنے انداز میں پوری طرح سمجھایا کہ اسے کیا بیماری ہے اور اس کے نتیجے میں اسے کیا کیا مشکلات پیش آئیں گی اور بیماری کس طرح اس کی بینائی کو متاثر کرے گی اور بالآخر اسے ختم کر دے گی۔

اس لیے ایرک ذہنی طور پر پہلے سے تیار تھا اور شاید اسی لیے وہ دنیا کو زیادہ سے زیادہ آنکھوں سے برت لینا چاہتا تھا۔ وہ خوب پڑھتا تھا۔ سات آٹھ سال کی عمر میں پڑھنے کے قابل ہونے کے بعد وہ نصابی کتب کے علاوہ دوسری کتابیں اور رسائل بھی پڑھنے لگا تھا۔ نصابی سرگرمیوں کے ساتھ اس کی غیر نصابی سرگرمیاں بھی کم نہیں تھیں۔ اسکول میں فٹ بال اور رگبی اس کے پسندیدہ کھیل تھے۔ اس کے ساتھ وہ باسکٹ بال جیسا تیز رفتار کھیل بھی کھیلتا تھا۔ مگر جیسے جیسے اس کی بینائی کم ہو رہی تھی اس کے لیے یہ کھیل کھیلنا دشوار ہوتا جا رہا تھا۔ دس سال کی عمر میں اس کی بینائی واضح طور پر کمزور ہو چکی تھی اور اسے نزدیک کا پڑھنے کے لیے بہت موٹی سی عینک لگانی پڑتی تھی۔ دور کی نظر کا کوئی علاج نہیں تھا۔ بعض اوقات اسے صاف بھی دکھائی دیتا تھا مگر کبھی کبھی اسے چند گز سے آگے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ ان دشواریوں کے باوجود اس نے ہمت نہیں ہاری تھی جہاں تک ممکن ہوا اس نے اپنی نصابی اور غیر نصابی سرگرمیاں جاری رکھیں۔

اسکول سے آنے کے بعد وہ گھر سے نکل جاتا اور آس پاس کے فطری مناظر دیکھتا تھا۔ وہ میدانوں میں گھومتا اور ندیوں کے کنارے گھنٹوں بیٹھے رہتا۔ جب گھر میں ہوتا تب بھی اس کا زیادہ وقت ٹی وی دیکھنے میں گزرتا۔ وہ ایسے چینل دیکھتا تھا جن میں دنیا کے بارے میں بتایا جاتا ہے۔ اگرچہ اس وقت نیشنل جیوگرافک اور ڈسکوری جیسے چینل نہیں تھے مگر شمالی امریکا کے چینل پھر بھی دنیا کے بارے میں بہت کچھ دکھاتے تھے۔ ایرک کے لیے ایڈ نے ایسے ہی چینل کو اپنے ڈش ریسیور کی مدد سے حاصل کر رکھا تھا۔ یہ خاصی مہنگی سہولت تھی مگر ایڈ اور ماریا نے ایرک کی خاطر اس کا بار بھی برداشت کیا۔ وہ اس معاملے میں ہر ممکن خیال رکھ رہے تھے۔ ان کی کوشش تھی کہ ان کے بیٹے کی بینائی ختم ہونے سے پہلے اسے زیادہ سے زیادہ دنیا دکھا دیں۔

دس سال کی عمر میں ایرک مضبوط جسم کا طویل قامت لڑکا تھا اور اس کا قد پانچ فٹ کے قریب ہو چکا تھا۔ شاید قد کی وجہ سے اسے باسکٹ بال سے بھی دل چسپی پیدا ہوئی ویسے بھی اسے ان تمام کھیلوں سے بہت دل چسپی تھی جن میں بھاگ دوڑ اور مشقت زیادہ ہو۔ ایسے کھیلوں میں باسکٹ بال سب سے نمایاں ہے۔ جس میں کھلاڑی ہر لمحے متحرک رہتا ہے اور کھیل کا حصہ رہتا ہے۔ ایڈ اس کی پوری حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ اس نے ایرک کے بارے میں بتایا۔ ”دس سال کی عمر میں وہ نارمل لڑکا تھا۔ وہ کھیلوں میں بہت زیادہ دل چسپی لیتا تھا اور آنے والے ایونٹس کی جوش و خروش سے تیاری کرتا۔ قطع نظر اس کے کہ جلد اس کی بینائی مکمل طور پر ختم ہونے والی تھی۔“

ایڈ کے برعکس ماریا ایرک کے آنے والے دنوں کے لیے بہت پریشان تھی۔ وہ بار بار ایڈ سے کہتی کہ اب ایرک کو نابینا بچوں کے اسکول میں داخل کرا دینا چاہیے۔ مگر ایڈ اس کے لیے راضی نہیں تھا اس لیے وہ ہر بار بیوی کی تجویز مسترد

کر دیتا۔ اس نے یہ سارے معاملات ایرک پر چھوڑ رکھے تھے اور وہ جو فیصلہ کرتا وہی ایڈ کا فیصلہ ہوتا۔ باپ کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے ایرک نے اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ بارہ سال کی عمر میں کیا۔ جب اس نے کہا کہ وہ نابینا ہونے کے باوجود اپنا طرز زندگی تبدیل نہیں کرے گا اور نابینا افراد کے لیے مخصوص زندگی نہیں گزارے گا۔ اسی لیے اس نے بریل سیکھنے اور کتار رکھنے سے انکار کر دیا۔ البتہ وہ گیارہ سال کی عمر سے چھڑی لینے لگا تھا۔ کیونکہ اکثر اسے چلتے ہوئے سامنے پڑی چیزیں دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ ٹھوکریں کھانے اور گھٹنے چھلوانے کے بعد وہ اس فیصلے پر مجبور ہوا تھا۔

بارہ سال کی عمر میں ایرک نے واٹسن کون ہائی اسکول کی انتظامیہ کو درخواست دی کہ وہ نابینا ہونے کے بعد بھی اسی اسکول میں پڑھنا پسند کرے گا۔ اس لیے اس کا داخلہ جاری رکھا جائے۔ اگرچہ ایک نابینا طالب علم یہاں نہیں پڑھ سکتا تھا کیونکہ یہاں اسے پڑھانے کے خصوصی انتظامات نہیں تھے مگر ایرک کی ذہانت اور کھیلوں سے اس کے لگاؤ کو مد نظر رکھتے ہوئے اسکول انتظامیہ نے اس کی درخواست منظور کر لی اور اسے بعض استثنائیات کے ساتھ اسکول میں تعلیم دی جانے لگی۔ اب ایرک سن کر اور آواز والی کتابوں کی مدد سے تعلیم حاصل کرنے لگا تھا۔ اسی طرح وہ آواز سے امتحان دیتا تھا۔ نابینا ہونے کے بعد اس نے باسکٹ بال کھیلنے کی کوشش جاری رکھی مگر جلد اسے احساس ہو گیا کہ بغیر آنکھوں کے یہ تیز رفتار کھیل اس کے لیے مناسب نہیں اس لیے اس نے باسکٹ بال ترک کر دی۔ فٹ بال اور رگبی وہ پہلے ہی چھوڑ چکا تھا کیونکہ اس کی دور کی نظر گیارہ سال کی عمر میں جواب دے گئی تھی اور اسے دس گز سے آگے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ ظاہر ہے وہ فٹ بال، رگبی جیسے کھیل نہیں کھیل سکتا تھا۔

بارہ سال اور چند مہینے کی عمر میں ایرک مکمل نابینا ہو گیا۔ حد یہ کہ آنکھوں کے آگے روشنی اور تاریکی کا احساس بھی جاتا رہا تھا۔ یہ اس کے لیے بہت اذیت ناک دور تھا۔ وہ یک دم ہی اپنی زندگی سے کٹ گیا تھا۔ اسے اسکول اور گھر میں معمولی کاموں میں بہت دشواری پیش آنے لگی تھی۔ وہ فطری طور پر دل برداشتہ اور مایوس ہونے لگا تھا۔ ماں باپ اور بھائی اس کی دل جوئی کرتے تھے۔ دوست اور اسکول کے ساتھی اس سے تعاون کرتے تھے اس کے باوجود اس کی مایوسی کم نہیں ہوئی تھی۔ وہ جو کام خود سے کرتا تھا اب اس کے لیے ناممکن ہو گئے تھے۔ نابینا ہونے سے پہلے اس نے بائیک اور کار بھی چلائی تھی مگر اب یہ کام نہیں کر سکتا تھا۔ ایڈ اس کی کیفیت محسوس کر رہا تھا مگر اس نے فی الحال اسے نہیں چھیڑا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ ایرک اپنی زندگی میں تبدیلی کو کتنی جلدی قبول کرتا ہے خود کو اس کے مطابق ڈھال لیتا ہے۔

ایرک میں پہلی تبدیلی کھیلوں کے حوالے سے آئی۔ اس کے اسکول اسپورٹس کوچ نے اس سے کہا کہ وہ ایسے کھیلوں میں کیوں حصہ نہیں لیتا جن میں آنکھوں کے بجائے جسم سے کام لیا جاتا ہے۔ اس کی یہ بات ایرک کے دل کو لگی اور اس نے ان کھیلوں کا جائزہ لیا جس میں وہ حصہ لے سکتا تھا اور اس نے فری اسٹائل ریسلنگ کا انتخاب کیا۔ اولمپک کھیلوں میں شامل فری اسٹائل ریسلنگ ایک مقبول ترین کھیل ہے جس میں کھلاڑی ایک دوسرے کو جسمانی نقصان پہنچائے بغیر ایک دائرے سے باہر پھینکنے یا ان کی پشت زمین سے لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ دیسی کشتی کی طرح زور آزمائی کا کھیل ہے جس میں دونوں حریف ایک دوسرے سے گتھ کر لڑتے ہیں۔ چند تجربات کے بعد ایرک کو یہ کھیل اتنا پسند آیا کہ اس نے دل و جان سے فری اسٹائل کشتی کو اپنا لیا اور جلد اس کھیل میں اتنی مہارت حاصل کر لی کہ وہ اسکول کی ٹیم کا کپتان بن گیا اور اسی حیثیت سے اس نے انٹر اسٹیٹ اسکول ریسلنگ ٹورنامنٹ میں شرکت کی۔

ریسلنگ کے ساتھ اسے ریس سے بھی دل چسپی ہوئی تھی۔ یہ بھی ایک ایسا کھیل تھا جس میں وہ کسی قدر مشکل کے ساتھ مگر حصہ لے سکتا تھا۔ ایک نابینا لڑکے کی طرف سے ریسلنگ میں مہارت کی خبر ایسی نہیں تھی جو میڈیا سے چھپ جاتی اور جلد اسے بی سی ٹی وی کے پروگرام ٹوینٹی ٹوینٹی ود باربرا والٹر میں اسے بلایا گیا۔ یہ پروگرام بیس لاکھ افراد باقاعدگی سے دیکھتے تھے۔ اس لیے ایرک صرف پندرہ سال کی عمر میں امریکا کے چند جانے پہچانے افراد میں شامل ہو گیا تھا۔ جب باربرا نے اس سے سوال کیا کہ وہ مستقبل میں کیا بننا پسند کرے گا تو اس نے جواب دیا۔ ”میں نہیں جانتا لیکن میں ایسا کوئی پیشہ اختیار نہیں کروں گا جو عام طور سے نابینا افراد اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔“

ایرک کے جواب سے اس کے بلند حوصلوں کا اندازہ ہو رہا تھا۔ ان ہی دنوں ایڈ نے اسے نابینا نوجوانوں کے ایک ہالی ڈے کیمپ بھیجا اور یہاں سے ایرک کا پہاڑوں سے عشق شروع ہوا۔ اسے ایک طرح سے اندھا عشق کہا جا سکتا تھا کیونکہ نابینا ہونے تک ایرک نے قریب سے کوئی پہاڑ نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی پہاڑوں میں سفر کیا تھا۔ اسی سال وہ اولین نابینا بن گیا جس نے میکسیکو کے ماچو پیچو کے انکا علاقے میں پچاس میل کا ٹریک کیا۔ ماچو پیچو کا شمار ٹریکنگ کے لحاظ سے دنیا کے دشوار ترین علاقوں میں ہوتا ہے۔ بہ ظاہر ایک نابینا فرد کے لیے یہ کام ناممکن حد تک مشکل نظر آتا تھا مگر ایرک نے اسے اتنی آسانی سے کیا جیسے آنکھوں والے کرتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اسے دوسروں کی مدد حاصل تھی لیکن یہ مدد چند الفاظ کی رہنمائی تک محدود تھی۔ ورنہ ایرک نے اس سفر کے دوران کسی کا سہارا بھی نہیں لیا تھا۔ ہالی ڈے کیمپنگ کے دوران ہی اس نے ٹریکنگ اور اس میں استعمال ہونے والے سامان کی تربیت حاصل کی تھی۔

ایرک نے بیرونی سرگرمیوں کے ساتھ اپنی تعلیم پر مکمل توجہ دی تھی۔ انیس سال کی عمر میں اس نے واٹسن ہائی اسکول سے ڈگری بہت اچھے گریڈ کے ساتھ حاصل کی۔ کیونکہ اس نے بریل نہیں سیکھی تھی اس لیے اس نے نابینا افراد کے لیے مخصوص کالج کے بجائے بوسٹن کالج میں داخلہ لیا اور چار سال بعد گریجویشن کی ڈگری بھی فرسٹ ڈویژن میں حاصل کی۔ وہ کسی عام کالج سے فرسٹ کلاس گریجویشن ڈگری حاصل کرنے والا اولین نابینا بھی تھا۔ اس کے دو سال بعد اس نے لیسلے کالج سے ماسٹرز کی ڈگری حاصل کی۔ یہ تمام تعلیم اس نے بغیر بریل سسٹم کے عام انداز میں کورس پڑھ کر اور لیکچرز سن کر حاصل کی۔ وہ آڈیو بکس اور لیکچرز کی مدد سے تیاری کرتا تھا اور امتحان بول کر دیتا تھا۔ ایک خاص کمپیوٹر اس کے کہے الفاظ کو لکھ کر پرنٹر سے کاغذ پر منتقل کرتا تھا۔ عام نصاب کے ساتھ ایرک کا مطالعہ بہت زیادہ تھا ہر شعبے میں اس کی معلومات قابل رشک تھیں۔ وہ لٹریچر اور معلوماتی نوعیت کی آڈیو کتابیں سنتا تھا اسی طرح وہ ریڈیو کا باقاعدہ سامع تھا اس سے اس کی معلومات عامہ عام آدمی سے بہتر تھی۔

تیرہ سال کی عمر میں مکمل نابینا ہونے کے بعد ایرک عام زندگی اور دوستوں سے کٹ گیا تھا۔ کیونکہ وہ ان کے مشاغل اور سرگرمیوں میں ان کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ مگر جب اس نے ریسلنگ میں حصہ لینا شروع کیا تو اس کا دوسرے انسانوں سے لمس اور پکڑ کی مدد سے رابطہ ہوا اور اس چیز نے اسے دوبارہ سوشل سرکل میں آنے میں مدد دی۔ اس نے عام امریکی نوجوانوں کی طرح سترہ سال کی عمر میں ڈیٹنگ شروع کر دی تھی۔ اس کی اولین گرل فرینڈ عمر میں اس سے تین سال بڑی تھی۔ ان کی دوستی کئی سال چلی اور بعد میں یہ عام دوستی میں بدل گئی۔ اس کے بعد بھی کئی لڑکیاں ایرک کی گرل فرینڈز بنیں۔ اس بارے میں اس نے اپنی کتاب میں لکھا۔ ”عام لوگوں کی نسبت مجھے گرل فرینڈ بنانے کا یہ فائدہ ہوا کہ مجھے کتے کی رفاقت سے چھٹکارا مل گیا۔ جب میں کسی بار یا کلب میں جاتا تو کتے کو باہر چھوڑنا پڑتا تھا لیکن گرل فرینڈ میرے ساتھ ہوتی تھی۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ میں گرل فرینڈ کا موازنہ کتے سے کر رہا ہوں۔ میں صرف ایک اضافی فائدہ بتا رہا ہوں جو گرل فرینڈ سے مجھے حاصل ہوا۔“
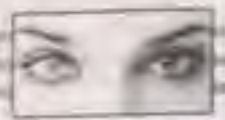
کیونکہ وہ دیکھ نہیں سکتا کہ جو لڑکی اس کے پاس آ رہی ہے وہ کیسی ہے تو اس کے دوستوں نے ایک اشارہ مخصوص کر لیا تھا۔ اگر لڑکی خوب صورت ہوتی تو اس کے دائیں ہاتھ کو دباتے تھے اور اگر خوب صورت نہیں ہوتی تو بائیں ہاتھ کو اور اگر اوسط درجے کی ہوتی تو کوئی اشارہ نہیں کیا جاتا اور معاملہ ایرک اور لڑکی کی قسمت پر چھوڑ دیا جاتا۔ ایرک اس پر جوش دور سے جلد گزر گیا۔ کیونکہ انیس سال کی عمر میں وہ کوہ پیمائی کی طرف متوجہ ہو گیا اور ساتھ ہی تعلیم بھی حاصل کر رہا تھا اس لیے اس کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا تھا کہ وہ کسی لڑکی سے دوستی کرے اور اس کے ساتھ ڈیٹ پر جائے۔ جیسے جیسے اس کا کوہ پیمائی سے شغف بڑھتا گیا دوسرے کاموں کے لیے اس کے پاس وقت کم ہوتا چلا گیا اور ایک طویل عرصے بعد آخری بار اس نے جس لڑکی سے دوستی کی وہ اس کی بیوی بن گئی۔

”بینائی نہ ہونے کی وجہ سے مجھے اس معاملے میں دوستوں کا محتاج ہونا پڑتا تھا مگر جلد میرے سوچنے کا انداز بدل گیا۔ جب آپ کسی کو دیکھ نہیں پاتے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ دیکھنے میں کیسی ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے عام انسانوں سے ہٹ کر کچھ دیکھنا اور محسوس کرنا چاہیے۔ میں لمس، جسمانی خوب صورتی اور مضبوط جسامت کو ترجیح دینے لگا۔ سب سے بڑھ کر میں آواز کو اہمیت دینے

لگا۔ میری بیوی ایلن دنیا میں سب سے خوب صورت آواز رکھنے والی عورت ہے۔"

دوران تعلیم ہی ایرک کا ذہن بنتا جا رہا تھا اگرچہ اس کے فیصلے کی راہ میں کئی ایک رکاوٹیں حائل تھیں مگر اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ مہم جو بنے گا اور اسے پیشے کے طور پر اپنائے گا۔ اس کا آغاز اس وقت ہوا جب ایڈ بیٹے کو لے کر پہاڑوں اور جنگلوں میں گیا اور اس نے اسے سکھایا کہ وہاں کس طرح راستہ تلاش کرتے ہیں۔ اسے یہ کام اپنی چھڑی کی مدد سے کرنا پڑتا تھا اور شروع میں اتنا مشکل ثابت ہوا کہ وہ دل برداشتہ ہونے لگا تھا۔ مگر ایڈ اس کی حوصلہ افزائی کرتا رہا۔ وہ اسے کہتا کہ ہر مشکل کا کوئی نہ کوئی حل ہوتا ہے بس اسے تلاش کرنا پڑتا ہے۔ وہ کہیں لے جانے سے پہلے ایرک کو کچی زمین پر چھڑی سے لکیر کھینچ کر اس جگہ کا نقشہ اور جغرافیہ سمجھاتا اور جب یہ ذہن نشین ہوجاتا تو وہ اسے وہاں لے جاتا۔ اس نے ایڈ کو سکھایا کہ وہ سمتوں کا تعین کیسے کرے۔ دن میں جب سورج نکلا ہو تو اس کی دھوپ کی سمت سے وہ جان سکتا تھا کہ مغرب اور مشرق کس طرف ہیں۔ ایرک کے پاس ایک بولنے والا ڈیجیٹل کمپاس بھی تھا لیکن وہ اس کی مدد صرف اس وقت لیتا جب اسے سورج کی روشنی اور ہوا کے چلنے سے سمت کا اندازہ نہ ہو۔

نابینا افراد کے لیے لگائے جانے والے ہالی ڈے کیمپ سے اس نے بہت کچھ سیکھا تھا۔ یہاں اسے کوہ پیمائی کی ابجد کا پتا چلا۔ رسی اور دوسری چیزوں کا استعمال سکھایا گیا اور یہ بھی کہ کوہ پیمائی اس دوران میں خود کو اور اپنے سامان کو کیسے سنبھالنا ہے۔ جب اس نے چٹانوں پر چڑھنا سیکھا تو اسے پہلی بار ایک ایسے حریف سے واسطہ پڑا جو اس سے لڑتا نہیں تھا مگر اپنی جگہ مضبوطی سے جما رہتا تھا۔ اسے اس حریف کو چھو کر اسے شکست دینا تھی اور یہ اس کا سب سے مضبوط پہلو تھا۔ رفتہ رفتہ وہ جان گیا کہ ایک چٹان پر چڑھتے ہوئے راستہ کیسے تلاش کرتے ہیں۔ اسے وہی کام کرنا تھا جو ایک مکڑی چٹانوں پر چڑھتے ہوئے کرتی ہے۔ وہ اپنے حساس اینٹینا سے تعین کرتی ہے کہ راستہ کہاں ہے اور کہاں سے نہیں گزرنا ہے۔ ایرک یہ کام اپنے ہاتھوں سے لیتا تھا۔ اس کے ہاتھ چٹان کی دراڑوں، ریخوں، چھجوں اور دیواروں کو ٹٹولتے تھے اور وہ فیصلہ کرتا کہ اسے کہاں سے چڑھنا چاہیے کن راستوں کو ترک کر دینا چاہیے۔ ایرک اس بارے میں کہتا ہے۔ "یہ بالکل کسی خوب صورت پزل کی طرح تھا جسے میں دھیرے دھیرے درست انداز میں جوڑنے میں کامیاب ہوجاتا۔"

چٹانوں پر چڑھنے والوں کو راک کلائمبر کہتے ہیں۔ ایرک نے اس میں پانچ اعشاریہ دس نمبر حاصل کیے اور آج تک کوئی راک کلائمبر جو سب سے زیادہ نمبر حاصل کر سکا ہے وہ پانچ اعشاریہ چودہ ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ایرک مہارت کے کس درجے تک پہنچ گیا تھا۔ پھر وہ جب پہاڑوں کی ان بلندیوں تک پہنچنے لگا جہاں برف سے واسطہ پڑتا ہے اور یہاں آدمی اپنے انگلیوں سے کام نہیں لے سکتا تھا۔ ایک کوہ پیما کا سب سے اہم ہتھیار اس کی کلہاڑی ہوتی ہے۔ ایریزونا کی پہاڑیوں میں اس نے جانا کہ کیسے کلہاڑی کی مدد سے برف کی مضبوطی کا اندازہ لگاتے ہیں کیونکہ ایک غلط ضرب کسی ایوالانچ کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوسکتی ہے۔ اگر ایرک کی کلہاڑی کی ہلکی سی ضرب پر برف چٹختی تو وہ جان جاتا کہ برف مضبوط نہیں ہے اور اس کی تہ اتنی ہلکی ہے کہ وہ اس کی کلہاڑی کا بوجھ نہیں سنبھال سکے گی اور جب برف سے ایسی آواز آتی جیسے کسی ٹھوس چیز پر کلہاڑی ماری جائے تو وہ جان لیتا کہ برف ٹھوس، مضبوط اور بوجھ سنبھالنے کے قابل ہے۔ جلد اس نے کوہ پیمائی میں مکمل مہارت حاصل کرلی۔ اس میں اس کا گریڈ بہت اچھے پیشہ ور کوہ پیماؤں سے بھی بہتر تھا۔

اس کے باوجود ایک نابینا شخص کا یہ فیصلہ نہ صرف عام لوگوں بلکہ اس کے گھر والوں کے لیے بھی حیرت کا باعث تھا۔ اب تک وہ جو کرتا آیا تھا ان کے خیال میں وہ اس کا خود کو کارآمد ثابت کرنے کی ایک کوشش تھی۔ ٹریک پر جانا اور کیمپنگ کرنا یہ سب مشغلے کے طور پر درست تھا لیکن ایک نابینا شخص کے لیے مہم جوئی کو پیشہ بنانا ان کے خیال میں ناممکن تھا۔ خود ایڈ جواب تک اس کی حوصلہ افزائی کرتا آیا تھا اور یہ ایڈ ہی تھا جو ہمیشہ ایرک کے لیے اس کی مرضی کا فیصلہ کرتا تھا۔ اس نے بھی ایرک کے اس فیصلے کی مخالفت کی۔ اس نے ایرک سے کہا۔ "تم جانتے ہو مہم جو ہمیشہ اسپانسر شپ سے کماتا ہے اور کوئی بھی شخص یا ادارہ ایک نابینا مہم جو پر رقم لگانے کے لیے تیار نہیں ہوگا۔"

"میں جانتا ہوں پاپا۔" ایرک نے سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن جب میں انہیں کچھ کر کے دکھاؤں گا تو وہ یقیناً مجھے اسپانسر کریں گے۔"

"تم کیا کرو گے؟"

ایڈ کے اس سوال کا جواب ایرک کے پاس موجود تھا۔ وہ جس گروپ کے ساتھ ٹریک کرتا تھا۔ وہ سب پروفیشنل نہیں تھے ان میں سے کچھ شوقیہ تھے اور یہ سب آنے والے گرما میں ہمالیہ کے مغرب میں واقع پامیر کی سطح مرتفع کی چوٹیاں سر کرنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ پامیر کا سلسلۂ کوہ پاکستان، افغانستان، چین اور تاجکستان کے درمیان میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کا بڑا حصہ چین کے پاس ہے مگر مغربی مہم جوؤں پر پابندی کی وجہ سے انہوں نے تاجکستان کی طرف سے چوٹیاں سر کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ایرک اس ٹیم کا ایک حصہ تھا اور اسے یقین تھا کہ یہ ٹریک اسے ایک پیشہ ور مہم جو بننے میں مدد دے گا۔ ایڈ اور ماریا کو اس کے فیصلے پر خدشات تھے۔ وہ پہلی بار ایک ایشیائی ملک میں مہم جوئی کے لیے جا رہا تھا اور وہاں کے حالات ٹھیک نہیں تھے۔ ان دنوں تاجکستان روس سے نیا نیا آزاد ہوا تھا اور یہاں سیاسی بے چینی تھی۔ کسی حادثے کی صورت میں ان کی مدد کے لیے کوئی انتظام نہیں تھا اور انہیں خود سب دیکھنا تھا۔ بہت سارے خدشات تھے جن کے ساتھ وہ اس مہم پر روانہ ہوئے۔

ایرک کی یہ مہم کامیاب رہی اور دو مہینے کے دوران میں اس نے اس دشوار گزار سلسلے کی کئی چوٹیوں کو عبور کیا جن میں سب سے بلند چوٹی بائیس ہزار فٹ بلند تھی جہاں ایرک کے قدم پہنچے تھے اور وہ بیس ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچنے والا پہلا نابینا فرد بن گیا تھا۔ اس کامیابی نے اس کے پیشہ ور مہم جو بننے کی راہ ہموار کردی تھی۔ واپسی پر اس نے ماسٹرز ڈگری کے لیے لیسلے کالج میں داخلہ لیا۔ اس دوران میں اس نے چھوٹی موٹی مہمات جاری رکھی تھیں لیکن کسی بڑی مہم کا حصہ نہیں بنا۔ 1993ء اس کے لیے اہم سال تھا۔ جب اس نے پہلی بار ہمالیہ میں قدم رکھا۔ مغرب کے مہم جوؤں اور کوہ پیماؤں کی اصل آزمائش ہمیشہ ہمالیہ میں ہوتی ہے۔ ایرک کی منزل بھی ہمالیہ رہی تھی۔ 1993ء کے موسم گرما میں وہ پاکستان پہنچا اور اسکردو کے راستے بالتورو کی طرف روانہ ہوا۔ اس نے دو افراد کی ایک ٹیم کے ہمراہ کے ٹو کے راستے میں آنے والا بالتورو گلیشیر عبور کیا۔ بالتورو کا شمار قطبین سے باہر دنیا کے چند بڑے گلیشیرز میں ہوتا ہے۔ یہ سب سے بڑا نہیں ہے لیکن اس کی خطرناکی دوسرے تمام گلیشیرز سے کہیں زیادہ

اسٹیوونڈر

کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ ونڈر نے کئی دہائیوں تک میوزک لورز کو حیران کیے رکھا۔ اسٹیوونڈر ہر دور کا بہترین ٹیلنٹ شمار ہوتا ہے۔ اس نے بے انتہا گیت گائے اور لکھے۔ وہ 1950 میں مشی گن میں اس دنیائے فانی میں اترا۔ وہ پیدائشی نابینا تھا مگر خداداد صلاحیتوں کا مالک تھا جو ناقابلِ یقین ہیں۔ آٹھ سال کی عمر تک اس نے از خود پیانو، آرگن، ہارمونیکا، اور ڈرم بجانا سیکھ لیا تھا۔ اس کی معذوری نے اس کے اوپر کوئی اثر نہیں ڈالا تھا۔ بارہ سال کی عمر میں اس نے پہلا گیت خود لکھا اور پرفارم کیا اور پھر وہ "اسٹار" بن گیا۔ گیت تھا۔

Everything is Alright

ہٹ گیتوں کی قطار نے اس کا امیج "گریٹ امریکن سنگر" کے طور پر پتھر پر کندہ کردیا۔ جیسے

Tear of clown

for once in my Life

1971 کا البم

"Where I'M coming from"

ملٹی پلاٹینم تھا

اس کے گیتوں نے جیسے

"I just called to say

I love you"

عوام میں بے انتہا مقبول ہوا۔

اسٹیوونڈر نے 20 سے زیادہ کامیاب البم دیے۔ 1989 میں اسے "راک اینڈ رول ہال آف فیم" میں شامل کیا گیا اور 2005 میں لائف ٹائم اچیومنٹ سے نوازا گیا۔

مرسلہ: ہدینا بتول، ڈی آئی خان

ہے۔اس میں جابہ جا دراڑیں ہیں اور یہ دراڑیں مسلسل اپنی جگہ بدلتی رہتی ہیں۔اسے عبور کرنا کے ٹو سر کرنے کے مساوی سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے جب ایرک نے کامیابی سے بالتورو عبور کیا اور کنکورڈیا تک جا پہنچا تو اس کی کامیابی کی گونج بین الاقوامی سطح پر سنائی دی۔

ایرک کا ملازمت کرنے کا ارادہ نہیں تھا لیکن اسے فونکس کاؤنٹی کے مہم جوئی کے اسکول کی طرف سے بہ طور انسٹرکٹر کام کرنے کی پیشکش ہوئی تو اس نے قبول کر لی کیونکہ یہ اس کے مزاج کے عین مطابق تھی اور اس کے لیے اعزاز بھی تھا کیونکہ اس اسکول میں صرف مستند مہم جو ہی انسٹرکٹر بن سکتے تھے۔اس جاب سے اسے کچھ رقم کمانے کا موقع ملا کیونکہ ابھی تک وہ باپ کی مدد سے گزارا کر رہا تھا اور باوجود کئی کامیابیوں کے اسے کسی طرف سے اسپانسر شپ نہیں ملی تھی۔ وجہ وہی تھی کہ مہم جوئی کے لیے اسپانسر شپ دینے والے افراد اور ادارے ایرک کے لیے مشکوک تھے کہ وہ پیشہ ور کوہ پیما بن سکے گا یا نہیں۔اسکول میں جاب کر کے اس نے دو سالوں میں کئی مہمات میں حصہ لیا اور ساتھ ہی کچھ رقم جمع کر لی تھی۔

1995ء میں پہلی بار اسے اسپانسر شپ حاصل کرنے میں کامیابی ملی۔امریکن فاؤنڈیشن فور دی بلائنڈ نے الاسکا میں واقع امریکا کی بلند ترین چوٹی ماؤنٹ مک کینلے کو سر کرنے کے لیے ایرک اور اس کے ساتھ دو افراد کی ٹیم کو اسپانسر کرنے کا اعلان کیا۔ اس مہم کے تمام اخراجات فاؤنڈیشن برداشت کرتی۔ایرک کے ساتھ کیلٹے کورک اور ٹام بروکاؤ تھے۔اتفاق سے دونوں کا تعلق صحافت کی دنیا سے تھا۔ایرک نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ دو دن میں چوٹی سر کر لی اور واپسی کے لیے اس نے ہیلی کاپٹر کی مدد لینے سے انکار کر دیا اور وہ واپس بیس کیمپ تک اپنے پیروں پر آئے۔اس کامیابی نے دنیا والوں اور خاص طور سے مہم جوئی سے وابستہ افراد کو ایرک کا نوٹس لینے پر مجبور کر دیا تھا۔

ٹی وی چینلوں نے اس مہم کی براہ راست کوریج کی تھی اور اس کوریج کا ایرک کو خاصا فائدہ ہوا۔ایک نابینا فرد کا بیس ہزار فٹ بلند چوٹی سر کرنا عام لوگوں کے لیے عجوبہ سے کم نہیں تھا۔ اگرچہ وہ اس سے پہلے بائیس ہزار فٹ بلند چوٹی پر بھی پہنچا تھا لیکن وہ ایک دور دراز کے ملک میں تھی اور اس کی ٹی وی کوریج بھی نہیں ہوئی تھی جب کہ اس مہم کی ٹی وی کوریج کروڑوں لوگوں نے دیکھی۔اس مہم سے واپسی پر ایرک پر یلغار ہوئی تھی اور اسے بے شمار اسکولوں اور اداروں کی جانب سے لیکچرز کی دعوت آنے لگی۔ڈنر پارٹیاں اور سیمینارز میں شرکت اس کے علاوہ تھی۔اسے لیکچر دینے کا کوئی معاوضہ نہیں ملتا تھا اور بعض اوقات تو آنے جانے کا خرچ بھی نہیں ملتا تھا۔کیونکہ اسے مدعو کرنے والے اکثر اسکول، نان پروفٹ ایبل ادارے اور چرچ ہوتے تھے۔ چند مہینوں میں اس نے پانچ سو سے زیادہ لیکچرز دیئے اور بعض اوقات تو وہ ایک دن میں نصف درجن لیکچرز دیتا تھا۔ان لیکچرز میں وہ لوگوں کو اپنی مہمات کے بارے میں بتاتا اور پھر وہ ان کے سوالوں کے جواب بھی دیتا تھا۔

اس کے ساتھ ہی اس نے اخبارات اور رسائل میں مضامین لکھنا شروع کر دیئے۔ظاہر ہے یہ مضامین اس کی مہم جوئی پر مشتمل ہوتے تھے۔ان سے اسے کچھ آمدنی ہو جاتی تھی۔مگر یہ اتنی نہیں تھی جس سے وہ مطمئن ہو جاتا۔اسے اپنی مہم جوئی کی سرگرمیاں جاری رکھنے کے لیے اس سے کہیں زیادہ رقم کی ضرورت تھی۔مالی لحاظ سے تو نہیں مگر یہ سرگرمیاں دیگر انداز میں اس کے لیے اچھی ثابت ہو رہی تھیں۔لوگ اسے سراہتے تھے۔ اس کی ہمت پر رشک کرتے تھے اور اس کی عزت کی جاتی تھی۔اسی سال اس کا نام ہوازہو میں شامل ہوا۔مزے کی بات ہے یہ اعزاز اسے نابینا فرد کے طور پر نہیں بلکہ سب سے کم وقت میں مک کینلے کی چوٹی سر کرنے پر حاصل ہوا۔

1996ء کا سال اس کے لیے مزید کامیابیاں لے کر آیا۔ اس سال اسے یہ اعزاز ہوا کہ وہ اولمپک مشعل لے جانے والوں میں شامل ہوا۔اسے فونکس سے ایریزونا کے صحرا میں ایک محدود فاصلے تک اولمپک مشعل لے جانی تھی مگر اس وجہ سے اس کا نام ہمیشہ کے لیے تاریخ میں درج ہو گیا۔اسے ایریزونا کا امتیازی ایوارڈ دیا گیا۔ اس کا نام امریکن ریسلنگ ہسٹری کے ہال آف فیم میں شامل ہوا۔یہ کامیابیاں معمولی نہیں تھیں۔مگر ایرک نے خود کو ان کا مستحق ثابت کیا تھا۔اس کے باوجود وہ ابھی کسی بڑی کامیابی سے دور تھا۔البتہ اس کی خانگی زندگی میں ایک تبدیلی آئی۔اس کی ملاقات ایلین سے ہوئی۔وہ کولوریڈو کی رہنے والی تھی اور ایرک کی طرح مہم جو تھی۔ان کی اولین ملاقات مہم جوئی کے سلسلے میں ہوئی تھی مگر جلد دونوں محسوس کرنے لگے کہ وہ ایک دوسرے کے لیے کسی اور طرح سے اہم ہیں۔

تعلق رفتہ رفتہ محبت کی طرف بڑھ رہا تھا مگر ایرک اس کا اظہار کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔پہلی بار وہ اپنے نابینا ہونے کے حوالے سے خوف کا شکار ہوا۔اسے خوف تھا کہ کہیں ایلین اسے مسترد نہ کر دے۔ایلین نے اس کا یہ خوف محسوس کر لیا اس لیے اس نے پہل کی۔ایرک کے لیے یہ سب سے بڑی کامیابی تھی۔اسے وہ لڑکی مل گئی جس سے وہ محبت کرتا تھا۔اس نے اپنے ایک مضمون میں لکھا۔"انسان کے لیے اس سے بڑھ کر کامیابی اور کوئی نہیں ہو سکتی... کہ وہ جس سے محبت کرتا ہے۔وہ بھی اس سے محبت کرے اور وہ اسے حاصل بھی کر لے۔"

ایرک اور ایلین نے جب شادی کا فیصلہ کیا تو انہوں نے اسے بڑے انوکھے اور اپنے پیشے کو خراج تحسین پیش کرنے کے انداز میں پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔1997ء میں ایرک اور ایلین افریقا کی سب سے بلند چوٹی کلی منجارو سر کرنے کے لیے روانہ ہوئے اور جب وہ تیرہ ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچے تو انہوں نے ایک پادری کے سامنے ایک دوسرے کو میاں بیوی قبول کر لیا۔ تیرہ ہزار فٹ کی بلندی پر یہ تقریب اس لیے انجام دی گئی کہ پادری اس سے زیادہ بلندی پر نہیں جا سکتے تھے۔ورنہ شاید یہ شادی چوٹی پر ہوتی۔اس شادی کے بعد انہوں نے اپنا سفر جاری رکھا اور شادی کے فوراً بعد کوئی چوٹی سر کرنے والے اولین میاں بیوی بن گئے تھے۔

اپنی بیوی کی طرح کوہ پیمائی ایرک کا مقصد حیات تھا۔مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ مہم جوئی کے دوسرے شعبوں میں طبع آزمائی کرتا تھا۔اس نے اسکائی ڈائیونگ اور اسکوبا ڈائیونگ میں اپنی مہارت کی وجہ سے سرٹیفکٹ حاصل کیے۔ وہ پہلا نابینا سرٹیفائڈ اسکائی ڈائیور اور اسکوبا ڈائیور ہے۔یہ دونوں کھیل نہایت مشکل تصور کیے جاتے ہیں اور آنکھوں والے افراد کے لیے ان میں حصہ لینا اور مہارت حاصل کرنا آسان نہیں سمجھا جاتا لیکن ایرک کا ان میں مہارت حاصل کرنا اس کی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ کوہ پیما بننے کے فیصلے کے بعد اس نے ریسلنگ سے ریٹائرمنٹ لے لی تھی کیونکہ ریسلنگ میں حصہ لینے کی صورت میں اس کا جسم سخت اور وزنی ہو جاتا جب کہ کوہ پیمائی کے لیے ہلکے اور لچکدار جسم کی ضرورت ہوتی ہے۔اس نے کوہ پیما بننے کی خاطر یہ قربانی دی۔

نابینا ہونے سے پہلے ایرک بائک چلانے لگا تھا اور ایڈ نے اسے ٹرائی بائک دی تھی۔ یہ اسپورٹس بائک تھی جو ناہموار جگہوں پر چلانے کے لیے بہترین ہوتی ہے مگر ایرک اس سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھا سکا تھا۔وہ ویسے ہی اس کے گھر کے گیراج میں بند تھی۔شادی کے بعد وہ اور ایلین الگ رہتے تھے۔ایک دن ایڈ اس سے ملنے آیا تو اس نے بائک دیکھ کر ایرک سے کہا۔"تم کسی روڈ ٹرپ پر کیوں نہیں جاتے؟"

"میری بھی خواہش ہے لیکن میرے ساتھیوں کے

پاس اس اضافی مہم کے لیے وقت نہیں ہے۔"

"میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔" ایڈ نے کہا۔

ایرک خوشی سے اچھل پڑا تھا۔ "رئیلی پاپا؟"

"ہاں میں اور تم .... پاپا اور سن۔ ہم ایک ٹیم ہوں گے۔" ایڈ نے جوش سے کہا۔ "میرے ذہن میں ایک جگہ ہے جو بائنگ رائڈ کے لیے نہایت موزوں ہے۔"

ایرک متفق تھا کہ باپ سے بہتر ساتھی کون ہو سکتا ہے۔ "کون سی جگہ پاپا۔"

"ویت نام، جہاں ایک زمانے میں میں فوج کی طرف سے گیا تھا۔ بہت خوب صورت ملک ہے اور مجھے یقین ہے تم اسے پسند کرو گے۔"

ایرک کو ویت نام اس سے بھی زیادہ پسند آیا تھا۔ اس کی اور ایڈ کی بائنگ رائڈ ہوچی من سے ہنوئی تک تھی۔ ایک زمانے میں ملک کے انتہائی سروں پر آباد یہ شہر جنوبی اور شمالی ویت نام کے دارالحکومت ہوتے تھے۔ پھر جب شمالی ویت نام والے غالب آگئے تو ہنوئی کی حیثیت ختم ہو گئی اب دارالحکومت ہوچی من ہے لیکن ہنوئی کی تجارتی و صنعتی اہمیت کہیں زیادہ ہے۔ بیس سال تک اس ملک میں سرمایہ داری اور کمیونزم کی جنگ جاری رہی اور اس جنگ میں تقریباً تیس لاکھ ویت نامی اور کوئی ایک لاکھ امریکی اور فرانسیسی فوجی مارے گئے تھے۔ آج ویت نام نے اپنی معیشت آزاد منڈی کے لیے کھول دی ہے اور اس کا شمار دنیا کے چند تیزی سے ترقی کرتے ملکوں میں ہوتا ہے۔ مگر جب 1998ء میں ایرک اور ایڈ بائنگ رائڈ پر روانہ ہوئے تو یہاں کمیونزم کے سائے گہرے تھے اور ویت نام کی جنگ کے زخم ابھی پوری طرح بھرے نہیں تھے۔ ایڈ سابق امریکی میرین تھا جو ویت نام میں لڑ چکا تھا۔

ایڈ اور ایرک کو خطرہ تھا کہ شاید انہیں عوام کی طرف سے کسی ردعمل کا سامنا کرنا پڑے۔ مگر حیران کن طور پر اس پورے سفر میں انہیں کہیں نفرت یا مزاحمت کا سامنا کرنا نہیں پڑا۔ بلکہ اکثر جگہوں پر لوگوں نے ان باپ بیٹے کو سراہا۔ خاص طور سے ایرک کو جو نابینا ہونے کے باوجود اس پورے سفر میں خود بائنگ چلاتا رہا۔ ایڈ کا کام صرف اتنا تھا کہ وہ پیچھے بیٹھ کر اسے گائیڈ کرتا رہے۔ تقریباً ساڑھے بارہ سو میل کا یہ سفر انہوں نے ایک ہفتے میں طے کیا اور ایرک کے لیے یہ ایک شاندار اور دل بڑھا دینے والا تجربہ تھا۔ اس نے بعد میں اپنی آٹو بائیوگرافی میں لکھا۔ "ویت نام کی مصروف ترین شاہراہوں پر جو خوفناک حادثات کے لیے مشہور ہیں، ساڑھے بارہ سو میل بائنگ چلانا میرے لیے ایسا تجربہ تھا جس کے بعد مجھے دنیا کا ہر کام آسان لگنے لگا۔"

اسی سال ایرک نے ارجنٹائن میں واقع اکون کاگوا کی چوٹی سر کرنے کی کوشش کی۔ یہ ایشیا سے باہر دنیا کی بلند ترین چوٹی ہے۔ مگر بدقسمتی سے مسلسل خراب موسم اور سردی کی وجہ سے وہ اپنی مہم ادھوری چھوڑ کر آنے پر مجبور ہوئے۔ اس مہم سے ایرک نے بہت کچھ سیکھا جو بعد میں اس کے کام آیا۔ خاص طور سے جب موسم خراب ہو تو کیا کرنا چاہیے۔ اتفاق سے ایرک کی اس مہم کو بھی نابینا افراد سے متعلق ایک ادارے "امریکن گلاکوما ریسرچ فاؤنڈیشن" نے اسپانسر کیا تھا۔ ایرک مایوس نہیں تھا، اس نے اگلے برس جنوری 1999ء میں ایک بار پھر اکون کاگوا کی چوٹی سر کرنے کی کوشش کی۔ اس کی مہم کو اس بار سان فرانسسکو گلاکوما ریسرچ فائنڈیشن نے اسپانسر کیا اور اس بار وہ کامیابی سے بائیس ہزار آٹھ سو پچاس فٹ بلند چوٹی تک پہنچنے میں کامیاب رہا۔ وہ اولین نابینا شخص بن گیا جو اس بلندی تک گیا تھا۔ اس کامیابی سے پہلی بار اس کے دل میں ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے خواہش جاگی تھی مگر ابھی اس کی منزل دور تھی۔

ایرک وین میئر خود گلاکوما کی بیماری کا شکار ہوا تھا جو ایک پیدائشی بیماری ہے اور یہ رفتہ رفتہ آنکھ کے پردے کو بیکار کر دیتی ہے۔ اس بارے میں تحقیق کرنے والے ادارے اس بات کے لیے کوشاں ہیں کہ اس بیماری کا جینیاتی علاج دریافت کیا جائے۔ تاکہ ایک تو مستقبل میں پیدا ہونے والے بچوں میں اس بیماری کی روک تھام کی جائے اور دوسرے نابینا ہو جانے والے افراد کی بینائی بحال کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس مہم کے دوران ایرک کی آنکھوں میں بلندی پر تکلیف شروع ہو گئی تھی کیونکہ گلاکوما سے خشک ہو جانے والی نسوں میں بلندی پر آنے سے دباؤ پیدا ہوتا ہے اور یہ شدید تکلیف کا باعث بنتا ہے۔ عام گلوکوما کے مریض پندرہ ہزار فٹ سے زیادہ بلندی پر نہیں جا سکتے ہیں جب کہ ایرک اس سے کہیں زیادہ بلندی پر جا چکا تھا۔ اس کا مطلب تھا اس میں تکلیف برداشت کرنے کی غیر معمولی صلاحیت تھی۔ ایرک نے اس بارے میں بتایا۔ "مجھے کچھ محسوس

نہیں ہوا تھا جب تک میں انیس ہزار فٹ کی بلندی تک نہیں پہنچ گیا لیکن جیسے ہی میں نے یہ بلندی سر کی میری آنکھوں میں ایسی تکلیف ہوئی جیسے کسی نے ان میں چھری گھونپ دی ہو۔ خوش قسمتی سے میرے پاس دوائیں اور آئی ڈراپس تھے جن کی مدد سے میں نے اس تکلیف پر قابو پالیا۔"

اب ایرک وین میئر ایک نامور اور تجربہ کار کوہ پیما تھا جو ایشیا سے باہر کم کینلے، اکون کاگوا اور کلی منجارو جیسی چوٹیاں عبور کر چکا تھا۔ ایشیا میں بھی وہ بائیس ہزار فٹ بلند نامعلوم چوٹیوں تک گیا تھا۔ اکون کاگوا کی چوٹی کی مہم کے دوران میں اس کا پارٹنر اور گائیڈ کرس مورس تھا۔ بے پناہ شور والی تند ہواؤں، صفر سے ستر درجے فارن ہائیٹ نیچے کا درجۂ حرارت اور پھر مختصر وقت ان کے لیے عذاب بن گیا۔ وہ صرف بیس منٹ تک پہاڑ کی چوٹی پر رکنے کا لطف اٹھا سکے تھے۔ اس مہم کے دوران میں ایک وقت ایسا آیا جب ایرک بغیر رسے کے سہارے اور کرس سے الگ تین گھنٹے تک ایک برفانی ڈھلان پر چڑھتا رہا۔ کرس اس سے زیادہ دور نہیں تھا مگر ہواؤں کا بے پناہ شور اس کی آواز ایرک تک پہنچنے نہیں دے رہا تھا۔ اس دوران میں ایرک کی رہنما اس کی انگلیاں تھیں جو اسے بتا رہی تھیں کہ راستہ کہاں ہے اور کہاں چٹان ہے۔ ایرک کو اس مہم میں ایک اعزاز اور حاصل ہوا تھا، صرف بیس فیصد کوہ پیما بیس کیمپ سے روانگی کے بعد اسی دن اکون کاگوا کی چوٹی تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے تھے اور ایرک ان میں سے ایک تھا۔

بہت سے لوگ اس سے سوال کرتے تھے کہ آخر کوہ پیمائی ہی کیوں؟ ایرک نے اس کا جواب اپنی آٹو بایوگرافی میں دیا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ "جب آپ نابینا ہو جاتے ہیں تو یہ سوال آپ کے سامنے آتا ہے کہ اب آپ میں کیا کرنے کی صلاحیت باقی رہ گئی ہے۔ کوہ پیمائی اس کا بہترین جواب ہے۔ ایک نابینا فرد کے لیے جو گلوکوما کا شکار ہو چکا ہے زندگی میں کیا چوائس رہ جاتی ہے۔ میں اسی سوال کے جواب میں بلند ترین پہاڑوں پر گیا۔ جب میں بلندی پر تکلیف دے بن جانے والے گلوکوما کے ساتھ جا سکتا ہوں تو یہ بات ان لوگوں کے لیے بہت حوصلہ افزا بن جاتی ہے جو گلوکوما کا شکار ہیں۔ وہ جان جاتے ہیں ان کی حد اس سے کتنی زیادہ ہے جتنا کہ وہ خیال کرتے ہیں۔"

گلوکوما ریسرچ فاؤنڈیشن کی ایگزیکٹو ڈائریکٹر تارا اسٹیلے نے کہا۔ "ایرک کی کامیابی صرف ایک فرد کی کامیابی نہیں ہے، یہ ان تمام لوگوں کی کامیابی ہے جو گلوکوما کی بیماری سے نبرد آزما ہیں، چاہے وہ اس کا شکار ہوں یا اس کا علاج دریافت کر رہے ہوں۔ ایرک نے ہمیں بتایا کہ کچھ ناممکن نہیں ہے اگر انسان کرنا چاہے تو.... اس سے ہمیں حوصلہ ملا ہے کہ ہمیں اس بیماری کا علاج دریافت ہونے تک ہار نہیں ماننی ہے۔"

اسی سال ایورسٹ ڈاٹ کام کی طرف سے ایرک کا انٹرویو ہوا اور اس انٹرویو میں ایرک نے اعلان کیا کہ وہ 2001ء کے بہار میں ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے کی کوشش کرے گا۔ اعلان کی بعد اسے توقع تھی کہ پیشہ ور کوہ پیما کلبس یا اداروں کی طرف سے اسے اسپانسر شپ کی پیشکش ہوگی مگر اس بار بھی ایرک کی توقع پوری نہیں ہوئی تھی۔ کسی طرف سے اسے پیشکش نہیں ہوئی۔ یہ رویہ نہایت سرد اور دل توڑ دینے والا تھا۔ ایرک سے کہیں معمولی درجے کے کوہ پیماؤں کو جو شراب اور سگریٹ پیتے تھے، جن کی صحت زیادہ اچھی نہیں تھی اور ان کے پھیپھڑے بھی اتنے مضبوط نہیں تھے کہ بلندی کو سہار سکتے۔ لیکن ان کو آسانی سے اسپانسر شپ مل جاتی تھی۔ ایسے کوہ پیماؤں کو بھی اسپانسر شپ مل جاتی ہے جو دس بار ماؤنٹ ایورسٹ کے بیس کیمپ سے ہو کر واپس آگئے تھے۔ کیونکہ وہ سب آنکھوں والے تھے اور پیشہ ور کوہ پیمائی کے کلبوں کو بالکل یقین نہیں تھا کہ کوئی شخص آنکھوں کے بغیر بھی ماؤنٹ ایورسٹ جیسی بلند ترین اور مشکل چوٹی سر کر سکتا ہے، جس کے بیس کیمپ کا سفر ہی دو ہفتوں کے دشوار گزار ٹریک پر مشتمل تھا۔ اس لیے کسی نے ایرک کا حوصلہ آزمانے کی کوشش نہیں کی۔ ایسے میں ایک اور نابینا افراد کی تنظیم نیشنل فیڈریشن آف بلائنڈ آگے آئی اور اس نے ایرک کی مہم کو اسپانسر کرنے کا اعلان کیا۔

آئین پاکستان کی دفعہ 19 میں آزادی تقریر کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اسلام کی عظمت یا پاکستان یا اس کے کسی حصے کی سالمیت، سلامتی یا دفاع، غیر ممالک کے ساتھ دوستانہ تعلقات، امنِ عامہ، تہذیب یا اخلاق کے مفاد کے پیشِ نظر یا توہینِ عدالت، کسی جرم (کے ارتکاب) یا اس کی ترغیب سے متعلق قانون کے ذریعے عائد کردہ مناسب پابندیوں کے تابع رہتے ہوئے ہر شہری کو تقریر اور اظہارِ خیال کی آزادی کا حق ہوگا اور پریس کی آزادی ہوگی۔

اگرچہ اس مہم کا بنیادی مقصد ماؤنٹ ایورسٹ کے بیس کیمپ میں پھیلے کچرے کی صفائی تھی جو وہاں کوہ پیماؤں کی آمد سے جمع ہو رہا تھا۔ مگر ساتھ ہی ایرک بھی اپنی ٹیم کے ہمراہ چوٹی سر کرنے کی کوشش کرتا۔ مگر اس مہم سے پہلے اس نے مناسب سمجھا کہ ہمالیہ کا ایک چکر لگا لے۔ اس کے لیے اس نے انڈیا اور نیپال کی سرحد کے ساتھ سو میل کا ایک ٹریک کرنے کا منصوبہ بنایا۔ خوش قسمتی سے اس مقصد کے لیے اسے بہ آسانی اسپانسر مل گیا۔ ورلڈ ٹیم اسپورٹس ایک نان پروفٹ ایبل آرگنائزیشن ہے جس کا مقصد دنیا بھر میں کھیلوں کے ذریعے مختلف قوموں اور ملکوں کے لوگوں کو آپس میں نزدیک لانا تھا، اس کے لیے یہ دنیا بھر میں ایسے ایونٹس کو اسپانسر کرتی ہے جس میں کھلاڑی دوسروں ملکوں میں جا کر کھیلوں میں حصہ لیں۔ اس ٹریک میں ایرک کے ساتھ ایک درجن افراد اور بھی شامل تھے۔ یہ ٹریک انڈیا اور نیپال کے ان دشوار گزار علاقوں میں تھا جہاں بہت کم لوگ باہر سے ٹریک کے لیے آتے تھے۔ اس ٹریک کی خوبی یہ تھی کہ اس کے ایک مقام سے دنیا کی پانچ بلند ترین چوٹیوں میں سے چار یعنی ماؤنٹ ایورسٹ، کنچن جنگا، لہوتسے اور ماکالو دکھائی دیتی تھیں۔ دنیا میں اور ایسا کوئی مقام نہیں تھا جہاں سے یہ چاروں چوٹیاں ایک ساتھ دکھائی دیں۔ مزے کی بات ہے ایرک کو اس کی خبر نہیں تھی اور جب یہ چوٹیاں ایک ساتھ نظر آئیں اور اس کے ساتھیوں نے اسے بتایا تو اس نے بے پروائی سے کہا۔ ”میرے لیے وہی چوٹی اہم ہوتی ہے جسے سر کرنے کے بارے میں سوچتا ہوں۔“

ایرک کو ایورسٹ کی مہم میں سب سے زیادہ فکر اپنی آنکھوں کی تکلیف کی تھی۔ 1988ء میں وہ اپنی دائیں آنکھ مکمل طور پر گنوا بیٹھا تھا۔ سرجری کے بعد اس کی آنکھ کا پردہ اور اندر تکلیف کا باعث بننے والی نسیں نکال دی گئی تھیں۔ نومبر 1999ء میں ایرک نے اپنی بائیں آنکھ کی سرجری کرائی تاکہ بلندی پر دباؤ سے بننے والی تکلیف سے بچ سکے۔ اسے اب بائیس ہزار فٹ کی بلندی سے کہیں بلند جگہ جانا تھا۔ سرجری کامیاب رہی اور تکلیف کا باعث بننے والی نسوں کو کھول دیا گیا۔ سرجری کے فوراً بعد وہ نیپال روانہ ہو گیا جہاں ہمالیہ کے ماحول سے روشناس ہونے کے لیے اس نے اماڈابلام نامی چوٹی سر کرنے کا ارادہ کیا۔ مکمل طور پر برف سے ڈھکی اور ترچھی ہموار ڈھلانوں والی اس چوٹی کا شمار دنیا کی حسین ترین چوٹیوں میں ہوتا ہے۔ ساتھ ہی یہ آسان بھی ہے اکثر کوہ پیما جو پہلی بار ہمالیہ اور نیپال آتے ہیں اسی چوٹی سے اپنی مہم کا آغاز کرتے ہیں۔

اس چوٹی سے ماؤنٹ ایورسٹ صاف دکھائی دیتی ہے اور کوہ پیما اس پر چڑھ کر ماؤنٹ ایورسٹ کے جغرافیہ سے بہتر طور پر واقف ہو جاتے ہیں، دوسری صورت میں انہیں ماؤنٹ ایورسٹ کے بیس کیمپ تک جانا پڑتا ہے۔ مگر یہ بلند ترین چوٹی نہیں تھی جسے ایرک نے سر کیا تھا۔ یہ بائیس ہزار پانچ سو فٹ بلند تھی اور ایرک اس سے ساڑھے تین سو فٹ مزید اوپر جا چکا تھا۔ چوٹی پر پہنچنے کے بعد جب اس کے ساتھی کوہ پیما نے اسے بتایا کہ ماؤنٹ ایورسٹ کس طرف ہے تو ایرک نے اس طرف رخ کر کے خود سے وعدہ کیا کہ وہ ایک دن ایورسٹ کی چوٹی پر کھڑا ہو کر اماڈابلام کی طرف رخ کرے گا۔ مگر اس سال وہ یہ کام نہیں کر سکا۔ ایک تو اس کے پاس اس مہم کے لیے اسپانسر نہیں تھا دوسرے اس کی ٹیم بھی مکمل نہیں تھی۔ اسے چند بہترین کوہ پیماؤں کے ساتھ ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنا تھی اور یہ کوہ پیما فی الحال دوسری مہمات میں مگن تھے۔ ایرک کو ان کے فارغ ہونے کا انتظار کرنا تھا تب ہی وہ ایورسٹ سر کرنے کا سوچ سکتا تھا۔

☆☆☆

پاسکولے اسکاچرو نے جب پہلی بار ایرک وین میئر کو دیکھا تو اسے فوراً اس مہم کی فکر لاحق ہو گئی تھی جس کا وہ سربراہ تھا۔ وہ ماؤنٹ ایورسٹ کے فرسٹ فلور یعنی کیمپ ون تک آ گئے تھے اور ایرک اس حال میں یہاں پہنچا تھا کہ وہ خون خون اور بیمار ہو رہا تھا۔ پانی کی کمی سے اسے چکر آ رہے تھے اور اگر اسے نظر آتا تو دنیا اس کی نظروں کے سامنے اندھیر ہوتی۔ اتنی بلندی پر معمولی بیماریاں بھی بہت خوفناک اور بعض اوقات جان لیوا ہو جاتی ہیں۔ ایرک کے ایک ساتھی کوہ پیما اور ٹیم کا حصہ مائیکل اوڈنل نے کہا۔ ”وہ مرجھایا ہوا تھا اور جارج فورمین سے مل رہا تھا جس نے محمد علی کلے سے شکست کھائی تھی۔“

ایرک کے ساتھ جو ہوا وہ اس کے پارٹنر اور رہنما لوئیس بینٹر کی غلطی تھی۔ اس کی غلط رہنمائی کی وجہ سے ایرک ایک دراڑ میں گر گیا اور جب لوئیس اس کی مدد کے لیے پہنچا تو اس کی برف میں چلنے والی چھڑی ایرک کی ناک اور زیر لب لگی تھی۔ زخم خاصے گہرے تھے اور اس بلندی پر یہ اتنی

آسانی سے بھرتے بھی نہیں۔ مرہم پٹی اور کھانے پینے کے بعد جیسے ہی ایرک اپنے خیمے میں گیا تمام ٹیم ایک جگہ جمع ہو گئی اور تقریباً ہر ایک کے ذہن میں کچھ نہ کچھ خدشات تھے۔ مگر سب منتظر تھے کہ کوئی دوسرا بات شروع کرے۔ مگر جب کوئی نہیں بولا تو مجبوراً پاسکو کو لیڈر ہونے کے ناطے بات کرنا پڑی۔ اس نے ہچکچا کر کہا۔ ”یہ خیال کچھ جچ نہیں رہا ہے۔ ہم دو سال سے اس مہم کی تیاری کر رہے ہیں اور ایک ڈاکومینٹری مووی بھی بن چکی ہے۔ یعنی ساری دنیا میں ہماری مہم کا ڈھنڈورا پٹ چکا ہے اور اس کا یہاں پہنچنے میں یہ حال ہو گیا ہے۔“

مگر وہ بھول رہا تھا کہ یہ نابینا کوئی حادثاتی کوہ پیما نہیں تھا جس نے نابینا ہونے سے پہلے چند پہاڑوں کو دیکھ لیا تھا۔ وہ تیرہ سال کی عمر میں نابینا ہو گیا تھا اور اس نے انیس سال کی عمر میں کوہ پیمائی شروع کی تھی اور وہ بیس ہزار فٹ سے بلند چار چوٹیاں سر کر چکا تھا۔ اس کے باوجود ٹیم کے ارکان میں اس کے متعلق خدشات سر سرا رہے تھے کیونکہ انہیں کھمبو گلیشیر کی طرف سے ایورسٹ پر چڑھنا تھا اور اس طرف سے چڑھائی نہایت دشوار ہے۔ کھمبو گلیشیر عبور کرنا ہی کسی معرکے سے کم نہیں تھا۔ بہت کم کوہ پیما اس طرف سے ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کرنے میں کامیاب رہے تھے۔ جتنے کامیاب رہے تھے اس سے دس گنا زیادہ ناکام رہے تھے اور جتنے کامیاب ہوئے تھے، تقریباً اتنے ہی اس کی برفوں میں دفن ہو چکے تھے۔ اس لیے ٹیم کے ارکان کا فکرمند ہونا لازمی تھا کہ ایرک کے ہوتے ہوئے کہیں ان کی یہ مہم کسی حادثے میں نہ بدل جائے اور ان سب کو بے نیل و مرام واپس جانا پڑے۔ دو سال کی تیاری اور تقریباً بیس لاکھ ڈالرز کا خرچ سب اکارت جاتا۔

ایسا لگ رہا تھا کہ دنیا کے پہلے نابینا شخص کی ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے کی کوشش مہلک غلطی تھی اور اس کی سزا اسے کسی نہ کسی صورت میں مل جانے کا قوی امکان تھا۔ پہاڑوں پر موت ارزاں اور اس کے بہت سے روپ ہیں، ان میں سے کوئی بھی روپ کسی صحت مند ترین اور بالکل فٹ کوہ پیما کو کسی وقت بھی ساتھ لے جا سکتا ہے۔ کوہ پیما دراڑ میں گر سکتے ہیں اور صرف دس منٹ میں سردی ان کی جان لے سکتی ہے۔ ہڈیاں پسلیاں ٹوٹنے کا بھی پورا خطرہ ہوتا ہے جس کے بعد بہ حفاظت بیس کیمپ تک واپسی بھی ایک مہم بن جاتی ہے۔ اوپر سے گرنے والی برف جسے ایولانچ کہتے ہیں پل بھر میں اچھی بھلی مہم کو ناکامی اور اجتماعی موت میں بدل دیتی ہے۔ یہ اس لحاظ سے زیادہ مہلک ہے کہ دراڑ میں ایک دو کوہ پیما گر سکتے ہیں کہ ایولانچ اگر بڑے ہوں تو پوری ٹیم کو سفر آخرت پر روانہ کرنے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ انفرادی بیماریاں اور تکالیف بھی کم خطرناک نہیں ہوتی ہیں۔ آکسیجن کی کمی سے اچانک ہی دماغ کام کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ یا دل رک جاتا ہے۔ محاورتاً اسے دماغ کا ابل کر باہر آنا بھی کہتے ہیں۔ اسی طرح آکسیجن کی کمی سے فیصلہ کرنے کی صلاحیت متاثر ہوتی ہے اور ایک غلط فیصلہ کوہ پیما کو ہمیشہ کے لیے برف کا حصہ بنا سکتا ہے۔

دوسری طرف خیمے میں لیٹا ہوا ایرک سوچ رہا تھا کہ بالآخر وہ اپنے اصل امتحان کی طرف آ گیا تھا جس میں کامیابی کے بعد کوئی یہ نہیں کہہ سکے گا کہ ایک نابینا فرد کے لیے سب سے موزوں پیشہ پیانو بجانا یا پنسل بیچنا ہے۔ یا زیادہ سے زیادہ وہ ٹائپسٹ بن سکتے ہیں۔ مہذب معاشروں میں نابینا افراد کے لیے خصوصی سہولتیں مہیا کی جاتی ہیں۔ ایک جیسی سطح والے مکان، ایک جیسی سیڑھیاں اور ہموار راستے تاکہ انہیں چلنے پھرنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ یہ تو کسی نے سوچا بھی نہیں ہو گا کہ ان کے لیے ایک مسلسل تبدیل ہوتی برفانی دنیا میں جانا بھی ممکن ہے جہاں ہر قدم پر ایسے خطرات ہیں کہ پوری طرح بینائی رکھنے والے بھی ان سے نہیں بچ سکتے ۔۔۔ کل انہیں ایک ہزار فٹ مزید بلندی پر چڑھنا تھا اس میں انہیں ڈھلانوں پر رینگنا تھا۔ برفانی سیڑھیاں تھیں جن کا ہر اسٹیپ مختلف تھا۔ دراڑیں تھیں اور سیدھی دیواریں تھیں۔ جب وہ اس ایک ہزار فٹ کو سر کر لیتے تو اس کے بعد ایک ایسی دنیا میں قدم رکھتے جس کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتے تھے۔ یہاں سے ان کی اصل مہم کا آغاز ہوتا۔

برفانی گلیشیر ایک بالکل مختلف دنیا ہیں۔ ان کی کوئی مخصوص شکل، کوئی مخصوص راستہ اور کوئی ترتیب نہیں ہوتی ہے۔ یہ ایک بے ہنگم ایسی دنیا ہے جس کی کوئی شکل تک نہیں ہوتی ..... دور تک بس جمی ہوئی برف ہوتی ہے جس کے نیچے پگھلتی ندیاں چلتی ہیں۔ یہ ندیاں خلا پیدا کرتی ہیں۔ دراڑیں وجود میں آتی ہیں اور گلیشیر کے کھسکنے سے اس کے اندر مہیب خلا بن جاتے ہیں جن میں گرنے والے کو عام

طور سے نکالنا بھی ممکن نہیں ہوتا ہے۔ ایسے حادثات میں بچنے کے امکانات صرف پچاس فیصد ہوتے ہیں۔ نصف گرنے والوں کو موت ملتی ہے اور عام طور سے وہ ہمیشہ کے لیے گم ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ جہاں گرتے ہیں وہاں سے ان کو نکالنا بھی ممکن نہیں ہوتا.... پاسکو اپنے ساتھیوں کے ہمراہ باہر آیا اور ماؤنٹ ایورسٹ کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس کی برف، اس کی ڈھلانوں اور کھائیوں کو دیکھو۔ کیا یہ نابینا شخص ان سے گزر سکے گا۔ اس میں دراڑیں ہیں۔ ایسی ترچھی دیواریں ہیں جس سے چپکنا ممکن نہیں ہے کیونکہ وہ اوپر کی طرف سے باہر نکلی ہوئی ہیں۔ ایسے برج ہیں جن پر ایک قدم کسی کوہ پیما کو ہزاروں فٹ کی گہرائی میں گرا سکتا ہے۔ ایسی گگریں ہیں جن پر آنکھ والے دیکھ کر بھی پورے یقین سے قدم نہیں رکھ سکتے کہ یہ پاؤں رکھنے کے بعد اپنی جگہ برقرار رہیں گی، نیچے تو نہیں گر جائیں گی۔ کیا ایرک ان جگہوں سے اور مشکلوں سے گزر سکے گا۔ وہ خود کو بچا لے گا؟“

اس سوال بلکہ سوالوں کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا سوائے ایرک کے اور وہ اپنے خیمے میں خوابِ خرگوش میں مگن تھا۔ اس کے مطمئن خراٹے باہر تک سنائی دے رہے تھے۔ اسے بیس کیمپ سے بیس ہزار فٹ کی بلندی پر واقع کیمپ ون تک آنے میں تیرہ گھنٹے لگے تھے۔ اس میں راستے کا حادثہ بھی شامل تھا لیکن اس کی خوفناکی گزر چکی تھی اور ایرک اب چوٹی پر جانے کے خواب دیکھ رہا تھا، یہ جانے بغیر کہ اس کے ساتھی فکرمند تھے کہ وہ چوٹی تک جائے گا یا اسے مردہ یا زخمی حالت میں واپس بیس کیمپ لے جانا پڑے گا۔ دونوں صورتوں میں ان کی مہم ناکام ہو جائے گی۔

ان کی ٹیم دس افراد پر مشتمل تھی لیکن کیمپ ون تک وہ سب آئے تھے۔ پہلے ہی طے کر لیا تھا کہ کیمپ ون میں سب لوگ جائیں گے ایرک کا بھی نام ان میں شامل تھا۔ وہ سب سے آخر میں آیا تھا۔ اگرچہ اس نے فاصلہ مقررہ وقت میں طے کیا تھا اور لوئیس نے سوائے ایک موقع کے اسے مشکل میں نہیں دیکھا تھا اس کے باوجود وہ پریشان تھے۔ یہاں آتے ہوئے ایرک کو زیادہ سامان نہیں اٹھانا پڑا تھا مگر اب اوپر جانے والے ہر فرد کو سامان اٹھانا تھا جس میں اس کی خوراک اور دوسرا ضروری سامان ہوتا۔ اس میں آکسیجن اور دوائیں بھی شامل تھیں۔ کیا ایرک اتنا سامان اٹھا سکتا تھا؟ اور اسے لے کر مزید نو ہزار فٹ کی بلندی تک جا سکتا تھا۔ یہ فاصلہ تین کلومیٹرز بنتا تھا اور تقریباً عموداً تھا۔ اس موقع پر یہ تجویز سامنے آئی کہ ایرک کو کیمپ ون میں چھوڑ دیا جائے اور بقیہ ٹیم ویڈیو کیمروں اور خوراک کے ساتھ پورٹر شرپاؤں کی ہمراہی میں اوپر کی طرف روانہ ہو جائے۔ کیمپ ون میں ایک دو افراد کا رکنا لازمی تھا۔ کسی ہنگامی صورت حال میں وہ سب پہلے یہیں واپس آتے۔ یہ معاملہ جب ایرک کے سامنے آیا تو اس نے اسے فوری مسترد کر دیا۔ ”اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ میں اس ٹیم کے ساتھ ایک مکمل ممبر بنے بغیر جاؤں۔ اس سے زیادہ اچھا یہ ہوگا کہ میں یہیں سے واپس چلا جاؤں۔ میں اس لیے نہیں آیا ہوں کہ مجھے ایک فٹ بال کی طرح واپس کک ماردی جائے۔“

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایرک نے اپنے ساتھیوں کے خدشات پر غور نہیں کیا تھا۔ کیمپ ون میں آنے کے بعد چند دن میں وہ کئی آزمائشی مہمات پر جا چکا تھا۔ اس دوران میں اس نے دس بار کھمبو گلیشیر کو عبور کیا اور ہر بار اپنا وقت بہتر کیا۔ آخری بار اس نے اسے صرف پانچ گھنٹے میں عبور کر لیا۔ ماؤنٹ ایورسٹ کی کوہ پیمائی کی تاریخ میں یہ ایک ریکارڈ ہے کہ کسی ایک کوشش کے دوران کسی کوہ پیما نے دس بار دشوار ترین کھمبو گلیشیر کو عبور کیا۔ اسے بالتورو اور سیاچن کے ساتھ دنیا کے تین خطرناک اور بڑے گلیشیرز میں شمار کیا جاتا ہے جو کسی معروف پہاڑی چوٹی کی طرف جاتے ہیں۔ اگرچہ ان سے بھی بڑے اور خطرناک گلیشیر ہیں مگر وہ کسی معروف چوٹی کے راستے میں نہیں آتے ہیں اس لیے انہیں سر کرنا ضروری نہیں ہوتا.... وہاں صرف وہی ٹریکر جاتے ہیں جو خاص طور سے ان گلیشیرز کو عبور کرنا چاہتے ہیں۔ جب ایرک اپنے کسی اسپانسر یا کلائنٹ جیسے گلیکسو یا اے ٹی اینڈ ٹی کے لیے کوئی جذباتی تقریر کر رہا ہوتا تھا اور کوئی شخص اس کے پاس آکر کہتا کہ کیا وہ بھی ایسا کر سکتا ہے تو ایرک اسے جواب دیتا۔ ”تم شراب، سگریٹ اور مرغن غذاؤں سے شوق کرتے ہو، تمہارا جسم بھدا ہے اور ذرا سی مشقت سے تمہارا سانس پھول جاتا ہے اور تم اس لیے کوہ پیمائی کرنا چاہتے ہو کہ تم دیکھ سکتے ہو۔“

ایرک لوگوں کو دل برداشتہ کرنے کے لیے یہ سب نہیں کہتا تھا بلکہ وہ ان پر واضح کرنا چاہتا تھا جس طرح ایک

انسان کے لیے آنکھیں اہم ہیں اسی طرح اس کے لیے جسم کا ہر عضو اہم ہے اور جب وہ کوئی بڑا کام کرنا چاہتا ہے تو اس کے پورے جسم کو بہترین حالت میں ہونا چاہیے۔ اگر کوئی شخص دیکھ سکتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے وہ ہر کام کر سکتا ہے، خاص طور سے کوہ پیمائی جیسا مشکل کام جو ہر لاکھ میں سے صرف ایک فرد کرتا ہے۔ اگر کوئی کرنا چاہتا ہے تو اسے خود کو ایرک کی طرح سپر فٹ رکھنا ہوگا۔ آنکھیں نہ ہونے کے باوجود اگر وہ کوہ پیمائی جیسے مشکل ترین کام کی طرف آیا تو اس کے لیے اس کے پاس قدرت کی طرف سے عطیہ کیا ہوا بہترین جسم تھا۔

عجیب بات تھی قدرت نے اسے پیدائشی گلوکوما جیسی بیماری دی مگر ساتھ ہی اسے کوہ پیمائی کے لیے موزوں ترین جسم دیا۔ اس کا قد طویل لیکن جسم ہلکا تھا۔ چھ فٹ اور دو انچ قامت کے ساتھ وہ صرف اسی کلوگرام وزن کا حامل تھا۔ اس کی ٹانگیں لمبی مضبوط اور لچکدار تھیں۔ خاص طور سے اس کے ٹخنے اور گھٹنے بے پناہ لچک والے تھے وہ مشکل ترین جگہوں سے چہل قدمی کرنے کے انداز میں گزر جاتا تھا۔ مضبوط سینہ اور مضبوط ترین بازو جو اس کے سارے جسم کا بوجھ نہایت آرام سے اٹھا سکتے تھے۔ اس کے تمام جسمانی اعضا بہترین حالت میں تھے اور دل کی دھڑکن نارمل سے کم تھی۔ اس کے ہاتھوں اور پیروں کے مسلز لمبے اور لچکدار تھے۔ سب سے بڑھ کر اس کے پاس وہ ذہنی پختگی اور مضبوطی تھی جو ایک کوہ پیما کے لیے لازمی ہوتی ہے۔

دنیا میں کوئی کھیل یا تفریح کوہ پیمائی سے زیادہ خطرناک نہیں ہے۔ ہر سال بلا مبالغہ سیکڑوں کوہ پیما دنیا کی مختلف چوٹیوں کو سر کرنے کی کوشش میں ہلاک ہو جاتے ہیں۔ یہاں جتنے خطرات نظر آتے ہیں اس سے کہیں زیادہ خطرات دکھائی نہیں دیتے ہیں۔ مسلسل موت کے خطرے کا سامنا کرنا کم حوصلہ لوگوں کا کام نہیں ہے۔ یہاں صرف خطرات نہیں ہوتے بلکہ ایسی مشکلات بھی ہوتی تھیں جن کا لازمی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بلندی کا ہلکا دباؤ اور بہت کم آکسیجن والی ہوا، بے پناہ سردی، بے آرامی اور اس کے نتیجے میں جسمانی تکالیف، خراب خوراک (ایسی منجمد اور بے ذائقہ خوراک کو کیا کہا جائے گا جسے حلق سے اتارنے سے پہلے بہت دیر تک منہ میں رکھ کر اس کے گھلنے کا انتظار کیا جائے؟) احساس تنہائی اور بے پناہ بوریت خاص طور سے آپ ہفتوں بیس ہزار فٹ کی بلندی پر تین فٹ گہری برف میں دبے ایک خیمے میں اکیلے پڑے رہیں۔ ہر کوہ پیما کو ان سب مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ان سے نمٹنے کے لیے بلند حوصلے اور بے پناہ اعصابی مضبوطی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایرک میں یہ تمام خوبیاں موجود تھیں کیونکہ الاسکا کی ایک چوٹی ڈینالی سر کرنے کے دوران میں وہ ان تمام مشکلات سے گزر چکا تھا۔ اسے کوہ پیمائی کی صعوبتوں کا بڑی اچھی طرح علم تھا۔ وہ ان سے نمٹنے کے لیے تیار بھی تھا۔

جب سامنا ایورسٹ سے ہو تو ذہنی اور اعصابی مضبوطی کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ دوسری تمام چوٹیوں کی نسبت یہ بلند ترین ہے اور تقریباً انتیس ہزار فٹ سے زیادہ اونچی ہے۔ اس بلندی پر درجۂ حرارت مستقل منفی ساٹھ سے ستر ڈگری سینٹی گریڈ رہتا ہے اور ہوا میں آکسیجن کا تناسب سطح سمندر کا صرف پانچواں حصہ رہ جاتا ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ سمندر کے کنارے جتنی آکسیجن انسان ایک سانس میں حاصل کر لیتا ہے اتنی آکسیجن ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی پر پانچ بار سانس لینے سے ملتی ہے اور اس پر یہ بھی کہ وہاں انسان جتنی مشقت سے پہنچتا ہے اسے آکسیجن کی ضرورت زیادہ ہی ہوتی ہے اس لیے اس بلندی پر جانے والے کوہ پیما لازمی اپنے پاس کمپریس آکسیجن کے سلینڈر رکھتے ہیں۔ اس مہم کے بعد ایرک کے ایک ساتھی کوہ پیما کرس موریس نے اس کے بارے میں کہا۔ ”وہ ان مضبوط ترین ذہن رکھنے والے لوگوں میں سے ایک ہے جن سے میں آج تک ملا ہوں۔“

ایورسٹ کی طرف جانے والا ہر شخص بیمار ہوتا ہے اور مقامی طور پر اس بیماری کو کھمبو کرد کہتے ہیں۔ یہ بیماری بلندی، آکسیجن کی کمی، خراب خوراک، منجمد پانی اور انسان دشمن ماحول کا ردعمل ہوتی ہے۔ وہ تمام چوٹیاں جو بیس ہزار فٹ سے زیادہ بلند ہوں ان کو سر کرتے ہوئے انسان ایسی ہی کیفیت سے لازمی دوچار ہوتا ہے۔ اس لیے کیمپ ون میں آمد کے بعد ایرک اور اس کے ساتھی بیمار پڑ گئے اب انہیں اس بلندی اور ہوا کا عادی ہونے تک یہاں رکنا تھا۔ ان میں سے نصف کو بخار ہو گیا تھا اور باقی فلو جیسی کیفیت میں مبتلا تھے۔ ہر ایک سردی سے پریشان تھا کیونکہ رات ہوتے ہی باہر کا درجۂ حرارت منفی تیس ڈگری سینٹی گریڈ ہو جاتا تھا۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ سلیپنگ بیگز میں لپٹے خیموں

میں پڑے رہتے تھے۔ وہ اپنے تمام معمولات نمٹاتے تھے اور مسلسل حرکت میں رہتے تھے۔ وہ اوپر جانے کی ریہرسل کر رہے تھے اور ایرک نے اسی دوران میں مسلسل بخار کے باوجود کھمبو گلیشیئر کو دس بار عبور کیا تھا۔ ایرک نے اپنی کتاب میں لکھا۔ ”یہ سب بہت انوکھا اور تکلیف دے تھا۔ میں نے اس سے پہلے کبھی کسی جگہ اتنا قیام نہیں کیا کہ مجھے اس سے آگے جانا ہے۔ رات عذاب ہو جاتی تھی خاص طور سے جب یورین کا مسئلہ ہوتا۔ تیس درجے منفی درجۂ حرارت میں باہر جانا اور پھر پینٹ کی زپ کھول کر اپنا کام کرنا بہت مشکل تھا کیونکہ دس سیکنڈ میں جسم کا وہ حصہ سن ہو چکا ہوتا تھا۔ ہماری کوشش ہوتی تھی کہ ایسے تمام کام دن میں نمٹا لیا کریں جب درجۂ حرارت کسی قدر بہتر ہوتا تھا اور یہ بہتر بھی بیس ڈگری منفی سے کم نہیں ہوتا تھا۔“

اوپر جانے سے پہلے ٹیم کے ارکان کی ذہنی اور جسمانی تربیت کا عمل جاری تھا۔ انہیں ایک سبق کی طرح اوپر کے خطرات سے آگاہ کیا جاتا تھا اور ہنگامی حالات میں بچاؤ کے طریقے بیان کیے جاتے تھے۔ ایرک کے ساتھیوں کو یہ جان کر حیرت ہوئی کہ وہ ان طریقوں کے بارے میں ان سب سے زیادہ جانتا تھا۔ وہ سیکھنے میں سب سے تیز اور حرکت میں ان سے آگے رہتا تھا۔ ان چند دنوں میں جو اس نے اپنی ٹیم کے ساتھ کیمپ ون میں گزارے اس کے ساتھیوں کے خیالات اس کے بارے میں بالکل بدل گئے تھے۔ ”وہ ہماری ٹیم کا دل اور روح تھا۔“ ایرک الیگزنڈر نے کہا۔ ”اس شخص میں ناقابل بیان توانائی اور اس کی روح میں ایسی بے چینی تھی جو آپ کو بھی سکون سے بیٹھنے نہیں دیتی تھی۔“

جب ایرک کھٹمنڈو پہنچا تو ان کی ٹیم کے لیے بندوبست کرنے والے اسے دیکھ کر حیران ہوئے تھے۔ یہ جان کر وہ دنگ رہ گئے کہ یہ نابینا شخص ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے کے ارادے سے نیپال وارد ہوا ہے۔ وہ اپنی سرخ چھڑی کے سہارے مزے سے کھٹمنڈو میں گھومتا تھا۔ وہ آرام سے چھڑی سے راستہ، سڑک اور آگے کی اونچائی نیچائی جان لیتا تھا اور اس کے ساتھیوں کو اس کی بہت معمولی سے مدد کرنا پڑتی تھی جیسے ”راستہ دائیں طرف ہے.... ٹھیک ہے.... ذرا سا دائیں طرف مڑنا ہے.... سوری بائیں طرف مڑنا ہے۔“

ایرک ہدایات پر نامحسوس انداز میں ذرا تاخیر سے عمل کرتا تھا تاکہ اگر اسے غلط ہدایت دی گئی ہو تو اس کو ٹھیک کر لیا جائے۔ مگر یہ تاخیر اتنی بھی نہیں ہوتی تھی کہ اس کی رفتار میں ان کے ساتھیوں کی نسبت کمی آتی۔ وہ ان کے ساتھ تقریباً ان ہی کی رفتار سے گھومتا تھا۔ ایک بار وہ جس علاقے میں گھوم لیتا اس کا نقشہ اس کے ذہن میں نقش ہو جاتا تھا اور وہ دوبارہ وہاں اکیلا یا بغیر رہنمائی کے بھی چلا جاتا تھا۔ اس دوران میں کئی چھوٹے موٹے حادثات ہوئے تھے جیسے وہ ایک شال بیچتی بوڑھی عورت پر جا گرا اور پھر ایک بائک کا پہیہ تقریباً اس کے پاؤں کو چھوتا گزر گیا۔ اگر وہ ایک انچ آگے ہوتا تو پہیہ اس کے پیر سے گزرتا اور شاید اسے وہیں سے واپس آنا پڑتا۔ اس کا طویل قد، ایتھلیٹ جیسا متناسب جسم اور چلنے کا پروقار انداز اسے آس پاس کے تمام لوگوں سے ممتاز کر دیتا تھا اور لوگ اس کا نوٹس لیے بغیر نہیں رہتے تھے اور جب وہ اسے دیکھتے تو انہیں پتا چلتا کہ اس طرح بے جھجک چلنے والا فرد اصل میں نابینا ہے تب وہ حیران ہوتے یا اسے مذاق سمجھتے تھے۔

ایرک آبائی لحاظ سے جرمن ہے یہ بات اس کے خدوخال سے جھلکتی ہے۔ سیدھے ہلکے براؤن بال اور کھڑا ناک نقشہ۔ اس کے ساتھی کبھی کبھی مذاق میں اسے پہاڑوں کا ہٹلر کہتے تھے اور وہ برا نہیں مناتا۔ جوانی میں ہی سیلیبریٹی بن جانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ لوگ اسے دیکھ کر آٹوگراف کے لیے گھیر لیتے ہیں۔ رپورٹر اور ٹی وی شوز کرنے والے اسے کالز کرتے ہیں اور جب وہ کسی ریستوران یا کیفے میں جاتا ہے تو اس سے بل نہیں لیا جاتا ہے۔ ایرک نے یہ عزت اور شہرت اپنی محنت سے کمائی ہے۔ مگر بعض پاپارازی ٹائپ کے رپورٹر اس سے پوچھتے ہیں کہ کیا اس کی شہرت کچھ سرکس جیسی نہیں ہے۔ جیسے کٹے نما لڑکا یا دو سر والا سانپ؟ ایسے موقع پر ایرک ان سے پرسکون انداز میں کہتا ہے۔ ”لوگ مجھے عجوبہ سمجھ کر نہیں ملتے یا دیکھتے ہیں، وہ مجھ سے محبت کرتے ہیں اور مجھے سراہتے ہیں اس لیے مجھ سے ملنا پسند کرتے ہیں۔ کتے نما لڑکے یا دو سر والے سانپ کی بہرحال کوئی عزت نہیں کرتا ہے۔“

نیشنل جیوگرافک کا رپورٹر رانڈ ایلش ایرک کا مداح ہے، وہ اس کے بارے میں کہتا ہے۔ ”ایرک کو سرکس کی چیز کہنا اس کے ساتھ نہیں انسانوں کے ساتھ زیادتی ہے۔ کتے نما انسان اور دو سر والا سانپ اپنی جسمانی ہیئت

کی وجہ سے مشہور ہوتے ہیں۔ مگر قطع نظر اس کے ایرک نابینا ہے، ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کرنا۔ دس بار کھمبو گلیشیئر کو پار کرنا اور دنیا کے تمام براعظموں کی بلند ترین چوٹیوں کو سر کرنا اور اس کے ساتھ ماہر اسکائی ڈائیور اور اسکوبا ڈائیور ہونا کیا ایسے کارنامے نہیں ہیں جو کسی بھی شخص کو سیلیبریٹی بنا دیں۔ پھر وہ شخص ماسٹرز ڈگری بھی رکھتا ہے اور اسے کئی یونیورسٹیوں نے پی ایچ ڈی کی اعزازی ڈگریاں بھی دے رکھی ہیں۔ ایرک نے یہ کام دوسروں سے کہیں بہتر انداز میں کیے۔ میسنر جسے آل ٹائم گریٹ کلائمبر کہتے ہیں، وہ نانگا پربت کی مہم میں اپنا بھائی کھو چکا ہے۔ اس کے پیروں میں چھ انگلیاں نہیں ہیں۔ اکثر کوہ پیما لوگوں کا سامنا نہیں کر سکتے۔ وہ کم پڑھے لکھے اور ذہانت سے محروم ہوتے ہیں، وہ بس کوہ پیما ہوتے ہیں لیکن ایرک ان سے بڑھ کر اور بھی بہت کچھ ہے۔“

ایرک پر ایک اعتراض اور کیا گیا کیونکہ اسے نظر نہیں آتا ہے اس لیے وہ کوہ پیمائی کے دوران خوفزدہ نہیں ہوتا ہے۔ ایک کوہ پیما ہزاروں فٹ کی بلندی پر جب کسی تکلے سے چھجے پر کھڑا ہو کر نیچے دیکھتا ہے تو قدرتی خوف اس کے اندر بھرتا ہے۔ ایرک نہیں دیکھتا اس لیے خوفزدہ بھی نہیں ہوتا۔ ایرک اس اعتراض کے جواب میں کہتا ہے۔ ”یہ احمقانہ بات ہے، بلندی اور موت کا خوف تو ہوتا ہے چاہے آپ دیکھ رہے ہوں یا نہ دیکھ رہے ہوں۔ لوگ سوچتے ہیں کیونکہ میں دیکھ نہیں سکتا اس لیے ڈرتا بھی نہیں ہوں۔ ایسا نہیں ہے۔ بلندی کا خوف اصل میں موت کا خوف ہے اور یہ ہر انسان کے اندر موجود ہوتا ہے۔“

ان سب باتوں اور ایرک کے اعتماد کو دیکھ کر بھی اس کے ساتھی اگر فکرمند تھے تو یہ اتنا بے جا بھی نہیں تھا۔ کوہ پیمائی اپنی استعداد اور ہمت کے مطابق خطرات سے کھیلنے کا نام ہے اور اگر معاملہ ایورسٹ کا ہو تو خطرے کی جگہ موت آ جاتی ہے۔ 1953ء جب پہلی بار اس چوٹی کو سر کیا گیا تب سے اب تک (جون 2001ء) تک ایک سو ترپن افراد ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کرنے کی کوشش میں مارے جا چکے ہیں اور ان میں سے اکثر کی لاشیں بھی وہیں موجود ہیں جہاں وہ گرے تھے یا ان پر ایولانچ آ کر گرا تھا۔ ایک مہینا پہلے ہی مئی میں چار کوہ پیما ہلاک ہوئے تھے۔ جب ایرک نے چوٹی سر کر لی تو ماؤنٹ ایورسٹ تک جانے والے دو حصوں میں بٹ گئے۔

ٹیم ممبران کے ساتھ ایک درجن شرپا تھے جو آخری کیمپ تک ان کے ساتھ جاتے، اس کے علاوہ ایک ٹیم الگ سے ان کی مہم کی فلم بندی کے لیے بھی آئی ہوئی تھی۔ دوسرے افراد کی طرح اس ٹیم کو بھی یقین تھا کہ ایرک صحیح سلامت چوٹی تک نہیں پہنچ سکے گا۔ ایک فلم کریو ممبر نے کہا۔ ”سب کہہ رہے ہیں ایرک ایک ایپک بننے جا رہا ہے۔ (ایپک ایورسٹ کو سر کرنے کے دوران پیش آنے والے حادثات کو کہتے ہیں۔) ہمارے ایک ساتھی نے تو سوچ لیا تھا کہ وہ اس کے پاس رہے گا تاکہ مارے جانے کی صورت میں وہ سب سے پہلے مردہ کوہ پیما کی تصویر لے سکے۔“

جن دنوں ایرک امریکا، جنوبی امریکا اور افریقا کی نسبتاً کم بلند چوٹیاں سر کر رہا تھا تو پاسکو ایرک سے سالٹ لیک سٹی کے ایک اسپورٹس ویئر شو میں پہلی بار ملا۔ اس سے پہلے اس نے سنا تھا کہ ایک نابینا کوہ پیما چودہ ہزار فٹ بلند چوٹیاں سر کر رہا ہے۔ اس کے لیے یہ حیرت انگیز خبر تھی کیونکہ اس سے پہلے کوئی نابینا اتنی بلندی پر نہیں گیا تھا۔ دوسری جسمانی معذوری کا شکار افراد بھی کوہ پیمائی کر رہے تھے حتیٰ کہ ایک شخص جس کی دونوں ٹانگیں گھٹنوں کے اوپر سے غائب تھیں، اس نے ماؤنٹ ایورسٹ سر کی تھی لیکن وہ نابینا نہیں تھا جب کہ ایرک نابینا تھا۔ پاسکو اس سے پہلے ایورسٹ سر کر چکا تھا اور ان دنوں وہ پیٹرولیم کی تلاش کے لیے بنائے جانے والے ریسرچ پلیٹ فارم کے تعمیراتی شعبے میں کام کر رہا تھا۔ اس وقت اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ کبھی ایرک کے ساتھ ایورسٹ کی مہم پر جائے گا۔ پھر بھی اس نے مذاق میں پوچھ لیا۔

”دوست، تم نے کبھی ایورسٹ کو سر کیا ہے؟“

”نہیں۔“ ایرک نے جواب دیا۔

”کیا کبھی سوچا بھی نہیں؟“

”ہاں سوچا تو ہے۔“

”تم وہاں جانا چاہتے ہو؟“

”کیوں نہیں۔“ پاسکو کو جواب ملا تھا۔

پاسکو کو تجسس ہوا تھا کہ ایرک کس طرح کوہ پیمائی کرتا تھا، اسے پتا چلا کہ وہ بینائی رکھنے والے کوہ پیماؤں سے ذرا مختلف طریقہ اختیار کرتا تھا۔ اس کی پشت سے ایک گھنٹی بندھی ہوتی تھی جو مسلسل بجتی تھی اور اس کے ساتھیوں کو پتا چلتا رہتا تھا کہ وہ کہاں ہے؟ وہ اپنی سہولت کے لحاظ سے

بنائے ہوئے کلائمبنگ پولز کی مدد لیتا تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں سے چند الفاظ کے اشارے طے کرلیتا تھا اور وہ ان کی مدد سے اس کی رہنمائی کرتے تھے۔ جیسے "ڈیتھ فال دو فٹ .....دائیں طرف ....." یا "ہیلی پیڈ جیسا میدان .....بائیں طرف۔" وہ بہت تیز تھا اور رہنمائی کو بہت کم وقت میں سمجھ کر حرکت کرلیتا تھا۔ مگر اس کے ساتھی ہمیشہ فکر مند رہتے تھے اور اس چکر میں وہ اس سے سست ہوجاتے جب کہ وہ پورے اعتماد سے دراڑیں عبور کرجاتا یا ایک چھجے سے دوسرے چھجے پر چھلانگ لگالیتا تھا۔ یہ مشکل ترین کام وہ اتنی صفائی اور مہارت سے کرتا کہ اس کے ساتھی بھی اش اش کرتے رہ جاتے تھے۔

ایورسٹ پر کوہ پیما ہمیشہ جوڑی کی صورت میں چڑھتے ہیں۔ اس لیے پاسکو نے اس بارے میں سوچا کہ وہ ایرک کے ساتھ ٹیم بنا کر ایورسٹ پر جائے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب ایرک نے ایورسٹ سر کرنے کا ذہن بنا لیا تھا۔ پاسکو نے نیشنل فیڈریشن آف بلائنڈز کے صدر مارس میورے کو خط لکھا اور اس نے فوری طور پر اس مہم کے لیے ڈھائی لاکھ ڈالرز دینے کا وعدہ کرلیا، بشرطیکہ ایرک چوٹی کی طرف جانے والے کوہ پیماؤں میں شامل ہو، وہ کم سے کم کیمپ ون تک ضرور جائے۔ دواؤں کی ایک کمپنی ایونٹس فارماسیوٹیکل نے اس مہم کے لیے ایک ڈاکومینٹری بنانے کی ذمے داری لے لی تاکہ اپنی اینٹی الرجک دواؤں کی پبلسٹی کرسکے۔ ایرک خود مختلف طرح کی الرجیز کا شکار رہتا تھا خاص طور سے جب موسم تبدیل ہوتا تو اسے الرجی کے مسئلے کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اسی طرح ایرک کے لیے اسپورٹس ویئر بنانے والے اداروں اور کھیلوں کا سامان بنانے والی کئی کمپنیوں کی ذاتی اسپانسر شپ موجود تھی۔

جو بھی ایرک کو جانتا تھا اس کا کہنا تھا کہ وہ نہایت تجربے کار کوہ پیما ہے اور اگر وہ اس مہم میں ناکام رہا تو اس کی وجہ اس کا دماغ، اس کے پھیپھڑے، دل یا کوئی اور جسمانی عضو ہوگا لیکن وہ اپنی آنکھوں کی وجہ سے ہرگز ناکام نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ حادثات سے خوفزدہ نہیں تھا کیونکہ وہ اس سے پہلے درجنوں اسکائی ڈائیونگ کرچکا تھا اور دنیا کی خطرناک ترین سمجھی جانے والی چٹانوں پر چڑھ چکا تھا۔ اسے واحد خوف یہ تھا کہ اس اعلان کے بعد دنیا والے اسے کس طرح لیتے ہیں اور جلد اسے معلوم ہوگیا کہ ان کا ردعمل حوصلہ افزا نہیں تھا۔ ایرک نے اس بارے میں کہا۔ "میں جانتا تھا کہ اکثر لوگ جو یہ سنتے تھے وہ یقین نہیں کرتے تھے کہ ایک نابینا شخص ماؤنٹ ایورسٹ سر کرسکتا ہے۔ انہیں یقین تھا کہ میں ناکام ہوجاؤں گا۔ اس کے باوجود میں نے فیصلہ کیا کہ میں جاؤں گا۔ ممکن ہے میں جاتا اور ناکام ہوجاتا۔ یہ بڑی بات ہوتی لیکن میرے نزدیک اس سے زیادہ بڑی بات یہ ہوتی کہ میں ناکامی کے خوف سے نہ جاتا۔ میں نیشنل جونیئر ریسلنگ ٹورنامنٹ میں اسی لیے گیا اور مرتے مرتے بچا۔ مجھے اس کا کوئی افسوس نہیں ہوا کیونکہ میں جاننا چاہتا تھا کہ میری حدود کیا ہیں؟"

اب تک ایرک جن بلندیوں پر گیا تھا وہاں بھی آکسیجن کی کمی مسائل پیدا کرتی ہے لیکن یہ اصل مسئلہ پچیس ہزار فٹ کے بعد پیدا کرتی ہے۔ وہاں ہوا میں آکسیجن اتنی کم ہوجاتی ہے کہ جسم اس کا متحمل نہیں ہو پاتا۔ دل کی دھڑکن بڑھ جاتی ہے، دماغ اپنا کام چھوڑ دیتا ہے یا محدود کردیتا ہے۔ سوچیں آپس میں گڈمڈ ہوتی ہیں اور ایسے موقع پر دماغ غلط فیصلے دینے لگتا ہے جب کہ ایک غلط فیصلے کا مطلب یقینی موت ہوسکتی ہے۔ ایک کوہ پیما اس بارے میں کہتا ہے۔ "یہاں دماغ رینگنے والا جانور بن جاتا ہے۔"

اس بلندی پر اگر کوئی ایرک کا خیال رکھ سکتا تھا تو وہ خود ہی تھا۔ اس کے ساتھی اس کی مسلسل بجتی گھنٹی سے یہ جان سکتے تھے کہ وہ ان کے ساتھ ہے اور اوپر کی طرف بڑھ رہا ہے، وہ اس کی محدود رہنمائی بھی کرسکتے تھے لیکن اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کرسکتے تھے کیونکہ اس وقت کرۂ ارض پر انسان کے لیے پائے جانے والے سخت ترین حالات میں وہ اپنی بقا کی جدوجہد میں مصروف ہوتے۔ البتہ چوٹی کی طرف جاتے ہوئے ایرک کو کچھ ایسے فوائد حاصل ہوتے جن سے عام کوہ پیما محروم ہوجاتے تھے۔ وہ آکسیجن کے لیے منہ پر ماسک لگالیتے تھے اور اس کے پار ان کے لیے بعض اوقات اپنے پاؤں دیکھنا بھی مشکل ہوجاتا ہے۔ ایرک پہلے ہی اس کا عادی تھا اسے کچھ دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ پھر عام طور سے چوٹی کی طرف آخری کوشش بہت صبح سویرے کی جاتی ہے، جب روشنی بھی نہیں ہوتی اور کوہ پیماؤں کو ٹارچوں کی روشنی میں سفر کرنا پڑتا ہے۔ وہ دن کے آغاز تک چوٹی پر پہنچنا چاہتے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ دیر وہاں رک کر اپنی فتح سے لطف اندوز ہوسکیں اور پھر دن کی روشنی میں ہی زیادہ سے زیادہ نیچے آجائیں۔ کم سے کم پچیس ہزار فٹ سے نیچے آجائیں تاکہ آکسیجن کے بغیر بھی سانس لے سکیں۔ ان کے پاس آکسیجن کی سپلائی محدود ہوتی ہے اور اگر یہ ختم ہو جائے تو ان کے لیے چوٹی سر کرنے یا صحیح سلامت واپس آنے کے مواقع محدود ہوجاتے ہیں۔ رات کی تاریکی بھی ایرک کے لیے مسئلہ نہیں تھی۔

☆☆☆

بالآخر طے ہوا کہ ایرک چوٹی کی طرف جانے والی ہر ٹیم میں شامل ہوگا جب تک کوئی مسئلہ نہ روک دے۔ کیمپ ٹو چوبیس ہزار فٹ کی بلندی پر تھا۔ جب انہوں نے چڑھنا شروع کیا تو موسم ٹھیک تھا اور ایک ہزار فٹ تک کوئی مسئلہ نہیں ہوا کیونکہ وہ راستوں سے واقف تھے۔ لیکن اس کے بعد وہ ایک بالکل اجنبی دنیا میں داخل ہوگئے۔ یہاں راستے نہیں تھے انہیں تلاش کرنے پڑتے تھے یا پھر متبادل طریقوں سے اوپر جانا ہوتا تھا۔ بائیس ہزار فٹ کی بلندی پر موسم خراب تھا اور پھر وہ جیسے جیسے اوپر چڑھتے گئے موسم خراب ہوتا چلا گیا۔ تیز ہواؤں کے ساتھ برف کے ٹکڑے جب چہرے کے کھلے حصوں سے ٹکراتے تو ایسا لگتا جیسے شاٹ گن کے چھرے آکر لگے ہوں۔ درجۂ حرارت دن میں بھی منفی چالیس درجے سینٹی گریڈ تھا۔ اس کے باوجود حالات بہت خراب نہیں تھے۔ وہ سست رفتاری سے سہی لیکن اوپر جارہے تھے۔ مگر تیسرے کیمپ تک جاتے جاتے حالات نہایت خراب ہوگئے تھے۔ ان کے پاس سامان ختم ہوگیا اور خاص طور سے آکسیجن سلینڈر نہ ہونے کے برابر رہ گئے تھے۔ ایسے میں چوٹی کی طرف جانا خودکشی کے مترادف ہوتا اس لیے پاسکو نے واپسی کا فیصلہ کیا۔ اس وقت وہ چوٹی سے دو ہزار فٹ نیچے تھے۔

واپسی پر سب بے حد مایوس تھے۔ سامان نہ ہونے کی وجہ سے انہیں کیمپ ون سے بھی واپس آنا پڑا تھا اور اب وہ بیس کیمپ میں تھے۔ یہ اس لحاظ سے بہتر تھا کہ مسلسل بلندی کا سامنا کرنے سے تمام افراد کی حالت ابتر ہورہی تھی۔ مورس اچھا خاصا بیمار ہوگیا تھا اور اسے کیمپ ٹو میں چھوڑنا پڑا تھا۔ مگر اس کی حالت ٹھیک نہیں ہوئی اس وجہ سے بھی وہ بیس کیمپ میں واپس آئے تھے۔ پھر آنے والے دو مہینوں میں انہوں نے مزید دو بار کوشش کی اور ہر بار انہیں دوسرے تیسرے کیمپ سے واپس آنا پڑا تھا۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کرنے کے لیے بہترین وقت مارچ سے جون تک کا ہوتا ہے اس کے بعد مون سون کی ہوائیں اس علاقے میں داخل ہونا شروع ہوجاتی ہیں۔ اس کے اثر سے بادل آجاتے اور بے پناہ برف باری شروع ہو جاتی۔ اس کے بعد جولائی کے آخر میں جاکر کچھ وقت کے لیے موسم بہتر ہوتا۔ مگر ان کے پاس اتنا وقت نہیں تھا، انہیں بہرصورت مئی کے آخر تک چوٹی سر کرنا تھی ورنہ مہم ناکام واپسی کی تیاری کرتی۔

بیس مئی کے دن وہ بیس کیمپ سے روانہ ہوئے اور اگلے دن وہ کیمپ ون سے آگے روانہ ہوئے۔ اس بار وہ کم افراد کے ساتھ لیکن مکمل سامان لے کر آئے تھے۔ مگر حالات امید افزا نہیں تھے۔ آنے والے چند دنوں میں خراب موسم کی پیش گوئی تھی اور چوٹی کے آس پاس برفانی طوفان کی آمد آمد تھی جس کے دوران ہوائیں ایک سو میل فی گھنٹے کی رفتار سے چلتیں۔ ہواؤں کی یہ رفتار کسی جدید شہر میں بھی کم خطرناک نہیں ہوتی ہے اور خاصی تباہی مچاتی ہے لیکن ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی کے پاس جہاں کھڑے ہونے کی جگہ بھی مشکل سے ملتی ہے اور انسان لڑکھڑا کر گر جائے تو وہ کھڑا نہیں ہوسکتا ہے کیونکہ وہ کئی ہزار فٹ کی گہرائی میں گر چکا ہوتا ہے۔ سو میل فی گھنٹے کی رفتار سے چلنے والی ہوائیں یقیناً بہت زیادہ خطرناک ثابت ہوسکتی تھیں۔ اس سے قبل 1996ء میں بھی ایسے ہی ایک طوفان نے ماؤنٹ ایورسٹ میں سیزن کو کوہ پیماؤں کے لیے ایک خوفناک خواب میں تبدیل کردیا تھا۔

اگلے دن وہ کیمپ ٹو پہنچ گئے تھے۔ چوبیس ہزار فٹ پر بھی موسم ٹھیک نہیں تھا لیکن اس کی اصل خرابی اس سے کہیں اوپر تھی اور انہیں وہیں جانا تھا۔ اس رات اپنے خیمے میں منفی ساٹھ ڈگری سینٹی گریڈ کی سردی میں سلیپنگ بیگ میں ٹھٹھرتے ہوئے ایرک نے اپنی وائس ڈائری تحریر کی۔ اس کے پاس ایک چھوٹا سا ڈیجیٹل ریکارڈر تھا جو بیس گھنٹے کی طویل ریکارڈنگ کرسکتا تھا اور یہ بہت معمولی سی بیٹری خرچ کرتا تھا۔ اسی لیے ایرک نے عام کیسٹ والے ریکارڈر پر اسے ترجیح دی تھی کیونکہ وہ بیٹریز بہت خرچ کرتے تھے اور اس بلندی پر بیٹری ویسے ہی جلد جواب دے جاتی ہے۔ ایرک اسے ہمہ وقت سینے سے لگا کر رکھتا تھا۔ شیونگ مشین جتنا بڑا یہ ریکارڈر استعمال میں آسان تھا بس ایک بٹن

دبایا اور ریکارڈنگ کرلی۔

"آج کا سفر مشکل نہیں تھا بس مجھے ایک ہزار فٹ طویل برج سے گزرنا پڑا جو کئی مقامات سے ایولانچ کی وجہ سے گر گیا تھا اور خالی جگہ کو چھلانگ لگا کر پار کرنا پڑا تھا۔ مجھے یقین ہے جب میں کسی ایسی جگہ سے چھلانگ لگاتا ہوں گا تو میرے ساتھیوں کے دل دہل جاتے ہوں گے۔ مگر میں پر اعتماد ہوں۔ میں چوٹی تک پہنچوں گا۔ اگر میرے ساتھی پہنچے تو میں ان میں سے ایک ہوں گا اور اگر دو افراد پہنچے تو ان میں سے ایک میں ہی ہوں گا اور اگر کوئی ایک فرد چوٹی تک پہنچا تو وہ میں ہوں گا۔ میرے نہ پہنچنے کی صرف دو وجہ ہوسکتی ہیں۔ ایک میں کسی حادثے یا بیماری کی وجہ سے اس قابل نہیں رہا ہوں یا میں اس دنیا میں نہیں رہا ہوں۔"

پاسکو اپنے خیمے میں لیٹا ہوا ایرک کی ڈائری سن رہا تھا۔ اسے اس شخص کے حوصلے اور اعتماد پر رشک آیا۔ آج کا دن آسان نہیں تھا۔ ایرک درست کہہ رہا تھا جب وہ کسی خلا کو چھلانگ لگا کر پار کرتا تھا تو ان سب کے دل دہل جاتے تھے اور وہ رک کر اس وقت تک اسے دیکھتے تھے جب تک وہ پار نہیں چلا جاتا تھا۔ آج انہوں نے ایسے بیس کے قریب خلا پار کیے تھے۔ جب وہ چھلانگ لگاتے تو بعض اوقات ان کے قدم لڑکھڑاتے تھے اور کئی بار وہ گرتے گرتے بچتے تھے لیکن ایرک ایک بار بھی نہیں لڑکھڑایا تھا اور نہ وہ جھجکا تھا۔ وہ ہر بار خلا کو آرام سے پار کر گیا۔ اس وقت سب سے اچھی جسمانی حالت اسی کی تھی اور وہ پوری توانائی سے اوپر چڑھ رہا تھا جب کہ ٹیم کے باقی ارکان پر تھکن اور آکسیجن کی کمی اثر انداز ہونے لگی تھی۔ ابھی وہ پچیس ہزار فٹ کی بلندی سے نیچے تھے لیکن آکسیجن کی کمی محسوس ہونے لگی تھی۔ البتہ اس بار وہ فیصلہ کر کے آئے تھے کہ جہاں تک ممکن ہوسکا وہ آکسیجن کے استعمال سے گریز کریں گے تاکہ آخری چڑھائی کے لیے آکسیجن موجود ہو۔ اکثر کوہ پیما چوٹی کے پاس پہنچ کر صرف اس لیے بھی ناکام واپس گئے تھے کہ ان کے پاس آکسیجن ختم ہوگئی تھی اور وہ اتنی بلندی پر از خود سانس نہیں لے سکتے تھے۔ اگر وہ رکتے تو مارے جاتے اس لیے واپسی ان کی مجبوری بن جاتی تھی۔

اگلے دن وہ دوبارہ روانہ ہوئے اور اس بار ان کی منزل کیمپ تھری تھا جو چھبیس ہزار فٹ کی بلندی پر تھا۔ اس کے بعد آخری کیمپ ستائیس ہزار پانچ سو فٹ کی بلندی پر تھا اور پھر چوٹی تک کا سفر تھا۔ اصل مشکل مراحل کیمپ ٹو کے بعد ہی تھے۔ ابھی وہ چند سو فٹ اوپر گئے ہوں گے کہ آسمان سرمئی ہونے لگا اور ہوائیں بدروحوں کی طرح چنگھاڑنے لگیں۔ مقامی باشندوں میں ماؤنٹ ایورسٹ کوئی مقدس چیز نہیں ہے بلکہ وہ اسے بدروحوں کا مسکن قرار دیتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ یہاں آنے والے کوہ پیماؤں کو گائیڈ اور پورٹر نہیں ملتے تھے۔ مجبوراً انہیں تبتی نژاد شرپا قبیلے پر بھروسا کرنا پڑا۔ یہ لوگ پہاڑوں پر چڑھنے اور راستے تلاش کرنے کے ماہر ہوتے ہیں۔ اس وقت ایسا لگ رہا تھا یہ بدروحیں ان کی مہم ناکام بنانے کے لیے میدان عمل میں آگئی تھیں۔ ساؤتھ پلر پر ہوائیں دائیں سے بائیں چل رہی تھی اور یہ چیز ان کی پیش قدمی کو مزید مشکل بنا رہی تھی کیونکہ انہیں دائیں طرف ہی بڑھنا تھا۔

ایرک آج کسی قدر محتاط تھا۔ اسے معلوم تھا کہ آگے خطرات مزید بڑھ گئے ہیں مگر وہ خوش تھا۔ اگرچہ وہ پہلے ہی اپنی کوہ پیمائی کے بلند ترین مقام پر آچکا تھا۔ لیکن آج وہ پہلی بار پچیس ہزار فٹ سے زیادہ بلندی کی طرف جا رہا تھا۔ یہ اس کے لیے ایک جادوئی ہندسہ تھا اور اسے یقین تھا کہ ایک بار اس نے پچیس ہزار فٹ کی بلندی عبور کرلی تو وہ چوٹی تک بھی پہنچ جائے گا۔ اس کی کلائی پر ڈیجیٹل آلٹی میٹر بندھا ہوا تھا جو ایک بٹن دبانے پر آواز سے بھی بلندی بتاتا تھا۔ جب ایرک کسی بلند جگہ چڑھتا یا ذرا اوپر آتا تو بٹن دبا کر بلندی جانتا۔ دوپہر تک وہ پچیس ہزار فٹ کی بلندی پر آگئے تھے۔ طوفان میں شدت نہیں آئی تھی مگر وہ برقرار تھا۔ البتہ جیسے جیسے وہ کیمپ تھری کی طرف بڑھ رہے تھے راستہ آسان ہو رہا تھا۔ پاسکو ایرک سے کچھ دور تھا ایک دیوار سے چٹ کر سستانے کے دوران پاسکو نے کہا۔ "کیمپ فور کے بعد ہمیں بالکونی تک پہنچنے کے لیے ہزار فٹ کے ایک پل پر سفر کرنا ہے۔"

"میں تیار ہوں۔" ایرک نے کہا پھر جلدی سے تصحیح کی۔ "ہم تیار ہیں۔"

آخری چڑھائی میں جب وہ دو دو کے گروپ میں بٹ جاتے تو کرس موریس ایرک کا پارٹنر ہوتا۔ وہ شام سے پہلے کیمپ تھری تک پہنچ گئے تھے۔ سردی ناقابل بیان تھی اور اب دن کا وقت تھا، رات نہ جانے ان کے لیے کیا قیامت لے کر آتی۔ انہوں نے بہ مشکل ڈنر کیا تھا کیونکہ جیسے ہی وہ اسے برنر سے گرم کر کے ذرا دور کرتے یہ فوراً ٹھنڈا پڑ جاتا تھا۔ اس دن چڑھائی سے زیادہ موسم نے انہیں تھکا دیا تھا۔ سرد ہوائیں سارا دن انہیں پیچھے دھکیلتی رہی تھیں۔ آکسیجن کی کمی بھی اثر انداز ہو رہی تھی اور انہیں راستے میں آکسیجن سلینڈر استعمال کرنے پڑے تھے۔ اگرچہ وہ صرف انتہائی ناگزیر حالت میں استعمال کر رہے تھے۔ ان کے پاس فی کس دس آکسیجن سلینڈر رہتے اور کیمپ فور کے بعد یہ رسد فی کس صرف چھ سلینڈر رہ جاتی اور اسی آکسیجن کے سہارے انہیں باقی راستہ طے کرنا تھا۔ ان میں ایرک واحد آدمی تھا جس نے اب تک اپنا کوئی سلینڈر استعمال نہیں کیا تھا اسے ضرورت نہیں پڑی تھی۔ اس کے پھیپھڑے غیر معمولی حد تک مضبوط ثابت ہوئے تھے۔ وہ بلندی اور آکسیجن کی کمی سہار گئے تھے۔

ہواؤں کی شدت ان کے خیموں کو جھنجوڑ رہی تھی اور بعض اوقات تو ایسا لگتا کہ وہ انہیں خیمے سمیت گھسیٹ کر پہاڑ سے نیچے پھینک دے گی۔ اگر انہوں نے فولادی کیلوں کی مدد سے خیموں کو مضبوطی کے ساتھ برف میں گاڑا نہ ہوتا تو شاید ایسا ہی ہوتا۔ شور بے پناہ تھا اور وہ شور اور سردی کو نظر انداز کر کے سونے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایسے میں صرف ایرک تھا جو چند گھنٹے کی نیند لے سکا تھا ورنہ باقی سب جاگتے رہے تھے۔ خدا خدا کر کے صبح نمودار ہوئی تو ان کی جان میں جان آئی تھی۔ وہ رینگتے ہوئے اپنے خیموں سے باہر آئے اور کیمپ فور تک جانے کی تیاری کرنے لگے۔ یہ دیکھ کر انہیں خوشی ہوئی تھی کہ آسمان صاف ہوگیا تھا اور ہوا کی تیزی میں بھی کمی آئی تھی۔ وہ جنوبی حصے کی طرف بڑھنے لگے۔ یہاں سے ہر کوہ پیما ایک انفرادی مہم میں بٹ گیا۔ اس کی ساری توجہ اس بات پر مرکوز ہوگئی کہ کس طرح کیمپ فور تک پہنچا جائے۔ وہ ایک ایسی پٹی پر سفر کر رہے تھے جس کے دونوں طرف ڈھلان تھی اور یہ تقریباً عمودی چڑھائی لیے ہوئے تھی۔ بعض مقامات پر انہیں برفانی سرنگوں سے گزرنا پڑتا تھا۔ یہ سرنگیں گزشتہ ایولانچ کے بعد وجود میں آئی تھیں۔ یہ سفر کا سب سے آسان مرحلہ تھا اور اس میں بس یہی خطرہ تھا کہ اوپر سے کوئی ایولانچ ہوا تو ان کے بچنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

جیسے جیسے بلندی بڑھ رہی تھی۔ آکسیجن کم ہوتی جا رہی تھی۔ انہیں بار بار اپنے سلینڈر استعمال کرنا پڑ رہے تھے۔

جالوت

فلسطینیوں کا ایک گراں ڈیل پہلوان، جس نے بنی اسرائیل کی فوج کو دعوتِ مبارزت دی اور جسے حضرت داؤدؑ نے قتل کیا تھا۔ یہ تقریباً ایک ہزار قبل مسیح کا واقعہ ہے۔ اس زمانے میں بنی اسرائیل پر عمالقہ کا غلبہ ہوگیا تھا اور انہوں نے اسرائیلیوں سے فلسطین کے اکثر علاقے چھین لیے تھے۔ بنی اسرائیل پر اس وقت سموئیل نبی حکومت کرتے تھے جو بہت بوڑھے ہوچکے تھے۔ سردارانِ بنی اسرائیل نے یہ ضرورت محسوس کی کہ کوئی اور شخص ان کا بادشاہ ہونا چاہیے جس کی قیادت میں وہ جنگ کرسکیں۔ چنانچہ سموئیل نبی نے حکمِ ربّی کے مطابق طالوت کو ان کا بادشاہ مقرر کردیا۔ جب طالوت بنی اسرائیل کا لشکر لے کر دریا پار کر کے آگے بڑھا تو انہوں نے طالوت سے کہا کہ ہم جالوت کا مقابلہ کرنے کی حالت میں نہیں ہیں۔

قرآن مجید میں جالوت کا ذکر اس طرح سے آیا ہے: پھر جب طالوت اور اس کے ساتھی مسلمان دریا پار کر کے آگے بڑھے تو انہوں نے طالوت سے کہہ دیا کہ آج ہم میں جالوت اور اس کے لشکروں کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے لیکن جو لوگ یہ سمجھتے تھے کہ انہیں ایک دن اللہ سے ملنا ہے۔ انہوں نے کہا۔ "بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک قلیل گروہ اللہ کے اِذن سے ایک بڑے گروہ پر غالب آگیا ..... اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔" اور جب وہ جالوت اور اس کے لشکروں کے مقابلے پر نکلے تو انہوں نے دعا کی "اے ہمارے رب ہم پر صبر کا فیضان کر ہمارے قدم جما دے اور اس کافر گروہ پر ہمیں فتح نصیب کر۔ آخر کار اللہ کے اِذن سے انہوں نے کافروں کو مار بھگایا اور داؤدؑ نے جالوت کو قتل کردیا۔" (2:248 تا 251)

جالوت سے جنگ کا مقام "غور" بتایا جاتا ہے۔ جو اردن کی زیریں وادی میں ہے۔ بعض نے جالوت کو امیر العمالقہ اور بقیۃ الجبارین کے القاب دیے ہیں۔ جالوت کے بارے میں مختلف قصے اور کہانیاں گھڑی گئی ہیں۔ اور مختلف قصوں میں اسے ملوث کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت داؤدؑ سے پہلے جن لوگوں نے بنی اسرائیل پر مظالم کیے تھے ان سب کو جالوت کا نام دے دیا گیا۔

مرسلہ: زاہد سلمان، کوئٹہ

تب جاکر ان کی سانس قابو میں رہتی کہ وہ سفر جاری رکھ سکیں۔ آج پہلی بار ایرک نے آکسیجن استعمال کی لیکن اس نے اپنے ساتھیوں کی نسبت بہت کم آکسیجن استعمال کی تھی ایرک نے اس بارے میں اپنی آٹو بائیو گرافی میں لکھا۔ ”میرا خیال تھا اور میری خواہش تھی کہ میں میسنر کی طرح بغیر آکسیجن کی مدد کے ایورسٹ سر کروں۔ وہ کوہ پیمائی میں میرا آئیڈیل ہے مگر افسوس کہ مجھے کیمپ فور کی طرف جاتے ہوئے آکسیجن لینا پڑی تھی۔“

خوش قسمتی سے موسم صاف رہا اور ہواؤں نے بھی زیادہ تنگ نہیں کیا تھا اور وہ کسی قدر آسانی کے ساتھ کیمپ فور تک جا پہنچے۔ اب وہ چوٹی سے صرف پندرہ سوفٹ نیچے تھے لیکن یہ پندرہ سو فٹ دنیا کے دشوار ترین پندرہ سو فٹ تھے۔ خاص طور سے پونے سات سوفٹ کا ایک ایسا راستہ تھا جسے چاقو کی دھار قرار دیا جاتا تھا۔ اس کے ایک طرف تبت والی سائیڈ پر کوئی دس ہزار فٹ کی گہرائی تھی اور نیپال والی طرف سات ہزار فٹ کی ایسی گہرائی تھی کہ اس درمیان میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ خطرناکی اور ہیبت میں یہ نانگا پربت کے چٹانی چہرے کا مقابلہ کرسکتا تھا جو چار ہزار میٹرز یعنی کوئی تیرہ ہزار فٹ تک سیدھی چٹان ہے۔ مگر ابھی یہ مرحلہ دور تھا۔ ستائیس ہزار پانچ سو فٹ کی بلندی پر سردی بہت زیادہ تو نہیں تھی یعنی درجۂ حرارت وہی منفی ساٹھ درجے تھا لیکن یہاں ہر چیز بہت سخت اور منجمد تھی۔ ان کا سامان بھی جیسے برف کا بنا ہوا ہورہا تھا۔ ایرک نے جو کافی پی وہ مگے میں ڈالے جانے سے لے کر ہونٹوں تک آتے آتے صرف پانچ سیکنڈ میں ٹھنڈی ہوگئی تھی۔ اس سے باقی چیزوں کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

چوبیس مئی کی صبح ان کے پاس صرف سات دن تھے جب وہ چوٹی سر کرسکتے تھے۔ اس کے بعد سیزن ختم ہوجاتا اور انہیں بہر صورت واپس بیس کیمپ کی طرف جانا پڑتا، دوسری صورت میں خراب موسم ان کی واپسی کا راستہ بھی بند کرسکتا تھا۔ ٹیم کا خیال تھا کہ اب ان کے پاس چوٹی سر کرنے کا یہ آخری موقع ہے اگر وہ اب بھی چوٹی نہ سر کرسکے تو انہیں ناکام واپس جانا ہوگا۔ وہ گروپ کی صورت میں تھے اور ایرک کے ساتھ کرس تھا۔ کرس مضبوط جسم کا ہنسنے ہنسانے والا آدمی تھا، اس کی شیو بڑھ کر داڑھی کی صورت اختیار کرگئی تھی اور یہ اتنی گھنی تھی کہ اس کی سانس کی بھاپ اس میں برف کی صورت میں جمع ہوتی رہتی تھی جسے وہ ہر رات سونے سے پہلے جھاڑ کر الگ کرتا تھا۔ وہ دونوں کوشش کرکے بالکونی تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب رہے تھے اور یہاں چوٹی کا جنوبی رخ زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ مگر ایسے موقع پر جب وہ چوٹی سر کرنے کے لیے پر امید ہوگئے تھے اچانک قسمت آڑے آگئی اور آسمان پھر سے سرمئی ہونے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے برف باری شروع ہوگئی اور یخ بستہ ہوائیں چلنے لگیں۔ ”ہمارا خیال تھا کہ ہم کامیابی کے بالکل پاس ہیں۔“ ایرک نے لکھا۔ ”لیکن ان حالات میں چوٹی کی طرف جانا خودکشی کے مترادف تھا۔“

مگر کچھ ٹیم ممبران حالات میں بھی کوشش کرنا چاہتے تھے۔ جیف ایونز اور بریڈ بل کی ٹیم حوصلے سے جمی ہوئی برف میں رسیاں اور کیلوں کی مدد سے گائیڈ لائن بنا رہے تھے کہ بیس کیمپ سے ریڈیو پر خراب موسم کی اطلاع آئی۔ ایک طوفان ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ فوری واپس آئے اور تمام ٹیم برف میں غار کھود کر اس میں بیٹھ گئی۔ اس جگہ سردی اور طوفان سے بچاؤ کا ایک یہی طریقہ تھا۔ دوسری صورت واپسی کی تھی اور کوئی اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ اس امید میں وہاں رکے ہوئے تھے کہ شاید موسم بہتر ہوجائے اور وہ چوٹی سر کرسکیں۔ ابھی وہ غار بنا کر روپوش ہوئے ہی تھے کہ طوفان سر پر آگیا۔ ہواؤں میں شدت تھی اور ساتھ ہی برف باری بھی ہورہی تھی مگر یہ اتنی زیادہ نہیں تھی کہ جما دیتی۔ برف کے ذرات جمنے سے پہلے ہواؤں کے زور پر اڑ کر چلے جاتے تھے۔

چند گھنٹے بعد موسم کسی قدر بہتر ہوا لیکن صرف اتنا کہ برف باری رک گئی تھی مگر ہوا اسی طرح چل رہی تھی۔ نے سب سے مشورہ کیا اور پھر اتفاق رائے سے طے ہوا کہ انہیں کم سے کم ہیلاری اسٹیپس تک جانا چاہیے۔ وہ گرم ترین ملبوسات میں جکڑے ہوئے تھے۔ پشت پر آکسیجن ٹینکس اور چہرے پر ماسک لگائے ہوئے آگے روانہ ہوئے تو اپنے حلیے اور انداز سے ایسے خلاباز لگ رہے تھے جو کی برفانی سطح پر بھٹک رہے ہوں۔ ہوا سے برف کے ذرات اڑ رہے تھے اور چند گز آگے کا منظر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ویسے بھی ان کے چہروں پر ماسک تھے۔ عینک کے شیشوں پر بار بار نمی جم رہی تھی جسے مسلسل صاف کرنا پڑ رہا تھا ورنہ انہیں آگے کچھ نظر نہیں آتا۔ بالآخر وہ اٹھائیس ہز

سات سو پچاس فٹ کی بلندی تک پہنچ گئے۔

یہاں سے چوٹی صرف تین سو فٹ کی بلندی اور کوئی سات سو فٹ کے فاصلے پر تھی اور یہ وہ جگہ تھی جہاں سے سب سے زیادہ کوہ پیما چوٹی سر کیے بغیر واپس جاتے ہیں۔ یہ ہلاری اسٹیپس تھے۔ چاقو کی دھار جیسا تیز اور خطرناک راستہ جس پر کوہ پیما صرف بچوں کے انداز میں چاروں ہاتھوں پاؤں سے چل سکتے تھے۔ اس طرح کہ ان کا دایاں پاؤں تبت اور بایاں نیپال والی سائیڈ پر ہوتا تھا۔ مگر یہ سیدھا راستہ نہیں تھا بلکہ اس میں اکثر سیڑھی نما کٹاؤ آتے تھے اور انہیں عبور کرنا ہی اصل کام تھا۔ یہاں ذرا سا توازن بگڑا اور پھر ہزاروں فٹ تک راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ ایرک نے راستے کے بارے میں لکھا۔ ”اس جگہ انسان کا واحد انحصار اس کی کلہاڑی پر ہوتا ہے جسے وہ بار بار چٹان میں پیوست کرتا ہے اور پھر اس یقین کے ساتھ آگے بڑھتا ہے کہ کلہاڑی نہیں نکلے گی۔ مگر جب وہ آگے بڑھتا ہے تو چٹان کے ٹوٹ جانے والے ٹکڑے نیچے گرتے ہوئے آواز نکالتے ہیں اور خبردار کرتے ہیں کہ ہمارے پیچھے آنے کی کوشش مت کرنا۔“

اس مہم میں قسمت اس وقت ان کی مدد کو آئی جب انہیں اس کی اشد ترین ضرورت تھی۔ جب وہ ہلاری اسٹیپس تک پہنچے تو موسم اچانک ہی صاف اور خوشگوار ہوگیا۔ ہوا رک گئی تھی اور دھوپ نکل آئی تھی۔ کچھ دیر پہلے کے موسم کو دیکھتے ہوئے انہیں یہ دھوپ اور رکی ہوا خواب جیسی لگ رہی تھی۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو ان میں سے کوئی اس خوفناک راستے پر قدم نہ رکھتا۔ ہلاری اسٹیپس عبور کرتے ہوئے آخری مرحلہ ایک انتالیس فٹ چٹان کی صورت میں تھا۔ اس پر چڑھنے کے بعد وہ ایورسٹ کی چوٹی پر پہنچ جاتے۔ مگر ابھی ہلاری اسٹیپس سر کرنا باقی تھا۔ وہ اب تک جو مشکلات دیکھتے اور بھگتتے آئے تھے اس کے بعد صاف موسم میں ہلاری اسٹیپس سر کرنا ان کے لیے بچوں کا کھیل ثابت ہوا تھا وہ گویا چہل قدمی کرتے چٹان تک آئے اور اوپر جانے کی تیاری کرنے لگے۔ ایرک نے اس موقع کے بارے میں لکھا۔ ”ممکن ہے عام طور سے ہلاری اسٹیپس سچ مچ خطرناک ہوں اور شاید موسم انہیں مزید خوفناک بنا دیتا ہے لیکن اس روز میں نے انہیں اپنے مکان کی سیڑیوں جتنا آسان پایا۔ ساتھ ہی مجھے بچپن کا لطف آیا جب میں ایسے ہی

ہیلن کیلر

دنیا کا بچہ بچہ جانتا ہے وہ جس معذوری کا شکار تھی اسے شکست دینے کا خواب ہی دیکھا جاسکتا ہے۔ جب وہ اٹھارہ ماہ کی تھی تو بیماری کی وجہ سے اس کی بینائی اور سماعت دونوں جواب دے گئی۔ تب وہ ہیلن ٹسکمبیا، الاباما میں رہتی تھی۔ وہیں 1880ء میں وہ پیدا ہوئی۔ والدین نے مایوس کن صورتِ حال کے باوجود زندگی سے لڑنے کے لیے اسے اعتماد دینے کا فیصلہ کیا اور درس گاہ میں داخل کرادیا۔ ہیلن کی کارکردگی خاصی مدھم تھی۔ مگر سات سال کی عمر میں اس کی زندگی نے صحیح سمت اختیار کی جب اسے اینی سولیوان (Annie Sullivan) جیسی کامل استانی ملی۔ جس نے منفرد اور صبر آزما طریقہ کار کے ذریعے ہیلن کو بولنا، پڑھنا، لکھنا اور موسیقی کی تربیت دینی شروع کی۔ ہیلن نے سولیوان سے مکمل تعاون کیا اور دل لگا کر سیکھنے لگی۔ اس تیز تر کارکردگی نے خاندان اور دوستوں کو تحیر زدہ کردیا۔ وہ اسی طرح سرپرائز دیتی ہوئی ریڈ کلف کالج سے گریجویشن کرگئی۔ پھر شادی ہوئی اور اس نے لکھنا شروع کردیا۔ متعدد میگزینز اور جرنلز میں اس کے مضامین شائع ہوئے۔

اس کی کتاب ”دی اسٹوری آف مائی لائف“ نے دنیا بھر میں دھوم مچادی اور پچاس زبانوں میں شائع ہوئی۔

ہیلن نے زندگی میں کئی سفر کیے، بارہ ممالک کے صدور سے ملاقات کی۔ ان گنت ایوارڈ وصول کیے۔ ڈاکٹریٹ کی متعدد اعزازی ڈگریاں حاصل کیں۔ وومین ہال آف فیم میں جگہ پائی۔ 1962ء میں ہیلن اور اینی پر آسکر وننگ فلم بنی جس کا نام تھا۔ The Miracle Worker

مرسلہ: امتیاز احمد، نوابشاہ

چاروں ہاتھوں پیروں سے چلتا ہوں گا۔"

ایرک نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اگر وہ چوٹی تک پہنچ گیا تو وہاں چہل قدمی کرے گا کیونکہ اس کی سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ وہ ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی پر چلے بے شک دو قدم ہی چلے۔ اس کے ساتھی اسے مذاق سمجھے تھے اس لیے جب وہ چوٹی پر پہنچے تو باقی سب آس پاس دیکھنے میں لگ گئے تھے اور ایرک ٹٹول ٹٹول کر وہ راستہ تلاش کر رہا تھا جس پر وہ چہل قدمی کر سکے۔ وہ سب خوشی سے بے قابو ہو رہے تھے۔ ایونز نے چلا کر اس سے کہا۔ "ہے ....ایرک ذرا دیکھو تو کیا شاندار نظارا ہے۔"

وہ بالکل بھول گیا کہ ایرک دیکھ نہیں سکتا ..... اس نے دوبارہ اصرار کیا۔ "صرف ایک لمحے کے لیے رک کر دیکھ لو۔"

مگر ایرک نے اتنی دیر میں اپنا راستہ طے کر لیا تھا اور اس نے دنیا کی چھت پر چہل قدمی شروع کر دی۔ اس دوران میں ٹیم کے باقی ارکان باری باری اوپر آ رہے تھے اور ظاہر ہے اسی لحاظ سے وہاں جگہ کم ہوتی جا رہی تھی۔ یہ ایک ریکارڈ ساز کامیاب ترین مہم تھی۔ صرف اس لیے نہیں کہ اس میں ایک نابینا شخص پہلی بار چوٹی تک پہنچنے میں کامیاب رہا تھا بلکہ اس لیے بھی کہ پہلی بار چوٹی پر انیس افراد پہنچے تھے۔ ان میں ایورسٹ سر کرنے والا عمر رسیدہ ترین شخص شرمین بل بھی شامل تھا۔ وہ چونسٹھ برس کا تھا جب اس نے چوٹی پر قدم رکھا۔ اس کا بیٹا بریڈ بل اوپر آیا تو پہلی بار ایسا ہوا کہ دو باپ بیٹے نے بیک وقت ایورسٹ کو سر کیا ہو۔ پہلی بار بیک وقت چھ شرپا اور پہلی ہی بار فلم کریو کے پانچ ارکان ایورسٹ پر پہنچنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ ان تمام ریکارڈز سے قطع نظر صرف ایرک کی موجودگی بھی اس مہم کو تاریخ میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کرنے کے لیے کافی تھی۔

اس کامیابی سے بعض سوالات اٹھے کہ کیا ایرک نے یہ سب صرف اس لیے کیا کہ وہ اپنی معذوری کو اس کامیابی تلے چھپانا چاہتا تھا۔ اکثر لوگ جو پیدائشی نابینا نہیں ہوتے ہیں اور پھر کسی وجہ سے نابینا ہو جاتے ہیں ان کا ردعمل خوف اور بدحواسی کا ہوتا ہے کیونکہ ان کی معمول کی زندگی اچانک ان سے چھن جاتی ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ایرک میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ نہ تو خوف زدہ ہوا اور نہ بدحواس ہوا اس نے بہت تیزی سے سیکھ لیا کہ دیکھے بغیر وہ کس طرح زندگی گزار سکتا ہے اور پھر وہ پوری استقامت سے طریقوں پر عمل کرنے لگا۔ اس کی مہم جوئی اور کوہ پیمائی [illegible] چیز نہیں ہے وہ اس سے خود کو دریافت کر رہا ہے اور اپنی مطمئن نہ ہونے والی جبلت کی تسکین کی کوشش [illegible] ہے۔ این بی ایف کا صدر میورے ایرک کے لیے کہتا [illegible] "ایرک آج کے دور میں نابینا افراد کے ایک مثال ہے [illegible] کیا کر سکتے ہیں۔ پرانی مثال ہیلن کیلر کی تھی لیکن ہیلن [illegible] نے جو کیا وہ کوئی بھی نابینا کرنے کا سوچ سکتا ہے اور [illegible] سارے نابینا افراد اس سے کہیں زیادہ پڑھ لکھ گئے اور [illegible] شعبوں میں بہت کامیاب رہے۔ ہیلن کیلر سو سال زندہ [illegible] مگر اب اس کی مثال پرانی ہو گئی ہے۔"

ایک ہفتے بعد وہ کھٹمنڈو کے ائرپورٹ پر بیٹھے [illegible] اور اپنی فلائیٹ کا انتظار کر رہے تھے جو انہیں ان [illegible] گھروں کو لے جاتی۔ ٹیم کے ارکان کا سامان چاروں طرف بکھرا ہوا تھا اور وہ اپنی کامیابی کا آخری جشن [illegible] رہے تھے کیونکہ اس کے بعد شاید ہی انہیں کبھی ایک سا[illegible] جمع ہونے کا موقع ملتا۔ وہ بہت خوش تھے کہ ایک بھی جا[illegible] گنوائے بغیر ایورسٹ سے کامیاب واپس جا رہے [illegible] جب کہ اسی سال اب تک چار کوہ پیما ایورسٹ پر ہلاک [illegible] چکے تھے اور اس سال چوٹی سر کرنے والوں کی کل تعدا[illegible] ساٹھ فیصد اس وقت ائرپورٹ لاؤنج میں بیٹھا مشروب [illegible] سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ایرک مضطرب تھا۔ ایورسٹ [illegible] کامیابی اپنی جگہ، مگر وہ گھر جانے کے لیے بے تاب تھا [illegible] کامیابی اس کے ماضی کا حصہ بن چکی تھی لیکن گھر میں اس [illegible] مستقبل؛ اس کی بیوی اور بچی کی صورت میں اس کا [illegible] تھا۔ چند مہینے پہلے ایورسٹ کی مہم کے لیے روانہ ہو[illegible] سے پہلے کولوراڈو میں اپنی رہائش گاہ کے پاس وہ [illegible] ایک سال کی بیٹی ایما کے ساتھ نکلا ہوا تھا۔ وہ دونوں [illegible] کے لیے کچھ کیلے لینے کے لیے نکلے تھے۔ ایما باپ [illegible] ساتھ باہر جانے پر بہت خوش تھی اس کی نرم و نازک انگلیاں باپ کے بالوں کو جکڑ رہی تھیں اور اس کی خو[illegible] سے بھرپور چہکاریں اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں یہ اس کی اصل زندگی اور اصل کامیابی تھی؛ وہ جلد از جلد [illegible] زندگی میں لوٹ جانا چاہتا تھا۔

شکیل صدیقی

وہ نابینا تھا اس لیے نابیناؤں کے درد سے واقف تھا۔ وہ خواب دیکھا کرتا کہ بینائی سے محروم افراد بھی تعلیم کی دولت سے مالا مال ہوں۔ اپنے اس خواب کو تعبیر دینے کے لیے وہ رات دن تانے بُنتا۔ بالآخر اس کی محنت رنگ لائی اور اس نے ایک ایسا طریقہ کار ایجاد کرلیا جس نے بے بصارتی کی دنیا کو منور کردیا۔ آنکھوں سے محروم افراد بھی پڑھنے لکھنے پر قادر ہوگئے۔

نابیناؤں میں مقبول تحریر شناسی کے طریقہ کار کو ایجاد کرنے والے کے حالاتِ زیست

فرانس اب تمدن یافتہ یورپی ملک ہے جہاں ایفل ٹاور اور شانزے لیزے اسٹریٹ کو دیکھنے کے لیے ہزار ہا افراد ہر سال جاتے ہیں اور فنکاروں کی سرزمین پر کسی آرٹسٹ کے سامنے بیٹھ کر تصویر بھی بنواتے ہیں۔ سائنسی اور تہذیبی اعتبار سے بھی یہ ملک بہت آگے ہے۔ اس کے بنائے ہوئے طیاروں نے دنیا میں دھوم مچا رکھی ہے، جن کی مانگ کو پورا کرنا فرانس کے لیے ممکن نہیں ہے۔ اس کے علاوہ مسحور کن پرفیوم بنانے میں بھی فرانس کا کوئی مقابل نہیں ہے۔ اسی ملک

کے ایک قصبے کوورے میں لوئی بریل 4 جنوری 1809ء میں پیدا ہوا۔ وہ پیدائشی نابینا نہیں تھا اور عام لڑکوں کی طرح نیلا آسمان، سرسبز چراگاہوں، نیلے پیلے پھولوں اور رنگین تتلیوں کو دیکھنے پر قادر تھا۔ اس کے تین بھائی بہن اور بھی تھے جن کے ساتھ وہ کھیلا کرتا تھا۔ جب کھیلتے ہوئے وہ تھک جاتا تھا تو اپنی ماں مونیکیو کی گود میں جا کر بیٹھ جاتا۔ اسے اپنے باپ سائمن سے بھی محبت تھی جو گھڑ سواری کے لیے چمڑے کا سامان بنایا کرتا تھا۔ اس کا ایک چھوٹا سا کارخانہ تھا جہاں ہر طرف چمڑا اور اوزار بکھرے رہتے تھے۔ اپنے بھائیوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے جب وہ تھک جاتا تو اپنے باپ کے کارخانے میں چلا جاتا۔ وہ بے حد چلبلا تھا اور وہ کچھ نہ کچھ کرنے کے لیے بے قرار رہتا تھا۔ اس کا باپ ایک لمبے سوئے سے جس کے ایک سرے پر لکڑی کی گول سی مٹھیا لگی ہوتی ہے، چمڑے میں سوراخ کیا کرتا تھا اور گھوڑوں کے لیے زین اور لگام بنایا کرتا تھا۔ بریل کا دل چاہتا تھا کہ وہ اپنے باپ کا ہاتھ بٹائے اور خود بھی ڈھیر سارا کام کر ڈالے لیکن جب بھی وہ اوزاروں کو ہاتھ لگاتا تو باپ کی طرف سے تنبیہی آواز آتی۔ ”نہیں اسے رکھ دو، ورنہ چوٹ لگ جائے گی۔“

”ڈیڈی میں آپ کی طرح سے....“ ننھا بریل کہنے کی کوشش کرتا۔

”جب بڑے ہو جانا، تب میری طرح سے کام کرنا۔“ اس کا باپ اس کا سر سہلا کر کہا کرتا۔ ”ابھی تم صرف یہ دیکھو کہ میں کیسے کام کرتا ہوں۔“

”مگر مجھے یہ تو بتا دیں کہ چمڑے میں سوراخ کیسے کیا جاتا ہے؟“ وہ کہتا۔

”ابھی نہیں۔ تمہارے ہاتھ چھوٹے چھوٹے ہیں۔ تم صحیح طریقے سے اوزار نہیں پکڑ سکتے۔ اس کے لیے ہاتھوں میں مضبوطی ہونا چاہیے۔“ اس کا باپ سمجھاتا۔

چھوٹے اور بڑے کا فرق بریل کی سمجھ میں خاک نہ آتا، وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ بڑوں کے ہاتھوں میں طاقت کیسے آجاتی ہے۔ سب سے بڑا اضطراب یہ تھا کہ وہ بڑا کب ہوگا۔ وہ کوئی انوکھا کام کر کے اپنے والدین کو حیران کر دینا چاہتا تھا۔

ایک ہفتے بعد اسے موقع مل گیا۔ اس کا باپ دکان کھلی چھوڑ کر پڑوس میں رابرٹ نامی شخص کی طرف چلا گیا جس پر اس کی رقم باقی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ پندرہ منٹ میں واپس آجائے گا، اس لیے کارخانہ بند کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اس نے بریل کو ہدایت کی کہ وہ چین سے بیٹھے اور ہاتھ پاؤں نہ ہلائے، وہ تھوڑی سی دیر میں آجائے گا۔

جب اس کا باپ چلا گیا تو بریل کے دماغ میں پھر کھلبلی مچنے لگی۔ اس نے سوا اٹھایا اور چمڑے کا ایک ٹکڑا لے کر اس میں سوراخ کرنا شروع کر دیا۔ ابتدا میں تو سُوا ملائم چمڑے میں داخل ہو گیا، لیکن پھر اٹک گیا۔ بریل نے زور آزمائی کی تو سُوا اس کے ہاتھ سے پھسل گیا اور اچھل کر آنکھ پر لگ گیا۔

بریل روتے چیخنے لگا۔ اس کی ماں کارخانے سے ملحقہ گھر سے نکل آئی اور اس نے بریل سے صورتِ حال پوچھی۔ پھر اس کی آنکھ سہلانے لگی۔ ڈاکٹر تین میل کے فاصلے پر مطب کرتا تھا۔ جب اس کا باپ آیا تو اس کی ماں نے سارا قصہ بتا کر اسے ڈاکٹر کی طرف جانے کو کہا۔ اس کے باپ نے گھوڑا گاڑی تیار کی اور ڈاکٹر کے مطب میں اسے لے گیا۔ ڈاکٹر نے آنکھ صاف کی اور پھر دوا ڈالی۔ سائمن کو ہدایت کی کہ وہ دو روز بعد پھر آ کر معائنہ کرائے۔ سائمن نے وعدہ کر لیا۔

وعدہ تو اس نے کر لیا، لیکن آنکھ کی چوٹ کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔ اس کا خیال تھا کہ کوئی بڑا حادثہ نہیں ہوا ہے اور چوٹ درست ہو جائے گی۔ بہرحال یہ اس کی بھول تھی۔ آنکھ میں سوجن ہوگئی اور دوسری آنکھ بھی متاثر ہوگئی۔ اس میں تعدیہ (انفیکشن) ہو گیا تھا۔ بریل کی بصارت دھندلا رہی تھی۔

اب اسے اجسام کے بجائے ہیولے دکھائی دے رہے تھے۔ سائمن پھر ڈاکٹر کے ہاں گیا۔ اس نے بریل کو دوا دی اور سائمن کو یہ مشورہ بھی دیا کہ وہ پیرس جا کر اس کا علاج کرائے۔ سائمن کا خیال تھا کہ پیرس تو بہت دور ہے۔ اگر معاملہ نہ سنبھلا تو کسی اور ڈاکٹر سے معائنہ کرا لے گا۔ اپنی مصروفیت کے باعث دوسرے ڈاکٹر سے معائنہ کرانے کی نوبت نہیں آئی اور بریل کی بینائی بتدریج کم ہوتی چلی گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو گیا ہے۔ وہ لوگوں سے پوچھتا تھا کہ صبح کب ہوگی؟ لوگ اس کے اس سوال کا جواب نہیں دے پاتے اور بیچارگی سے سر جھٹک کر رہ جاتے۔

بریل کے لیے اسکول جانا ممکن نہ رہا۔ اس لیے کہ اس زمانے میں یعنی دو سو برس پیشتر نابینا افراد کے لیے اسکول نہیں تھے۔ غریب گھرانوں کے بچے جب بڑے ہو جاتے تو بھیک مانگ کر گزارا کرتے۔ ان کے کپڑے پھٹے ہوتے اور صورت پر درماندگی ہوتی۔ اگر اچھی بھیک مل جاتی تو انہیں اچھا کھانا مل جاتا ورنہ روکھی سوکھی پر گزارا کرنا پڑتا۔ سونے کے لیے بھی ان کے پاس کوئی جگہ نہ ہوتی تو وہ کونوں کھدروں میں لیٹ کر یا عبادت گاہوں کے زینوں پر سر ٹیک کر سو جاتے۔

سائمن ایک حساس شخص تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا اتنی ذلت آمیز زندگی گزارے۔ اس لیے اس نے بریل کو اپنے ساتھ کام پر لگا لیا۔ اس نے بریل کو موم سے چمڑے پر پالش کرنا سکھا دیا۔ بریل اس کام کو تندہی سے کرنے لگا۔ جب پالش ہو جاتی تو وہ اس کی چمک کو نہ دیکھ پاتا، لیکن محسوس کر لیتا کہ اس نے کام کو درست طریقے پر انجام دیا ہے۔ اسے مٹھائی کھانا مرغوب تھی، اس لیے کام کے بعد اس کا باپ اسے ایک چاکلیٹ دیتا تھا۔

ابتدا میں سائمن اور اس کی بیوی کو بریل کی ہر وقت دیکھ بھال کرنا پڑتی تھی، اس لیے کہ وہ چلتے ہوئے چیزوں سے ٹکرا جاتا تھا۔ زمین پر نشیب و فراز کا فرق نہ معلوم ہونے سے گر پڑتا تھا۔ وہ ایک باحوصلہ اور باعزم لڑکا تھا، اس لیے اس نے راستوں اور آوازوں کو اپنی یادداشت میں محفوظ کرنا سیکھ لیا۔

سائمن نے لوگوں سے مشورہ کیا تو انہوں نے بتایا کہ نابینا لوگوں کو سفید چھڑی دی جاتی ہے تاکہ وہ اس سے ٹٹول کر راستوں کی ناہمواری کا اندازہ لگا لیں۔ سائمن نے اپنے بیٹے کو ایسی ہی ایک چھڑی لا کر دے دی۔ بریل کے لیے چلنا قدرے آسان ہو گیا۔ اب اسے معلوم ہو گیا تھا کہ کہاں رکاوٹ ہے اور کہاں نشیب۔

اس کی مناسب کارکردگی دیکھ کر سائمن نے اسے گھوڑوں کے منہ پر لگائی جانے والی جھالریں بنانا بھی سکھا دیا۔ سائمن نے نہایت دانش مندی سے اپنے بیٹے کو ایسے کام سکھانے سے گریز کیا جس میں بھاری اور نوک دار اوزاروں کا استعمال کیا جاتا ہے۔

گھر میں بھی بریل ہر کام میں دل چسپی لینے لگا، وہ اپنی ماں کا ہاتھ بٹاتا تھا، مثلاً کھانے کی میز کیسے صاف کی جاتی ہے، اس پر پلیٹیں کیسے لگائی جاتی ہیں اور گھر میں جھاڑ پونچھ کیسے کی جاتی ہے۔ اس نے اندازے سے کنویں پر جانا سیکھ لیا تھا اور کنویں سے پانی کیسے بھرا جاتا ہے یہ بھی اسے معلوم ہو گیا تھا۔ ابتدا میں جب وہ ڈول میں پانی بھر کر لاتا تھا تو ناہموار راستوں پر لڑھک بھی جاتا تھا، لیکن جب اس نے راستوں کو دماغ میں محفوظ کر لیا تو یہ دشواری بھی دور ہو گئی۔ دو قدم چلنے کے بعد اسے معلوم ہو جاتا تھا کہ اب نشیب ہوگا یا فراز آئے گا۔ اسے ایسے کام کر کے دلی مسرت ہوتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اپنے والدین پر بوجھ نہیں ہے اور ان کا ہاتھ بٹا سکتا ہے۔
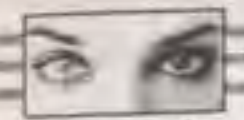
اسے کچھ دکھائی تو نہیں دیتا تھا، لیکن اس نے آوازوں کو دماغ میں محفوظ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اپنے والدین کی آوازیں تو پہلے ہی اس کی یادداشت کی لائبریری میں محفوظ تھیں، لیکن اب اس نے نئی آوازوں کو بھی ان کے ناموں کے ساتھ یادداشت میں رکھنا شروع کر دیا تھا۔

اس طرح سے وہ نت نئی باتیں سیکھتا چلا گیا۔ اس کی حسیات نہایت تیز ہو چکی تھیں۔ جب وہ بیکری کے قریب سے گزرتا تو اسے کیک اور بسکٹوں کی خوشبو سے اندازہ ہو جاتا کہ اب وہ بیکری کے پاس ہے۔ اسی طرح سے مٹھائی کی دکان کا بھی اسے علم ہو گیا تھا۔ حد یہ ہے کہ دودھ کی دکان کا اندازہ بھی اسے ہو گیا تھا۔

وہ اپنے گھر کے سامنے ایک چبوترے پر بیٹھ جاتا اور لوگوں سے ان کے نام اور پتے دریافت کرتا رہتا۔ دوسرے موقع پر وہ ان کے نام بتا دیتا تو وہ حیران رہ جاتے۔ اس سے پوچھتے کہ کیا اسے دکھائی دینے لگا ہے تو وہ ہنس کر جواب دیتا کہ نہیں۔ میں نے قدموں کی چاپ سے تمہارے نام کو نتھی کر دیا ہے۔ حیران ہونے کی ضرورت نہیں، جس طرح بیل، گائے اور بکری کے چلنے کی آوازیں مختلف ہوتی ہیں اسی طرح سے ہر شخص کے چلنے کی آواز بھی جدا جدا ہوتی ہے۔ کوئی پورا پاؤں رکھ کر چلتا ہے، کچھ پاؤں گھسیٹ کر چلتے ہیں تو کچھ کی عادت ہوتی ہے کہ وہ زمین پر ٹھوکر مارتے ہوئے چلیں۔ اسی طرح سے ہر شخص الگ انداز سے کھانستا، چھینکتا اور قہقہہ لگاتا ہے۔ ان سب کا فرق اگر دماغ میں محفوظ کر لیا جائے تو یادداشت کی لائبریری کشادہ ہوتی چلی جائے گی۔

آوازیں تو اسے سب ہی اچھی لگتی تھیں، لیکن جب کوئی اسے بے چارہ کہتا تھا اور اس سے ہمدردی کا اظہار کرتا تھا تو اسے رنج ہوتا اور وہ آزردگی میں کافی دیر تک خاموش رہتا۔ کوئی اس سے سوال کرتا کہ بریل خاموش کیوں ہو تو وہ جواب دیتا۔ ”کوئی خاص بات نہیں ہے۔“

وہ سب کچھ کر لیتا تھا، لیکن بہت سے کام ایسے تھے جنہیں وہ نہیں کر سکتا تھا۔ بریل جانتا تھا کہ وہ دوڑ بھاگ نہیں سکتا یا آنکھ مچولی نہیں کھیل سکتا۔ وہ جس جگہ رہتا تھا وہاں ہر

شخص اس سے محبت کرتا تھا، لیکن اس کا کوئی ایسا دوست نہیں تھا جس کے ساتھ وہ کھیل سکتا۔

قصبے کے چرچ میں نیا پادری ایلم آیا تو اس نے اپنا ربط وضبط بڑھانے کے لیے لوگوں سے ملنا جلنا شروع کر دیا۔ وہ ایک نرم و مشفق شخص تھا اور لوگوں سے محبت کرتا تھا۔ اس نے جب بریل کو دیکھا تو اس کے چہرے پر اسے غیر معمولی چمک اور ذہانت نظر آئی۔ اس کا خیال تھا کہ بریل ایک ہیرا ہے، جس پر پالش کر کے اسے چمکانا ہے۔ اس نے بریل سے اپنا تعارف کرایا اور پوچھا۔ ”کیا تم ہفتے میں چند دن چرچ میں آ سکتے ہو؟“

بریل نے اثبات میں جواب دیا۔ پادری اسے چرچ لے گیا تاکہ بریل راستہ سمجھ لے۔ دوسرے دن صبح بریل نے اپنے والدین کو آگاہ کیا اور پھر ان سے اجازت لے کر چرچ کی طرف چلا گیا۔ پادری صاحب اسے باغیچے میں لے گئے جہاں انہوں نے بریل سے بہت سی باتیں کیں، عزم و حوصلے کی باتیں، زندگی کو کیسے گزارتے ہیں، عمل اور نظریے میں کیا فرق ہے۔ مستقبل کیا ہے اور اس کی منصوبہ بندی کیسے کی جائے وغیرہ۔ اس کے بعد فادر اسے چرچ میں لے گیا۔ اس نے وہاں کی ہر چیز کے بارے میں بریل کو آگاہ کیا اور اسے اجازت دی کہ وہ چھو کر بھی چیز کو محسوس کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ فادر نے اسے تاریخ اور سائنس کا درس دینا شروع کیا۔ ستاروں کا علم بتایا اور یہ کہ ہماری اصل کیا ہے، ہماری جڑیں کہاں تک جاتی ہیں۔

وہ بہت دل نشیں انداز سے پڑھاتا تھا۔ اس کے موضوعات خشک اور بے جان نہیں ہوتے تھے۔ وہ کہانیاں بھی سناتا تھا، بہادر اور جری لوگوں کی کہانیاں جنہوں نے تاریخ کا رخ بدل دیا، سنہری لفظوں سے اپنا نام کتابوں کے صفحات میں درج کرا لیا۔ آدمی سب طرح کے ہوتے ہیں۔ اچھے کے علاوہ برے بھی ہوتے ہیں۔ بہادر اور بزدل، نیک دل اور شقی القلب، بے وقوف اور دانا۔ فادر کا کہنا تھا کہ اسے اپنے لیے راہ کا انتخاب کرنا ہے۔ زندگی میں کچھ کر کے جانا ہے۔

ان دنوں قصبے کے اسکول میں ایک نئے استاد مارٹن ہو کر آئے۔ فادر ان سے ملاقات کرنے گئے تو انہوں نے لوئی بریل کے بارے میں انہیں بتایا۔ انہوں نے دل چسپی کا اظہار کیا۔ لیکن جب فادر نے یہ کہا کہ وہ بریل کو ان کے اسکول میں داخل کرانا چاہتے ہیں تو وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔ ”ایک نابینا کو اسکول میں داخلہ نہیں مل سکتا، اس لیے کہ وہ کتابیں نہیں پڑھ سکتا۔“

”مگر اس میں پڑھنے کا جذبہ بدرجۂ اتم موجود ہے، ہمیں اس کی رہنمائی کرنا چاہیے۔ اگر ہم نے اس کی رہنمائی نہیں تھامی تو وہ آوارہ گرد بن جائے گا۔ گلیوں میں گھومنے کے سوا اس کے لیے کوئی کام نہیں رہے گا۔“

”اسکول کا قانون ہے کہ طالب علم کتاب پڑھے۔ کتاب کے بغیر تعلیم حاصل نہیں کی جا سکتی۔“ استاد نے دلیل دی۔

”یہی مسئلہ تو ہمیں حل کرنا ہے۔ اس کے لیے سوچ بچار کیجیے۔“ فادر نے التجا کی۔

کچھ سوچ کر استاد مارٹن نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ یوں بریل کو وہاں داخلہ مل گیا۔ لوئی کو یہ اطلاع پا کر بہت خوشی ہوئی۔ اس کے پڑوس سے ایک لڑکا پہلے ہی اسکول جایا کرتا تھا، وہ بریل کا ہاتھ پکڑ کر اسکول لے جانے لگا۔

اس زمانے میں اسکول صبح آٹھ بجے سے شام پانچ بجے تک ہوتے تھے۔ طالب علم اتنی طویل مدت میں پڑھتے پڑھتے اکتا جاتے تھے اور انہیں جمائیاں آنے لگتی تھیں۔ مگر بریل پڑھنے کے لیے مستعد رہتا۔ اس کا حافظہ اچھا تھا، اس لیے وہ جو کچھ پڑھتا اسے یاد ہو جاتا۔ وہ اپنی کلاس کے طالب علموں کے مقابلے میں زیادہ ذہین اور روشن دماغ تھا۔ وہ حساب کے سوالات دوسرے طالب علموں کی نسبت تیزی سے حل کر دیتا، مگر جب استاد مارٹن کہتے۔ ”چلو بچو! اب اپنی کتابیں نکالو۔“ تو بریل آزردہ ہو جاتا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے ذہن میں جو سوالات پیدا ہوتے ہیں ان کے جوابات کتابوں ہی سے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ وہ کتاب پڑھنے سے محروم ہے، لہٰذا وہ پیچھے رہے گا۔

وہ کتاب کے صفحات پر ہاتھ پھیرتا اور حسرت سے سوچتا کہ قدرت نے اس کے ساتھ ایسا مذاق کیوں کیا ہے؟

بریل جب دس برس کا ہو گیا تو فادر ایلم کو اس کی طرف سے فکرمندی لاحق ہو گئی۔ وہ ہر وقت سوچتے رہتے کہ جب بریل قصبے کے اسکول میں تعلیم ختم کرنے گا تو پھر کیا ہوگا؟ وہاں نابیناؤں کے لیے تو کوئی اسکول ہی نہیں ہے۔ وہ اس جستجو میں لگے رہے کہ دوسرے قصبات میں اگر کوئی ایسا اسکول ہے تو اسے وہاں بھجوا دیں گے۔ ان ہی دنوں پیرس میں نابیناؤں کے لیے ایک اسکول کھلا اور اس کا اشتہار اخبارات میں آیا۔ فادر ایلم اس اشتہار کو پڑھ کر بہت خوش ہوئے۔

طالب علموں کو اس اسکول میں تاریخ، جغرافیہ اور موسیقی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ دست کاری اور دوسرے شعبوں سے بھی روشناس کرایا جاتا تھا تاکہ وہ اکتساب تعلیم مکمل کرنے کے بعد کوئی کام بھی کر سکیں۔ ہنر مندی آنے سے وہ معاشرے کے کارآمد شہری بن سکیں۔

اب فادر ایلم کے لیے مسئلہ یہ تھا کہ بریل کو اس اسکول میں داخلہ مل سکتا ہے یا نہیں۔ وہ ایک معمولی سا قصبہ تھا جہاں کی ہر چیز معمولی تھی۔ انہوں نے سوچا کہ اگر وہ اسکول کے پرنسپل کو خط لکھیں گے تو کوئی ضروری نہیں کہ وہ اسے جواب بھی دے دیں، لہٰذا کسی معتبر اور متمول شخص سے سفارشی خط لکھوانا چاہیے۔ یہ سوچ کر وہ قصبے کے سب سے معزز شخص اوہارو کے پاس گئے جو چار ڈیری فارمز کا مالک تھا۔ انہوں نے بریل کا تذکرہ کیا کہ وہ علم کا پیاسا ہے، چنانچہ اس کی مدد کی جانی چاہیے۔ اوہارو خط لکھنے پر تیار ہو گیا۔ اس نے خط لکھ کر اس پر مہر بھی لگا دی اور اسے فادر ایلم کے حوالے کر دیا۔

فادر بہت خوش ہوا اور اس نے خط کو حوالۂ ڈاک کر دیا۔ اس وقت اس کی خوشی دوچند ہو گئی جب پیرس کے اسکول سے مثبت جواب موصول ہوا۔ وہ اس خط کو لے کر بریل کے والدین کے پاس گیا۔ بریل کے والدین یہ اطلاع پا کر زیادہ خوش نہیں ہوئے۔ اس کی ماں بولی۔ ”بریل یہیں خوش ہے۔ بھلا اتنی دور کہاں جائے گا؟“

”ہاں۔ بریل کا وہاں جانا صحیح نہیں ہے۔ ہمارا دل لگا رہے گا۔“ اس کا باپ بیوی کی حمایت کرنے لگا۔

”میں جانتا ہوں کہ وہ تمہارا بیٹا ہے اس لیے آنکھ سے اوجھل ہوتے ہی وسوسے اور اندیشے تمہارا پیچھا کرنے لگیں گے۔ لیکن یہ تو سوچو کہ قصبے کے اسکول کی تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ کیا کرے گا؟“ فادر ایلم نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

اس دلیل پر انہوں نے رضامندی تو ظاہر کر دی لیکن یہ سوچ کر پریشان ہو گئے کہ وہ اتنی دور تنہا کیسے رہے گا؟ شہر میں تو گاڑیاں بھی ہوتی ہیں، اگر وہ کسی گاڑی سے ٹکرا گیا تو؟ وہ اسے روز دیکھ بھی نہیں سکیں گے، اس لیے کہ وہ تو صرف گرمیوں کی چھٹیوں میں ہی گھر آ سکے گا۔
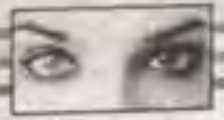
بریل کا خیال سب سے مختلف تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ نابیناؤں کے اسکول میں وہ بہتر طریقے پر پڑھ سکے گا۔ زیادہ علم حاصل کر سکے گا۔ چنانچہ اس نے کہا۔ ”ڈیڈی! مجھے پیرس جانے دیجیے۔ میں وہاں بہت کچھ حاصل کر سکوں گا۔“

اس کے باپ نے فوری جواب نہیں دیا بلکہ پیرس کے سرکاری اسکول کو خط لکھا اور بہت سی باتیں دریافت کیں۔ ایک ہفتے کے بعد ان کا جواب آ گیا تو میاں بیوی کو تسلی ہو گئی۔ انہوں نے دھڑکتے دل سے اسے اجازت دے دی، لہٰذا بریل فروری 1819ء میں ریل گاڑی میں بیٹھ کر پیرس روانہ ہو گیا۔ اس کے والدین اسے الوداع کہنے ریلوے اسٹیشن پر آئے۔

ابتدا میں بریل کو بہت دشواری محسوس ہوئی، اس لیے کہ وہاں ایک سو طالب علم تھے۔ ان سب کا تعارف بریل سے کرایا گیا۔ سو نام یاد رکھنا بہت دشوار تھا۔ نام آپس میں گڈمڈ ہو گئے۔ پھر یہ کہ سب اجنبی تھے، اس لیے وہ ان سب کے درمیان رہتے ہوئے بھی خود کو تنہا محسوس کر رہا تھا۔

جب رات ہوئی تو سب کو سونے کے کمرے میں لے جایا گیا۔ ایک بستر بریل کے حصے میں بھی آیا۔ سفر کے بعد وہ تھکا ہوا تھا، لیکن ماں کی یاد آئی تو وہ تکیے پر سر رکھ کر رونے لگا۔

نزدیک کے بستر سے ایک لڑکا اٹھ کر اس کے نزدیک آ گیا اور اس نے اپنا رومال نکال کر اس کے آنسو پونچھے۔ ”مجھے جبریل گوتیئر کہتے ہیں۔“ اس نے اپنا تعارف کرایا۔ ”تم کون ہو؟“

”لوئی بریل!“ اس نے ہچکیوں کے ساتھ جواب دیا۔

”تم ابھی نئے ہو، اس لیے ماں کو یاد کر کے رونا آ رہا ہے۔ میں جب نیا تھا تو مجھے بھی رونا آتا تھا۔ پریشان نہ ہو، میں تمہارا دوست ہوں۔“ اس نے بریل کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

بریل کو قدرے سکون حاصل ہوا۔

”کل تم بہتر محسوس کرو گے۔“ گوتیئر نے کہا۔ ”اب سونے کی کوشش کرو۔“

بریل اسی وقت سے خود کو بہتر محسوس کرنے لگا، اس لیے کہ پیرس میں اس کا ایک دوست پیدا ہو گیا تھا۔ دوسرے دن گوتیئر نے بہت سے لڑکوں سے اس کا تعارف کرا دیا۔ بریل کو اندرونی طور پر سکون حاصل ہوا لیکن وہاں کے ماحول نے اس کے دل و دماغ پر بوجھ طاری کر دیا

تھا اس لیے کہ وہاں کا ماحول قصبے کی بہ نسبت دم گھوٹ دینے والا تھا۔ قصبے میں ہر دم تازہ ہوا اس کے سر کو سہلاتی ہوئی جاتی تھی، لیکن ایک سو طالب علموں کے اسکول میں ہوا نہیں آتی تھی، اس لیے اسے سانس لینے میں دشواری محسوس ہوتی تھی۔ وہاں کا ماحول حبس زدہ تھا۔ سردی کا موسم تھا اس لیے کمروں میں بند ہو کر رہنا پڑتا تھا۔ نہانے کا بھی مسئلہ تھا۔ قصبے میں اس کی ماں پانی گرم کر کے دیتی تھی تو نہا لیا کرتا تھا۔ گرمیوں میں لڑکے تالاب میں جاتے تھے۔ یہاں ایسا کوئی انتظام نہیں تھا۔

اسکول دریا کے کنارے تھا، اس لیے ہر وقت مرطوب ہوا ملتی تھی۔ فرش اور در و دیوار نم رہتے تھے۔ بہت سے طالب علموں کا کھانسی آنے لگی تھی۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ مرطوب آب و ہوا ان پر اثر انداز ہو رہی ہے اور اس کا سدباب کرنا اس کے بس میں نہیں ہے۔ بریل کی صحت بتدریج گرنے لگی۔ وہ جب قصبے سے آیا تھا تو صحت مند تھا، لیکن اب اس کے رخسار پیلے سے ہونے لگے تھے۔

صحت گر رہی تھی، لیکن وہ ماحول سے آشنا ہو گیا تھا۔ بغیر کسی سہارے کے وہ سارے اسکول میں گھوم پھر سکتا تھا۔ بہت سے لڑکے دوست بن گئے تھے۔ پڑھائی میں دل لگا لیا تو والدین کی یاد بھی دھندلا گئی۔

وہ پڑھائی میں دوسرے طالب علموں سے آگے تھا، کیوں کہ اسے سارے مضامین دل چسپ لگتے تھے۔ اس کی عمر دس برس تھی۔ اس کی دل چسپی کو دیکھ کر بہت سے اساتذہ نے اس کا اعتراف کیا کہ وہ ایک ہونہار طالب علم ہے۔

پڑھائی کے بعد طالب علم کام سیکھنے کے لیے اسکول سے ملحقہ کارخانے میں جاتے تھے۔ وہاں انہیں ٹوپیاں، کپڑے، چمڑے کی چپلیں، گھوڑوں کی چابکیں اور لگامیں بنانا سکھایا جاتا تھا۔ بریل چونکہ اپنے والد کے ساتھ دکان پر کام کر چکا تھا، اس لیے اسے ان کاموں میں بھی کوئی دشواری محسوس نہیں ہوتی تھی۔ سال کے اختتام پر بریل کی صلاحیتوں کے اعتراف کے طور پر اسے بہترین بُنائی پر انعام دیا گیا۔

شام کے وقت طالب علموں کو موسیقی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ بریل کو کئی طرح کے ساز بجانا آ گئے لیکن اسے پیانو سے زیادہ دل چسپی تھی۔ وہ اسے اتنی مہارت سے بجاتا تھا کہ دوسرے طالب علم اسے داد دیتے تھے۔

اسکول کے طالب علموں کو احاطے سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اس لیے کہ سڑکوں پر ٹریفک ہوتا تھا، البتہ ہر جمعرات کو کوئی استاد انہیں لے کر باہر جاتا تھا۔ اتنے طالب علموں کو لے کر باہر نکلنا آسان کام نہیں تھا۔ استاد پریشان ہو جاتے تھے۔ بالآخر ایک استاد نے اس کا حل یہ نکالا کہ وہ اپنے ہاتھ میں ایک رسی تھام لیتا اور طالب علم اسی رسی کو پکڑ لیتے اور ایک لائن میں اس کے پیچھے چلتے رہتے۔ ابتدا میں بریل کو شہر اچھا نہیں لگا۔ اس لیے کہ لوگ اس سے ٹکرا جاتے تھے۔ ہر شخص جلدی میں لگتا تھا۔ بہرحال وہ پیرس کے ماحول کا بھی عادی ہو گیا۔ شہر کی چیزوں کی مخصوص آوازوں سے اس نے آشنائی حاصل کر لی۔ دریائے سین میں چلنے والی سیٹیوں کی آواز کیسی ہوتی ہے، طیارے فضا میں کیسے گڑگڑاتے ہیں اور ریل گاڑیاں پٹریوں پر کیسے بھاگتی ہیں، کبوتر اپنے پر کیسے پھڑپھڑاتے ہیں، اسے سب معلوم ہو گیا تھا۔

کئی ماہ بعد اسے اپنی پڑھائی کی طرف سے بے اطمینانی محسوس ہوئی۔ وہ جو کچھ کرنا چاہ رہا تھا، کر نہیں پا رہا تھا۔ 1820ء میں نابینا طالب علموں کو ایسی کتابوں سے پڑھایا جاتا تھا جن میں ابھرے ہوئے حروف ہوتے تھے۔ طالب علم ان پر انگلی پھیر کر معلوم کر لیتے تھے کہ یہ کون سا لفظ ہے۔ جب حروف سے پہچان ہو جاتی تھی تو طالب علم ان حروف کو جوڑ کر یہ جان لیتے تھے کہ لفظ کیا ہے۔

بریل نہایت محنت سے لفظ بنانا سیکھ رہا تھا، لیکن اس نے جان لیا کہ اس طریقہ کار میں وقت بہت صرف ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ لفظ کا مجموعی مطلب اخذ کرنے میں وقت لگ جاتا تھا، اس لیے کہ جب لفظوں کو ترتیب سے پڑھنے کی کوشش کی جاتی تو ابتدائی لفظ ذہن سے محو ہو جاتا۔ گویا ایک کتاب پڑھنے میں کئی دن لگ جاتے۔

”پڑھائی کا یہ طریقہ مناسب نہیں ہے۔“ بریل نے ایک روز اپنے استاد سے کہا۔

”لیکن اسے ترتیب دینے میں کئی برس لگ گئے تھے۔ اس سے بہتر طریقہ کیا ہو سکتا ہے؟ اگر تمہارے ذہن میں کچھ آتا ہے تو مجھے بتاؤ۔“ انہوں نے جواب دیا۔

”میں کوشش کروں گا۔“ وہ بولا۔

اسکول کی لائبریری میں طالب علموں کے لیے صرف چودہ کتابیں تھیں۔ اس لیے کہ ان کتابوں کو تیار کرنے میں بے حد دشواری ہوتی تھی، اس لیے ہر حرف ہاتھ سے لکھا جاتا تھا اور ان پر سرمایہ بھی زیادہ لگتا تھا۔ ہر حرف کو تین انچ کی لمبائی میں لکھا جاتا تھا تب طالب علم اسے سمجھ پاتے تھے۔ کتاب کے ایک صفحے پر صرف چند لفظ ہی آ پاتے تھے۔

بریل کو یقین تھا کہ اگر یہی حال رہا تو نابیناؤں کے لیے سال میں ایک کتاب ہی تیار ہو سکے گی۔ وہ اپنے ساتھیوں سے بحث کرتا کہ ہمیں کوئی نیا طریقہ سوچنا چاہیے۔ وہ الٹا اس سے پوچھتے کہ نیا طریقہ کیا ہونا چاہیے۔ وہ اپنے دماغ سے کوئی اچھی سی ترکیب نکالے۔ بحث مباحثہ کرنے سے کیا فائدہ؟

ایک دن فوج کا ایک کپتان چارلس باربیئر اسکول آیا۔ اس نے ایک ایسی کتاب تیار کی تھی جو اس کے دستے کے سپاہیوں کے کام آتی تھی۔ اس کی مدد سے وہ تاریکی میں دوسرے سپاہیوں کو پیغامات ارسال کر سکتے تھے۔ اس طریقے کو اس نے ”تحریرِ شب“ کا نام دے رکھا تھا۔ کپتان اسکول کے نابینا طالب علموں کو یہ سمجھانے آیا تھا کہ تحریرِ شب کو وہ بھی پڑھائی میں استعمال کر سکتے ہیں۔

تحریرِ شب میں نقطے استعمال کیے جاتے تھے۔ اس نے ہر لفظ کی تقسیم آواز کے اعتبار سے کر رکھی تھی اور ہر آواز کے لیے ایک ابھرا ہوا نقطہ مقرر کیا تھا۔ موٹے کاغذوں یا گتوں پر فولاد کے نوک دار قلم سے نقطے بنائے جاتے تھے جو دوسری طرف ابھر جاتے تھے۔ جب ان نقطوں کو پڑھنا مقصود ہوتا تو کاغذ کو پلٹ دیا جاتا۔ پھر ان پر انگلی پھیری جاتی اور نقطوں کو محسوس کر کے عبارت پڑھی جاتی۔

نابینا اسکول کے طلبہ نے جب ان نقطوں کو استعمال کیا تو کئی دشواریاں پیش آئیں۔ پہلی یہ کہ اس میں کیپٹل حروف نہیں تھے۔ دوسرے یہ کہ ان میں کاما، فل اسٹاپ اور دوسرے نشانات بھی نہیں تھے۔ تیسرے یہ کہ سپاہیوں کے لیے مناسب تھی جو رات کی تاریکی میں پیغامات ارسال کرتے تھے، مثلاً آگے جاؤ، پیچھے ہٹ جاؤ، دشمن کا خیال رکھو وہ تمہاری دائیں جانب ہے۔ یہ احکام تھے جو صرف ان کے لیے مناسب تھے۔ ان سے مسلسل عبارت نہیں بنائی جا سکتی تھی۔ نابینا طالب علموں کے لیے تحریرِ شب ناکام ثابت ہوئی۔ بہرحال بریل کے دماغ میں کھلبلی مچنے لگی۔

اس نے سوچا کہ تحریر میں خرابی ہے، لیکن ان نقطوں کو درست انداز میں استعمال کیا جائے تو بات بن سکتی ہے۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ ان نقطوں سے ایک نیا رسم الخط ایجاد کرے گا۔ چنانچہ اس نے نقطوں کی طرف توجہ مرکوز کر دی۔ وہ چاہتا تھا کہ نئی تحریر اتنی آسان ہو کہ طلبہ سہولت سے اسے سیکھ لیں اور موٹی کتابوں سے نجات حاصل کر لیں۔
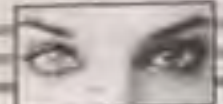
اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بریل نے سامان بھی حاصل کر لیا۔ یہ چند گتوں کے ٹکڑے تھے اور ایک سُوا تھا۔ سُوا بالکل ویسا ہی تھا جس سے سوراخ کرتے ہوئے بریل نابینا ہو گیا تھا۔

کپتان باربیئر کو جب معلوم ہوا کہ کوئی شخص اس کے نقطوں کو بہتر بنانے کی کوشش کر رہا ہے تو وہ اس سے ملاقات کی غرض سے اسکول آیا۔ اس وقت بریل کی عمر صرف بارہ برس تھی۔ باربیئر نے جب اپنے سامنے ایک نابالغ بچے کو دیکھا تو اس نے سوچا اتنا چھوٹا سا بچہ بھلا کیا کام کر سکے گا۔ وہ اس سے بات کیے بغیر ہی واپس چلا گیا۔

بریل بہت رنجیدہ ہوا۔ اسے یقین ہو گیا کہ مستقبل میں باربیئر سے کوئی مدد نہیں مل سکتی۔ اسے یہ کام .... تنہا ہی کرنا پڑے گا۔

بریل مسلسل اپنی کوشش میں لگا رہا۔ اسے اسکول میں زیادہ وقت نہیں ملتا تھا، البتہ جب وہ چھٹیوں میں گھر آتا تھا تو ناشتا کرنے کے بعد کسی چراگاہ کی طرف نکل جاتا اور بنچ پر بیٹھ کر اپنا کام شروع کر دیتا۔ لوگ اس کے قریب سے گزرتے تو اشارہ کر کے کہتے کہ دیکھو لوئی بریل گتے میں سوراخ کر رہا ہے۔ ان کے نزدیک یہ ہنسی مذاق تھا۔ وہ اسے کھیل کود سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ بریل ایک نیا رسم الخط ایجاد کرنے کی سعی کر رہا ہے۔

بریل جب اسکول میں ہوتا تو رات کو جب سب سونے کے لیے بستروں پر چلے جاتے تھے تو وہ اپنے بستر پر بیٹھ کر کام میں مصروف ہو جاتا۔ اس وقت کام میں مداخلت کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ وہ اپنے کام میں اتنا محو ہو جاتا کہ اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ جب دودھ کی گاڑیوں کی آوازیں آنے لگتیں تو اسے معلوم ہو جاتا کہ صبح ہو چکی ہے، لہٰذا وہ چند گھنٹوں کے لیے سو جاتا پھر ناشتا کر کے اسکول جانے کی تیاری شروع کر دیتا۔ اس کی حوصلہ افزائی کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ طالب علم اس سے کہتے۔ ”بریل تم محنت تو بہت کر رہے ہو اور رسم الخط ایجاد کرنے کے لیے راتوں کو جاگتے ہو، لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔ تم بھلا نیا

رسم الخط کیسے ایجاد کرسکتے ہو؟"

بریل جواب دیتا کہ ہوسکتا ہے، تم لوگ درست کہتے ہو، لیکن کوشش کرنے میں کیا حرج ہے؟ یہ کہہ کر وہ پھر تندہی سے اپنے کام میں مصروف ہوجاتا۔ اسے ایک روز خیال آیا کہ باربیئر کے نقطے آوازوں کو ظاہر کرتے تھے۔ جب کہ فرانسیسی زبان میں چھوٹی سے چھوٹی آواز کے لیے ایک لفظ ہے۔ چنانچہ ایک لفظ لکھنے کے لیے سیکڑوں نقطے بنانا پڑتے ہیں۔ اتنی بڑی تعداد میں نقطے بنانا کاردارد ہے۔ اگر نقطے بن بھی جاتے ہیں تو پڑھنے میں دشواری ہوتی ہے۔ اس نے سوچا کہ نقطوں کو آوازوں کے بجائے حروف کی بنیاد پر لکھنا چاہیے۔ اس لیے کہ فرانسیسی زبان میں صرف چھبیس حروف ہیں۔ یہ خیال آتے ہیں بریل کے دل و دماغ میں ایک نیا جوش وجذبہ پیدا ہوگیا۔ اس نے کاغذ اٹھایا اور قلم سے اس پر چھ نقطے بنادیے اور اس کے بعد ان نقطوں پر نمبر ڈال دیے۔

اب اس نے نمبر ایک کو A قرار دیا۔ ایک اور دو کو B ایک اور چار کو C اس کے بعد ایک چار اور پانچ کو D۔ اسی انداز سے اس نے A تا Z سارے حروف بناڈالے۔

ان میں سے ہر نقطہ ابھرا ہوا تھا اور ان پر انگلی پھیر کر انہیں پڑھا جاسکتا تھا۔ بریل نے ان پر انگلی پھیر کر پڑھا اور فتح مندی سے چیخا۔ "ارے! یہ تو بہت آسان ہے، میں نے کارنامہ انجام دے دیا۔"

یہ سارے حروف صرف نقطوں کو اِدھر اُدھر کرنے سے بن گئے، جن سے عبارت بھی لکھی جاسکتی تھی اور اس کی کتاب بھی تیار کی جاسکتی تھی۔ ان ہی نقطوں نے بریل کو ایک عالمی شہرت عطا کی اور ساری دنیا میں اس کا نام احترام سے لیا جاتا ہے۔ اس نے تین سال کی محنتِ شاقہ کے بعد یہ رسم الخط ایجاد کرلیا تھا اور اسے اسی کے نام پر پکارا جاتا ہے۔ جب اس نے یہ کارنامہ انجام دیا، اس کی عمر اس وقت صرف پندرہ برس تھی۔

جس وقت بریل نے ان حروف تہجی کو ترتیب دیا، وہ اپنے گھر میں تھا۔ اب وہ بے چین اور مضطرب تھا کہ کسی طرح جلد از جلد اسکول پہنچ کر ساتھی طالب علموں کو یہ نقطے دکھائے۔ ایک ہفتے کے بعد وہ اسکول گیا اور اس نے اپنے دوستوں کو اس بارے میں بتایا تو وہ انگلی پھیر کر پڑھنے لگے۔ سب نے اسے داد دی اور اعتراف کیا کہ اب وہ آسانی سے ان نقطوں کو پڑھ سکتے ہیں۔ سارے اسکول میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔

اسکول کے ڈائریکٹر پکنیئر کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے بریل کو اپنے آفس میں بلایا اور پوچھا۔ "لوئی بریل! میں نے نقطوں کے بارے میں سنا ہے۔ کیا واقعی تم نے کوئی رسم الخط تیار کرلیا ہے؟ ذرا مجھے بھی تو کچھ بتاؤ۔"

"جناب! یہ اسی وقت سمجھ میں آئے گا جب آپ کوئی تحریر پڑھیں گے۔" بریل نے جواب دیا۔

پکنیئر نے ایک چھپی ہوئی کتاب اٹھائی اور دھیرے دھیرے اسے پڑھنا شروع کیا تو بریل کاغذ پر نقطے ڈالتا چلا گیا۔ جب پکنیئر خاموش ہوا تو بریل نے اپنے بنائے ہوئے نقطوں پر انگلی پھیری اور عبارت پڑھ کر سنادی۔

پکنیئر بہت خوش ہوا اس نے کہا۔ "بریل! تم نے تو کمال کردیا۔ تمہاری عمر اس وقت کیا ہے؟"

"پندرہ برس۔"

"بہت خوب۔ جو کام دوسرے ساری زندگی نہیں کر پاتے وہ تم نے صرف پندرہ برس میں انجام دے ڈالا۔ مجھے تم پر فخر ہے۔"

"جناب اب ہم کتابیں تیار کر کے پڑھ سکیں گے نا؟" بریل نے پوچھا۔

ڈائریکٹر پکنیئر کچھ دیر خاموش رہا اس کے بعد اس نے ملائمت سے کہا۔ "بریل! تم ساری باتوں سے آگاہ نہیں ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا اسکول حکومت کی بے حد معمولی امداد پر چلتا ہے یا پھر دولت مند حضرات چندہ دے دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ اب ہم کتابیں کیسے تیار کریں؟"

بریل خاموش رہا، اس لیے کہ اس کے پاس اس ٹیڑھے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کہا۔ "آپ دولت مند لوگوں سے گزارش تو کرسکتے ہیں کہ وہ نئے رسم الخط کو سہارا دیں تاکہ نابینا بچے علم حاصل کرسکیں اور بیناؤں کے شانہ بہ شانہ چل سکیں۔"

"ہاں، اس معاملے میں ایسے حضرات سے اپیل کی جاسکتی ہے۔" پکنیئر نے کہا۔ "مگر ہمیں زیادہ امید نہیں باندھنا چاہیے۔ اس لیے کہ لوگ لہو ولعب میں تو رقم خرچ کرنے میں دیر نہیں لگاتے، لیکن رفاہی کاموں میں کچھ کرنے پر آمادہ ہی نہیں ہوتے۔ بہرحال دیکھتے ہیں۔"

اسکول ڈائریکٹر پکنیئر نے سارے مخیّر حضرات کو خطوط لکھے۔ ان میں سرکاری افسران، ملوں کے مالک اور زمیں دار شامل تھے۔ ایک ہفتے کے بعد جوابات آنا شروع ہوگئے۔ کچھ نے سپاٹ لہجے میں انکار کردیا تھا، بعض افراد نے عجیب عجیب سوالات کیے تھے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو سب نے کورا جواب دیا تھا کہ وہ ایسے کسی منصوبے میں رقم نہیں لگانا چاہتے۔ ایک شخص نے تحریر کیا تھا کہ پرانے رسم الخط میں آخر کیا خرابی ہے جو آپ نیا رسم الخط نافذ کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ وہ بھی تو نقطوں پر مشتمل ہے۔ دوسرے نے لکھا تھا کہ میں نے اس سے پہلے والے منصوبے میں کافی رقم بھیجی تھی وہ آپ نے کیا کی؟ اب آپ خود کہہ رہے ہیں کہ وہ مناسب نہیں ہے، اس پر آپ نے پہلے غور وخوض کیوں نہیں کیا؟

ایک اسکول کے استاد نے لکھا کہ میں خود ایک نیا رسم الخط تیار کر رہا ہوں۔ تمہارا رسم الخط مجھے منظور نہیں ہے۔ میرے ہوتے ہوئے وہ اس اسکول میں رائج نہیں کیا جاسکتا۔

بیشتر افراد ایسے تھے جنہوں نے نہ نہیں کی، لیکن ہاں بھی نہیں کی۔ گول مول سا جواب دیا تاکہ پڑھنے والے کا دماغ چکرا جائے۔

نابینا اسکول کے طالب علم اس رسم الخط سے فائدہ اٹھانے لگے۔ وہ اب اسی میں لکھ پڑھ رہے تھے، لیکن ان کی تعداد بہت تھوڑی تھی، جب کہ باہر ایسے ہزاروں بلکہ لاکھوں نابینا طالب علم تھے جو اس سے فیض نہیں اٹھا پا رہے تھے۔

بریل یہ سب جان کر شکستہ دل ہوگیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ جب رسم الخط اتنا آسان ہے کہ طالب علم اسے قبول کررہے ہیں تو پھر عام لوگ اس پر رقم کیوں خرچ نہیں کررہے؟ کیا وہ اپنے اسکول تک ہی محدود ہوکر رہ جائے گا؟

جب وہ انیس برس کا ہوگیا تو اس کے پیرس اسکول کی تعلیم ختم ہوگئی۔ وہ چاہتا تو اسکول سے تعلق ختم کردیتا، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اسکول ڈائریکٹر اس کی صلاحیتوں سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ بریل بہت سے مضامین میں تمغا حاصل کرچکا ہے، لہٰذا اسے چھوڑنا مناسب نہیں تھا۔ اس نے بریل کو پیشکش کی کہ اگر وہ چاہے تو استاد کی حیثیت سے طالب علموں کو پڑھا سکتا ہے۔ بریل نے اس پیشکش کو قبول کرلیا۔ وہ خود کسی ایک بڑے شہر میں رہنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے خیالات اور منصوبوں کو فروغ دے۔ اس کے لیے قصبے کے لوگوں کا تعاون کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا، بلکہ شہر کے سمجھ دار افراد ہی اس کے منصوبے کی تکمیل میں تعاون کرسکتے تھے۔

جب وہ اسکول کا استاد بن گیا تو اس کی تنخواہ پندرہ فرانک مقرر کی گئی۔ اسے رہائش کے لیے ایک علیحدہ کمرا دیا گیا۔ اسے یہ حق بھی دیا گیا کہ وہ جب چاہے اسکول کی ملازمت چھوڑ سکتا ہے۔ اس پر کوئی قدغن نہیں ہوگی۔

بریل نے طالب علموں کو دل چسپی اور لگن سے پڑھانا شروع کردیا۔ وہ رات ہی کو اس مضمون کی تیاری کرلیتا تھا جو صبح اسے پڑھانا ہوتا تھا۔ طالب علموں کے سوالات کے جوابات وہ رسانیت سے دیتا تھا اور انہیں کبھی نہیں جھڑکتا تھا۔ اس نے تعلیم میں دل چسپی نہ لینے والے طالب علموں کو کبھی ڈانٹا ڈپٹا نہیں، بلکہ وہ ان سے پوچھتا تھا کہ وہ والدین کی رقم خرچ کرنے کے باوجود صحیح طور پر کیوں نہیں پڑھ رہے ہیں؟

ابتدا میں بریل نے پیانو کی طرف توجہ دی تھی اور اس میں مہارت اختیار کرلی تھی، لیکن بعد میں اس نے آرگن بجانا بھی شروع کردیا۔ چند ہی ماہ میں اس کی شہرت سارے پیرس میں پھیل گئی تو اسے پیرس کے سب سے بڑے گرجا گھر میں آرگن بجانے پر مقرر کردیا گیا۔ اس کے آرگن بجانے کا انداز اتنا مسحور کن تھا کہ لوگ کہتے تھے کہ اگر وہ اسکول کی ٹیچری چھوڑ بھی دے تو اس فن سے اچھی روزی روٹی کما سکتا ہے۔ اس کا شمار بڑے موسیقاروں میں کیا جائے گا۔

وہ تعلیم دے رہا اور موسیقی سنا رہا تھا، لیکن اب بھی اس کے دل میں کسک اٹھتی تھی کہ کاش کسی طرح سے اس کا تیار کیا ہوا نقطوں کا رسم الخط عام ہوجائے اور سارے فرانس، بلکہ ساری دنیا کے نابینا طالب علم اس سے مستفید ہوسکیں۔ اس رسم الخط میں کتابیں تیار ہونا ہی اس کی دلی آرزو تھی۔

ایک بار گرجا گھر میں موسیقی پیش کرتے ہوئے اسے خیال آیا کہ اگر وہ اسے نقطوں میں لکھ دے تو دوسرے بھی اس سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔ یہ خیال آتے ہی اس نے موسیقی کے اشاروں کو نقطوں میں منتقل کرنا شروع کردیا۔ یہ کام بھی دشوار تھا، گھنٹوں کام کرنے کی وجہ سے اس کی کمر میں درد ہونے لگا۔ وہ اب زینے بھی مشکل ہی سے چڑھ پاتا تھا۔ اس کی جسمانی حالت بتدریج روبہ انحطاط تھی۔ اسکول کے ڈاکٹر نے اس کا تفصیلی معائنہ کیا اور بتایا کہ اسے دق ہوچکی ہے، لہٰذا اسے محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔

اس زمانے میں دق کا کوئی علاج نہیں تھا۔ بہرحال بریل نے اس سے جنگ کرنے کا ارادہ کرلیا۔ یہ بیماری اسے اسکول کے گھٹن آمیز ماحول کی وجہ سے ہوئی تھی۔ اس کے

علاوہ دریا کے کنارے واقع اسکول کی ہوا مرطوب اور سمیت زدہ تھی۔ اس کا خیال تھا کہ زندگی کتنی ہے، اس کا کسی کو پتا نہیں ہے۔ بہرحال وہ عام لوگوں کی طرح زندہ نہیں رہنا چاہتا۔ زندگی محض کھانے پینے اور پہننے کا نام نہیں ہے۔

ڈاکٹر نے ہدایت دی تھی کہ وہ تازہ ہوا میں زندگی بسر کرے اور خوب کھائے پیے، اس طرح اس کے جسم میں جان آجائے گی اور وہ بیماری کا مقابلہ آسانی سے کر سکے گا۔ بریل نے اس کی ہدایات پر عمل کیا، سارا کام وقتی طور پر چھوڑ دیا اور پوری نیند لینے لگا۔ جب اس کی حالت قدرے بہتر ہوئی تو اس نے اسکول کے باہر جا کر ٹہلنا بھی شروع کردیا۔ اس کا بھی مثبت اثر پڑا۔ جب وہ صحت مند ہوگیا تو اس نے دوبارہ طالب علموں کو پڑھانا شروع کردیا۔

ڈائریکٹر پگنیئر ایک معقول اور دانش مند شخص تھے، انہیں بریل کا منصوبہ پسند آیا تھا، اس لیے وہ اسے تکمیل تک پہنچانے کے لیے کچھ رقم پس انداز کرنے لگے۔ ایک موقع پر انہوں نے بریل کو بتایا کہ اب اتنی رقم جمع ہوچکی ہے، جس سے کتاب چھاپی جاسکتی ہے۔ یہ سن کر بریل بہت خوش ہوا۔ نقطوں والی کتاب چھپ گئی۔ جس کا نام تھا "الفاظ، موسیقی اور گیت لکھنے کا طریقہ، نابیناؤں کی طرف سے نابیناؤں کے لیے۔"

پگنیئر نے اس کتاب کی بہت سی جلدیں دوسرے اسکولوں کو بھی بھجوائیں۔ سب نے شکریے کے خطوط ارسال کیے لیکن ستائش کے طور پر کچھ نہیں کہا۔ انہوں نے کتاب پر تبصرہ کرنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ یہ صورت حال بے حد پریشان کن تھی، تاہم بریل نے حوصلہ نہیں ہارا۔ وہ جب بھی کسی سے گفتگو کرتا اسے نئے رسم الخط کے بارے میں ضرور بتاتا۔ اس امید پر کہ شاید کوئی اس طرف توجہ دے اور کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دے۔

1841ء میں پگنیئر اپنے عہدے سے ریٹائر ہوگیا اور اس کی جگہ دوفاؤ کام کرنے کے لیے آیا۔ نیا ڈائریکٹر پگنیئر کا الٹ تھا۔ اسے بریل کا رسم الخط بالکل پسند نہیں آیا۔ وہ انہیں احمقانہ نقطے کہتا تھا۔ یہ مایوس کن تبصرہ سن کر بریل پھر بیمار پڑ گیا۔ اسے دق نے آگھیرا تھا۔ ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کیا اور تنبیہ کی کہ اگر تم زیادہ عرصے تک اس آب و ہوا میں رہے تو پھر تم زندہ نہ بچ سکو گے۔

ڈاکٹر کی بات سن کر بریل کے دوستوں نے اس کا سامان باندھنا شروع کردیا۔ وہ اسے بریل کے قصبے پہنچا آئے اور آنسوؤں سے الوداع کیا۔ اس کی ظاہری ... سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس بار وہ زندہ نہیں بچے گا۔

بریل نے جب چھ ماہ تک کھلی فضا میں سانس لیا تو ... کی صحت ایک بار پھر بہتر ہوگئی۔ جب وہ پوری طرح ... مند ہوگیا تو اس نے پیرس کا رخ کیا۔ وہاں ایک دل ... صورت حال کا سامنا ہوا۔ ساتھی طالب علموں نے اسے ... کہ دوفاؤ نے جیسے نئے رسم الخط کے خلاف محاذ بنالیا ہے۔ ... سب لڑکوں پر پابندی لگادی کہ کوئی بھی بریل کے ترتیب ... ہوئے نقطوں کی کتاب استعمال نہیں کرے گا۔ اس کے ... وہ اس کے حق میں بھی نہیں تھا کہ کوئی لڑکا اسے اپنے کمرے میں لاکر ان نقطوں پر انگلیاں پھیرے۔ سب سے کر... حرکت اس نے یہ کی کہ بریل کی کتاب جلوادی۔

بریل کے لیے یہ صدمہ ناقابلِ برداشت تھا۔ گھبرا کر اسکول کی عمارت سے نکل آیا۔ جاتا کہاں؟ ... واپس آیا اور طالب علموں کو پڑھانے لگا۔ وہ سب کام ... کے مطابق کر رہا تھا، لیکن بے دلی اور دل شکستگی کے ساتھ۔ جن خوابوں کے سہارے زندگی بسر کر رہا تھا، وہ خواب ... کر رہ گئے تھے۔

اس کا خیال تھا کہ اب وہ اس صورتِ حال کا مقابلہ نہیں ... پائے گا اور اس دنیائے رنگ و بو سے بے نیل و مرام چلا جائے گا۔ لیکن اس وقت تاریکی میں اسے روشنی کی ایک کرن نظر آئی جب طالب علموں نے اس کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔ انہوں نے اسے یقین دلایا کہ دوفاؤ نے اگر اس رسم الخط پر پابندی لگا دی ہے تو کچھ نہیں بگڑا۔ وہ اسے ترک نہیں کریں گے۔ یہ رسم الخط زندہ رہے گا۔ دوفاؤ نے ہر چند کہ لکھنے والی ساری چیزیں اسکول سے ہٹالی تھیں، لیکن طالب علموں نے وہ چیزیں یعنی ... اور سُوا وغیرہ دوبارہ حاصل کرلیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے سلائی اور بُنائی کی سوئیاں تک استعمال کیں۔ کتاب تیار ہوگئی تو نئے طالب علموں کو پرانے طالب علموں نے سکھانا شروع کردیا۔ انہیں کسی کا ڈر خوف نہیں تھا۔

دوفاؤ ہی نہیں بلکہ دوسرے اساتذہ بھی اس رسم الخط کے حامی نہیں تھے، ممکن ہے وہ دوفاؤ سے خوف زدہ رہتے ہوں۔ اسی اثنا میں ایک نیا استاد جوزف گودے اسکول میں آیا۔ جب اسے لوئی بریل کی کہانی اور اس کے رسم الخط کے بارے میں معلوم ہوا تو اس نے نئے رسم الخط کی حمایت کی۔ وہ طالب علموں کی در پردہ حمایت کرنے لگا۔

ایک روز اس نے دوفاؤ سے کہا۔ "مجھے بریل کا رسم الخط پسند آیا ہے۔ طالب علم جس طرح سے اس کی حمایت کر رہے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک روز دنیا میں انقلاب آئے گا اور ساری دنیا کے طالب علم اس رسم الخط کو استعمال کریں گے۔ کیا آپ یہ نہیں چاہتے کہ لوگ اس معاملے میں آپ کا نام احترام سے لیں؟"

"کیا مطلب؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

"رسم الخط تو بریل نے ایجاد کیا ہے، لیکن جب آپ اس کی اجازت دے دیں گے تو یہ تیزی سے پھیلے گا اور اس کا کریڈٹ آپ کو بھی ملے گا کہ اس اسکول کے ڈائریکٹر کے تعاون سے رسم الخط دائم و قائم ہوا۔"

دوفاؤ کی سمجھ میں یہ بات آگئی۔ اس نے سوچا بریل کا نام اگر تاریخ میں درج کیا جائے گا تو لوگ اسے بھی اچھے نام سے پکاریں گے۔ چنانچہ اسے نئے رسم الخط کی مخالفت نہیں کرنا چاہیے۔ اگلے دن سے اس نے اعلان کردیا کہ اسکول کے طالب علم بریل کا رسم الخط استعمال کرسکتے ہیں۔

1844ء میں حکومت کو احساس ہوگیا کہ اسکول کی عمارت بوسیدہ اور شکستہ ہوچکی ہے۔ اس لیے اس کی جگہ کوئی اور عمارت تعمیر ہونا چاہیے۔ اسی برس ایک نئی عمارت وجود میں آگئی جس میں دوفاؤ نے شہر کے عمائدین کو مدعو کیا۔ عمارت کی افتتاحی تقریب میں سب ہی تعلیم یافتہ افراد شامل تھے۔ اس کے علاوہ سرکاری اور نیم سرکاری عہدے داران نے بھی شرکت کی۔

جب تقریب شروع ہوئی تو دوفاؤ نے بریل کے نئے رسم الخط کا تعارف کرایا۔ اس دوران لوئی بریل بھی اسٹیج پر بیٹھا رہا۔ اس کے رسم الخط پر نہ جاننے والوں نے اعتراضات کی بوچھاڑ کردی، جس کا جواب دوفاؤ نے نہایت صراحت سے دیا۔ اس کے باوجود حاضرینِ محفل کو یقین نہ آیا تو اس نے ایک نابینا طالبہ کو بلایا اور ایک کتاب اٹھا کر چند سطریں سست رفتاری سے پڑھیں۔ اس دوران طالبہ ایک گتے پر سُوے سے نقطے ڈالتی رہی۔ دوسرے ہی لمحے اس نے ان نقطوں پر انگلی پھیر کر وہ عبارت پڑھ کر سنادی، جو دوفاؤ نے پہلے پڑھی تھی۔

وہاں جو افراد بیٹھے تھے، انہوں نے خوب تالیاں بجائیں۔ بریل کو داد و تحسین ملی۔ مگر چند افراد ایسے بھی تھے جنہیں اس پر یقین نہیں آیا اور انہوں نے کہا کہ طالبہ کو پہلے سے وہ عبارت یاد کرادی گئی تھی۔ اس موقع پر بریل نے اپنی جگہ سے اٹھ کر دوفاؤ کے کان میں کچھ کہا۔

دوفاؤ نے مائک پر جا کر کہا۔ "میں دو منٹ میں اس بات کو ثابت کرسکتا ہوں کہ جو کچھ آپ نے ملاحظہ فرمایا ہے اس میں کوئی چالبازی نہیں ہے۔"

پھر اس نے کلاس سے دو طالب علموں کو بلایا اور ان میں سے ایک کو باہر بھیج دیا۔ پھر حاضرین سے درخواست کی کہ کوئی اسٹیج پر آئے۔ ایک صاحب تشریف لائے۔ دوفاؤ نے میز پر رکھی کتابوں کی طرف اشارہ کرکے درخواست کی کہ وہ اس میں سے کوئی عبارت پڑھیں۔ انہوں نے عبارت پڑھی تو اس نابینا طالب علم نے اسے نقطوں سے گتے پر تحریر کردیا۔

اس کے بعد اس نے باہر والے طالب علم کو طلب کیا اور اس سے نقطوں کی تحریر پڑھنے کو کہا۔ اس نے گتا لیا اور انگلی پھیر کر وہ عبارت من و عن سنادی۔ اب تو سب کو یقین آگیا کہ بریل کے نقطوں والے رسم الخط میں کوئی چالبازی نہیں ہے۔ انہوں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر والہانہ انداز میں تالیاں بجائیں اور بریل کو خراج تحسین پیش کیا۔ ایک دو نے لوئی بریل زندہ باد کے نعرے بھی لگائے۔ بریل خوشی سے رو پڑا۔

بریل کا دورِ ابتلا ختم ہوچکا تھا۔ مگر اس کا جسم کمزور ہوچکا تھا اور تپ دق کی بیماری اس پر غالب آرہی تھی۔ اس نے اب طالب علموں کو پڑھانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ بہرحال وہ مطمئن تھا کہ اس کی جدوجہد رنگ لائی اور اس نے اپنی منزل پالی۔

لوگ اب اس کے رسم الخط کی طرف توجہ دے رہے تھے، جب کوئی دقت پیش آتی تھی تو وہ اسے خط لکھتے تھے اور نقطوں کے بارے میں دریافت کرتے تھے۔ متمول اشخاص اس بات پر بھی تیار تھے کہ نقطوں والی کتابیں تیار کرنے کے لیے کوئی چھاپا خانہ بھی ہونا چاہیے۔ انہوں نے دوفاؤ کو اس کے لیے چندہ بھیجنا شروع کردیا۔

بالآخر 1847ء میں مناسب سی زمین خریدی گئی اور عمارت تعمیر کرنے کے بعد اس میں چھاپا خانے کی مشینیں لگ گئیں۔ بہت سے اساتذہ کی خواہش تھی کہ ان کے اسکولوں میں بھی یہی طریقہ رائج کیا جائے۔

لوگوں نے متفقہ طور پر تسلیم کیا کہ اس رسم الخط کا بانی چونکہ لوئی بریل ہے، لہٰذا اس کا نام "بریل" ہی ہونا چاہیے۔ بریل کے لیے یہ خبر خوش کن تھی، اس لیے کہ اس کا خاندانی نام ہی بریل تھا اور اسے شہرت اور عزت مل گئی تھی۔ اس کی عمر حالانکہ 35 برس تھی، مگر وہ اپنی عمر سے زیادہ کا

لگتا تھا۔ بیماری نے اسے چاٹنا شروع کردیا تھا۔ تاہم وہ خوش رہتا اس لیے کہ اس کے کمرے میں طالب علم جمگھٹا لگائے رہتے تھے۔

بریل جب موڈ میں ہوتا اور طبیعت میں بہتری پاتا تو پیانو اٹھا لیتا اور انہیں کوئی مشہور گیت کی دھن سنانے لگتا۔ جب کام نہ کرنے سے اکتاہٹ ہونے لگتی تو سُوا اٹھاتا اور طالب علموں کے لیے بریل سے لکھی ہوئی کوئی نئی کتاب تیار کرنے لگتا۔ وہ ستائش کا امیدوار نہیں تھا اور یہ چاہتا تھا کہ اس کا رسم الخط سارے پیرس پھر فرانس اور اس کے بعد ساری دنیا میں پھیل جائے۔

دسمبر 1851ء میں اسے نزلہ ہوگیا۔ معمولی سا نزلہ تھا، لیکن وہ بڑھ گیا، کھانسی بھی ہونے لگی اور بخار نے اسے آلیا۔ ڈاکٹر آیا اور اس کا مزاج پوچھ کر دوائیں تجویز کیں۔ اس نے دوائیں استعمال کیں، لیکن افاقہ نہیں ہوا۔ اس کی تکالیف بڑھتی چلی گئیں۔ بریل کو معلوم ہوگیا کہ اب اس کا آخری وقت قریب ہے۔

6 جنوری 1852ء کو جب طوفان آیا ہوا تھا، بجلی کڑک رہی اور مینہ برس رہا تھا اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی۔

بریل تب تک اس کی موت تک سارے پیرس میں نہیں پھیلی تھی، اس لیے وہ زیادہ مشہور نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ اس کی موت کی خبر پیرس کے کسی اخبار نے شائع نہیں کی۔ وہ گم نامی کی موت مرا، لیکن بعد میں اس کا نام امر ہوگیا۔ وہ ایک معمولی اسکول کا استاد تھا اور اس کے پاس دولت نہیں تھی۔ نابینا اب بھی اس کے رسم الخط میں لکھی ہوئی کتاب پڑھتے اور اسے دعائیں دیتے ہیں۔

اس کی موت کے بعد لوگ اس کے رسم الخط کو نظر انداز نہیں کرسکے۔ پانچ برس کے بعد فرانس کے ہر اسکول میں اس کے رسم الخط پر کتابیں پڑھائی جانے لگیں۔ امریکا کے ایجوکیشنل ڈیپارٹمنٹ نے اس کا نوٹس لیا اور ہر اعتبار سے اسے نابیناؤں کے لیے مفید و مناسب پایا۔

لوئی بریل کی موت کے تقریباً سات برس کے بعد بریل طریقہ امریکا کے ہر نابینا اسکول میں رائج کردیا گیا۔ پھر تقریباً تیس برس کے بعد یہ رسم الخط سارے یورپ میں پھیل گیا اور یوں ساری دنیا کے نابینا طالب علم اس کی مدد سے کتابیں پڑھنے اور علم حاصل کرنے لگے۔ وطنِ عزیز میں بھی یہ طریقہ رائج ہے۔

لوئی بریل کے آبائی قصبے کے لوگوں نے اس کی یادگار قصبے کے وسط میں تعمیر کی، جو مرمر کے دو ستونوں پر مشتمل ہے۔ ایک طرف لوئی بریل کی تصویر تراش کر لگائی گئی ہے جس میں وہ ایک طالب علم کو پڑھا رہا ہے، جب کہ دوسری جانب ایک جملہ تحریر ہے:

”احسان مند طالب علموں کی طرف سے بریل کی یادگار“

کووے میں یہ جگہ بریل چوک کہلاتی ہے اور ہر لمحہ لوئی بریل کو خراجِ عقیدت پیش کرتی ہے۔ اس کے مکان کو بریل میوزیم میں تبدیل کردیا گیا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ پیرس کے اخبارات نے اس کی موت کی خبر تک شائع نہیں کی تھی، لیکن بریل اب ساری دنیا میں مشہور ہوچکا ہے۔ اس کے حالاتِ زندگی پر سیکڑوں کتابیں شائع کی جاچکی ہیں، ڈاک کے ٹکٹ جاری ہوچکے ہیں، انسائیکلوپیڈیا میں اس پر معلومات ہیں، درسی کتب میں اس پر مضامین ہیں۔

جب اس کا رسم الخط ساری دنیا میں پھیل گیا تو فرانس کی حکومت کو احساس ہوا کہ لوئی بریل کوئی معمولی شخص نہیں تھا، لہٰذا انہوں نے اس کی لاش قصبہ کووے سے نکال کر پیرس کے مشہور و معروف قبرستان پین تھیون میں دفن کی جہاں فرانس کی ذی شان اور عالی مرتب ہستیاں دفن ہیں۔ قصبے کے لوگوں نے جب احتجاج کیا کہ بریل کا تعلق اس قصبے سے ہے تو اس کے جفاکش ہاتھ وہیں دفن کیے گئے جب کہ باقی جسم پین تھیون لے جایا گیا تھا۔

پیرس پہنچتے ہی اس کے تابوت کو احتراماً ساری گلی اور کوچوں میں گھمایا گیا۔ اس موقع پر بینڈ نے ایک المیہ دھن بجائی۔ نامی گرامی اشخاص اور حکومت کے اعلیٰ عہدے داران اس کے تابوت کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ ان میں فرانس کے صدر اور ہیلن کیلر بھی شامل تھی۔ سب سے آخر میں ہزاروں کی تعداد میں نابینا طالب علم ہاتھوں میں سفید چھڑیاں لیے چل رہے تھے، جن کے لیے لوئی بریل اپنی جان سے گزر گیا تھا۔

> 2009ء میں لوئی بریل کی دوسویں برسی منائی گئی۔ اس موقع پر اس کی یاد میں تقریبات ہوئیں اور سمپوزیم منعقد ہوئے۔ بیلجیم اور اٹلی نے یورو کے دو سکے بریل کی یاد میں جاری کیے، جب کہ انڈیا نے دو روپے کا ایک سکہ جاری کیا۔ امریکا نے بھی ایک ڈالر کا یادگاری سکہ جاری کیا۔

وہ جوڈو جیسے کھیل کا ورلڈ چیمپئن بنا۔ کئی گولڈ، برانز اور سلور میڈلز حاصل کیے۔ 1997ء میں اس کو ”آرڈر آف آسٹریلیا میڈل“ دیا گیا۔ آسٹریلیا اور ساؤتھ آسٹریلیا سے ”دہائی کے غیر معمولی کھلاڑی“ کے ایوارڈ لیے۔ وہ لیول۔1 کوچ تھا۔ اعلیٰ درجہ کا مقرر تھا۔ اس نے آٹو بائیو گرافی لکھی۔ ”ناممکن کو کیسے حاصل کیا جاتا ہے۔“

اس کا پورا نام ”انتھونی لارنس کلارک“ تھا۔ عالمی چیمپئن تو بہت ہوتے ہیں۔ مگر انتھونی کلارک میں ایسی ایک خاص بات

بیناؤں کی آنکھیں کھول دینے والا، ایک نابینا کا قصہ

کون کہتا ہے کہ بینائی سے محرومی انسان کو کسی کام کا رہنے نہیں دیتی؟ اس نے نابینا ہوتے ہوئے بھی جوڈو جیسے کھیل میں نام پیدا کیا، ورلڈ چیمپئن بنا۔ اس نے دکھادیا کہ عزمِ صمیم، یقینِ کامل اور فولادی ارادے سے ناممکن کو ممکن بنایا جاسکتا ہے۔

چیمپئن

امجد رئیس

تھی جس کی وجہ سے اسے اہمیت دی جاتی ہے۔ وہ نابینا تھا۔ بالکل نابینا، یقین نہیں آیا...... نابینا موسیقار ہوسکتا ہے، گلوکار ہوسکتا ہے، لکھاری ہوسکتا ہے، شاعر ہوسکتا ہے وغیرہ وغیرہ لیکن وہ جوڈو جیسے کھیل کا چیمپئن تھا۔

☆☆☆

انتھونی نے بھرپور جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ دیا تھا۔ جب نوجوان بے خوف اور نڈر ہوتے ہیں۔ ان کے سینے روشنی اور رنگینیوں سے بھرے ہوتے ہیں اور وہ بلندی پر پرواز کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے مشغلے بھی عموماً خطرناک ہوتے ہیں۔ 1978ء میں انتھونی کی عمر 17 برس تھی۔ تعلیم زیادہ نہیں تھی جس نے اس کے اندر مزید بے خوفی بھردی تھی۔ وہ بائکنگ کرتا تھا۔ بھاری موٹر سائیکل دوڑاتا تھا۔

وہ آسٹریلیا کے کھردرے علاقے کلبرن (Kilburn) میں رہتا تھا۔ اس کی زندگی خوشیوں سے لبریز تھی کہ 1978ء میں جوانی کا دریا الٹا بہہ نکلا اور انتھونی کی طاقت سپنوں اور جوانمردی کو ڈبو گیا۔ ابھی تو وہ پرواز کے لیے پر تول رہا تھا کہ قدرت نے اس کے پر کاٹ دیے۔ زندگی کا رخ یکسر بدل گیا...... یہ رخ اندھی کھائی کی طرف ہوگیا تھا۔

اس رات وہ ایک پب سے شب کا جشن منا کر نکلا تھا اور حسبِ معمول طوفانی رفتار سے کار دوڑا رہا تھا۔ وہ آنے والے لمحے سے بے خبر اور بے پروا تھا۔ دفعتاً کار کا اگلا پہیہ کنارے سے اتر گیا اور انتھونی کو سنبھلنے کے لیے مہلت بھی نہیں ملی۔ کار اڑتی ہوئی ٹیلیگراف پول سے ٹکرائی...... پھر کیا ہوا، اسے کچھ پتا نہ چلا۔ وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ اتنا احساس ضرور تھا کہ وہ زندہ ہے اور کار دوسرے کھمبے کے ساتھ ٹکی ہوئی ہے۔

اس کے ہاتھ گود میں تھے اور چہرے سے ابلنے والا خون اس کی ہتھیلیوں میں جمع ہورہا تھا۔ خون رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ انتھونی کو یقین تھا کہ وہ موت کے منہ میں ہے۔ کچھ دیر کے بعد اس کے حواس معطل ہوگئے۔ پھر اسے لگا کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے اور کار کی چھت پر بیٹھا ہے۔ اس نے نیچے دیکھا کہ ایک آدمی کسی کو ایمبولینس میں منتقل کررہا تھا۔ اس نے غور کیا کہ جس کو ایمبولینس میں ڈالا جارہا تھا وہ انتھونی کلارک خود تھا۔ تو پھر کار کی چھت پر کون بیٹھا تھا؟ کیا وہ مرچکا ہے؟ یہی آخری خیال تھا جس کا جواب کبھی نہیں مل سکا۔

اسپتال میں اسے دو ہفتے بعد ہوش آیا۔ اور جلد ہی بھیانک حقیقت منکشف ہوئی کہ وہ اندھا ہوچکا ہے۔

انتھونی نے کوئی ردِعمل نہیں دیا۔ اسے چپ لگ گئی تھی۔ ایک لمحہ نے اسے آسمان سے زمین پر پٹخ دیا تھا اور اس سے نہایت قیمتی چیز چھین لی تھی، انتھونی کی خاموشی زیادہ دیر برقرار نہیں رہی۔ اسے احساس ہوگیا کہ اس کی سب سے قیمتی شے ابھی تک اس کے پاس ہے۔ اس کا دماغ...... جو پوری طرح کام کررہا تھا۔

انتھونی کی بحالی صحت میں نرسنگ اسٹاف نے نہایت اہم کردار ادا کیا۔ وہ اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتیں، لطیفہ بازی کرتیں...... انہوں نے انتھونی کو بینائی سے محرومی کا احساس نہ ہونے دیا۔ وہ خود بھی اس ہلڑبازی میں اتنا آگے نکل گیا کہ ایک دن اسے سزا کے طور پر ٹوائلٹ میں بند کردیا گیا۔

☆☆☆

انتھونی کلارک نے کل سات ہفتے اسپتال میں گزارے۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کی زندگی ہمیشہ کے لیے بدل گئی ہے۔ اس وقت انتھونی کو پتا نہیں تھا کہ یہ تبدیلی مصیبت کے نقاب میں ایک نعمت ثابت ہوگی۔

بینائی سے محرومی نے اسے نئے سرے سے سوچنے پر مجبور کیا۔ اسے اس حال میں کیا کرنا چاہیے تھا؟ اس سے زیادہ اہم سوال یہ تھا کہ اسی حال میں اسے کیا نہیں کرنا چاہیے؟

کلبرن، ایڈیلیڈ کا مضافاتی علاقہ تھا۔ روایتی طور پر یہاں کی معاشی اور سوشل لائف بھی ایسی ہی تھی۔ حادثے سے قبل انتھونی غلط سوسائٹی میں اٹھتا بیٹھتا رہا۔ علاقہ اور عمر کے اعتبار سے یہ عام بات تھی۔ تشدد، شراب، منشیات اور آوارہ گردی وغیرہ۔ یہاں کے نوعمر لڑکے عموماً انہی حالات میں پلتے بڑھتے تھے۔

حادثے کے بعد انتھونی ''تبدیلی'' کی ناگزیریت کو جلد سمجھ گیا۔ اسے سب سے پہلے اس ماحول سے نکلنا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ'' اس مقصد کے لیے میرے سامنے تین راستے تھے: 1۔ تعلیم، 2۔ رسک، 3۔ حقیقی صلاحیت کی پہچان۔ جہاں تک رسک لینے کا تعلق تھا تو جب میں آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں اپنے کزن مارکس کے ہمراہ بائکنگ کرتا تھا تو مجھ پر یہ حقیقت عیاں ہوئی کہ زندگی کے سفر کی سمت کا تعین صرف اور صرف آپ ہی کرسکتے ہیں۔

تیسرا آپشن صلاحیت کا تھا۔ آخر میری حقیقی صلاحیت کیا ہے؟ ماضی میں میں پاور لفٹنگ اور جوڈو سے کسی نہ کسی حد تک منسلک رہا تھا اور میری خیالی سوئی بار بار جوڈو پر ہی جا کر اٹک جاتی۔ پتا نہیں کیوں؟

☆☆☆

بالآخر انتھونی لارنس کلارک نے جوڈو کے حق میں فیصلہ کرلیا۔ یہ ایک انوکھا فیصلہ تھا۔ انتھونی کہتا ہے کہ اس فیصلے کے پیچھے شاید ''کلبرن'' کا بھی حصہ تھا، جہاں میں پلا بڑھا تھا۔ کیونکہ جوڈو ایک فزیکل اسپورٹس ہے جس میں جسمانی طاقت اور جسامت کی اپنی اہمیت ہوتی ہے۔ دوسرے نابینا حضرات جو اسپورٹس میں آنے کی ہمت کرتے ہیں وہ قدرے سست کھیل پسند کرتے ہیں، جیسے کرکٹ (بلائنڈ کرکٹ) ٹیبل ٹینس، ایتھلیٹکس وغیرہ...... انتھونی نے منطقی اعتبار سے اپنا جائزہ لیا اور بینائی کی محرومی کو سامنے رکھتے ہوئے جوڈو اور ریسلنگ پر غور کیا۔

اس علاقہ میں ایک جوڈو کلب تھا۔ انتھونی نے رجسٹریشن کرائی اور کوچ کو بتایا کہ وہ جوڈو کھیلنا چاہتا ہے۔ اس وقت کوچ اور انتھونی دونوں کو اندازہ نہیں تھا کہ آسٹریلیا نہ صرف ایک ورلڈ کلاس بلائنڈ جوڈو پلیئر متعارف کرانے جارہا ہے بلکہ بینائی رکھنے والے کھلاڑیوں کے خلاف بھی ایک بہترین کھلاڑی وجود پذیر ہے۔

تکنیکی طور پر جوڈو کی کئی قسمیں ہیں۔ جوڈو کے معنی ہیں (Gentle Way)

بحیثیت اسپورٹس جو لوگ جوڈو کی اصلیت سے واقف نہیں ہیں ان کے لیے مختصر تعارف پیشِ خدمت ہے۔ جوڈو میں حریف کو اس طرح پٹخنا ہوتا ہے کہ وہ پشت کے بل زمین پر گرے اور ہار جائے۔ اگر پہلو کے بل گرتا ہے تو لڑائی جاری رہتی ہے۔ دونوں زمین پر ہوتے ہیں، جو 25 سیکنڈ تک حریف کو دبائے رکھتا ہے وہ فاتح قرار پاتا ہے یا پھر آرم لاک کے ذریعے اعترافِ شکست کرالیا جاتا ہے۔ ہار نہ مانے تو بے ہوش ہوکر یا کہنی نکلوا کر ہار جاتا ہے۔

انتھونی جانتا تھا کہ کلب میں وہ واحد نابینا کھلاڑی ہے جسے سیکھنا بھی ہے اور آنکھوں والے کھلاڑیوں سے لڑنا بھی ہے۔ یہ ایک دشوار تر چیلنج کی مانند تھا لیکن انتھونی کے نزدیک اصل چیلنج دوسروں کا منفی رویّہ تھا۔

انتھونی نے زندگی کے ہر پہلو کو منظم کیا اور ہر تکنیک آزمائی۔ جوڈو میں فائٹنگ کے دوران تکنیک کی بڑی اہمیت ہے۔ وہ اپنی تمام منصوبہ بندی میں ضرورت اور خامی کے اعتبار سے ردوبدل کرتا رہتا۔ اس نے کشتیاں جلادی تھیں۔ اس کی بے نور آنکھیں بلند ترین ٹارگٹ دیکھ رہی تھیں۔ اگر وہ یہ ٹارگٹ شیئر کرلیتا تو اسے مزید منفی رویوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ چنانچہ اس نے اپنا ٹارگٹ کسی کو نہیں بتایا۔

انتھونی نے کئی مرتبہ ناممکن کو ممکن کر دکھایا اور اس کی شہرت پھیلنے لگی۔ اس کا کہنا تھا کہ '' قربانی کے بغیر کامیابی نہیں ملتی...... اگر آپ خود کو تبدیل کرنے کی طاقت اور عزم رکھتے ہیں تو میرا ایمان ہے کہ آپ کچھ بھی کرسکتے ہیں۔

انتھونی اپنی کہانی سناتے ہوئے کہتا ہے کہ میرے ابتدائی جوڈو کیریئر میں، میں قومی جوڈو ٹائٹل کے لیے جنوبی آسٹریلیا کی نمائندگی کررہا تھا اور ایسا متواتر چار برس سے ہورہا تھا۔ جلد ہی میرے علم میں یہ بات آگئی کہ سلیکٹرز نے مجھے ٹیم سے باہر کردیا ہے۔ حالانکہ میں ہمیشہ کی طرح کوالیفائی کرکے آیا تھا۔ سلیکٹرز کا فیصلہ خالصتاً اس بنیاد پر تھا کہ میں اس ''لیول'' پر کامیابی سے مقابلہ نہیں کرسکتا۔ یہ اطلاع میرے لیے صدمے سے کم نہیں تھی۔

میں نے اپنے کوچ سے بات کی تو اسے بھی سلیکٹرز کا ہم خیال پایا۔ کوچ کا جواب تھا کہ ''موجودہ ''لیول'' پر تم کامیاب نہیں ہوسکتے۔'' میری دانست میں کسی کوچ کو براہِ راست ایسی بات نہیں کہنی چاہیے۔ اپنے کوچ کی زبان سے یہ فقرہ سن کر مجھے پہلے سے زیادہ شاک لگا تھا اور میں نے دریافت کرلیا کہ میرے علاوہ کسی کو بھی میری صلاحیتوں پر اعتماد نہیں ہے۔

انتھونی کے تجربہ نے اسے سکھادیا تھا کہ اگر آپ خود کو ٹھیک سمجھتے ہیں، اپنی غلطیوں کو جانچ سکتے ہیں اور منزل پر آپ کی نگاہ مرکوز ہے تو جلد یا بدیر آپ خواب کی تعبیر پالیں گے۔

انتھونی نے اسی دن کے بعد نئے سرے سے منصوبہ بندی کی۔ اس نے ایک کوچ پر انحصار کرنے کے بجائے۔ چار کوچ منتخب کیے۔

(a) فٹ نس کوچ۔ (b) ٹیکنیکل کوچ۔ (c) کمپٹیشن کوچ اور سب سے اہم (d) نفسیاتی کوچ۔

اسے پتا چلا کہ اسپورٹس سائیکالوجی کا اسپیشلائزڈ کوچ ایک بہترین دوست ثابت ہوتا ہے۔ دوست بھی اور استاد بھی۔ آپ دنیا کی بیشتر صلاحیتیں حاصل کرسکتے ہیں لیکن خواہش اور جذبہ کے بغیر ان خوبیوں کو ترقی نہیں دے سکتے۔

انتھونی نے مراقبہ کی تکنیک تبدیل کی، ریلیکس Relax ہونا سیکھا۔ تصور کی اہمیت کو مزید وقت دیا کہ دماغ کی اس خوبی کو استعمال کرنا اور سمجھنا کتنا اہم ہے جو بظاہر ایک مذاق معلوم ہوتا ہے کہ آپ تصور میں خود کو عالمی چیمپئن دیکھ رہے ہیں۔

مختصر یہ کہ انتھونی نے جلد ہی سلیکٹرز کو مجبور کردیا کہ وہ اسے ٹورنامنٹ میں حصہ لینے دیں۔ اس دوران ایک طویل وقفہ آچکا تھا تاہم اس کا جوش وجذبہ قائم تھا۔ انتھونی نے ابتدائی تین میں سے دو مقابلے جیت لیے...اور جلد ہی قومی سطح پر جوڈو کا نمبر 3 کھلاڑی بن گیا۔ پھر اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔

1۔ 1996ء کے اٹلانٹا پیرالمپکس (Paralumpics) میں گولڈ میڈل۔

2۔ دو ورلڈ چیمپئن شپ۔

3۔ پانچ سے زیادہ قومی ٹائٹل جیتے۔

4۔ متعدد بار بینائی رکھنے والے کھلاڑیوں کو ہرایا۔

5۔ تھرڈ ڈگری بلیک بیلٹ۔

6۔ بینا اور نابینا کھلاڑیوں کی کوچنگ۔

7۔ قومی اور بین الاقوامی سطح پر متعدد سفر کیے اور اپنے لیکچرز کے ذریعے بے شمار لوگوں کو متاثر کیا۔

آسٹریلیا میں تو دھوم مچ گئی۔ 1997ء میں آسٹریلیا کی حکومت نے اسے ''دی آرڈر آف آسٹریلیا میڈل، ایوارڈ دیا۔

☆☆☆

اسے پیرالیمپئن جوڈو (Paralumpion) کا ماہر تسلیم کرلیا گیا۔

پیرالیمپئن جوڈو، جاپانی مارشل آرٹ جوڈو کی ایک ترمیم شدہ شکل ہے۔ جو نیم نابینا اور نابینا کھلاڑیوں کے لیے مخصوص ہے۔ اس کے اصول وضوابط میں اور عام جوڈو کے اصولوں میں معمولی فرق ہے۔ مردوں کے لیے یہ 1988ء سے منعقد ہو رہے ہیں اور خواتین کے لیے 2004ء سے۔ خواتین کے لیے بعض جگہ 1996ء لکھا ہے۔

پیرالیمپئن جوڈو کو انٹرنیشنل جوڈو فیڈریشن (IJF) منظم کرتی ہے۔ جس میں اسے انٹرنیشنل بلائنڈ اسپورٹس ایسوسی ایشن (IBSA) کا تعاون حاصل ہوتا ہے۔

رولز میں سب سے نمایاں فرق یہ ہے کہ مقابلہ صرف اسی وقت شروع ہوتا ہے جب حریف ایک دوسرے کے جوڈو کے مخصوص لباس پر گرفت قائم کرلیتے ہیں۔ یہ گرفت ''کومی کاٹا'' (Kumi Kata) کہلاتی ہے۔ اگر گرفت ٹوٹ جائے تو کھیل.... روک دیا جاتا ہے اور گرفت دوبارہ قائم کرنے کے لیے کہا جاتا ہے۔

مثلاً لیگ سویپد دکاٹا'' اور ''یوکمی'' (Ukeami) وغیرہ۔

مختصر یہ کہ نابینا کھلاڑی کو اپنی سماعت پر زیادہ انحصار کرنا پڑتا ہے اور دیگر حسیات کو تربیت کے ذریعے تیز کرنا پڑتا ہے۔ ایسا کھلاڑی اپنے اطرافی ماحول کا بھرپور احساس رکھتا ہے اور اپنی معذوری کے باعث جوڈو کی طوالت سے بچنے کے لیے تربیت، ہائیکنگ اور ''پاور لفٹنگ'' سرگرمیوں کو حذف کردیتا ہے۔

انتھونی کی آخری فائٹ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ اگرچہ افسوسناک ہے۔ تاہم انتھونی کا ردِعمل قابلِ قدر ہے۔

انتھونی کا پانچواں اور آخری پیرالیمپئن، بیجنگ میں تھا۔ اس وقت آسٹریلین لیجنڈ کی عمر 47 برس کی ہوچکی تھی۔ عمر نے اس بوڑھے شیر کو بے بس کردیا تھا۔ 90Kg کلاس میں اسے ابتدا میں ہی دو شکستوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بیجنگ میں وہ سب سے عمر رسیدہ کھلاڑی تھا۔ تاہم اس نے اپنی تکنیک اور تجربے کے جو ہر ضرور دکھائے لیکن اگلے دو مقابلے وہ ہار گیا۔

آخری چانس تھا کہ وہ اسپین کے ویز کوپز کو ہرادے۔ ویز کوپز محض 19 برس کا تھا اور بھرپور فٹ نس رکھتا تھا۔ انتھونی کے حملے ناکام جارہے تھے پھر بھی وہ کئی بار ''ویز کوپز'' کو گرانے میں کامیاب رہا...... تاہم ہر مرتبہ ویز کوپز اس کے دباؤ سے نکل گیا۔

پانچ منٹ کی جھڑپ کا نتیجہ ویز کوپز کی فتح کی صورت میں برآمد ہوا۔

انتھونی گھٹنوں پر ہاتھ رکھے ہانپ رہا تھا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ اس نے خوشدلی سے شکست کو قبول کیا۔ اس کے چہرے پر کہیں مایوسی کی جھلک نہیں تھی۔ وہ ساتھیوں کے ہمراہ راستہ بناتا ہوا ورکرز جم میں کوچ کے پاس چلا گیا۔ انتھونی نے کوچ کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

''شاید خوش کن اختتام ناولز اور فلموں میں ہوتا ہے۔''

اس کے لمبے بالوں سے پسینا اب بھی ٹپک رہا تھا

بصارت سے بصیرت

ڈاکٹر ممتاز عمر

شہر کراچی کے ایک باہمت شخص کا زندگی نامہ جس نے بے بصارتی کی کٹھنائیوں کو ٹھوکروں میں اڑا کر P.H.D کی ڈگری حاصل کی اور یہ بتایا کہ علم کی پیاس اگر ہو تو ہر مشکل آسان ہوسکتی ہے۔ اس کے کالم اخبارات کی زینت بن کر لوگوں کی بصیرت میں اضافہ کرتے اور آج بھی اس کی کتابیں مشعلِ راہ ہیں۔

بے شمار کالموں کے خالق، کئی کتابوں کے مصنف کا ذکرِ خاص

''اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے تم نے اعلیٰ ترین ڈگری حاصل کرکے ممتاز ہونے کا حق ادا کردیا۔ آج تم اپنی کامیابی کا جشن منا رہے ہو اور تمہیں منانا بھی چاہیے کہ تم نے معذوری کے باوجود اس مقام کو حاصل کیا۔ تم میرے چمن کے وہ پھول ہو جو اپنی معاملہ فہمی، انسان دوستی، ہمدردی، قابلیت اور صلاحیت ہی میں ممتاز نہیں بلکہ مشکل حالات میں پریشان نہ ہونے جیسی خوبی میں بھی ممتاز تر ہو۔ تمہاری موجودگی ہر خوشی وغم کے موقع پر تقویت کا باعث ہوتی ہے۔

مجھے فخر ہے کہ تم نے اپنی لگن، محنت اور جستجو سے وہ باب رقم کیا ہے جو خاندان کے بچوں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوگا۔ تم ہمارے لیے حوصلوں کا سامان ہو اور تمہاری کامیابی حوصلہ مند ہونے کی دلیل ہے۔ اس خوشی کے موقع پر مجھے تمہارے والد ڈاکٹر عبدالقدیر اور بڑے بھائی راشد جمال کی کمی از حد محسوس ہو رہی ہے۔ تمہارے لیے دعاؤں سے بہتر تحفہ میرے پاس اور کچھ نہیں ہے۔ میری دلی دعا ہے کہ تم زندگی کے ہر امتحان میں یوں ہی کامیاب رہو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں دنیا و آخرت کی تمام نعمتوں سے نوازے اور تمام پریشانیوں سے بچائے آمین!"

خط کی صورت میں یہ کلماتِ تبریک تھے اور لمحات میری پی ایچ ڈی کی تقریبِ تشکر کا پُرمسرت موقع تھا۔ یہ کلماتِ تحسین والدہ ماجدہ کی طرف سے مجھ جیسے فرزند کے لیے تھے جو اُن پہ جتنا ناز کرے کم ہے کیونکہ میں نے دنیا کے اس کٹھن اور پُرخار راستے پر جس ہمت و حوصلے سے چلنا شروع کیا وہ بیناؤں کے لیے بھی کٹھن ہے۔

میں نے شعور کی آنکھ کھولی تو احساس ہوا کہ شام ڈھلے جو اندھیرا چھا جاتا ہے وہ میری بینائی بھی اچک لے جاتا ہے۔ البتہ دن کی روشنی میں مجھے زندگی معمول پر محسوس ہوتی ہے۔ اس احساس کے ساتھ ہی آج بھی وہ مناظر میرے تخیل میں ابھرتے ہیں کہ میرے والدین جگہ جگہ علاج کے لیے جا رہے ہیں؛ انہوں نے ہر اس جگہ جا کر میرے اور میری بڑی بہن کے علاج کی کوشش کی جہاں انہیں امید کی ہلکی سی کرن نظر آئی۔ لیکن میری کم نگاہی کم ہوتے ہوتے بالکل ہی روشنی کے احساس تک معدوم ہو کر رہ گئی۔ یہ وہ دور تھا جب میرے ہم عمر ساتھی چاند کی روشنی میں دوڑتے بھاگتے اور نت نئے کھیلوں میں مصروف ہوا کرتے تھے مگر میں ان ہی کی ہمراہی کا دعویدار ہوتے ہوئے بھی قدم ملا کر چلنے یا دوڑنے سے خوفزدہ تھا کیونکہ اکثر دیواروں اور ستونوں سے ٹکرا کر گر جاتا تھا۔ وہ میرے لیے ذرا دیر ٹھہرتے اور پھر کھیل میں مگن ہو جاتے۔

میں نے اپنا تعلیمی سفر بینا بچوں کے ساتھ ہی شروع کیا تھا۔ ہاں! کبھی کبھی جب بادل گھرے ہوں اور ماحول میں اندھیرا سا چھا گیا ہو تو بلیک بورڈ پر لکھی عبارت نہ دکھتی تھی۔ اسکول سے چھٹی ہوتی تو راہیں مسدود نظر آتیں، تب میں ٹکراتا اور سہارا ڈھونڈتا گھر کی راہ لیا کرتا، مگر ایسے موقع تو کبھی کبھی آتے۔ یوں زندگی اپنی ڈگر پر چلتی رہی یہاں تک کہ انٹر کا امتحان میں نے روشنی کے ساتھ دیا۔ اس کے بعد بصارت کا وہ دیا کیا بجھا کہ مجھے سائنس کے مضامین کو خیرباد کہہ کر آرٹس کے مضامین اختیار کرنے پڑے۔ ان راہوں میں جس ہستی نے ان مٹ نقوش چھوڑے وہ میرے بڑے بھائی راشد جمال تھے۔ وہ میرے دوست، غمگسار، ہم جماعت اور سب سے بڑھ کر میرے مددگار بھی تھے۔ بلاشبہ برادرانہ شفقت و محبت کا حق ادا کر گئے۔ والدین کے علاوہ دیگر بہن بھائیوں نے مجھے اپنی اس معذوری کا احساس نہ ہونے دیا اور جو کچھ میرے لیے کر سکتے تھے کیا۔ کہیں آنا جانا ہو یا امتحان کے لیے اسباق کی کیسٹوں میں ریکارڈنگ، ان کا تعاون شامل رہا اور آج بھی وہ میرے ممد و معاون ہیں۔

اگر یہ سب دکھ سکھ کے ساتھی نہ ہوتے تو زندگی کا سفر اس معذوری کے ساتھ گزارنا کس قدر مشکل ہوتا اس کا اندازہ مجھے گاہے بہ گاہے ہوتا رہا ہے۔ اور پھر مجھے معاونین ملتے گئے اور میں نے بی۔ اے کے بعد جامعہ کراچی سے اردو ادب میں باقاعدہ طالبعلم کی حیثیت سے ایم اے کرلیا۔ سندھ پبلک سروس کمیشن کے امتحان میں کامیابی کے بعد مجھے میرٹ پر ایک کالج میں لیکچرار کی ملازمت مل گئی۔

ایم اے کے دوران ہومیو پیتھک کا ڈپلوما ڈی، ایچ ایم ایس مکمل کیا تو میرے ہم جماعتوں نے ایک محفل جمائی جس کا مقصد میری خصوصی حیثیت کے باوجود جد و جہد اور کامرانیوں کا اعتراف کرتے ہوئے حوصلہ مندی اور آگے بڑھنے کے لیے مہمیز دینا تھا۔ میں نے بھی ملازمت کے فوراً بعد تمام ہم جماعتوں کو جامعہ کراچی کے شعبۂ اردو کے سیمینار میں ایک دعوت پر مدعو کیا جس میں طلبا و طالبات کے ساتھ مشفق اور مہربان اساتذہ نے بھی ہمت افزائی کی خاطر شرکت کی۔ اس تقریب میں صدر شعبۂ اردو پروفیسر جمیل اختر خان نے ارشاد فرمایا "ممتاز عمر تمہارے نام کے ساتھ ڈاکٹر کا سابقہ موجود ہے کیا ہی اچھا ہو تم اپنی محنت، صلاحیت اور جد و جہد کے ذریعے اسے ادب کے ڈاکٹر میں تبدیل کرلو۔"

پی ایچ ڈی کی تکمیل کا خواب آنکھوں میں سجائے محکمانہ اجازت کے حصول کے بعد میرے محسن و مشفق استاد پروفیسر ڈاکٹر سید محمد یونس حسنی نے نگراں ہونے کی ہامی بھری۔ "نسیم حجازی کی تاریخی ناول نگاری کا تحقیقی و تنقیدی تجزیہ" میرے مقالے کا عنوان قرار پایا۔ جب اس کی مشکلات کا اندازہ ہوا تو مجھے حوصلہ دینے والوں میں جہاں میرے والدین اور بہن بھائی تھے وہاں شریکِ حیات بھی تھیں۔ اسماء پروین 1992ء کے اواخر میں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو کر میری دم ساز و غمخوار بنی تھیں۔ یہ موقع بھی بڑا عجیب تھا۔ میرے گھر والے میرے لیے شریکِ حیات کے متلاشی تھے، سرکاری ملازمت ہونے کے باوجود رشتے کے حصول میں راہیں مسدود پائیں۔ کم و بیش ہر رشتے دار نے بیگانگی کا رویہ اپنا لیا تھا۔ رہے غیر تو وہ بھی دیکھتے بھالتے ایک نابینا سے اپنی بینا بیٹی بیاہنے میں کترا رہے تھے۔ بلاشبہ دو در جن گھرانوں نے ایک بار آنے کی زحمت کی اور پھر ایسے پلٹے کہ ادھر کا رخ نہ کیا۔

ربّ العالمین نے میرے لیے بھی جوڑا بنایا تھا اور بنت امین اسماء ممتاز بن کر میری زندگی میں سحر کی طرح نمودار ہوئیں۔ شادی کے کوئی تین ماہ بعد ربِ ذوالجلال کے خصوصی فضل و کرم سے ہم دونوں ماہِ صیام کی لیلۃ القدر میں حرم کعبہ کی دید کو جا پہنچے۔ وہیں ختم قرآن میں شریک ہوئے اور پھر مدینۃ النبی روانہ ہوئے جہاں قمرِ عید نمودار ہوا۔ عید کی خوشیاں اس وقت دوبالا ہوئیں جب روضۂ رسولؐ پر حاضری بھی نصیب ہوئی۔ حرمین و شریفین کا یہ مبارک سفر اس اعتبار سے منفرد تھا کہ رشتۂ ازدواج کے بعد یہ ہماری پہلی عید تھی۔

تحقیقی کام کے لیے رجسٹریشن تو 1994ء میں ہوا مگر ابتدائی تین سال میں کام ترتیب و تنظیم کے ساتھ نہ ہو سکا۔ کسی ایسے معاون کی تلاش تھی جو میرے لیے معاون و مددگار ثابت ہو اور پھر میری ایک شاگرد شازیہ اسد نے یہ مشکل آسان کردی۔ یوں کام کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ کام شروع ہوا تو پھیلتا ہی چلا گیا جسے ترتیب دینے کے لیے ایک اور معاون صبا کوثر کی خدمات بھی حاصل کرنا پڑیں۔ نسیم حجازی کی شخصیت و تحریروں سے میں دورِ طالبعلمی ہی میں خاصا متاثر ہو چکا تھا اس لیے ایم اے کے بعد ہی اس راہگزر پر خراماں خراماں مسافت کا آغاز کر دیا تھا۔ 1992ء میں جب وہ زندہ تھے میں نے ان سے ملاقات کی اور بہت سی معلومات ٹیپ ریکارڈر کی مدد سے کیسٹوں میں محفوظ کر لی تھیں۔ دورانِ تحقیق اندازہ ہوا کہ میرا سرمایہ تو ناکافی ہے اس لیے ایک بار پھر رختِ سفر باندھا اور لاہور سے ہوتا ہوا راولپنڈی جا پہنچا جہاں نسیم حجازی تو موجود نہ تھے کیونکہ وہ اس جہان فانی سے کوچ کر گئے تھے۔ ہاں! ان کے اہلِ خانۂ اعزہ، رفقا اور مختلف کتب خانوں سے معلومات لے کر واپس لوٹا۔ جوں جوں کام آگے بڑھا اک خوف اور دھڑکا سا بھی لگا رہا کہ انجام کار کیا ہوگا؟ تحقیق و تنقید کا یہ کام جان جوکھوں کا ہے جسے کرنے کی سکت بینا ہی نہیں پاتے تا آنکہ ایک نابینا اس مشکل راہگزر پر عازمِ سفر ہوا ہے۔ میں اکثر اس تشویش میں بھی مبتلا ہو جاتا کہ کہیں ایسا نہ ہو راستے ہی میں اپنا سفر ادھورا چھوڑ دوں۔ مگر میں نے تمام تر مسائل اور محدود وسائل کے باوجود اپنا سفر جاری رکھا حالانکہ اپنی محدود تنخواہ میں گھر چلانا اور اس راہ کے اخراجات بھی برداشت کرنا ایک مشکل کام تھا۔

مقالہ تیار ہوا اور جمع کرا دیا گیا۔ اس کی ایک کاپی ہندوستان اور ایک برطانیہ (لندن) بھیجی گئی اور وہاں موجود اساتذہ سے رائے لی گئی اور زبانی امتحان یکم ستمبر 2003ء کو ہوا۔ 19 ستمبر 2003ء کے اخبارات میں کامیابی کا اعلان شائع ہوا۔ اس کام کے دوران مجھے ہر ہر موقع پر بہت

ٹیرف

حکومت کی طرف سے مختلف درآمدی اشیا پر عائد کردہ محاصل کی فہرست یا گوشوارہ۔ شروع میں درآمدی محاصل محض آمدنی کی خاطر ہی عائد کیے جاتے تھے، مگر بعد میں یہ ملکی صنعت و حرفت میں بہت ممد ثابت ہوئے، کیونکہ ان کی وجہ سے غیر ملکی مال کی درآمد میں کمی ہو گئی اور ملکی صنعت کو مقابلہ بازی سے تحفظ حاصل ہو گیا، خصوصاً صنعتی طور پر پسماندہ ممالک تو ملکی صنعتوں کے فروغ کے لیے بہت زیادہ شرح پر یہ محاصل عائد کر دیتے ہیں، تاکہ غیر ملکی مال بہت کم مقدار میں آسکے اور ملکی صنعت ترقی کر سکے۔

ان محاصل کے مخالفین اس خیال کے حامی ہیں کہ آزادانہ تجارت، جو ان محاصل سے پاک ہو، اس امر کی ضمانت دے سکتی ہے کہ ہر ملک وہی مال تیار کرے گا جس کے لیے وہ زیادہ سے زیادہ موزوں ہے، نیز ملکی باشندوں کو مناسب قیمت پر مطلوبہ شے مل سکے گی، ورنہ درآمدی محاصل کی صورت میں ملکی خریداروں ہی کو بالواسطہ طور پر زیر بار ہونا پڑتا ہے۔

مرسلہ: احمد یار خان، ساہیوال

سے لوگوں سے تعاون ملا تھا اس لیے میں نے 14 جنوری 2004ء کو اظہارِ تشکر کی خاطر ایک محفل سجائی جس میں اپنے تمام احباب اور معاونین کو مدعو کیا۔ تقریب کے مہمانِ خصوصی سٹی ناظم کراچی جناب نعمت اللہ خان ایڈووکیٹ نے گولڈ میڈل پہنانے کے بعد جب اپنے خطاب میں کہا کہ آج ایک نابینا کو باوجود معذوری کے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کی خوشی میں تمام بینا جمع ہوئے ہیں تو خوب تالیاں بجیں۔ انہوں نے تقریب کا آغاز سورۂ عبس کی ابتدائی آیات کی تلاوت سے کیا جس میں نابیناؤں کی اہمیت و فوقیت کا تذکرہ ہے۔ اس تقریب کے صدر نشیں میرے نگراں اور شعبہ اردو جامعہ کراچی کے سابق صدر پروفیسر ڈاکٹر یونس حسنی تھے۔ انہوں نے کہا کہ ممتاز عمر کا شمار میرے ان شاگردوں میں ہے جن پر استاد ناز کرتے ہیں۔ ان کی محنت بیناؤں کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ہے۔ اس موقع پر رکن قومی اسمبلی اور بابائے کراچی عبدالستار افغانی، کورنگی ٹاؤن کے ناظم عبدالجمیل خاں، نائب ناظم سید اورنگزیب حیدر نے بھی خطاب کیا۔

اس تقریب کے لیے ملک کی اعلیٰ شخصیات وزیراعظم پاکستان میر ظفر اللہ جمالی، اعلیٰ تعلیمی کمیشن کے چیئرمین پروفیسر ڈاکٹر عطاء الرحمٰن، صوبہ سرحد کے سینئر وزیر سراج الحق، سینیٹر پروفیسر خورشید احمد، رکن قومی اسمبلی قاضی حسین احمد، ڈائریکٹر جنرل ہمدرد فاؤنڈیشن فرقان احمد شمسی و دیگر اعلیٰ شخصیات نے پیغاماتِ تبریک ارسال کیے۔ جس شخصیت کا پیغام پڑھ کر سنایا گیا وہ ہستی ہمہ وقت دعاؤں میں یاد رکھنے اور کامیابی و کامرانی کے لیے دستِ دعا بلند رکھنے والی میری ماں کی تھی جس کا تذکرہ میں شروع میں ہی کر چکا ہوں۔ بات یہیں ختم نہیں ہوئی بلکہ میرے کالج پرنسپل اور دیگر بہت سے اداروں کی سفارش پر حکومت پاکستان نے 2004ء میں سول ایوارڈ اور پھر 2008ء میں اعزازِ کمال کے لیے نامزد کیا مگر یہ نامزدگیاں کامیابی کا زینہ طے نہ کر سکیں کیونکہ صدارتی اعزازات کے حصول کے لیے صلاحیت، قابلیت اور خصوصی حیثیت کے علاوہ بھی کچھ اور درکار ہوتا ہوگا مگر میں اس مزید سے بے بہرہ ثابت ہوا۔ حالانکہ ان اعزازات کے حصول سے جہاں ایک طرف عام لوگوں کو عمل کی تحریک ملتی تو علم و دانش سے محبت کرنے والوں کو تحقیقی کام کرنے کے لیے ایک ولولۂ تازہ بھی نصیب ہوتا۔

تحقیقی کام کے دوران میں نے اپنے لیے اس سمت تعین کر لیا تھا کہ قلم و قرطاس کے رشتے کو برقرار رکھوں گا۔ اسی کے زیرِ اثر معاشرتی موضوعات پر کہانیاں لکھنے کے ساتھ ساتھ ادبی موضوعات کو برتنے کی کوشش بھی کی۔ الحمدللہ ملکی و غیر ملکی ہر دو سطح پر میری تحاریر مختلف جرائد کی زینت بنتی رہیں۔ اخبارات میں کالم لکھنے کا آغاز بھی کیا۔ پھر ایک وقت وہ بھی آیا کہ پاکستان کے سب سے بڑے کثیرالاشاعت روزنامہ کے ادارتی صفحے پر میرے کالم باقاعدگی سے شائع ہوئے۔ یہ وہ خواب تھا جس کی تعبیر اتنی جلدی بہت کم لوگوں کو نصیب ہوا کرتی ہے۔ یہ میرے لیے انتہائی فخر و انبساط کے لمحات تھے کہ جب میں ارشاد احمد حقانی، جمیل الدین عالی، زاہدہ حنا، عبدالقادر حسن، جاوید چوہدری جیسے بڑے ناموں کے درمیان اپنی جگہ بنا سکا۔ پھر ملک کے بڑے موقر جرائد، عالمی ترجمان القرآن، ادبیات، پیغام آشنا، قومی زبان، چمن، بتول، خواتین میگزین، افکارِ معلم، سرگزشت، پاکیزہ ڈائجسٹ، اردو ڈائجسٹ میں بھی میری تحاریر کو پذیرائی نصیب ہوئی۔

قلم و قرطاس کے رشتے سے تعلق کے علاوہ میں نے معاشرے کے بچھڑے ہوئے طبقات کے حوالے سے بھی اپنی مصروفیات متعین کیں۔ غریب اور نادار بچوں کی تعلیم، قیدیوں کی اصلاح و تربیت کی غرض سے لٹریچر کی فراہمی اور اعلیٰ تعلیم میں مصروف نوجوانوں کی رہنمائی کو بھی فریضہ جانا۔ ملازمت کے حصول میں کوشاں خواتین و حضرات کی رہنمائی، انٹرویو کی تیاری اور مختلف رہنما اصولوں کے ذریعے ہمہ وقت خدمات پیش کیں تاکہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ملک، قوم کی ترقی میں اپنا حصہ ادا کرتے ہوئے آنے والوں کو نشانِ منزل کی طرف رہنمائی کرتا رہوں۔

تمام تر نامساعد حالات اور اربابِ حل و عقد کی چشم پوشی کے باوجود خصوصی افراد کے لیے یہی پیغام کہ وہ مایوس ہو کر بیٹھنے کے بجائے آگے بڑھیں اور اپنی تعلیمی و دیگر تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ملک و قوم کی ترقی میں اپنا حصہ ادا کریں۔ مصر کے سابق وزیرِ تعلیم ڈاکٹر طٰہٰ اور برطانیہ کے دوسرے نابینا وزیر کی طرح اعلیٰ عہدوں تک پہنچنے کی کوشش جاری رکھیں۔ جو لوگ رک کر، تھک کر بیٹھنے کے بجائے اٹھتے، چلتے اور دوڑتے ہیں منزل انہی کو ملتی ہے۔

مسافر ہوں یارو

کھوند وکار احمد حسن
ترجمہ، زین مہدی

وہ فن کی دنیا کا ایک بڑا نام تھا۔ اس نے "باؤل گیتی" گا کر خوب شہرت حاصل کی تھی۔ اسی شہرت کی بنا پر اسے لندن بلایا گیا تھا، اپنے سفر کی روداد اس نے ایسے دلچسپ پیرائے میں لکھی ہے کہ آخر تک سفرنامے کا لطف برقرار رہتا ہے۔

بینائی سے محروم ایک گلوکار کی دلچسپ سفر کہانی

ضیا الرحمان انترجاتیک بیمان بندر (ضیاالرحمٰن انٹرنیشنل ائرپورٹ) کی زمین کو الوداع کہہ کر بی او اے سی کے دیوہیکل جہاز نے ہوا میں پرواز شروع کر دی۔ کھڑکی سے ضیاالرحمان بیمان بندر کی عمارت چڑیا کا گھونسلا سا نظر آتی اس لیے میں نے ادھر دیکھنے کی ضرورت نہ سمجھی اگر دیکھ بھی لیتا تو بیمان بندر (ہوائی اڈا) کا کیا بگڑ جاتا۔ یوں بھی تیج گاؤں ائرپورٹ بند ہونے اور اس ائرپورٹ کے شروع ہونے تک اسے اتنی بار دیکھا ہے کہ مزید دیکھنے کی تمنا نہیں رہی کیونکہ اس وقت تک آنکھوں میں روشنی اور دل میں آرزو ہوا کرتی تھی جو اب قصۂ پارینہ بن چکا ہے۔ اس لیے اعلان

ہوتے ہی سیٹ بیلٹ باندھ لیا اور آرام سے نیم دراز ہو گیا۔ کچھ دیر تک آنکھیں بند کیے رہا پھر جب جہاز عمودی رخ پر آ گیا تو میں نے اپنی تیسری آنکھ سے (جی ہاں تیسری آنکھ...اب آپ کہیں گے کہ تم ہندو ہوتے جا رہے ہو کہ شیو کی تیسری آنکھ کی تمنا کرنے لگے ہو تو میں بتا دوں، میری تیسری آنکھ احساس کی آنکھ ہے۔ آپ آنکھ والے جو کچھ آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور خود میں بھی بارہ سال کی عمر تک دیکھتا رہا تھا۔ وہی کام اب میں احساس کی قوت سے لیتا ہوں۔ میری پانچوں حسیں اپنا پورا کام کرتی ہیں۔ میں چاپ سن کر بتا سکتا ہوں کہ آنے والا کس قد و قامت کا ہے۔ عورت ہے یا مرد۔ وہ مزید نزدیک آ جائے تو میں اس کی رنگت تک بتا سکتا ہوں کہ وہ گورا ہے یا کالا۔ آپ کو حیرت ہوئی نا؟ مگر جو لوگ میرے ساتھ وقت گزارتے ہیں ان سے پوچھ لیں۔ وہ میری اس خصوصیت کا بطور خاص ذکر کریں گے۔ دراصل اللہ تعالیٰ نے میری آنکھیں چھین کر ذہن کی قوت بڑھا دی ہے۔ صرف بُو سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ کیسا ہے۔ اس لیے کہ ہر انسان کے بدن کی خوشبو الگ ہوتی ہے...... (خیر ان باتوں کو جانے دیں، میں رودادِ سفر سنا رہا تھا) تو میں نے اپنی تیسری آنکھ سے ہمراہیوں کا جائزہ لیا۔ ان میں بہت تھوڑے سے ہم وطن تھے باقی سب وہ تھے جو ہمارا تماشا دیکھنے آتے ہیں۔ ہم غریب لوگ غریب ملک کے غریب شہری ہیں پھر بھی کچھ عجیب دیکھنے ... کی خواہش رکھتے ہیں۔ اس خواہش کی تکمیل کے لیے ٹکٹ لے کر چڑیا گھر کی سیر کرتے ہیں۔ یورپ والوں کے پاس ڈالر' پاؤنڈ' اسٹرلنگ ہے۔ ایک ڈالر ہمارے ساٹھ ٹکا کے برابر ہے یعنی ایک ڈالر میں وہ ساٹھ ٹکا کے مزے لوٹ سکتے ہیں۔ اسی لیے تو یہ سب غول کے غول ہمارے یہاں آتے ہیں۔ ہم نے اپنی حفاظت کے لیے لال باغ قلعہ بنایا۔ عبادت کے لیے مسجدیں بنوائیں طرح طرح کی' آرٹ کی شہکار مسجدیں ... وہ انہیں دیکھنے بھاگے چلے آتے ہیں اور دیکھ کر حیرت کا اظہار بھی کرتے ہیں "ارے یہ تارا مسجد ہے۔ اتنے سارے ستارے گنبد کے اوپر نیچے بنائے کیسے؟ یہ سات گنبد مسجد ہے۔ یہ حسینی دالان ہے۔ یہ بیت المکرم مسجد ہے۔" یہ اور ان جیسی وہ تمام مساجد جن کی وجہ سے ہمارا شہر مسجدوں کا شہر کہلاتا ہے۔ ان کے نزدیک صرف عمارت ہے اور وہ عمارت دیکھنے آتے ہیں۔

لیکن ہمارے لیے اہمیت کا حامل ہیں اس لیے پسند نہیں کہ لوگ انہیں عام عمارتوں کی طرح سمجھیں، پنجروں میں بند جانور دیکھنے جاتے ہیں اور یہ لوگ رہے ہمارے عوام کو دیکھنے آتے ہیں' جو جفاکش ہیں' کے بے رحم تھپیڑوں سے لڑنا جانتے ہیں۔ ان ادھ کو دیکھ کر ان کو تسکین ملتی ہے۔ ان کے تحت الشعور میں کمی کہ جس وقت ہم مسلمان آدھی دنیا پر حکمران تھے اس یہ لوگ غاروں میں زندگی گزارتے تھے۔ ہم ماضی کے کی ترقی و خوشحالی کا گیت گانے والے، وہ ماضی کی تلخیوں بھلانے کی کوشش کرنے والے۔ تبھی تو یہ اپنی انا کی تسکین لیے ہی ہم مسلمانوں کا تماشا دیکھنے آتے ہیں۔ ہمارا سنہرا ان کا اندھیرا ماضی۔ آج ہم غربت کی لپیٹ میں ہیں تو انہی کا عطیہ ہے۔ بغداد سے ہسپانیہ تک ہم سے ہمارا سنہرا انہوں نے ہی تو چھینا ہے۔ اور آج بھی کشمیر و فلسطین میں کھیل کھیل رہے ہیں۔ ہم سے ہمارا مستقبل چھین ہیں۔ ہمیں غریب سے غریب تر بنا رہے ہیں۔

میں ان جیسا سازشی نہیں اور نہ نذرالاسلام جیسا ہوں کہ چیخ چیخ کہتا رہوں "مار رے لاٹھی بھاگ تالا..جو تو شوب بندی شالہ آگون جلا آگون جلا" (مار لات' توڑ دو تالے۔ جتنے بھی قید خانے ہیں سب میں آگ آگ لگا) اور نہ ہی اسلامی شاعر سر محمد اقبال کا شاہین جسے جھپٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا بہ خوبی آتا ہو۔ میں دبی کچلی قوم معصوم سا فرد ہوں اس لیے آہیں بھرتا ہوں اور ان کا تما دیکھتا ہوں۔ مجھے یو کے کی ثقافتی تنظیم نے بلانے کی غلطی کی تھی۔ ہم ان کو گورا کہتے ہیں۔ آخر کو یہ نسلاً گورے نا... گوروں نے ہم پر ایک دو نہیں دو سو سال تک حکومت ہے اسی کا اثر ہے کہ ہم اب تک گوروں کے آگے دم ہلا ر ہیں۔ اگر یقین نا ہو تو نظر بھر کر دیکھ لیں۔ آپ کو گوروں جوتا پالش پر تیار ہمارے بیشمار لیڈر ملیں گے۔ خیر میں بتا ر کہ مجھے یہاں سے دعوت نامہ پہنچا تھا اسی لیے میں نے جلد جلدی بانگلہ دیش بیتار کیندرو (ریڈیو بنگلہ دیش) سے چھٹی تھی اور سفر پر روانہ ہو گیا تھا۔ غلام کی یہی تو پہچان ہے کہ حکم سنتے ہی حکم بجا لائے۔ میں بھی فوراً بی اواے سی کی فلائٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ میرے برابر میں جو محترمہ محو آرام تھیں ان کی ادھ ننگی ٹانگیں شیطان کا بلاوا تھیں (اگر دیکھ سکتا تو لطف بھی مگر اس قوت سے محروم ہوں اس لیے اسی طرح لعنت کی بھیج

ستر سال کی عمر میں پہنچ کر لوگ کرتے ہیں کیونکہ اب ان کے کرنے کو کچھ رہ نہیں جاتا)۔ اس وقت مجھے ابا مرحوم کھندکار فضل علی شدت سے یاد آ رہے تھے۔ وہ ایسٹ پاکستان فوڈز کارپوریشن میں کلرک تھے۔ ساری زندگی قلم گھسنے گزار دی۔ قلم گھسنے سے جو وقت بچتا وہ گھر کی مسجد میں ہر روز بعد نماز مغرب وعظ کرنے میں خرچ کرتے۔ باقی جو منٹ بھر وقت ملتا وہ ہم بھائیوں کو ڈانٹنے پھٹکارنے میں خرچ کرتے۔ ان کے پاؤں میں ہر وقت باٹا کی ہوائی چپل ہوا کرتی تھی جو ان کے پیروں میں کم اور ہم بھائیوں کی پیٹھ پر زیادہ نظر آتی تھی۔ کبھی بڑی آپا کے سر پر پڑتی تو کبھی جلیل الرحمان بھیا کی پیٹھ پر۔ اس ہوائی چپل کا سائز اور اس کی قوت آج بھی میں اپنی پیٹھ پر محسوس کرتا ہوں۔ آخری چوٹ اس دن محسوس کی تھی جب یہ لمبا سہرا باندھ کر ابا اور چاچا متین کے درمیان سائیکل رکشا پر اپنے ماموں کے گھر جا رہا تھا کیونکہ ماموں کا گھر نکاح کے دو بول ادا ہوتے ہی میری سسرال بن جاتی۔ ایک تو گرمی کے دن اس پر دھوپ کی شدت، شیروانی جو یقیناً مجھ سے پہلے ابا اور تینوں چاچا اور شاید دادا کے بھی بدن کی گرمی پا چکی ہوگی اسے مجھے پہنا دیا گیا تھا۔ اس گرمی میں اس سے ابھرتی پتھلین کی بو۔ اس پتھلین کی بو جسے بچپن میں اماں کی نظر بچا کر بکس سے نکال لیتا تھا اور اس سفید گولی کو مٹھی میں بند کر کے خوب سونگھا کرتا تھا وہی اس وقت عجیب حال کیے دے رہی تھی۔ کاغذ کے پھولوں کا سہرا اور اس کی بو دماغ چکرائے دے رہی تھی۔ اس پر غضب یہ کہ سائیکل رکشا کی سیٹ پر بیٹھ نہیں سکتا تھا کہ یہ رسم کے خلاف بات ہوتی۔ مجھے پائیدان پر کھڑا رہنا تھا' سو کھڑا ہوا تھا۔ اور رسم کے مطابق چیخ چیخ کر آتے جاتے لوگوں کو السلام علیکم السلام علیکم کہتا جا رہا تھا۔ اگر رکتا تو فٹ پاتھ پر کھڑے یا برابر سے گزرتے رکشے پر سوار مسافر سلام داغ دیتے اور پھر.... مجھے بھی السلام علیکم کی گردان شروع کر دینی پڑتی تھی۔ سلام کرتے کرتے حلق خشک ہوا جا رہا تھا مگر ابا کو رحم نہیں آ رہا تھا۔ جہاں آواز میں رخنہ پڑتا کہ ابا کا ہاتھ چپل کی طرف بڑھ جاتا۔ ہوائی چپل کی جلن سہنے کا میں متحمل نہیں ہو سکتا تھا اس لیے پھر زور زور سے سلام کرنا شروع کر دیتا۔ نواب پور جیسی بھیڑ بھاڑ والی سڑک پر بھی ابا چوکے نہیں۔ تھکن سے شاید اونگھ آ گئی تھی اور لب پر مہر لگ گئی تھی کہ ابا کا کب ہاتھ نیچے جھکا اور کب ان کے ہاتھ میں چپل آئی میں ادراک نہ کر سکا۔ پتا تب چلا جب وہ چپل میری پیٹھ پر پڑی اور غراتی ہوئی آواز کانوں تک پہنچی "کتے کا بچہ! سنت ادا کرنے میں کوتاہی کرتا ہے۔ جہنم میں جائے گا جہنم میں۔۔۔ لوگوں کی دعائیں لے ورنہ زندہ گاڑ دوں گا۔"

بھری سڑک پر زندہ گڑ ہی چکا تھا۔ شرم محسوس ہونا ضروری تھی۔ اس کٹے پر لوگوں نے نمک چھڑکنا شروع کر دیا "ہاں میاں صاحب ایک ہاتھ اور...... یہ نئی نسل اسلام کو مانتی ہی نہیں ہے۔"

کہنے والے کہتے ہوئے چل دیے اور میں اپنی چوٹ بھلا کر السلام علیکم کی گردان کرنے لگا۔ دل تو چاہا تھا کہ کہہ دیں کہ ابا میں تو اب تک خود کو آپ کا بچہ سمجھتا رہا تھا مگر معلوم تھا کہ اگر زبان پھسلی تو چپلوں کی بارش ہو جائے گی۔ پیچھے والے سائیکل رکشا پر بھائی تھے۔ وہ زور سے بولے "دعا کرو، بھائی دعا کرو میرا بھائی نکاح کرنے جا رہا ہے۔"

گزرتے ہوئے لوگوں نے دعا دینی شروع کر دی۔ بھائی کی غیبی امداد سے گلے کو کچھ آرام مل گیا۔ مگر دل ہی دل میں اس وقت کو کوس رہا تھا جب مامی نے مجھے فریدہ یاسمین کا ہاتھ پکڑے دیکھ لیا تھا۔ کاش میری آنکھیں ہوتیں تو میں دیکھ لیتا کہ اس وقت وہ کمرے کے باہر برآمدے میں براجمان ہیں اور میں ایسی حرکت نہ کرتا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ انہوں نے وحید مراد اسٹائل میں ادا کیے ہوئے ڈائیلاگ نہیں سنے تھے جو میں نے اردو فلم ارمان دیکھ کر یاد کیے تھے (اس وقت اردو فلم دیکھنا خود کو پڑھا لکھا ثابت کرنا جو تھا) ارے آپ سوچ رہے ہوں گے یہ باؤل (ایک خاص قسم کے لوک گیت کا گلوکار) جھوٹا ہے۔ آنکھوں سے محروم لوگ بھی کبھی سنیما دیکھتے ہیں تو میں بتا دوں کہ ایک میں ہی نہیں ہزاروں ... نابینا پابندی سے فلم دیکھنے سنیما ہال جاتے ہیں۔ وہ سن کر ڈائیلاگ کے ذریعے فلم سمجھتے ہیں .. خیر میں مامی کا بتا رہا تھا.... اگر وہ سن بھی لیتیں تو سمجھ نہ پاتیں کیونکہ وہ جب ماموں کی بات سمجھ نہیں پاتی ہیں تو میری بات کیسے سمجھ لیتیں۔ وہ اردو بس اتنا سمجھتی تھیں کہ اللہ اللہ، ماشاءاللہ، سبحان اللہ، خدا حافظ... ان کی اردو اس سے آگے جاتی ہی نہیں تھی۔ مگر انداز سے بہت کچھ سمجھ لیا تھا اور دوڑتی ہوئی اماں کے پاس آئی تھیں۔ عزت کی دہائی دی تھی اور اماں نے فوراً حکم نامہ جاری کر دیا تھا کہ اگلے جمعرات کو نکاح ہوگا۔ یہ ایک ایسی سزا تھی جو تمام عمر بھگتنی پڑتی۔ یہ ایک ایسی سزا ہے

کہ کبھی کبھی ہی قسمت ساتھ دیتی ہے تو گھڑی بھر کے لیے رہائی مل جاتی ہے جیسے آج ملی تھی۔ اسی آزادی کا لطف اٹھانے کے لیے میں ہواؤں کے دوش پر اُڑ رہا تھا۔ بس اُڑے جا رہا تھا، اتنا خوش تھا کہ بیوی نے جو ہدایت نامہ رٹوایا تھا اسے بھی بھول گیا تھا۔ ہدایت نامہ میں تھا کہ فجر پڑھنے ضرور اٹھنا ہے اور کچھ دیر تک اچھل کود یعنی ہلکی پھلکی ورزش کرنا ہے۔ کیونکہ وہ جانتی ہے کہ نماز پڑھوں گا تو نماز بچانے کی کوشش بھی کروں گا۔ نماز پڑھوں گا تو بری نظر پر کنٹرول کروں گا۔ پھیکی چائے پینا ہے۔ مٹھاس کو حرام سمجھنا ہے۔ یہ بیویاں ہوتی ہی ایسی ہیں۔ ڈانٹتی بھی ہیں تو پیار کا ملمع چڑھا کر، زہر کو امرت کہہ کر مگر میں نے سوچ لیا ہے کہ اس بار خوب بد پرہیزی کروں گا۔ اس نے جتنی ہدایت دی ہیں سب کا الٹ کروں گا، لندن کے کیک بڑے مزے کے ہوتے ہیں۔ پیٹ بھر کر کھاؤں گا۔ لندن کی گوری میم کے ہاتھ پیر بھی کیک کی طرح نرم نرم ہوتے ہیں۔ اپنی طرف کی لڑکیوں جیسے پتھر کو شرما دینے والے نہیں کہ گال پر پڑے تو عید کا چاند محرم میں نظر آنے لگے۔

لندن کی لڑکیاں یاد آئیں تو میں نے غیر محسوس انداز میں کھڑے ہونے کے بہانے ہاتھ ہلایا تاکہ برابر میں بیٹھی لڑکی سے چھو جائے۔ وہ شاید آنکھیں بند کیے تھی۔ ہلکی سی بھی کسمسائی نہیں اور میں دوبارہ بیٹھ گیا۔ موسیقی سننے کا انتظام تھا مگر بی اوا سی والے انتہائی بدذوق ثابت ہوئے.... کان میں ائیر فون لگایا تو ایسی چیخم دھاڑ سنائی دی کہ گھبرا کر جلدی سے ائیر فون سے کان کا رشتہ توڑ دیا۔ تمام کے تمام گانے انگلینڈ والوں نے اپنی زبان کے رکھے تھے، ہماری بنگلہ زبان جیسی مٹھاس کسی اور زبان میں کہاں؟ اس لیے خود ہی گنگنا کر مزہ لینے لگا۔ آواز ہلکی رکھی تھی کیونکہ سن رکھا تھا کہ گورے چیختے بھی ہیں تو سرگوشی میں (ہمارے یہاں سرگوشی اسی آواز کو تو کہتے ہیں جسے پڑوسی نہ سن سکے مگر کمرے میں موجود ہر شخص سن لے)۔ میں ابھی گنگنا ہی رہا تھا کہ برابر بیٹھی لڑکی نے بنگلہ میں کہا ”آپ کی آواز بہت سریلی ہے۔“

اس ایک جملے نے مجھ پر گھڑوں پانی ڈال دیا اور میں اپنی قوتِ ادراک پر شک کرنے لگا کہ اس عورت نے مجھے دھوکا دے دیا۔ شاید اس لیے میں صحیح اندازہ نہیں لگا پایا تھا کہ اس نے تیز خوشبو لگا رکھی تھی۔ وہ بنگالی ہے یہ سوچ کر میں نے کہا ”میں بانگلا بیتار کیندرو (ڈھاکا ریڈیو اسٹیشن) کا گلوکار ہوں۔“

”اچھا...... آپ کس قسم کے گیت گاتے ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”میں باؤل سنگیت گاتا ہوں مگر نذرول گیتی اور روبندرو سنگیت بھی گا لیتا ہوں... آدھونک گان بھی گاتا ہوں۔“ میں نے اس پر رعب ڈالنے کی کوشش کی۔

”آپ کا نام کیا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”کھندوکار محمد حسن..“ میں نے مختصر سا جواب دیا۔

اس نے چونک کر مجھے دیکھا تھا کیوں کہ تجسّس کی حرکت صاف پتا چلی تھی۔ پھر اس کی میٹھی آواز سنائی دی۔ ”او ہو آپ ہی کھندوکار محمد حسن ہیں، میں آپ کے گانے سن چکی ہوں... میرا نام ہیلن پیٹرسن ہے۔ میں آپ کے یہاں آدی واسی سماج پر ریسرچ کر رہی ہوں۔۔۔۔ پچھلے تین سال سے بنگلہ دیش آنا جانا ہے۔۔۔ کنٹریکٹ پر کام کرتی ہوں.. ایک ڈاکومنٹری کے لیے بھی کام کر رہی ہوں۔ اس کے علاوہ میری تحریریں اخبارات میں بھی لگتی رہتی ہیں۔“

”میں سمجھ گیا کہ اب یہ میرا دماغ چاٹے گی۔ مجھ سے گرامین سماج“ کے بارے میں پوچھے گی۔ مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اس نے اِدھر اُدھر کی باتوں میں وقت گزار دیا پھر مجھے نیند آنے لگی تو میں نے معذرت کر کے لمبی تان لی۔

☆☆☆

صبح کاذب کا وقت ہو گا جب مجھے ہیتھرو ائیر پورٹ نے خوش آمدید کہا لیکن آواز سنائی نہیں دی تھی، جہاز نے ٹیکسی کی اور رک کر کھڑا ہو گیا۔ سب کے ساتھ میں بھی اترا اور اپنی چھڑی ٹیکتا نیچے اترنے کے لیے آگے بڑھا تھا کہ ایک نرم نازک ہاتھ نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ایک سنسنی سی جسم میں دوڑ گئی۔ اس نے سہارا دے کر نیچے اتارا۔ یہ اس کی ڈیوٹی میں شامل رہا ہو گا مگر مجھے ایک لطیف احساس دے گیا۔ وہ مجھے سہارا دیے ہوئے امیگریشن کاؤنٹر تک لائی اور پھر اس نے کہا ”آپ لائن میں کھڑے رہیں۔ میں ائیر پورٹ والوں سے مدد کی درخواست کرتی ہوں۔ آپ کو مدد دینا ہمارے لیے خوش قسمتی ہے۔ مگر میں ڈیوٹی آف کر چکی ہوں۔“

میں دیگر افراد کے ساتھ کھڑا تھا کہ ایک دوسرے ہاتھ نے میرا ہاتھ تھام لیا اور کاؤنٹر تک پہنچا دیا۔ پتا نہیں کاؤنٹر والے نے کیا سمجھا۔ میرے پاسپورٹ کو دیکھا بھی یوں ہی الگ رکھ کر سوال جواب کرنے لگا۔ وہ بار بار ایک ہی بات پوچھ رہا تھا کہ اگر آپ بینائی سے محروم ہیں تو یہاں اکیلے کیوں آئے ہیں۔ ابھی میں جواب میں بتاتا کہ میرے ساتھ ایک شخص ہے جو اکانومی کلاس میں تھا مگر اس سے پہلے...... ایک جانی پہچانی خوشبو ہوا کے دوش پر آئی۔ میں نے جان لیا کہ ہیلن آرہی ہے۔ قریب آتے ہی وہ آفیسر پر رعب گانٹھنے لگی۔ وہی آفیسر جو کچھ دیر پہلے شیر بنا ہوا تھا ہیلن کا کارڈ دیکھتے ہی بلی بن گیا، وہ بھی بھیگی ہوئی۔ اس نے مہر اٹھائی اور پوری قوت سے ٹھک ٹھک میرے پاسپورٹ پر بجانے لگا۔۔۔ مجبوراً مجھے اس کے آباؤ اجداد کی طرح پاسپورٹ وغیرہ سمیٹنا پڑا۔ فرق اتنا تھا کہ اس کے آباؤ اجداد نے پورے برصغیر سے بوریا بستر سمیٹا تھا اور مجھے اس کاؤنٹر سے اپنے کاغذات وغیرہ۔ وہ لوگ بھی جلدی جلدی برصغیر سے نکلے تھے میں بھی ائیر پورٹ سے برق کی مانند نکلا تھا۔ فرق اتنا تھا کہ میرے ساتھ ایک گوری تھی۔ وہ مجھے ساتھ لے کر آگے بڑھ رہی تھی کہ فاروق آگیا اس کے پیروں کی چاپ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ بھاگتا ہوا آیا ہے۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا تو ہیلن نے پوچھا ”آپ ان کے ساتھ ہیں؟“

یقیناً فاروق نے اثبات میں سر ہلایا ہو گا کیونکہ فوراً ہیلن کی آواز سنائی دی تھی کہ ”آپ انہیں مدد دیں، میں کچھ کام نمٹا لوں۔“ پھر اس کے قدموں کی آہٹ دوسروں کے پیروں کی چاپ میں گم ہو گئی۔

فاروق نے میرا ہاتھ پکڑا اور ٹرالی دھکیلتا ہوا باہر کی سمت چل پڑا۔ اس کو ساتھیوں نے زبردستی ساتھ کر دیا تھا، اس شرط کے ساتھ کہ آمدنی میں اس کا بھی حصہ ہو گا کیونکہ سوائے باتھ روم کے، وہ ہمہ وقت میرے ساتھ رہے گا۔ اس نے باہر پہنچتے ہی سرگوشی کی کہ محترمہ ہیلن صاحبہ محوِ انتظار ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بولی ”میں تو جج کا پتا کرنے گئی تھی، آپ کہاں رہ گئے تھے؟“

میں نے مسکرا کر جواب دیا ”مسافر ہوں ٹھکانے پر نظر تھی۔ جہاں ٹھہرایا جائے گا اس کا پتا کر رہا تھا۔“

”آپ ٹھہرے ہمارے مہمان ---- منزل تک پہنچانے کا وقت نہیں ہے تو کیا ہوا، منزل کا پتا تو بتا ہی سکتی ہوں۔“

میرے لیے یہ بھی بہت بڑی آفر تھی۔ کیونکہ یہاں تو یہ عالم تھا کہ ہر طرف انگریز ہی انگریز تھے۔ ذاتی تجربہ تو نہیں مگر سنتے ہیں کہ انگریز جہاں بھی جاتے تھے، جس ملک کو بھی

بصارت کھوگئی لیکن بصیرت تو سلامت ہے

یوں تو بصارت اور بصیرت کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے لیکن کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ رشتہ قائم نہیں رہتا بلکہ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ یہ دونوں چیزیں ایک ساتھ ہی متروک ہو جاتی ہیں۔ کوئی واقعی بصارت سے محروم ہو جاتا ہے اور کوئی سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی اپنی بصیرت کھو بیٹھتا ہے مگر کچھ لوگوں کے ہاں ایسا نہیں ہے۔ وہ اگرچہ بصارت سے محروم ہیں لیکن بصیرت کے بل بوتے پر آج اس مقام پر کھڑے ہیں جہاں بصارت اور بصیرت رکھنے والے بھی کم کم ہی پہنچ پاتے ہیں۔ اسے بہت سے لوگوں کی داستان حاضر ہے جو بچپن ہی میں بینائی جیسی دولت سے محروم ہو گئے۔ یوں اپنی آنکھوں سے زندگی کی بہاروں اور معاشرے کی ناہمواریوں کو نہ دیکھ سکے۔ زندگی جو جہد مسلسل کا نام ہے ایسے میں اگر کوئی معذوری بھی آڑے آجائے تو پھر یہ جدوجہد کئی گناہ بڑھ جاتی ہے مگر ڈاکٹر ممتاز عمر نے بلاشبہ اپنی معذوری کو مجبوری نہیں بننے دیا اور نہ وہ ہزاروں ایسے افراد کی صف میں شامل ہو جائے جنہیں ہمارا معاشرہ ”حافظ“ کہہ کر پکارتا ہے۔ ان میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو قرآن پاک کے حافظ نہیں ہوتے۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ ہم سب کچھ جانتے ہوئے بھی ناسمجھ بن جاتے ہیں اور ایسے افراد ہماری توجہ کے طالب ہوتے ہیں مگر ہم ان کو دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے ہیں اور اپنے معاشرے کا فرد ہی نہیں سمجھتے۔ الحمدللہ انہوں نے اس فرسودہ نظام اور روایت کے خلاف آواز اٹھائی۔ نہ صرف آواز اٹھائی بلکہ اعلان جنگ بھی کیا۔ یہ اسی بغاوت کا نتیجہ ہے کہ آج وہ ایک کامیاب انسان ہیں۔ آج وہ جس راہ پر جاتے ہیں کامیابی ان کے قدم چومتی ہے یہ آپ ہی کی کوششوں اور راہنمائی کا نتیجہ ہے کہ آج ایسے ہزاروں افراد جو اپنے آپ کو احساس کمتری کا شکار سمجھتے تھے اب ایک خوشگوار اور بھرپور زندگی گزار رہے ہیں اور معاشرہ انہیں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب جنہوں نے خود اپنی زندگی کو انتہائی دشواری گزار اور کٹھن راہوں پر چل کر بسر کیا اب دوسروں کے لیے ایک مثال ہیں اور صحیح معنوں میں ایک ادارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جو مقام و مرتبہ آج انہیں حاصل ہے وہ ان کی جہد مسلسل اور کوشش پیہم کا ثمر ہے۔

مرسلہ: محمد اقبال ہمری

کمزور پاتے تھے اس پر قبضہ کر لیتے تھے۔ میرا ملک تو دور تھا مگر اٹیچی اور سوٹ کیس تو ساتھ تھا۔ اسے دیکھ کر کہیں کسی انگریز کو اپنی روایت یاد نہ آجائے اور وہ بڑھ کر اس پر ہی قبضہ نہ کر لے یہی ڈر کھائے جارہا تھا۔ پھر وہ سب انگریزی بول رہے تھے اور ہمارے یہاں ایم اے اِن انگریزی کرنے کے بعد بھی صحیح انگریزی نہیں آتی ہے۔ میں جو انگریزی بول رہا تھا اس سے اچھی انگریزی یہاں کا بھنگی بول لیتا ہوگا۔ اس شرمندگی سے بھی بچا تھا۔ کیونکہ یقیناً وہ سب مجھے شرمندہ کرنے کے لیے ہی اتنی اچھی انگریزی بولتے ہوں گے۔ اتنی اچھی کہ آدھا لفظ بولتے اور آدھا منہ میں بچا لیتے ہیں۔

محترمہ ہیلن کی عنایت کا شکریہ ادا کرنا ضروری تھا اس لیے میں نے عورتوں کو بے وقوف بنانے کا انٹرنیشنل فقرہ ادا کیا۔ ''یقین کریں میں جھوٹ نہیں بولتا (حالانکہ یہ پورا فقرہ جھوٹ ہے) جو کہتا ہوں سچ کہتا ہوں اور سب سے بڑی سچائی یہ ہے کہ آپ بہت خوبصورت ہیں۔''

اس نے بھی مسکرا کر کہا ''چلیے یقین کیا کیونکہ میں بھی عورت ہوں اور عورت کی سب سے بڑی کمزوری یہی ہے کہ وہ اپنے حسن کی تعریف سننا چاہتی ہے، خواہ وہ جھوٹ ہی کیوں نہ ہو۔'' پھر اس میں اپنے سریلے قہقہے کو بھی شامل کر لیا۔ ''میں یہ... نہیں پوچھوں گی کہ جب آپ دیکھ نہیں سکتے تو میری خوبصورتی کا اندازہ کیسے لگایا۔''

کچھ حد تک اس میں شک نہیں کہ میں نے جو کہا تھا اس میں مبالغہ نہیں تھا۔ کیونکہ میں ایک مرد ہوں اور یہ میری فطرت میں شامل ہے کہ میں صنفِ مخالف میں کشش محسوس کروں اور میں ہیلن میں کشش محسوس کر رہا تھا۔ گو کہ اب وہ زمانہ خواب بنتا جارہا ہے، جب دل میں طوفان اٹھا کرتے تھے پھر بھی اس سے باتیں کر کے اچھا لگ رہا تھا۔ سارے راستے ہم چونچ لڑاتے آئے تھے پھر بھی دل بھرا نہیں تھا۔ کیونکہ وہ انگریزی تھی یعنی مکھن کی ڈلی جیسی تھی اور میں سانولے سلونے دیس کا باشی۔ خیر جناب... اس نے ہمارے میزبان کا فون نمبر مانگا تا کہ انہیں ہمارے آنے کی خبر دے سکے۔ میں نے ان کا نام لکھا تھا کہ میرے ہمزاد فاروق نے کہا ''وہ لوگ آگئے۔''

''تمہیں کس نے بتایا؟'' میں نے فاروق سے پوچھا۔

''ایک شخص اپنے ہاتھ میں پلے کارڈ پکڑے ہوئے ہے، جس پر لکھا ہے ''کھنڈ وکار احمد حسن''۔''

ہیلن نے ہی اشارہ کیا ہوگا یا پھر انہوں نے خود ہی اندازہ لگا لیا ہوگا۔ وہ میرے پاس آکر بولے ''آپ ہی ڈھاکا سے آرہے ہیں؟''

''جی ہاں۔'' مجھ سے پہلے میرا ہمزاد بولا اور میں فاروق کی تیزی پر خوش ہوگیا۔ کاؤنٹر سے یہاں تک خاموش تھا مگر اب اس کی آواز میں تیزی آگئی تھی۔ شاید اس نے پاؤنڈ کو ٹکا سے ضرب دے دیا ہو، میں اسے جو دیتا وہ اس کے ایک ماہ کیا ایک سال کی تنخواہ کے برابر ہوتا۔ اسی تصور نے اس کی آواز اور دماغ میں تیزی بھر دی تھی، یا پھر وہ اتنے لمبے سفر سے اکتا گیا ہوگا۔ جس طرح میں ٹائپ رائٹر پر انگلیاں چلاتے چلاتے تھک جاتا ہوں۔

''ہم آپ کو لینے آئے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''یہ تو خوشی کی بات ہے'' میں نے اخلاقاً کہا۔

''میں چلتی ہوں۔'' ہیلن کی آواز آئی اور میرے دل نے چپکے سے کہا ''ہائے'' مگر کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اسے تو جانا ہی تھا۔ اب میں ان لوگوں کے حوالے تھا جو مجھے لینے آئے تھے۔ ان میں سے کسی نے کہا ''اپنا بیگ مجھے دے دیں...... یہ ڈیوٹی میری ہے۔''

مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی۔ اس سے زیادہ خوشی تب ہوئی جب وہ گورا میرے بیگ کو اٹھا کر چلا۔ دو سو سال تک ہم ان کے غلام تھے آج وہ میری غلامی کر رہے تھے۔ اس خوشی میں پھولے نہ سمائے اور فاروق کا سہارا لے کر وین کی طرف بڑھے۔ وین میں بیٹھے اور منزل کی جانب چل پڑے۔

وہ صاحب ہمیں ایک بند وین میں ٹھونس کر ایک بڑے سے ہوٹل کی چوتھی منزل کے کمرے تک لے آئے۔ وہاں بہت سارے لوگ دروازے پر میرے منتظر تھے۔ پتا چلا کلکتہ سے انیل گانگولی بھی آئے ہوئے ہیں۔ انیل سے میری پہلی ملاقات ڈھاکا میں ہی ہوئی تھی۔ ویسے اسے غائبانہ طور پر میں بہت پہلے سے جانتا تھا۔ ''آدھونک گان'' کے لیے وہ ایک جانا پہچانا نام ہے۔ اس کے کئی گانے میں بھی لوگوں کی فرمائش پر سناتا رہتا ہوں۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی اپنی سریلی آواز میں کہا ''دادا.. مجھے بہت خوشی ہے کہ آپ سے ملاقات ہوگئی.... اب وقت بھی اچھا گزرے گا اور ان لوگوں کو مشورہ دوں گا کہ ہم سے ڈیوٹ گوایا جائے۔'' ''حسن راجا رگان'' ہم ساتھ گائیں گے۔''

باتیں ابھی اور چلتیں کہ میزبانوں میں سے کسی نے کہا ''اندر تو چلیں۔''

تب مجھے احساس ہوا کہ ہم دروازے پر کھڑے ہیں۔ میرے ہمزاد نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے اندر کی جانب لے کر چلا۔ کمرے میں آتے ہی احساس ہوا کہ وہ ایک کافی بڑا کمرا ہے اور اس کمرے میں کئی بستر لگے ہوئے ہیں۔ مجھے سہارا دے کر اس بستر پر پہنچایا گیا جو میرے نام پر الاٹ تھا، جس پر لیٹ کر مجھے آرام کرنا تھا مگر اس کی امید کم تھی۔ اس لیے کہ مانچسٹر سے انور آنے والا تھا۔ وہ ''پلی گیت'' گایا کرتا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ ایک ٹریولنگ ایجنسی چلاتا ہے۔ جب وہ بولنے پر آتا تھا تو بے تکان بولتا چلا جاتا تھا۔ پردیس میں رہنے والے دیس کی محبت میں مرتے رہتے ہیں مگر دیس میں پہنچتے ہی ان کی حب الوطنی دم توڑ دیتی ہے۔ وہ بچپن سے مانچسٹر میں پلا بڑھا تھا اس لیے وطن سے اسے بہت محبت تھی۔ اپنی زبان سے محبت تھی۔ یورپ بھر میں کہیں بھی ''سانسکرتیک انوشٹھان'' (ثقافتی پروگرام) ہوتا ہے تو اس میں اس کی شرکت یقینی ہے۔

انیل گانگولی نے مجھے سگریٹ دیتے ہوئے کہا ''لو بھائی چار مینار پیو اور سینہ جلاؤ۔''

اپنے یہاں کا بگلا مارکا سگریٹ اس جیسا ہی ہوتا ہے اس لیے میں نے سگریٹ لے کر کش لگایا اور پوچھا ''دادا وہاں کے کیا حال ہیں...... قاضی شبو شاچی کیسا ہے۔'' (شبو شاچی قاضی نذر الاسلام کے بیٹے کا نام ہے جو ماں کی وجہ سے ہندو بن گیا)

''اس کا کیا پوچھنا... وہ خوش ہے......'' اس نے بے دلی سے جواب دیا۔ میں نے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا کیوں کہ مجھے یاد آگیا تھا کہ اس کی اور شبو شاچی کی بنتی نہیں ہے۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد میں لیٹ گیا اور پھر پتا نہیں کس وقت نیند آگئی۔

صبح اٹھا تو انیل گانگولی بھی اٹھ چکا تھا۔ مجھے بیدار ہوتے دیکھ اس نے کہا ''دادا مونی! بی بی سی چلنا ہے؟ میں نے اپائنٹ منٹ لیا ہے۔''

یہاں آکر بی بی سی نہ دیکھا جائے تو بیکار ہے۔ اس لیے ناشتا کر کے ہم بھی اس بلڈنگ کو دیکھنے کی چاہ میں نکل پڑے جہاں بیٹھے لوگ برصغیر کے سیاسی ماحول کو گرم کرتے ہیں۔ انیل گانگولی کے سہارے میں نے اس بلڈنگ کے داخلی دروازے کو پار کیا۔ یہاں اردو سروس، ہندی سروس کے علاوہ برصغیر کی دیگر زبانوں کے شعبے بھی کام کر رہے ہیں۔

ڈیانا (Diana)

ڈیانا گورسکایا (Gurtskaya)

2 جولائی 1979 میں جارجیا میں پیدا ہوئی۔ وہ پیدائشی نابینا تھی۔ شروع میں اس نے اسپیشل ایجوکیشن میں داخلہ لیا پھر میوزک کی طرف چلی گئی۔ 10 برس کی عمر میں اسٹیج پر پہلی پرفارمنس دی اور سامعین کے دل جیت لیے۔ اس کی آواز بے مثال تھی۔ اس کی خواہش اور محنت نے اسے بلند کرنا شروع کیا۔ 1995ء میں نوعمر گلوکاروں کے ساتھ میکسیکو میں پرفارم کیا اور جیوری سے اسپیشل پرائز حاصل کیا۔ اس کی خواہش تیز تر ہوتی گئی اور ٹیلنٹ نکھرتا گیا۔ 1999 میں گریجویشن کے بعد ڈیانا نے خود انحصاری کے تحت اپنا کیریئر شروع کیا اور اسے اعزازات اور ایوارڈز ملنا شروع ہوگئے۔ اس نے دیگر ممالک سے بھی ایوارڈ حاصل کیے۔ جارجیا سے Honour Award بھی حاصل کیا۔ ڈیانا رشین فیڈریشن کی بھی اونرڈ آرٹسٹ تھی۔ اس کے علاوہ یوکرائن اور ساتا باربرا وغیرہ میں بھی مقبولیت رکھتی تھی۔

ڈیانا کی شہرت کا سورج مغرب میں بھی طلوع ہوا۔ امریکا، کینیڈا، اسرائیل میں بھی شہرت خوب پھیلی۔ اس نے وقت کے نامور گلوکاروں کے ساتھ ڈوئٹس کیے۔ مثلاً رے چارلس، ڈیمس روسوس، ٹوٹو کیٹگنو وغیرہ۔ اس نے خیراتی اور فلاحی کاموں میں بھی حصہ لیا۔ جون 2007ء میں ماسکو کے ایک مشہور وکیل سے شادی کرلی۔ ڈیانا رشین اکیڈمی آف تھیٹریکل آرٹ سے وابستہ ہے۔

مرسلہ: سعدیہ طیب، خیرے وال (پھالیہ)

ہمیں بنگلہ کے شعبے میں جانا تھا سو پہنچ گئے۔ سب سے پہلی ملاقات نیمائی سنیال سے ہوئی۔ اتفاق سے وہ بکرم پور ڈھاکا سے تعلق رکھتے تھے لیکن تعلیم کا میدان انہوں نے مدنا پور بھارت میں سر کیا تھا اس لیے بھارتی کہلاتے تھے۔ ان کے ساتھ دلیپ بنرجی تھے وہ بھی بھارتی تھے۔ یہ دونوں ہی تقسیم کی وجہ سے مشرقی بنگال چھوڑ کر مغربی بنگال چلے گئے تھے۔ دونوں ہی پُرتپاک انداز میں ملے تھے مگر مجھے وہ خوشی نہیں تھی جس کا میں متلاشی تھا۔ ابھی باتوں کا دور چل ہی رہا تھا کہ پنجابی (کرتہ) پاجامہ میں ملبوس ایک صاحب آن وارد ہوئے۔ وہ میرے نام سے واقف تھے۔ اپنا تعارف کراتے ہوئے بولے "لوگ مجھے احمد حسین بھوئیاں کہتے ہیں" یہ سنتے ہی میں اٹھ کر ان کے سینے سے لگ گیا۔ وہ بہت پہلے ڈھاکا سینٹر میں ہوتے تھے تب بنگلہ دیش بیتار کیندرو، ریڈیو پاکستان ڈھاکا کہلاتا تھا۔ ان کی آواز میں ایسی کشش تھی جو بھلائے نہیں بھولتی۔ 1965ء کی پاک بھارت جنگ کے وقت میں بہت چھوٹا تھا مگر جب وہ بتاتے تھے کہ پاک فوج نے ان ان جگہوں پر فتح حاصل کی ہے اس وقت ایسا لگتا تھا جیسے وہ خود بھی فوج کے ہمراہ ہیں۔ ہماری قوم کی بدقسمتی کہ اس نے ایسی گرجدار مگر سریلی آواز کی قدر نہ کی اور انہیں غدارِ وطن قرار دے دیا۔ وہ بحالت مجبوری بوریا بستر لے کر لندن آبسے۔ اب وہ برطانوی شہری ہیں۔ نہ بنگلہ دیشی، نہ پاکستانی۔ کیونکہ بنگلہ دیشی انہیں پاکستانی کہتے ہیں اور پاکستانی انہیں بنگالی۔ گویا یہ اِدھر کے ہیں نہ اُدھر کے، اس لیے لندن واسی بن گئے ہیں۔

بھوئیاں صاحب سے مل کر مجھے جو خوشی ہوئی وہ بتا نہیں سکتا۔ ان کے بعد کئی اور لوگوں سے بھی ملاتب پتا چلا کہ یہاں آدھے اسٹاف بنگلہ دیشی ہیں اور آدھے انڈین۔ ہم کیفے ٹیریا میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ ایک لطیف خوشبو کا جھونکا آیا اور میں سمجھ گیا کہ کوئی حسینہ آ رہی ہے۔ تعارف کے بعد معلوم ہوا کہ اس کا نام نورالنہار ہے۔ یہ بھی ڈھاکا سے آئی ہیں اور ریسرچ سیکشن سے منسلک ہیں۔ اندازے سے جان لیا کہ اس کا خوب گورا رنگ ہے، لمبا پورا قد ہے تو یقیناً بڑی بڑی گہری جھیل جیسی آنکھیں ہوں گی جن میں ڈوب جانے کو دل کرنے لگے۔ کاش میں شادی شدہ نہ ہوتا یہ بات میں نے ہنستے ہنستے کہی بھی تھی۔ ہوا یہ تھا کہ ستار، بھوئیاں، ممتاز حسن، نیمائی سنیال، انیل گانگولی، پرتھوی چکرورتی وغیرہ کے ساتھ گپ لگا رہا تھا کہ نورالنہار نے پوچھا "آپ کی شادی ہوگئی؟"

"بہت افسوس ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"جی میں سمجھی نہیں؟ کس بات کا افسوس ہے؟" نورالنہار نے حیرت بھری آواز میں کہا۔

"اپنے شادی شدہ ہونے کا۔ دراصل جب میری شادی کے لیے اماں بہنیں لڑکیاں دیکھتی پھر رہی تھیں تو ہر اس لڑکی کے باپ نے ایسی تمام لڑکیوں کو چھپا دیا تھا جو آپ جیسی حسین تھیں۔"

اس نے مسکرا کر کہا۔ "دوشٹو۔" گویا اس نے شریر کہہ کر دل کی بھڑاس نکال لی۔ اگر یہی جملہ میں اس سے ڈھاکا میں کہتا تو یقیناً اس کا ہاتھ اپنی چپل کی طرف بڑھتا۔ گویا اس نے انگریزوں کی معاشرت کو قبول کرلیا تھا جہاں کا ہر نوجوان ہر دوسری لڑکی کے لیے ہاتھوں میں اپنا دل لیے پھرتا ہے، اب یہ اور بات ہے کہ ہم دل پیش کرتے ہیں، انگریز لڑکے جسم۔

"آپ اس کی بات پر مسکرا رہی ہیں۔" انیل کی آواز سنائی دی تو میں سمجھ گیا کہ اس لڑکی نے مسکرانے میں انگریزوں کی بھرپور نقل کی تھی جو مسکراتے وقت بھی بخل سے کام لیتے ہیں اور گفتگو میں تو بخیلی کی آخری حد پر نظر آتے ہیں۔ کوئی کام ہوا تو بات کرلی ورنہ خاموش رہے۔

میں نے چائے کا سپ لیتے ہوئے کہا۔ "تو گویا تم مجھے سمیلن تک لے جانے کی مہم ادا کرو گی۔"

"تو کیا آپ سمیلن میں شریک ہونے سے مفر کی راہ تلاش کر رہے ہیں؟ اگر یہ سچ ہے تو جان لیں کہ جتنے پونڈز آپ پر خرچ ہوئے ہیں وہ پروگرام منعقد کرنے والے چمڑی ادھیڑ کر وصول کرلیں گے۔" نورالنہار نے کہا اور اس کی کھلکھلاہٹ گونجی۔

اس کی اس قاتل مسکراہٹ نے مجھے مزید گھائل کیا اور میں بولے بغیر نہ رہ سکا۔ "کوی گرو (رویندر ناتھ ٹیگور) نے تمہاری ہنسی دیکھ کر ہی "چول ایرہاشی" جیسی کویتا لکھی ہوگی۔"

وہ مصنوعی غصے سے بولی۔ "تو کیا میں اتنی عمر والی ہوں کہ کوی گرو نے مجھے دیکھا۔"

"نہیں نہیں اس سے کچھ کم ہو۔" میرا جملہ بھولپن سے لبریز تھا۔

"بات ایک ہی ہوئی یعنی کہ میں بڈھی لگ رہی ہوں۔"

"آپ کہتی ہیں تو میں بڈھی مان لیتا ہوں۔" کہہ کر میں نے قہقہہ لگایا مگر فوراً احساس ہوگیا کہ مجھ سے غلطی ہوگئی ہے۔ یہ ڈھاکا نہیں لندن ہے اور یہاں ہنسنے پر پراشتنگ ہے۔ صرف مسکرانے کی اجازت ہے۔ یقیناً لوگ مجھے مڑ مڑ کر دیکھنے لگے ہوں گے۔

"آپ ہیں مزے دار آدمی۔" اس نے یہ جملہ بھی کابوری (ڈھاکا کی فلمی اداکارہ) کے اسٹائل میں ادا کیا پھر بولی۔ "تو آپ سمیلن میں چلنے کے لیے تیار رہیں گے۔ میں ٹھیک وقت پر آجاؤں گی اور آپ کو ساتھ لے کر گیارہ بجے تک ہال میں پہنچ جاؤں گی۔ کسی اور سے آپ مدد نہیں لیں گے۔ جب تک آپ یہاں ہیں میں آپ کی گائیڈ بنی رہوں گی۔"

"آپ بے فکر رہیں، میں ساڑھے دس بجے کمرے سے نکل کر لاؤنج میں آجاؤں گا۔"

"یاد رہے کہ یہاں ساڑھے دس کا مطلب ساڑھے دس ہی ہوتا ہے۔ یہاں بنگلہ دیش اسٹینڈرڈ ٹائم نہیں چلتا کہ دس کہا تو بارہ بجے پہنچے۔"

"یا اللہ آپ تو مجھے پابندیوں کا قیدی، بنا کر دیں گی۔"

"ترقی کا راز وقت کی پابندی میں مضمر ہے۔" اس نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

"یقیناً آپ کا ساتھ رہا تو میں ہر قسم کی پابندی کا عادی ہو جاؤں گا۔"

"اچھا تو میں چلتی ہوں اب کل صبح ہی ملاقات ہوگی۔" اتنا کہا اور کھڑی ہوگئی۔ انیل نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا:

"اب ہمیں بھی اٹھ جانا چاہیے کیونکہ یہاں والوں کو ڈیوٹی بھی دینی ہے۔"

ہم وہاں سے واپس آئے اور کمرے میں پہنچتے ہی آرام کے خیال سے لیٹ گئے۔ فاروق کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ کہیں گیا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ کئی اور لوگ بھی ہیں۔ اکیلے پن کا فائدہ اٹھا کر میں لیٹ گیا۔

ابھی ہم لیٹے ہی تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔ کسلمندی سے میں نے سرہانے رکھے فون کے ریسیور کو اٹھایا۔ ریسپشنسٹ نے بتایا کہ ایک صاحب نیچے انتظار کر رہے ہیں۔ چوتھی منزل سے نیچے جانا پھر واپس کمرے تک آنا عذاب سے کم نہ تھا مگر یہ سوچ کر خود کو تیار کرلیا کہ کوئی بات نہیں، مہمان کو تکلیف دینا بری بات ہے۔ پھر خیال آیا کہ یہ جگہ نئی ہے اور ہماری دیکھی بھالی بھی نہیں ہے کہیں ہم مہمان کو اوپر لاتے لاتے سیڑھیوں

ایک بینائی سے محروم شخص کی کتاب سے

ہم جمہوریت، مساوات اور سماجی انصاف کا جتنا راگ الاپتے ہیں اسے سن سن کر سماعتیں گنگ ہوگئی ہیں لیکن اپنے اردگرد نظر ڈالیے تو بھینس اسی کی ہوگی جس کے ہاتھ میں لاٹھی ہوگی۔ قانون اسی کی حفاظت کرے گا جو سب سے بڑا قانون شکن ہے۔ جمہوریت کی بات کرنے والے نہ اپنے گھر میں جمہوری ہیں اور نہ اپنے دفتر میں، نہ اپنے محلے میں نہ اپنے دوستوں میں۔ بس جمہوریت کے نعرے بلند کرنا اچھا لگتا ہے، شاید ایسا کرنا بھی Status symbol ہے۔ علم کی عظمتوں کے گن گاتے گاتے کوئی تھکتا دکھائی نہیں دیتا۔ ہر شام محفلیں آراستہ کی جاتی ہیں جس میں علم کی عظمت کا کہیں احساس تک نظر نہیں آتا۔ سب سے کم اہم شخص وہ ہے جو علم کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔ بیسیوں کتابوں کا مصنف محض اپنے دل کو خوش کرتا رہتا ہے مگر ایک چھکا لگانے والا شہرت دوام حاصل کرلیتا ہے۔ علم و ادب میں اپنے شب و روز گزارنے والا شخص اپنے چند شاگردوں سے داد و تحسین سمیٹ سکتا ہو تو سمیٹ لے لیکن پردہ سیمیں پر نمودار ہونے والا خوش قسمت عوام الناس کے دلوں کی دھڑکن ہوتا ہے۔ وہ شخص جو ساری زندگی عوام الناس کی فلاح و بہبود میں صرف کردیتا ہے۔ کبھی کبھار تعریف و توصیف کے چند کلمات سن لے تو سن لے لیکن وہ شخص، وہ جو میدان سیاست میں قدم رکھ دیتا ہے رات ہی رات میں قوم کا ہیرو ٹھہرتا ہے۔ آپ ہی بتایئے، آپ ہی فیصلہ کیجیے کہ اس صورتِ حال میں کوئی صاحبِ فہم و ذکا اور صاحبِ علم، کس طرح اعلیٰ اقدار کا پرچار کرنے کی جرات کرسکتا ہے اور اگر کرے بھی تو اسے سننے کے لیے کون تیار ہوگا۔

اقتباس: "کب رات بسر ہوگی"
از: پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال

سے نیچے چلے گئے تو سیدھا اوپر پہنچ جائیں گے۔ اس لیے اپنی جگہ بیٹھ گیا اور ریسپشن پر کہہ دیا کہ مہمان کو بھیج دیں۔ پھر سوچنے لگا کہ کہیں کسی دوسرے کی تلاش میں کوئی نہ آیا ہو۔ کیونکہ یہاں میرا کوئی جاننے والا جو نہیں ہے۔

جب وہ کمرے میں آیا اور اس کی آواز سنی تو واقعی کوئی انجان شخص تھا مگر ایک بات اچھی تھی کہ وہ بنگلہ بول رہا تھا گویا اپنے ہاں کا تھا۔ اس نے بتایا کہ اسے میرے آنے کی خبر مل گئی تھی۔ وہ میرے بھتیجے ارشد کا دوست ہے اور اسے ارشد نے ہی خبر دی ہے۔ اپنے بارے میں بتا کر وہ آگے بڑھا۔ اسلامی انداز میں گلے ملا پھر پیور بنگلہ میں بولا۔ ”میرا نام عبدالمنان ہے۔ میں نے سوچا عید کا دن ہے تو آپ کو اپنے گھر لے چلوں۔ چلیے ہمارے بچے آپ سے مل کر خوش ہوں گے۔“

ڈھاکا میں، میں اپنے بچوں کو چڑیا گھر لے جا کر جانور دکھایا کرتا تھا تاکہ بچے خوش ہو جائیں۔ یہ صاحب مجھے اپنے بچوں کو دکھانے لے جا رہے تھے۔ اسے کہتے ہیں انقلاب بر زمانہ! ہم بچوں کو اپنا چہرہ دکھا کر خوش کرنے کے لیے چل پڑے۔ راستے میں انہوں نے ایک جگہ کار روکی۔ وہاں کی دکانیں کیسی تھیں یہ تو نہ دیکھ سکا مگر احساس ہو گیا کہ یہاں ایشیائی زیادہ ہیں کیونکہ آتے جاتے لوگ اردو بول رہے تھے۔ ایک دو بنگلہ بولتے بھی سنائی دے گئے۔ مجھے ایسا لگا جیسے ہم گلستان یا بیت المکرّم کے بازار میں کھڑے ہیں۔ وہ صاحب بولے ”یہاں کی دکانوں پر انگریزی اور اردو میں عید مبارک لکھا ہوا ہے۔ ایک دو دکانوں پر اردو کے ساتھ بنگلہ میں بھی لکھا ہوا ہے' یہ پورا بنگلہ دیش ہے۔ یہاں بنگلہ کتابیں، ناولز، کیسٹس میں روبندرو سنگیت، بھاٹیالی، پولی ہر قسم کے گانے، ڈھاکا اور کلکتہ کے اخبارات، فروزون مچھلیاں، چاول، مسالے، یعنی ہر وہ چیز جو اپنے ہاں کی ہے یہاں بکتی نظر آتی ہے۔“ پھر وہ دکاندار سے باتیں کرنے لگا۔ میں نے دکاندار سے دیسی مٹھائی کا پوچھا تو اس نے ایک ٹین تھما دیا جس کی قیمت پانچ پونڈ بتائی۔

پانچ پونڈ کے رس گلے کا ٹین خریدا اور منان کے ساتھ باہر نکل آیا۔ عبدالمنان نے کہا ”مجھے اندازہ تھا آپ یہی خریدیں گے۔ اس دکان کے رس گلے بہت مشہور ہیں۔“

رس گلے کا ٹین اٹھائے ہوئے ہم عبدالمنان کے گھر پہنچے۔ ان کی بیوی اور بچے مجھے دیکھ کر واقعی خوشی سے کھل اٹھے۔ جیسے عبدالمنان کوئی نایاب جانور پکڑ لایا ہو۔ بیوی نے بتایا کہ وہ بھی بکرم گنج کی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ میں ڈھاکا کا ہوں اور وہ چاپائی کی۔ اس کے شوہر نامدار عبدالمنان منشی گنج کے ہیں اور یہاں چار سال سے ایک ائیرلائن کے لیے کام کر رہے ہیں۔ ان کے ہاں اس دن خاص طور سے نمک چینی ملی سویاں بنائی گئی تھیں جسے میں نے بھی شوق سے کھایا۔ پردیس میں دیسی کھانے کچھ زیادہ ہی مزہ دیتے ہیں۔ وہ دن میرے لیے یادگار دن تھا۔ شام تک ان کے ہاں رہا اور معلومات لندن جمع کرتا رہا پھر دوبارہ سے منان کے ساتھ نکلا تو بس سے سفر کرنے کا سوچا۔ پکاڈلی سرکس کو دریافت کرنا تھا مگر میرے ساتھ میرا دم چھلا ہوا منان تھا۔ یوں بھی میں یہاں اکیلے کیسے آسکتا تھا۔

یقین کریں کولمبس کو امریکا کی دریافت میں اتنی پریشانی نہیں ہوئی ہوگی جتنی مجھے پکاڈلی کو دریافت کرنے میں ہوئی۔ آج تک اس کے بارے میں جو کچھ سنا تھا وہ سب جھوٹ نکلا۔ سنا تھا کہ یہاں ہمہ وقت سیاحوں کا ہجوم رہتا ہے۔ ہر رنگ و نسل کے لوگ ٹھاٹھیں مارتے سمندر جیسے رہتے ہیں۔ سال میں پچاس لاکھ لوگ یہاں کی انڈر گراؤنڈ ٹرین سے گزرتے ہیں۔ صبح میں ہر پندرہویں سیکنڈ پر ایک ٹرین گزرتی ہے۔ دکانیں جگمگ کرتی خریداروں کو متوجہ کرتی ہیں۔ اس کی ہزاروں رنگین تصویریں ڈھاکا میں بکتی ہیں مگر یہاں آکر سخت مایوسی ہوئی۔ ایک بے ہودہ سا گندا چوراہا اس پر اتنا ناز۔ (یہ بات میں منان سے سن کر بتا رہا ہوں) بس جناب دو گھنٹے میں اس پکاڈلی سرکس پر لعنت بھیجتا ہوا واپس چل پڑا۔ کافی عرصے بعد پیدل چلا تھا۔ پیٹ میں چوہوں نے اچھل کود مچا دی۔ ایک اسٹور پر عبدالمنان کو دوڑا کر بسکٹ اور بیوریج بوتل خریدی۔ کسی ریسٹورنٹ میں اس لیے نہیں گیا کہ کوئی میرے ایمان کی تاک میں نہ ہو اور مجھے حرام کھلا کر مسلمانیت سے خارج کرا دے۔

بسکٹ کھاتا بوتل سے چسکیاں لیتا ہوا میں کار میں بیٹھا رہا۔ کافی آگے جانے کے بعد پتا چلا کہ منان غلطی سے ایک ٹرن غلط مڑ گیا تھا اور اسے دوسرا ٹرن نہیں مل رہا۔ پھر جب ملا تو انکشاف ہوا کہ وہ راستہ بھول گیا ہے۔ اب آتے جاتے لوگوں سے پتا پوچھنے لگا تو پتا چلا کہ ہر راہ گیر غیر ملکی ہے۔ کوئی کا ہے تو کوئی ڈنمارک کا۔ کسی کو بھی یہاں کے راستے کا صحیح علم نہیں ہے۔ بڑی مشکل سے بلکہ اتفاقیہ طور پر منان کو

ہوٹل کی عمارت نظر آگئی اور ہم لوٹ کے گھر آگئے۔ عید کی نماز تو پڑھی نہیں تھی مگر اگلے دن جمعہ تھا سوچا کہ جب مسجد کا پتا چل گیا ہے تو کیوں نا نماز میں شریک ہو جاؤں۔ گانے گا گا کر جہنم کا راستہ تو ڈھونڈ ہی رہا ہوں لگے ہاتھوں جنت کے لیے بھی کچھ کر لیا جائے۔ باقی تو روزِ حشر جو ہونا ہے وہ تو ہو کر ہی رہے گا۔ یہاں ریجنٹ پارک کی مسجد میں مرکزی طور پر نماز ادا کی جاتی ہے۔ یہ ریجنٹ پارک ہم نے دیکھا نہیں تھا اور نہ میرا ہمزاد فاروق جانتا تھا پھر ہم راہ بھٹکنے سے محفوظ بھی رہنا چاہتے تھے اس لیے ٹیکسی بلوالی۔ یہاں کی ٹیکسی میں کافی جگہ ہوتی ہے کہ سامان رکھا جاسکے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ یہاں کی ٹیکسی کے میٹر خراب بھی نہیں ہوتے۔ صحیح مائلز پر صحیح کرایہ وصولنے کا رواج ہے۔ عجیب احمق لوگ ہیں۔ مسافر لٹنے کو تیار اور یہ لوگ لوٹتے بھی نہیں ہیں۔ ان کو ٹریننگ کے لیے ایک بار ڈھاکا ضرور بھیجنا چاہیے تاکہ واپسی کے بعد کچھ تو لوٹنے کا فن ساتھ لے آئیں اور جس طرح بیت المکرّم سے پرانا پلٹن کا کرایہ سو ٹکا تک وصول لیا جاتا ہے یہ راز ان پر بھی آشکار کرنا چاہیے کہ دیکھو ہم لوگ کتنے چالاک ہیں۔ مرے پر سو دُرّے مارتے ہیں۔ اپنے برادرِ اسلامی کو ہی لوٹتے ہیں۔ خیر جناب! ریجنٹ پارک تک کا کرایہ صرف ڈھائی پونڈ بنا جو ہم نے بہ آسانی ادا کر دیا پھر شان سے نیچے اترے۔ اس دن کی مناسبت سے ہم نے پاجامہ اور کرتہ پہنا تھا۔ سوچا تھا اپنے لباس کی وجہ سے ہمیں فوراً پہچان لیا جائے گا کہ ہم مسلمان ہیں لیکن فاروق نے یہ بتا کر کہ یہاں تو ایک ازدحام ہے دیسی پوشاک والوں کا۔ نوے فیصد لوگ کرتہ پاجامہ، شلوار قمیص اور شیروانی میں نظر آرہے ہیں۔

سڑک کے دونوں اطراف میں گاڑیاں کھڑی تھیں۔ پولیس والے مستعدی سے خدمت میں مصروف تھے۔ مسجد بھی بہت عمدہ تھی لیکن عید بقرہ عید کے لیے چھوٹی تھی۔ لوگ نماز پڑھ کر اپنے دفاتر جاتے ہیں۔

مسجد کے اندر پہنچے تو خطبہ ہو رہا تھا۔ خطبہ بھی اردو میں۔ پتا چلا کہ گزشتہ ہفتے کی نماز میں بنگلہ میں خطبہ ہوا تھا۔ ہر ملک کے مسلمان نماز پڑھنے آتے ہیں اسی حساب سے امام کو بھی بلایا جاتا اور ہر زبان میں خطبہ دے دیا جاتا ہے۔ خوشی ہوئی کہ پردیس میں بھی دیسی انتظام ہو جاتا ہے۔

نماز پڑھ کر نکلے تو ٹیکسی مل گئی اور سیدھے ہوٹل پہنچ گئے۔ میرے ساتھ کلکتہ کے فونی مجمدار بھی ٹھہرے ہوئے

بینائی سے محروم کی نظر میں

”نابینائی اور گداگری“

کشکول گدائی اس امر کا غماز ہے کہ کشکول زندگی میں کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ انسان اپنی صلاحیتیں کھو بیٹھا ہے اور انسان ہوتے ہوئے انسان کے سامنے ہاتھ پھیلانا گویا زندگی کا منہ چڑانا ہے ایسا انسان زندہ تو ہے مگر زندگی سے عاری لیکن جب کوئی نابینا ہاتھ پھیلاتا ہے تو اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے والے تمام نابینا اپنی کوششوں کو ملیامیٹ ہوتے ہوئے اپنی ہی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ نابیناؤں کے لیے اداروں اور تنظیموں کا یہ نعرہ بلند کرتے کرتے آواز بیٹھ گئی ہے کہ نابینائی ایک مشکل ضرور ہے لیکن اس سے انسان کی صلاحیتیں ہرگز سلب نہیں ہوتیں لیکن جب کوئی نابینا بھکاری اپنی نابینائی کے واسطے دست سوال دراز کرتا ہے تو ایک لمحے کے لیے تمام حوصلوں کا ہاتھ پھیل جاتا ہے گویا تمام نابینا افراد بھیک مانگنے والے لگتے ہیں۔ یہ اندوہ ناک منظر ہر بس، ہر گاڑی اور ہر شاہراہ پر نابیناؤں کے لیے تنظیموں اور اداروں کا منہ چڑا رہا ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ نابیناؤں کے ہاتھوں میں کشکول گدائی کس نے تھمایا۔ ان کی مجبوری نے یا سخی لوگوں کی دریا دلی نے، ان کی بے بسی نے یا اہل ثروت کی غلط سخاوت نے، ان کی بے چارگی نے یا معاشرتی احساس تراحم نے، لوگ ایک روپیا دے کر یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے لیے جنت کے دروازے وا ہو گئے ہیں۔ انہوں نے اپنا انسانی فرض ادا کر دیا لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ انہوں نے خودداری اور عزت نفس پر ضرب کاری لگائی ہے اور ایک گھناؤنا جرم کیا ہے۔ ایک انگریزی قول ہے کہ انہیں ”پینی“ مت دیجیے پاؤنڈ کمانے کے قابل بنائیے۔ بینا حضرات بھیک مانگتے نظر آئیں تو یہ ایک الگ بات ہے کیونکہ اس سے بینا افراد کا وقار مجروح نہیں ہوتا کیونکہ بیناؤں میں مجبور بھی ہیں جابر بھی، دینے والے ہاتھ بھی ہیں اور لینے والے ہاتھ بھی لیکن نابینا تو ہیں ہی ”بے چارے مجبور اور لاچار“ اگر وہ دوسرے درجے کے شہری بننے کی بجائے پہلے درجے کے شہری بننا چاہتے ہیں، لوگوں کی نگاہوں میں باعزت اور باوقار ہونا چاہتے ہیں تو نابیناؤں کے کشکول گدائی اور اس کشکول میں کھنکتے سکے ڈالنے والے ان کی اس کوشش کو خاک میں ملا دیتے ہیں۔

اقتباس: ”کب رات بسر ہوگی“
از: پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال

تھے، اشوتی ہالدار اور نعمت بشیر تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی شور مچادیا کہ ساتھ چلنا ہوگا۔ میں نے لاکھ انکار کیا کہ ہم تھکے ہوئے ہیں مگر وہ نہ مانے اور زبردستی ہمیں ساتھ لے لیا۔ ان لوگوں کا پروگرام تھا کہ اس عمارت کو قریب سے دیکھیں گے جہاں بیٹھ کر ہم پر حکومت کی گئی تھی۔ جہاں سے ملکہ وکٹوریہ کا حکم نامہ جاری ہوتا تھا اور ہم پر صادر کیا جاتا تھا۔ جہاں ایک عجیب وغریب محبت کی کہانی نے جنم لیا تھا اور اس کہانی پر زبردستی سنسر لگایا گیا۔ جی ہاں ملکہ وکٹوریہ اور منشی عبدل کریم کی کہانی۔ منشی صاحب کلکتے کے تھے اور ہندوستانی زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ اس وقت تک فارسی کی جگہ اردو نے لے لی تھی۔ اس اہم کام کا سہرا فورٹ ولیم کالج کے سر جاتا ہے۔ یہ کالج تاریخی اعتبار سے اس لیے اہم ہے کہ اس کالج نے بنگلہ زبان کی بہت خدمت کی۔ خاص کر مسلمانوں کی زبان کی۔ اسی کالج کی وجہ سے جسیم الدین جیسے شاعر کو ہم نے پایا۔ شاید آپ کو یاد نہ ہو۔ ہندوستانی عملداری میں مسلمان شعرا اور ادبا کو ابھرنے کا موقع نہیں دیا جاتا تھا۔ بیدروہی کوی (باغی شاعر) نذرالاسلام نے کس طرح اپنی جگہ بنائی یہ وہی جانتے ہیں۔ ان پر کیسے کیسے الزام نہ لگے، کیسی کیسی باتیں نہ بنائی گئیں لیکن جب ان کا قلم نہ رکا تو انہیں زہر دے دیا گیا جس کی وجہ سے ان کی قوتِ گویائی اور قوتِ فکر ختم ہوگئی۔ خیر بات ہو رہی تھی کوی جسیم الدین کی۔ اس وقت جسیم الدین جنہیں آج ہم پوئٹ آف نیچر ورڈز ورتھ کے ہم پلہ مانتے ہیں۔ جن کی شاعری میں قدرتی حسن نظر آتا ہے، یہی پلی کوی (گاؤں والا شاعر) نوجوانی کی سیڑھیوں پر قدم رکھ رہا تھا۔ اس نے اپنی مشہور کویتا (نظم) ''قبر'' کہی اور اسے چھپنے کے لیے ایک کے بعد ایک اخبار و رسائل میں بھیجتا رہا مگر مسلمان ہونے کی وجہ سے کسی نے چھاپنے کی ہمت نہیں کی۔ بالآخر اس نے کمیونسٹوں کے اخبار میں وہ نظم بھیجی۔ وہ نظم اشتراکیت کا پرچار کرنے والی نہیں تھی لیکن فنی اعتبار سے بہت عمدہ تھی اس لیے تعصب کو پرے دھکیل کر ان لوگوں نے ''قبر'' کو اخبار میں لگادیا۔ وہ کویتا فورٹ ولیم کالج والوں کی نظر سے گزری تو سب چونک گئے۔ ''ایکھانے تور دادیر قبر، ڈالم گاچھر تلے'' (یہاں تمہاری دادی کی قبر ہے انار کے پیڑ کے نیچے) تیرش بچھو بھیجے رکھے چھی دو نئو نیر جلے'' (تیس سال سے بھگا رکھا ہے دو آنکھوں کے پانی سے) اس قبر نامی نظم میں شاعر نے اتنے عمدہ انداز میں اس دور کی مکمل عکاسی کی تھی کہ تب معاشرہ کیسا تھا۔ کتنی چھوٹی عمر میں شادیاں ہوتی تھیں۔ ایک نظم میں چار پشت کا بیان ہے، چار ادوار ہے۔ یہ دیکھ کر فورٹ ولیم کالج والوں نے ایجوکیشن کو سفارشی خط لکھا کہ اسے نصاب میں شامل کیا جائے۔ اس طرح ہمیں ایک بہترین شاعر مل گیا۔ اسی فورٹ ولیم کے شعبۂ اردو میں منشی عبدالکریم پڑھایا کرتے تھے۔ قابلیت کو دیکھتے ہوئے فورٹ ولیم کالج والوں نے لندن بھیج دیا۔ منشی جی کو ذمے داری دی گئی کہ وکٹوریہ کو اردو پڑھادیں۔ وہ اردو پڑھانے گئے تھے عشق کی پڑھائی شروع ہوگئی۔ ہند کی سرزمین پر رضیہ سلطان یعقوت کے عشق کا جو انجام ہوا تھوڑا سا مختلف وہی انجام اس عشق کا بھی ہوا۔ رضیہ سلطان ملکہ ہند تھی اور یعقوت کا غلام۔ یہاں ملکہ وکٹوریہ حاکم ہند تھی اور منشی جی ان کے ملازم۔ عشق اقتدار کی سولی پر چڑھ گیا۔ منشی جی کو موت تو نہیں ملی مگر اس بیلنگھم پیلس سے ملک بدر کیا گیا۔ ... مل گیا۔ اتنے برسوں بعد میں اسی عمارت کو دیکھنے آیا جہاں کبھی ملکہ وکٹوریہ رہا کرتی تھی۔ ایک ہندوستانی کے عشق میں گرفتار ملکہ۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے ہم نے ٹیکسی کی تھی۔ اتفاق کی بات ہے کہ اس ٹیکسی کا شوفر اپنے بنگلہ دیش کا تھا۔ اس وقت مجھے ایک پرانا فلمی گانا ''چار چاکا بھاگیو بیندھے دیکھے نیلم بھائی۔ شوب جنیشر مولو آچھے ما شیر دام نائی'' (چار پہیوں سے قسمت باندھ کر دیکھ لیا بھائی ہر چیز کی قیمت ہے انسان کی قیمت کچھ بھی نہیں) واقعی انسان کی قیمت کیا ہے کچھ بھی نہیں ڈرائیور کے بیوی بچے میمن سنگھ میں رہا کرتے تھے۔ وہ اکیلا رہ کر پیسے کمار ہا تھا۔ راستے میں اس سے ڈھیر ساری باتیں ہوئیں۔ یہ میرا پسندیدہ مشغلہ جو ٹھہرا۔ میں جہاں کہیں بھی پروگرام کے لیے جاتا ہوں وہاں ٹیکسی ڈرائیوروں، خوانچہ فروشوں اور ہوٹل کے بیروں سے ضرور گپ شپ لگاتا ہوں۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ میں اس طرح ان کی آنکھوں سے وہ شہر دیکھ لیتا ہوں۔ باتوں کے ذریعے تجربہ میرے پاس آجاتا ہے اور میں اس شہر کے چپّے چپّے سے واقف ہو جاتا ہوں۔ اس شوفر کو ہم زبان پا کر میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا پھر پوچھا ''بھائی تم یہاں کب سے ہو؟''

''تقریباً پندرہ سال ہوگئے۔ ویزا دلانے والے ایجنٹ نے ڈیڑھ لاکھ ٹکا لیا تھا۔ شرط تھی کہ وہ مجھے نوکری دلائے گا۔ میں نے ڈھاکا یونیورسٹی سے بی کام کیا تھا۔ امید تھی کہ کسی کمپنی میں جاب ملے گی۔''

''تو کیا جاب نہیں ملی تھی؟''

''جاب ملی تھی لیکن ایک پب میں۔ لوگوں کو گلاس اور بوتل ٹیبل پر پہنچانے کی۔ ایجنٹ نے کہا کہ شرط نوکری دلانے کی تھی، دلادی۔ یہ کہاں کہا تھا کہ کسی بہت بڑے دفتر میں دلائی ہے۔ تقریباً 4 ماہ تک کراہیت سے وہ کام کیا پھر ایک انگریز دوست کی مہربانی سے اس کی ٹیکسی چلانے لگا۔ اس نے لائسنس وغیرہ کا انتظام کرادیا تھا۔ تب سے یہی کام کر رہا ہوں۔ اپنا اور اپنے گھر والوں کو حلال رزق کھلا رہا ہوں، ہر ماہ پانچ سو پاؤنڈ گھر بھیجتا ہوں۔ اتنی تنخواہ کسی دفتر سے کب ملتی ہے۔ اس لیے خوش ہوں۔''

''گھر میں کون کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ایک چھوٹا بھائی ہے، مجھ سے تین سال چھوٹا۔ دو بچے ہیں اور ایک بچے کی اماں ہے۔''

''پانچ سو پاؤنڈ تو ان کے لیے بہت بڑی رقم ہوتی ہوگی۔'' میں ... دل کی بات زبان پر لایا۔

''دراصل یہ رقم میں امی کے نام بھیجتا تھا۔ میرا گاؤں ضلع کشور گنج کے ایشور گنج تھانے میں ہے۔ امی اور بیوی بچے وہیں رہتے تھے۔ ایک سال تک رقم بھیجتا رہا۔ رقم بھائی کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرتا تھا، اس سے کہا تھا کہ وہ مکان پختہ کروالے۔ وہ مسلسل خبر دیتا رہا کہ اب دیوار اٹھ رہی ہے۔ اب چھت پڑ رہی ہے۔ اب مکان تیار ہو گیا۔ لیکن جب میں پہنچا تو ...'' وہ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔ میں سمجھ گیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ میں نے آنکھوں سے دنیا والوں کا چہرہ نہیں دیکھا ہے مگر مجھے پتا ہے کہ اب دنیا والے کیسی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ پھر بھی پوچھ لیا ''کیسا گھر بنا تھا؟''

وہ ڈرائیو کرتے ہوئے بولا ''میں ایشور گنج اسٹیشن پر اترا اور ٹھیلا (ایک قسم کا سائیکل رکشا) لیا اور اونچا کھیلا کی طرف چل پڑا۔ راستے بھر میری نظر اپنے گاؤں کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میرا گھر سب سے اونچا بنا ہوگا اس لیے دور سے نظر آئے گا مگر گاؤں تک پہنچتے پہنچتے گھر نظر نہ آیا، پھر گاؤں میں داخل ہوا تو وہی پرانا، پھوس کی چھت والا گھر مجھے منہ چڑھا رہا تھا۔ میں غصے میں گھر میں داخل ہوا تو بیوی پھٹی ہوئی ساڑی اور بچے پھٹے ہوئے کپڑوں میں نظر آئے، بیوی سے پوچھا کہ میں نے اتنا روپیا بھیجا وہ کہاں گیا تو وہ بولی کہ لیاقت تو کہتا تھا کہ آپ نے وہاں شادی کرلی ہے اس لیے پیسے نہیں بھیجتے۔ میں سر پکڑ کر رہ گیا۔''

''یہ تو برا ہوا، بیوی بچوں کو لے آتے؟'' میں نے مشورہ دیا۔

''کیسے لے آتا...... مہاجن کا قرض تھا۔ اماں تھیں جو گاؤں کی زمین چھوڑنے پر تیار نہیں تھیں کہ اس زمین میں میرا ابا دفن ہے۔ مجبوراً مجھے خود میمن سنگھ جا کر بیوی کے نام پر اکاؤنٹ کھولنا پڑا، مہاجن کو سود کی رقم دی اور ایک ماہ کی جگہ پندرہ دن میں واپس آنا پڑا۔ اب میں ہر ماہ رقم بھیج کر پتا بھی کرتا رہتا ہوں کہ رقم ملی یا نہیں۔''

''بھائی کا کیا بنا؟'' میں نے پوچھا۔

''بھائی ہے، چھوٹا ہے، غلطیاں کرتا رہتا ہے۔ معاف کردیا۔ اس نے وہ پیسے ڈھاکا کے ایک فراڈیے کو بزنس کے لیے دیے تھے جو ڈوب گئے۔ اب وہ بھی اسی گھر میں رہتا ہے۔ اسے اس کی ضرورت کے مطابق ماں دے دیتی ہے۔ مگر گھر بن گیا۔ بچے اچھا کھا رہے ہیں۔ مجھے اور کیا چاہیے۔ میں محنت کیے جا رہا ہوں۔''

باتوں میں پتا نہ چلا اور ہم اس عظیم الشان عمارت کے سامنے پہنچ گئے جس کو دیکھنے کی چاہ میں ہم یہاں تک آئے تھے۔ میں تو دیکھ نہیں سکتا تھا مگر میری آنکھیں فاروق تھا، وہ ایک ایک بات کو دوہراتا جاتا اور میں اس کی آنکھوں سے عمارت کو دیکھ لیتا۔ میں نے دیکھا تو نہیں مگر پڑھا تھا کہ 1730 میں جہازیوں کا ایک وفد بھوک سے بلبلاتا، پیاس سے بے حال نواب علی وردی خان کے پاس آیا۔

نوابوں کا نواب علی وردی خان جو ایک معمولی سپاہی سے ترقی کرتے اپنی بہادری اور شجاعت کے سہارے آگے بڑھا اور پورے صوبہ بنگال کا مطلق العنان حکمران بنا جس میں ہمارا پورا ملک 'پڑوس کے پیارے دشمن' ملک کے کئی صوبے یعنی ویسٹ بنگال شامل ہے اس کے علاوہ بہار، اڑیسہ، میزورم، تری پورا، سکیم۔ یوپی کا آدھا حصہ، ناگالینڈ، امپھال، وغیرہ بھی شامل ہیں۔ اتنے بڑے علاقے کے حکمران کے پاس وہ ننگے بھوکے آئے تھے تو ناکام کیسے لوٹتے۔ نواب نے انہیں کھانا کھلایا، پانی پلایا اور ٹھہرنے کی جگہ دی۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ تاجر ہیں اس لیے

تجارت کی بھی جگہ دے دی گئی، اس جگہ جہاں آج کلکتہ ہے۔ انہوں نے دھیرے دھیرے پاؤں پسارے اور علی وردی خان کے نواسے نواب سراج الدولہ کو راہی ملکِ عدم کیا اور پورے بنگال پر قبضہ کرکے بیٹھ گئے۔ بنگال کے بعد پورے برصغیر پر غلامی کی مہر لگادی۔ یہ ایام غلامی اتنی طویل ثابت ہوئی کہ دو سو سال لگ گئے۔ کیونکہ کمپنی نے غلامی کی مہار اسی بیکنگھم پلیس کی ملکہ کے ہاتھ میں تھما دی تھی۔ اسی محل کی ملکہ وہ بھی تھی جس کا ذکر پہلے بھی میں کرچکا ہوں۔

خیر جناب! میری آنکھ (فاروق) نے اس عمارت کے بارے میں بتانا شروع کیا تھا کہ یہ ایک بہت بڑی عمارت ہے آگے کی جانب وسیع وعریض سبزہ زار ہے۔ اتنی جگہ ہے کہ بہت سارے لوگ پکنک منا سکتے ہیں۔ بارہ پندرہ جھولے لگا کر بچوں کا لطف دوبالا کیا جاسکتا ہے لیکن لال باغ قلعہ جیسی خوبصورتی نہیں ہے۔ تبھی ایک جانی پہچانی خوشبو آئی اور میں چونک گیا کہ نور النہار کہاں سے آٹپکی۔

"آپ تو ہمیں بغیر بتائے آگئے مگر دیکھیں ہم نے آپ کو ڈھونڈ لیا نا۔" نور النہار نے کھلکھلا کر کہا۔

"تمہارا یہی تو کمال ہے۔ عورتیں تو ہوتی ہی ہیں کمال دکھانے والی۔" میں نے کہا تو پھر اس کی کھلکھلاہٹ گونج اٹھی۔

"میں جب آپ کے روم پر پہنچی تو پتا چلا کہ آپ لوگ یہاں کا ارادہ کیے بیٹھے ہیں اور میں نے پروگرام بنالیا کہ آپ لوگوں کو سرپرائز دوں گی۔"

"اب تو دے ہی دیا ہے اس لیے ہم سب کو نیا مسافر سمجھ کر کچھ ارشاد ہو جائے اس گھر اور گھر کے مکینوں کے بارے میں۔"

"کیوں نہیں۔" اس آواز سنائی دی۔ "اسے 1705 میں ڈیوک آف بیکنگھم کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ ڈیڑھ سو سال تک یہ عمارت پرائیوٹ پڑی رہی پھر جارج سوم نے اسے 1761 میں حاصل کرلیا شہزادی کرلوٹ کے لیے۔ اور اس عمارت کا نام پڑ گیا کوئن ہاؤس۔ انیسویں صدی میں اسے جون ناش نامی معمار کے نقشے کے مطابق بڑا کیا گیا اور پھر ملکہ وکٹوریہ کے عہد 1837 میں اسے شاہی دفتر کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔"

"ہائے اللہ اتنی معلومات میں کیسے محفوظ رکھوں گا۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"آیئے آج پبلک ڈے ہے اس لیے ہر خاص و عام کے لیے محل کا ایک حصہ کھلا ہوا ہے۔" کہہ کر اس نے بے تکلفی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

اندر لے جاتے ہوئے وہ بولی "اس عمارت میں شہزادی کرلوٹ سے چودہ یا پندرہ بچوں نے جنم لیا۔ ان کی پرورش و پرداخت اسی عمارت میں ہوئی۔" وہ آگے بڑھتے ہوئے بولی "108 بائی 120 میٹر کی یہ اصل عمارت 24 میٹر اونچی ہے۔"

ابھی وہ کچھ اور اندر لے جاتی کہ عوامی حدود ختم ہونے کا ہمیں بتایا گیا۔ پتا نہیں دیگر لوگوں کا دل بھرا تھا یا نہیں مگر مجھے اکتاہٹ ہونے لگی تھی اس لیے میں نے کہا کہ اب چلنا چاہیے کیوں کہ شام میں پروگرام ہے۔

جب میں نے یاد دلایا تو سب کو یاد آگیا کہ اسی شام کی وجہ سے میزبانوں نے ہمیں بلایا ہے۔ پھر سب کو جانے کی جلدی ہوگئی۔ ہم سب باہر آئے۔ نور النہار اپنی کار لے کر آئی تھی جو وہ خاص خاص موقوں پر ہی نکالتی تھی اس لیے کہ وہاں پارکنگ کا بہت مسئلہ ہے۔ مجھے اور فاروق کو اس کی کار میں جگہ مل گئی اور ہم واپس چل پڑے۔

اس شام مجھے کچھ پیش کرنے کو نہیں کہا گیا کیونکہ میری وجہ سے بہت سے لوگ اس کنسرٹ میں آئے تھے۔ مجھے سن کر بھاگ لیتے۔ میزبان عقلمند تھے اس لیے پہلے روز ادھونک گان کا پروگرام رکھا تھا مگر عوام کے اصرار پر مجھے اسٹیج پر بلایا گیا۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ میں صرف ایک گانا سناؤں گا لیکن عوام کب ماننے والی تھی۔ مجھے دو گانے سنانے پڑے۔ بھوائیا اور پلی گیتی گانے والوں کو بلایا گیا۔ آخر میں نذرول گیتی کا پروگرام رکھا گیا۔

اس سے پہلے بھی میں نے بہت سارے کنسرٹ کیے ہیں مگر اس دن ایسا لگ رہا تھا کہ میں بہت زیادہ ایکسائٹڈ ہوں۔ شاید اس لیے کے ٹکٹ خریدنے والے امریکا تک سے آئے ہوئے تھے۔ یورپ کے دیگر شہروں کا ذکر کیا۔ کہیں اتنے بڑے بڑے نامی گرامی گانے والوں میں میرا مقام بن پائے گا بھی یا نہیں... مگر جب میں نے مائیک تھاما تو لگا کہ میں اپنے بنگلہ دیش میں ہی ہوں۔ میرے چاہنے والے وودیش میں اتنی بڑی تعداد میں ہیں اس کا پتا اس دن چلا تھا۔ کاش میں انہیں دیکھ سکتا۔ اے کاش!

بڑے لوگ

عارفہ کریم عثمانی

زندگی گزار لینا بہت آسان ہے مگر سلیقے اور سبھاؤ کے ساتھ گزارنا آسان نہیں مگر وہ سب حوصلے وعزم کے کوہِ جودی تھے۔ یہ نورِ چشم کے بعد بھی انہوں نے عالمی شہرت حاصل کرکے دکھایا کہ وہ آنکھوں سے معذور تو ہیں مگر مجبور نہیں۔ ہر پریشانی کو ٹھوکر سے اڑا کر اپنی منزل آپ بنانا جانتے ہیں۔

مشہور و معروف افراد کا مختصر مختصر سا قصۂ عزم

وہ ایک نابینا بچہ تھا۔

کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کا مستقبل کیا ہوگا۔ وہ اسے کس شعبے میں ڈالتے۔ اس کو تعلیم تو دلوائی گئی لیکن وہاں بھی اس کے ساتھ خدشات ہی لگے ہوئے تھے۔ زندگی کی بے رحم اور سخت دوڑ میں جب آنکھوں والوں کو اپنی جگہ بنانی مشکل ہو جاتی ہے تو ایسے میں ایک نابینا بچے کا کیا مستقبل ہو سکتا تھا۔

ایک دن اس کی میوزک ٹیچر نے بتایا "اس کی آواز

بہت پیاری ہے۔"

"آواز سے کیا ہوتا ہے۔ اصل بات روشن مستقبل اور کیریئر کی ہے۔"

"یہ تو مجھے نہیں معلوم لیکن اتنا ضرور معلوم ہے کہ اگر اس کو موسیقی کی مناسب تربیت دی جائے تو شاید یہ اس فن میں اپنا نام پیدا کر سکے۔"

اس بچے کے لیے یہ ایک امید تو تھی۔ لیکن یہ ایک موہوم سی امید تھی۔ اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ نہ جانے کتنے بچوں کی آوازیں بہت اچھی ہوتی ہوں گی۔

لیکن وہ خوبصورت آوازیں انہیں کیا فائدہ پہنچا رہی تھیں، کچھ بھی نہیں۔

ایک دن اس کے بارے میں ایک اور انکشاف کیا گیا۔ "پیانو پر اس کی انگلیاں بہت خوبصورتی سے چلتی ہیں۔ حالانکہ کی بورڈ اسے نظر نہیں آتا ہوگا۔ اس کے باوجود بہت اچھی دھنیں نکال لیتا ہے۔"

یہ سب جانتے تھے کہ جو لوگ بینائی سے محروم ہو جائیں، ان میں خاص قسم کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اب ایسا بھی نہیں ہوتا کہ وہ ترقی کی انتہا تک پہنچ جائیں۔

اس شہر میں بہت سے نابینا لوگ تھے۔ جن کی آوازیں بہت خوبصورت تھیں۔ وہ کوئی نہ کوئی ساز بھی بجا لیتے تھے۔ لیکن وہ کرتے کیا تھے، کیا تھا ان کا ذریعۂ معاش، غیر یقینی۔

لیکن اس بچے کی آواز نے اپنا جادو دکھانا شروع کر دیا تھا۔ موسیقی کے حوالے سے اس کی صلاحیتیں کمال کی تھیں۔ اسے کئی ساز بجانے پر بھی قدرت حاصل تھی۔

کہا جاتا ہے کہ دنیا بھر کے مشہور اور کامیاب نابیناؤں کی اگر فہرست تیار کی جائے تو اس کا نام سرفہرست ہوگا۔ اس کی پیدائش امریکا میں 13 مئی 1950ء کو ہوئی تھی۔

موسیقی اور گانے کے ساتھ اسے شاعری کا بھی شوق تھا۔ اس نے اپنے گائے ہوئے گیت خود ہی لکھے اور پیش کیے تھے۔

وہ میوزک البم کا پروڈیوسر بھی تھا۔ اس نے ثابت کر دیا تھا کہ اس کی نابینائی اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ اس کے عزائم بہت بلند ہیں۔ وہ بہت آگے جانا چاہتا ہے۔

وہ مشہور امریکن سنگر، شاعر، پروڈیوسر اور موسیقار اسٹیو ونڈر ہے۔ (Steviewonder) جس کے گائے ہوئے گیتوں Ebny اور Ivory نے پوری دنیا کو اپنے سحر میں گرفتار کر لیا تھا۔

ماڈرن میوزک کا تذکرہ اس کے بغیر نامکمل رہ جاتا ہے۔ اب بتائیں، اس کی یہ معذوری اس کے راستے کی رکاوٹ بنی؟

اس نے اس معذوری کو ایک طاقت ایک توانائی بنا کر زندگی بسر کی ہے۔

☆☆☆

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ رنگ بولتے ہیں۔ لیکن اس مصور نے ثابت کر دیا کہ رنگ واقعی بولتے ہیں۔ ان کی اپنی زبان ہوتی ہے۔ اپنا لہجہ ہوتا ہے۔ اپنی شناخت ہوتی ہے۔

اس نے پہلی تصویر اس وقت بنائی، جب وہ صرف دس سال کا تھا۔

اس سے پہلے بھی وہ تصویریں بناتا رہا تھا۔ لیکن وہ خاکے ہوتے تھے۔ لائنیں ہوتی تھیں۔ کسی مصور کی پہچان اس کی لائن ورک سے ہی ہوا کرتی ہے۔

اس کی لائنیں کیسی ہوتی ہیں۔ یعنی ڈرائنگ، وہاں سے اس کی مصوری کا سفر شروع ہوتا ہے۔

اس میں ایک عادت بہت عجیب تھی جس کو اس کے ساتھ اسکول جانے والے ساتھی محسوس کرتے اور اس کی اس عادت سے بور بھی ہو جایا کرتے۔

وہ کسی بھی حسین منظر کو دیکھ کر جیسے ٹرانس میں آ جاتا اور پہروں اس کی طرف دیکھتا رہتا۔ چاہے وہ پھول ہوں، درخت ہوں، کھیت ہوں، پہاڑ ہوں، یا آسمان پر مختلف

پیٹرن بناتے ہوئے بادل ہوں، وہ ان کو مبہوت ہو کر دیکھتا رہتا۔

اس کے ساتھی جب بور ہو کر اس سے کہتے تو وہ جواب دیتا۔ "بھائی، مجھے یہ سب دیکھنا بہت اچھا لگتا ہے۔ اور میں انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے دماغ میں محفوظ کر لینا چاہتا ہوں، ان کی ہر نزاکت، ہر باریکی، ہر شیڈ کو سنبھال کر اپنی یادداشت کے خانوں میں رکھ لیتا ہوں۔"

وہ اکثر ایک خواب بھی دیکھا کرتا تھا جس کا ذکر وہ اپنے والدین سے کیا کرتا۔ "میں ایک اجنبی مقام سے گزر رہا ہوں۔ بہت خوبصورت جگہ ہے۔ ہر طرف ہریالی ہے، پھول ہے، میرے اوپر آسمان پر سورج روشن ہے۔ جس کی روشنی میں مجھے سب کچھ دکھائی دے رہا ہے۔ پھر اچانک ہر طرف اندھیرا چھا جاتا ہے۔ سورج نہ جانے کہاں چلا گیا ہے۔ اب چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے لیکن میں پھر بھی آگے بڑھتا چلا جا رہا ہوں۔"

رنگوں اور مناظر سے اس کی محبت اس وقت سامنے آگئی جب اس نے اپنی پہلی پینٹنگ بنائی۔ یہ درختوں کے ایک جھنڈ کی پینٹنگ تھی اور اتنی مہارت اور خوبصورتی سے بنائی گئی تھی کہ کیمرے کا شاہکار معلوم ہوتی تھی۔

اس کی اس پینٹنگ کو ناقدین نے بھی بہت سراہا اور انہوں نے پیش گوئی کی کہ اس میں ایک عظیم مصور ہونے کے امکانات بہت روشن ہیں۔

اس کے بعد اس نے رکنے کا نام نہیں لیا تھا۔ وہ مسلسل کام کرتا رہا۔ اس کی بنائی ہوئی تصویریں پوری دنیا میں مشہور ہوتی چلی گئیں۔

1906ء اور 1907ء میں اس نے دنیا کے مشہور مصوروں میں اپنی جگہ بنالی تھی۔

اس کی پیدائش 14 نومبر 1940ء کو پیرس فرانس میں ہوئی۔

کچھ لوگ کسی خاص کام ہی کے لیے پیدا کیے جاتے ہیں۔ خاص طور پر تخلیقی کام۔ بچپن ہی سے ان کا رجحان سامنے آ جاتا ہے اور یہ پتا چل جاتا ہے کہ آگے چل کر انہیں کیا کرنا ہے۔

قدرت نے انہیں کن کاموں کے لیے مخصوص کر لیا ہے اور ان کی ڈیوٹی کیا ہے۔ وہ بھی ایسا ہی تھا۔

وہ تصویریں بناتا اور شہرت حاصل کرتا رہا.... ایک دن اچانک اس نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرے چھانے لگے ہیں۔ یہ ایسے اندھیرے تھے جو کچھ دیر کے لیے سب کچھ اس کی نگاہوں سے اوجھل کر دیتے۔

پہلے تو یہ اندھیرے کچھ دیر کے لیے ہوا کرتے پھر آہستہ آہستہ ان کا دورانیہ بڑھتا چلا گیا۔ اسے فوراً آنکھوں کے ڈاکٹرز سے رجوع کرنا پڑا۔

جنہوں نے بتایا کہ اس کی بینائی بہت تیزی سے ختم ہوتی جا رہی ہے۔ اس مصور کے لیے یہ بہت بڑا صدمہ تھا۔ اس کا تو کام ہی روشنی اور بینائی کا تھا۔

وہ آنکھوں سے رنگوں کی پہچان کر کے اپنی پینٹنگ میں ان کا استعمال کیا کرتا تھا۔ اسے اپنے وہ خواب یاد آنے لگے جن میں وہ سورج کی روشنی میں کہیں چلا جا رہا ہے۔ پھر اچانک سورج کہیں غائب ہو جاتا ہے اور ہر طرف اندھیرے ہی اندھیرے ہو جاتے ہیں۔

تو کیا اس کا یہ خواب سچ ہونے جا رہا تھا۔

پھر ایک دن اچانک مکمل اندھیرا چھا گیا۔ اس کی بینائی اس کا ساتھ چھوڑ گئی۔ سورج اوجھل ہو گیا۔ اس کا خواب سچا ہو گیا تھا۔

لیکن مکمل نابینا ہو جانے کے باوجود اس نے ہمت نہیں ہاری۔ کچھ دنوں تک تو وہ وحشت کے عالم میں رہا تھا اور ایک دن وہ اپنا رنگ اور برش سنبھال کر بیٹھ گیا۔

اس وقت رنگ اس سے باتیں کرنے لگے۔ اسے یاد آیا کہ شاید وہ ان ہی دنوں کے لیے قدرت کے حسین مناظر کو اپنے تمام تر جذبات سمیت اپنی یادداشت میں محفوظ کرتا چلا آیا ہے۔

اس نے رنگوں کی زبان سمجھ کر اور اپنی یادداشت کو اپنے چشم تصور میں لا کر ایک بار پھر پینٹنگ کا سلسلہ شروع کر دیا۔

مکمل نابینائی کے باوجود اس نے شاہکار تصویریں تخلیق کیں۔ مشہور زمانہ Water Lillies ان ہی

دنوں کی پینٹنگ ہے۔

اس مشہور زمانہ مصور کا نام Monrt Claude Oscar ہے۔ اس کی وفات 5.12.1926ء میں ہوئی ـــــ یہ نابینا مصور اپنے کام اور اپنی ہمت کی وجہ سے آج بھی زندہ ہے۔

☆☆☆

اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ اسے کہاں لاکر رکھا گیا ہے۔

وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ اسے جس کمرے میں رکھا گیا ہے اس میں روشنی کا انتظام ہے بھی یا نہیں یا اس کمرے میں اس کے علاوہ کوئی اور بھی ہے یا وہ اکیلی ہے۔

اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا کیونکہ وہ مکمل نابینا تھی۔ اس کی عمر اٹھارہ بیس سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ ایک افریقین لڑکی تھی۔

جوان اور خواہشوں سے بھرپور۔ لیکن اسے کنیز بنالیا گیا تھا۔ اور جب کوئی کنیز یا غلام بن جائے تو پھر اس کے آقا ہی اس کے جذبات اور خوابوں کے مالک ہوتے ہیں۔ اس کا اپنا کچھ بھی نہیں ہوتا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے کنیز بنانے والوں نے یہ خیال کیوں نہیں کیا کہ وہ ایک نابینا لڑکی ہے۔ وہ ان کے کسی کام نہیں آسکتی۔

اس کے باوجود وہ اسے پکڑ لائے تھے اور شاید اس کے وطن سے بہت دور لے آئے تھے۔ اسے احساس ہورہا تھا کہ اس کا سفر بہت طویل تھا، کئی دنوں اور راتوں کا سفر تھا۔

یہ سفر پانی کے جہاز کا تھا۔ اس کے بعد اسے اس کمرے میں بند کردیا گیا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اسے کہاں لایا گیا ہے اور اس کمرے میں اس کے علاوہ کوئی اور بھی ہے یا نہیں ہے۔

پھر اس نے کسی کی آواز سنی۔ کوئی آہستہ آہستہ رو رہا تھا۔ اس نے دھیان دیا۔ رونے والی کوئی عورت یا لڑکی ہی تھی۔

اس نے ہمت کرکے آواز دی۔ ''کون ہے اس کمرے میں۔''

رونے کی آواز بند ہوگئی۔ اس کے ساتھ اسے احساس ہوا کہ کوئی اس کے پاس آکر بیٹھ گیا ہے۔ آنے والی نے اس کا ہاتھ تھام کر پوچھا۔ ''تم کون ہو؟''

اس نے اپنا نام بتایا۔ ''اور تم؟ تم کون ہو؟''

پتا چلا کہ اس کمرے میں اس کے علاوہ اسی کے قبیلے کی ایک لڑکی تھی۔ اس کو بھی زبردستی کنیز بنایا گیا تھا۔ اغوا کرنے والے انہیں افریقا سے کینیڈا لے آئے تھے۔ اس دوسری لڑکی کا نام سوزا تھا۔

''سوزا، کیا تمہیں یقین ہے کہ ہم کینیڈا میں ہیں۔'' اس نے پوچھا۔

''ہاں، مجھے یقین ہے۔'' سوزا نے کہا۔

''سوزا، میں دیکھ نہیں سکتی۔ لیکن میں کنیز بن کر بھی زندگی نہیں گزاروں گی۔ میں مرجاؤں گی یا آزادی حاصل کرلوں گی۔ کیا تم میرا ساتھ دوگی؟''

''بتاؤ، تم کیا چاہتی ہو؟''

''تم میری آنکھیں بن جاؤ۔'' اس نے کہا۔ ''پہلا مرحلہ یہ ہے کہ ہمیں یہاں سے فرار ہونا ہے۔''

اس کا ارادہ پختہ تھا۔ اس کے عزائم بلند تھے۔ نابینا ہونے کے باوجود اس کے اندر کی آنکھیں روشن تھیں۔ وہ اپنی ساتھی کی مدد سے کینیڈا سے فرار ہوکر امریکا پہنچ گئی۔

اس کی زندگی کی کہانی بے مثال جدوجہد کی کہانی ہے۔

امریکا پہنچ کر اس نے غلامی کے خلاف جگہ جگہ تقریریں شروع کردیں۔ سیاہ فام اسے اپنی نجات دہندہ کہا کرتے تھے۔

اس نے پورے امریکا میں غلامی کے خلاف ایک آگ سی لگادی تھی۔ امریکا کی تاریخ میں آج بھی اس کا نام بہت عزت اور احترام سے لیا جاتا ہے۔

اس جرأت مند، بہادر اور نابینا افریقین لڑکی کا نام Harriat Tubeman تھا۔ اس کی پیدائش مارچ 1713ء کی تھی، جبکہ اس کا انتقال 1820ء میں ہوا تھا۔

اس نابینا خاتون کو آج بھی غلامی کے خلاف جدوجہد کرنے والی ''پہلا سپاہی'' کہا جاتا ہے۔

☆☆☆

یہ دنیا صرف آنکھوں والوں کی نہیں بلکہ نابیناؤں کی بھی ہے۔

ان کو بھی زندہ رہنے اور اپنی صلاحیتوں کو منوانے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ بہت سے شعبے ایسے ہیں جن کے لیے یہ کہا جاتا ہے کہ یہ صرف آنکھوں والوں کے ہیں۔

لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی ہمت اور عزم سے اس کرائی ٹیریا کو رد کرکے بہت آگے نکل جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک شعبہ کھیل کا بھی ہے۔

4 جنوری 1969ء کو سانتا ماریہ، امریکا میں پیدا ہونے والی خاتون نے ثابت کردیا کہ وہ اپنی معذوری کے باوجود اس فیلڈ میں بھی بہت سے بیناؤں کو شکست دے سکتی ہے۔

وہ اپنی دوستوں سے کہا کرتی ''مجھے اولمپکس میں حصہ لینا ہے اور وہ بھی میراتھن میں۔''

اس کی دوست اسے سمجھانے لگتیں۔ ''یہ کیسے ممکن ہے۔ تم تو دیکھ ہی نہیں سکتی ہو۔''

''اس سے کیا ہوتا ہے میرے ارادے میری رہنمائی کرتے رہیں گے۔'' وہ جواب دیتی۔

وہ اپنے گھر کے سامنے والے میدان میں میراتھن کی پریکٹس کیا کرتی اور وہ بھی گھنٹوں۔ تھک کر بے حال ہوجاتی پھر بھی چلتی ہی رہتی۔

اس نے کاؤنٹی کی سطح پر مقابلوں میں حصہ لیا اور کامیابیاں حاصل کرتی چلی گئی۔ ایک دن ایسا آگیا جب اسے اپنے خوابوں کی تعبیر ملنے والی تھی۔

اس کا نام اولمپکس کمیٹی کے سامنے پیش ہوگیا۔ اس بات کا اعتراف تو سب کو تھا کہ اس میں بے پناہ ٹیلنٹ ہے لیکن رکاوٹ یہ تھی کہ وہ دیکھ نہیں سکتی تھی۔

بہرحال وہ اولمپکس کی تاریخ کی پہلی نابینا ایتھلیٹ تھی جس کو قانونی طور پر میراتھن میں حصہ لینے کی اجازت دے دی گئی تھی۔

اس نے پانچ ہزار میٹر کی ریس میں حصہ لیا اور عورتوں کی چیمپئن بن گئی۔ یہ اتفاق نہیں تھا۔ وہ دوبار چیمپئن رہ چکی ہے۔

اس نے سڈنی اولمپکس میں بھی پانچویں پوزیشن حاصل کی تھی۔

اس باہمت نابینا ایتھلیٹ کا نام Marla Runyan تھا۔

ان باہمت اور باحوصلہ لوگوں نے ہر میدان میں ثابت کیا ہے کہ وہ کسی سے کم نہیں ہیں۔ ان کے ارادے بلند ہوتے ہیں اور ان کے سننے، محسوس کرنے کی صلاحیت حیرت انگیز ہوا کرتی ہے۔

اس شعبے میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔

ایک وہ جو اپنی معذوری کو بہانہ بناکر ہمت ہار بیٹھتے ہیں۔ جو کچھ نہیں کرپاتے اور گھر کے ہوکر رہ جاتے ہیں۔ ان کا یہ خیال ہوتا ہے کہ ان کے لیے دنیا ختم ہوگئی ہے۔

جبکہ دوسری کیٹگری ان لوگوں کی ہے... جن کے لیے معذوری کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ وہ زندگی کی دوڑ میں حصہ لیتے رہتے ہیں اور بے شمار آنکھوں والوں سے بھی آگے نکل جاتے ہیں۔

☆☆☆

یہ کہانی ایک اور حیرت انگیز انسان کی ہے۔

وہ ایک صحافی تھا۔ اس نے سماجی برائیوں کے لیے قلم اٹھایا اور ٹیکسی چوروں، جواریوں اور دوسرے مجرموں کے خلاف بے باک رپورٹنگ کرتا رہا۔

اس کی پیدائش ہنگری میں 10 اپریل 1847ء کو ہوئی تھی۔ اس نے بہت پیسے کمائے لیکن وہ اپنی دولت کو ہمیشہ بہبود انسانی کے لیے خرچ کرتا رہا۔

اس کی آنکھوں میں شروع ہی سے خرابی تھی۔ دھندلا دھندلا سا دکھائی دیتا تھا۔ اس کے باوجود اس نے اپنا کام جاری رکھا۔

اس کا بہت گہرا تعلق کولمبیا یونیورسٹی کے شعبۂ صحافت سے رہا ہے۔ 1889ء میں وہ بہادر اور بے باک صحافی مکمل طور پر نابینا ہوگیا۔

یہ اس کے لیے ایک قیامت سے کم نہیں تھا۔ اس کا

کام ہی ایسا تھا کہ اس میں بینائی کی ضرورت تھی۔ نابینا ہونے کے بعد وہ کیا کرتا۔

لیکن کچھ دنوں کے صدمے اور ڈپریشن کے بعد اس نے دوبارہ قلم سنبھال کر اپنا کام شروع کردیا۔ اب وہ خبریں مختلف زاویے سے وصول کرتا اور انہیں اپنے انداز اور رنگ میں پیش کردیا کرتا۔ وہ جرائم کی دنیا کے لیے ایک خوف کی علامت بن گیا تھا۔

وہ ایک باکمال صحافی تھا۔ اپنی زندگی میں بھی باکمال رہا اور اپنی موت کے بعد بھی اس نے باکمال لوگوں سے اپنا رابطہ ختم نہیں کیا۔

اس کی وفات 29 اکتوبر 1911ء میں ہوئی تھی۔ وہ دوملین ڈالر کی رقم صحافت، ادب اور میوزک کے شعبے میں ہر سال باکمال لوگوں کو ایوارڈز دینے کے لیے چھوڑ گیا تھا۔

اس کا نام جوزف پلسٹرز تھا.... آج دنیائے صحافت، ادب اور میوزک میں پلسٹرز ایوارڈ کو ایک سند کا درجہ حاصل ہے۔

☆☆☆

اس کے دوست ہنسا کرتے تھے۔

جب وہ اپنے اس ارادے کا اظہار کرتا کہ اسے بڑے ہو کر مصور بننا ہے تو دوست کہا کرتے "ارمغان، خود سوچو، تم مصور کیسے بن سکتے ہو۔ تم کو تو نظر ہی نہیں آتا۔"

"تو کیا ہوا۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ دنیا میں ایسے بہت سے مصور گزرے ہیں جو دیکھ نہیں سکتے تھے۔"

"لیکن ان میں اور تم میں فرق یہ ہے کہ وہ بعد میں نابینا ہوئے، اس سے پہلے دنیا ان کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ سارے مناظر ان کی یادداشت میں تھے جنہیں وہ ٹیسٹ کرتے رہے، لیکن تم تو بہت کم عمری میں نابینا ہو گئے ہو۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں نے جو کچھ دیکھ لیا ہے، میرے لیے وہی بہت ہے۔" وہ کہا کرتا۔ "تم لوگ دیکھ لینا، میں دنیا میں ایک مثال بن کر رہوں گا۔"

اس کی پیدائش ترکی میں ہوئی تھی۔ اس کا سن پیدائش 1953ء ہے۔ وہ ایک غریب گھرانے کا بچہ تھا۔ اس کے والدین کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ وہ اسے اعلیٰ تعلیم دلوا سکتے۔

پھر بھی کسی نہ کسی حد تک انہوں نے اسے تعلیم دلوا ہی دی تھی۔ اس کے والدین اس کی ایک صلاحیت کا اعتراف کرتے ہیں۔ "اس کی ڈرائنگ ہمیشہ سے اچھی رہی ہے۔ وہ بغیر اسکیل کے ہی سیدھی لکیر کھینچ دیا کرتا تھا۔"

بہت کم میں اس قسم کی صلاحیت ہوا کرتی ہے۔

اس کی دوسری صلاحیت یہ تھی کہ وہ رنگوں کا استعمال جانتا تھا۔ رنگوں کے کمبی نیشن میں اس کا جواب نہیں تھا۔ وہ بتادیا کرتا کہ کون سا رنگ کہاں موزوں رہے گا۔

اس نے اپنی سب سے پہلی پینٹنگ اس وقت بنائی جب وہ صرف نو برس کا تھا۔ نو برس کی عمر ہی کیا ہوتی ہے۔ پھر بھی اس کی یہ تصویر دیکھنے والوں کو حیران کردیا کرتی۔

ماہرین نے اس کے بارے میں یہ خیال ظاہر کردیا تھا کہ وہ آگے چل کر ایک بڑا مصور بن جائے گا۔ بشرطیکہ اس کی ٹریننگ مکمل ہوتی رہے۔

اس غریب بچے کے ساتھ ٹریننگ وغیرہ کا کیا جواز ہوسکتا تھا۔ اس کی تو صلاحیتیں اسے آگے لے جارہی تھیں۔

اس نے جب دوسری تصویر بنائی تو اس وقت سے ہی اس کی آنکھیں... خراب ہونی شروع ہوگئیں اور صرف دس سال کی عمر میں وہ مکمل نابینا ہوگیا تھا۔

اس کے والدین سر تھام کر رہ گئے۔ وہ والدین جو اس کے خوبصورت دنوں کے خواب دیکھ رہے تھے۔ اب تو وہ نابینا ہو چکا تھا۔

وہ اب کیا کرسکتا تھا۔

غریب والدین کے بس میں جو تھا وہ اس کے لیے کرتے رہے۔ جہاں جہاں سے بھی ہوسکا، اس کا علاج کراتے رہے۔ لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اس کی خراب آنکھیں تندرست نہیں ہوسکیں۔

وہ نابینا ہی رہا۔

اور اس کے بعد قدرت نے اس کی صلاحیتیں ظاہر کروانی شروع کردیں۔

اس نے باقاعدہ پینٹنگ شروع کردی۔

ایک تصویر، دوسری تصویر، اور ہر تصویر ناقدین سے داد حاصل کرتی رہی۔ مصوری کی دنیا میں اس کی مثال نہیں ملتی کہ ایک شخص مکمل نابینا ہوجانے کے بعد مصوری کیے جارہا ہے۔

اس نے مصوری کی پوری تاریخ میں ایک حیرت انگیز

مقام حاصل کیا ہے۔

اس کی تصویروں کی نمائش اس کے اپنے ملک ترکی کے علاوہ دنیا کے اور کئی ممالک میں بھی ہوتی رہی ہے اور ہر جگہ اسے بے حد سراہا گیا ہے۔

اس باکمال نابینا مصور کا نام ارمغان ہے۔ ترکی میں پیدا ہونے والے اس مصور نے اپنے ہنر سے پوری دنیا کو نہ صرف حیران کردیا ہے بلکہ یہ بھی ثابت کردیا ہے کہ ارادے مستحکم ہوں تو کوئی بھی معذوری رکاوٹ نہیں بن سکتی۔

ایسرن ارمغان پوری دنیا کے باہمت لوگوں کے لیے ایک مثال بن کر رہ گیا ہے۔ ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے۔

ترکی اپنے اس باکمال نابینا مصور پر بجا طور پر فخر کرسکتا ہے۔

ایسا نہیں تھا کہ انہوں نے جوان ہونے تک قران شریف کو پڑھا ہی نہ ہو۔

ہر مسلمان بچے کی طرح ان کو بھی قران کی تعلیم دی گئی۔

لیکن یہ ایسی ہی تعلیم تھی جیسی ہر گھرانے میں دی جاتی ہے۔

قرآن شریف پڑھ لیا یا زیادہ سے زیادہ حفظ کرلیا۔

بہت کم ایسے ہوتے ہیں جو قرآن شریف پر غور کرتے ہیں۔ تدبر کرتے ہیں۔ خدا کے اس کلام کو اپنی روح میں اتارنے کی کوشش کرتے ہیں۔

وہ بھی ایک عام سا نوجوان تھا۔ مصر کے ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہونے والے اس بچے کے بارے میں کون یہ کہہ سکتا تھا کہ خدا نے اسے اپنے کسی خاص مقصد کے لیے منتخب کرلیا ہے۔

ثوبان رضی اللہ عنہ

(وفات 54ھ/673ء) صحابی۔ ابو عبداللہ کنیت۔ آپ یمن کے مشہور حمیری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ثوبان غلام تھے آنحضورؐ نے خرید کر آزاد کردیا اور فرمایا "دل چاہے اپنے خاندان والوں میں چلے جاؤ اور دل چاہے میرے ساتھ رہو۔" حضرت ثوبان نے اس شرف کو خاندان پر ترجیح دی اور آنحضورؐ کی خدمت میں رہنے لگے۔ آنحضورؐ کی وفات کے بعد مدینہ میں طبیعت نہ لگی اور یہاں سے شام چلے گئے اور رملہ میں سکونت اختیار کرلی۔ بعد میں رملہ سے حمص منتقل ہوگئے اور یہیں وفات پائی۔ ثوبانؓ آنحضورؐ کے خادم خاص تھے اور مسلسل آپؐ کی خدمت میں رہنے کا موقع ملا تھا۔ چنانچہ انہیں آنحضورؐ سے استفادہ کرنے کا زیادہ وقت ملا تھا۔ انہیں 127 حدیثیں ازبر تھی۔ بقول حافظ ابن عبدالبر ثوبان ان لوگوں میں ہیں جنہوں نے حدیثیں محفوظ کیں اور ان کی اشاعت بھی کی۔" ثوبانؓ کے تلامذہ میں معدان بن طلحہ، راشد بن سعد، جبیر بن نفیر، عبدالرحمان ابن غنم، ابوادریس فولانی قابلِ ذکر ہیں۔ آنحضورؐ کی وفات کے بعد جو جماعت صاحبِ علم وافتا تھی ثوبان اس کے ایک رکن تھے۔ لوگ ان سے احادیث سنتے تھے۔ ان کے معاصرین دوسروں سے سنی ہوئی حدیثوں کی تصدیق ان سے کراتے تھے۔ آنحضورؐ کی حیاتِ مبارکہ میں اور وفات کے بعد بھی دونوں زمانوں میں آپ کا فرمانِ مبارک ثوبانؓ کے پیشِ نظر رہتا تھا۔ ایک مرتبہ زبانِ نبویؐ سے جو کچھ سن لیا وہ ہمیشہ جان کے ساتھ رہا جس چیز میں بھی آنحضورؐ کے حکم کی خلاف ورزی کا ذرا سا بھی پہلو نکلتا ہوتا وہ ہمیشہ اس سے محترز رہتے۔

مرسلہ: نعمان اشرف، پشاور

نوجوانی ہی میں اسے شوگر لاحق ہوگئی۔

یہ موذی مرض جس کو لاحق ہوجائے اس کو برباد کرکے رکھ دیتا ہے۔ وہ نوجوان بھی اس بھیانک مرض کے چنگل میں گرفتار ہوا اور آہستہ آہستہ اس کی بینائی متاثر ہوتی چلی گئی۔

بہت علاج ہوا لیکن اس کی بینائی کو گرنے سے کوئی نہیں روک سکا۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ وہ مکمل طور پر نابینا ہوگیا۔

خدا کی قدرت ایسے ایسے معجزے دکھاتی ہے کہ انسانی عقل دنگ ہوکر رہ جاتی ہے۔ اس کی بینائی شاید اس لیے گئی تھی کہ اس کے اندر کی صلاحیتیں پوری طرح سامنے آجائیں۔

اس نے اپنے دل کی آنکھیں کھول لی تھیں۔

مکمل نابینا ہونے کے بعد اس نے الازہر یونیورسٹی سے اسلامک اسٹڈیز سے شاندار طور پر گریجویشن مکمل کرلی۔

یہ اس کا ایک شاندار کارنامہ تھا۔ پورا مصر اس کی کامیابی پر حیران ہوگیا تھا۔ اس نے ثابت کردیا تھا کہ اس نے اپنی ہمت نہیں ہاری ہے۔

بلکہ وہ اور آگے جانا چاہتا ہے۔ گریجویشن تو اس کی پہلی منزل تھی۔ اس کا سفر ابھی باقی تھا۔ اس نے ایک بار پھر قرآن شریف کا مطالعہ شروع کردیا۔

لیکن اس بار اس کی نیت کچھ اور تھی۔

وہ قرآن کو صرف پڑھنا نہیں بلکہ سمجھنا چاہتا تھا۔

..... خدا نے اسے اس مقصد کے لیے منتخب کرلیا تھا۔ اس کی نابینائی بھی اس کے راستے کی رکاوٹ نہیں بن سکی۔

اس نے بریل سسٹم کی مدد سے قرآن کو پڑھنا اور سمجھنا شروع کردیا۔ عربی اس کی اپنی زبان تھی۔ اس لیے اسے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔

قرآن شریف کے پوشیدہ خزانے اس پر منکشف ہوتے چلے جارہے تھے۔ اندھیروں میں جانے کے بعد وہ پھر روشنی میں آگیا تھا۔

اس نے قرآن پر ریسرچ کیا۔ غور کیا، سوچا اور خدا نے اسے بے مثال عالم بنادیا۔ وہ قرآن کے ذریعے بینائی تقسیم کرنے کا ذریعہ بن گیا۔

اس نے جان لیا کہ عالمی طاقتیں مسلمانوں کے خلاف کیسی سازشیں کررہی ہیں۔ اس کی ہمدردی ان لوگوں سے تھی جو مغرب کی چھیڑی ہوئی جنگ میں خوامخواہ مارے جارہے تھے۔

وہ چونکہ ایک عالم تھا۔ اس لیے اس کے پاس ہر مکتبۂ فکر کے لوگ آیا کرتے۔ اس کی بیٹھک کے دروازے ہر ایک کے لیے کھلے ہوئے تھے پھر ایسے میں وہ سانحہ ہوگیا۔ جس نے کئی معنوں میں عالم اسلام کو ایک طرف اور سامراجی طاقتوں کو دوسری طرف کردیا تھا۔

یہ تاریخ کا سب سے حیران کردینے والا موڑ تھا۔ یعنی ..... مشہور زمانہ ٹریڈ سینٹر کی تباہی۔ اس حادثے کے بعد تو جیسے دنیا ہی بدل کررہ گئی تھی۔ پورے امریکا میں بسنے والے مسلمان دہشت گرد سمجھے جانے لگے تھے۔ ان پر طرح طرح کی سختیاں شروع ہوگئی تھیں۔ امریکا اور امریکا سے باہر مسلمانوں پر حملے شروع ہوگئے تھے۔

پوری دنیا میں پکڑ دھکڑ شروع ہوگئی۔ القاعدہ نامی تنظیم کا ایک ہوا کھڑا کردیا گیا اور اس کی آڑ میں افغانستان پر حملے شروع ہوگئے۔

یہ سانحہ پوری دنیا کے لیے حیرت انگیز تبدیلی کا سبب بن گیا تھا۔

امریکا کو جس پر بھی شبہ ہوجاتا کہ اس نے ٹریڈ سینٹر کے سانحے میں کسی بھی قسم کا کوئی کردار ادا کیا ہے تو اسے گرفتار کرلیا جاتا۔

چاہے وہ دنیا کے کسی بھی حصے میں رہتا ہو۔ اس نابینا عالم کو بھی گرفتار کرلیا گیا۔ اس پر القاعدہ کے دہشت گردوں کی باقاعدہ مدد کا الزام تھا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ یہ الزام بھی تھا کہ یہ شخص مسلمانوں کو عیسائیوں کے خلاف بھڑکایا کرتا ہے۔

اس عالم کو کیلی فورنیا کی جیل میں ڈال دیا گیا۔ اسے ایک لمبی سزا ہوگئی۔

ہمارا موضوع اس شخص کے گناہ یا بے گناہی کا نہیں ہے، بلکہ موضوع یہ ہے کہ بینائی سے محروم لوگ بھی تاریخ میں اپنا کردار ادا کرسکتے ہیں اور ادا کررہے ہیں۔

اس عالم کا نام ہے عمر عبدالرحمان۔ اس کی پیدائش 3 مئی 1978ء کو مصر میں ہوئی تھی۔ اس نے اپنی معذوری کے باوجود قرآن شریف سے اپنا تعلق استوار کیا اور ایک مستند عالم بن کر لاکھوں کروڑوں دلوں میں اپنی جگہ بنالی۔

بابا وینگا

روبینہ

وہ ایک ایسی عورت تھی جس کے نام کا سکّہ چلتا تھا۔ لوگ اس کی ایک ایک بات پر آنکھ بند کرکے یقین کرتے تھے۔ بلغاریہ، روس اور دیگر کئی ممالک میں وہ بے انتہا مقبول تھی۔ دور دور سے لوگ اس کی دعائیں لینے آتے تھے۔

آنکھوں سے محروم تھی مگر پیش گوئی میں اسے ید طولیٰ حاصل تھا

ایک انتہائی غریب گھرانے میں پیدا ہونے والی یہ بچی دوسرے بچوں سے بہت مختلف تھی۔

دوسرے بچے تو کھیل کود میں وقت گزارتے جبکہ یہ کسی گوشے میں بیٹھ کر نہ جانے کیا کیا سوچتی رہتی۔

وہ 31 جنوری 1911ء میں بلغاریہ میں پیدا ہوئی تھی۔ وہ جب پیدا ہوئی تو بے انتہا کمزور تھی۔ اتنی کمزور کہ وہ پیدا ہونے والے دوسرے بچوں کی طرح رو بھی نہیں پارہی تھی۔

اس کے بارے میں اس کے گھر والوں نے یہ سوچ لیا تھا

کہ وہ زندہ نہیں بچے گی۔ اس لیے اس کا کوئی نام نہیں رکھا گیا تھا۔

وہ غربت زدہ گھر کا ایک چھوٹا سا کمرا تھا جہاں اس کی پیدائش ہوئی تھی۔ اس کی ماں کے اردگرد گھر کی پرانی دایہ کے علاوہ دو چار رشتے دار بھی کھڑے ہوئے تھے۔

پورے کمرے میں تیل اور مسالوں کی بُو رچی ہوئی تھی۔ ایک عجب سا ماحول۔ اس پر ایک ایسی بچی کی پیدائش جس کی سانسیں شاید گنتی کی تھیں۔

پیدا ہونے والی بچی کا باپ دوسرے کمرے میں اپنا سر تھامے بیٹھا تھا۔ یہ ان کی پہلی اولاد تھی۔ اگر یہ بچی صحت مند اور نارمل ہوتی تو شاید اس کے باپ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا۔ لیکن اس وقت تو وہ اس کی زندگی ہی کی طرف سے مایوس تھا۔

”کیوں نہ ہم ہی اس کا کوئی نام رکھ دیں۔“ ایک عورت نے کہا۔

”نہیں۔ کیا فائدہ، اس کو زندہ تو رہنا نہیں ہے۔ یہ گم نام ہی بہتر ہے۔“

لیکن ان سبھوں کے خدشات کے برعکس بچی نے نہ صرف کلبلانا شروع کردیا۔ بلکہ ہلکی آواز میں رونے بھی لگی تھی۔ اس کے باپ کو جب یہ خبر سنائی گئی تو وہ جوش میں کھڑا ہوگیا۔ ”اب جلدی سے اس کا نام رکھ دو۔“

اس علاقے کی روایت یہ تھی کہ جب کوئی بچہ پیدا ہوتا تو دایہ بچے کو گود میں لے کر گلی میں نکل جاتی اور جو پہلا راہ گیر دکھائی دیتا اس سے درخواست کی جاتی کہ بچے کا نام رکھ دے۔

اگر پہلے راہگیر کا نام پسند نہیں آتا تو پھر دوسرے راہ گیر سے کہا جاتا۔ دایہ رسم کے مطابق بچی کو کپڑے میں لپیٹ کر گود میں اٹھا کر گلی میں لے آئی۔

پہلے راہ گیر نے جو نام رکھا وہ ان لوگوں کو پسند نہیں آیا۔ وہ مشکل بھی تھا اور اس نام میں یونانی اثرات بھی تھے۔ دوسرے راہ گیر نے جب اس بچی کو دیکھا تو کچھ دیر تک دیکھتا ہی رہا۔ پھر دھیرے سے بولا۔ ”یہ بچی بہت مختلف ہوگی۔ اس لیے اس کا نام ونیگار رکھ دو۔“

اس طرح وہ بچی گم نام نہیں رہی بلکہ ونیگا ہوگئی تھی۔ اس لفظ کا مطلب تھا خوش خبری دینے والا یا دینے والی۔

بچی ذرا بڑی ہوئی تو اس کے مشاغل دوسروں سے بہت مختلف نظر آنے لگے۔

وہ آسمان کو دیکھا کرتی۔ ہواؤں کو سونگھا کرتی۔ ایک بار اس نے کہا۔ ”کل بہت زور کی بارش ہوگی۔“

سب نے اس کا مذاق اڑانا شروع کردیا کیونکہ نہ تو وہ بارش کا موسم تھا۔ اور نہ ہی آسمان پر بادلوں کا نام و نشان تھا۔ اس کے باوجود وہ بہت پُریقین تھی۔ ”میں نے کہا نا کہ کل بارش ہوگی۔ تم لوگ دیکھ لینا کیسی بارش ہوتی ہے۔“

اور دوسرے دن خلافِ توقع بہت زوردار بارش ہوئی۔ اس کی اس بات کو حیرت سے دہرایا تو گیا لیکن اس پر زیادہ دھیان نہیں دیا گیا۔ کبھی کبھی کچھ بچے اس قسم کی باتیں کہہ جاتے ہیں اور قدرت ان کی بات رکھ لیتی ہے۔

یہ بھی شاید کوئی ایسی ہی بات ہوگی جو اتفاقاً ہوگئی ہوگی۔

لیکن جب اس نے ایک بار شہر کے ایک علاقے میں آگ لگنے کی پیش گوئی کی تو سب یہ جان گئے کہ اس میں کوئی غیر معمولی صلاحیت ضرور ہے۔

اس کے مشاغل صرف یہیں تک محدود نہیں تھے بلکہ اس نے علاج بھی شروع کردیا۔ کوئی بچہ بیمار ہوجاتا تو وہ اس کا ہاتھ تھام کر یا اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر ہیلنگ..... بھی کیا کرتی، اس طرح اس نے بے شمار بیمار بچوں کے علاج کر ڈالے تھے۔

اپنے گھر اور پورے محلے میں ونیگا کو ایک خاص اہمیت حاصل ہوگئی تھی۔ کئی بڑے لوگ بھی اپنی قسمت کا حال جاننے کے لیے اس کے پاس آیا کرتے۔ کچھ لوگ موسم کا حال معلوم کرنے اس کے پاس آتے اور وہ ٹھیک ٹھیک بتادیا کرتی۔

اس کے ساتھ کئی انتہائی خطرناک حادثات بھی ہوئے۔

پہلا حادثہ تو اس کی ماں کی موت کا تھا۔ اس کی موت اچانک ہی ہوئی تھی اور دوسرا حادثہ اس کے نابینا ہوجانے کا ہوا۔

ایک بار کھیل کے دوران اس کی آنکھوں میں ڈھیری ریت گھس گئی۔ اس ریت نے اس سے بینائی چھین لی۔ اس کے غریب باپ نے اس کا علاج کروانے میں کوئی کمی نہیں رکھی تھی۔ لیکن اس کی آنکھیں ٹھیک نہیں ہوسکیں۔

خفیہ صلاحیتیں یا تو ان میں ہوتی ہیں جو بچپن ہی سے اس کے حامل ہوتے ہیں یا پھر ان میں ہوتی ہیں جنہیں قدرت کسی ایک حس سے محروم کردیتی ہے اور تب ان کی دیگر صلاحیتیں بیدار ہوجاتی ہیں۔

تیسری قسم ان انسانوں کی ہوتی ہے جو اپنی محنت اور ذہانت سے اس کمال کو حاصل کرلیتے ہیں۔ ونیگا میں یہ صلاحیتیں شروع سے موجود تھیں۔

نابینا ہوجانے کے بعد وہ صلاحیتیں پوری طرح سامنے آگئیں۔ وہ کہا کرتی۔ ”میں خود سے کوئی بات نہیں بتاتی بلکہ کوئی مخلوق آکر مجھ سے سرگوشی کرتی ہے کہ فلاں بات اس طرح اور اس دن ہونے والی ہے اور یوں میں اس بات کو دوسروں تک پہنچادیتی ہوں۔“

اس کے باپ نے اسے نابیناؤں کے ایک اسکول میں داخل کرادیا لیکن وہ زیادہ پڑھ نہیں سکی کیونکہ لوگ اسے گھیرے رہتے تھے۔

دوسری طرف اس کے باپ نے دوسری شادی کرلی تھی۔ جس سے ونیگا کے سوتیلے بھائی بہن تھے۔ خوش قسمتی یہ ہوئی کہ ونیگا کی دوسری ماں بہت مہربان اور پیار کرنے والی عورت ثابت ہوئی۔ اس نے اپنی سگی اولاد کی طرح ونیگا کا خیال رکھا تھا۔

سوتیلی ماں نے اس کی خفیہ صلاحیتوں کی بھی بھرپور ہمت افزائی کی۔

اسکول میں آنے کے بعد اس کی دوسری صلاحیتیں بھی سامنے آنے لگیں۔ نابینا ہونے کے باوجود وہ بہت اچھا پیانو بجالیتی۔ کوکنگ کرلیتی۔ رقص کرسکتی تھی۔

اس کی پیش گوئی اور علاج کا سلسلہ ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

اسکول میں اس نے صرف تین سال گزارے۔ تین سال کے بعد وہ گھر واپس آگئی۔ اس کی سوتیلی ماں کا بھی انتقال ہوگیا تھا۔

اس نے اس موقعے پر نابینا ہونے کے باوجود بڑی بہن کا بھرپور کردار ادا کیا۔ وہ اپنے سوتیلے بھائی بہنوں کی دیکھ بھال کرتی رہی۔

لیکن بدقسمتی ابھی اس کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ 1934ء میں نہ جانے جذام جیسا موذی مرض اسے کہاں سے لگ گیا۔

لیکن اس بار بھی قدرت نے اسے بچالیا۔ وہ بالکل ٹھیک ہوگئی۔ اس کے ٹھیک ہوجانے کے بعد اس کی پیش گوئیوں کا رکا ہوا سلسلہ پھر شروع ہوگیا۔

اس کی ہیلنگ اور جڑی بوٹیوں کے علاج نے بھی لوگوں کو اس کی طرف دھیان دینے اور اس کے پاس آنے پر مجبور کردیا تھا۔

رفتہ رفتہ اس کی شہرت بلغاریہ سے نکل کر دوسرے ملکوں میں بھی پھیلنے لگی۔ یہاں تک کہ زار اس سے ملاقات کرنے اور اپنے مستقبل کا حال معلوم کرنے کے لیے

جالینوس

130ء۔200ء

ایک مشہور و معروف طبیب، جراح، دوا ساز اور علم طب کی کتابوں کا مصنف۔ ایشیائے کوچک کے شہر پرگاموں میں پیدا ہوا۔ یہ ایک معمار کا بیٹا تھا۔ سولہ برس کی عمر میں طب کا مطالعہ شروع کیا۔ علم کی تحصیل کے لیے سمرنا، کورنتھ اور سکندریہ گیا۔ اسکندریہ سے واپس آکر پرگیم کے بادشاہ کا شاہی طبیب مقرر ہوا۔ بعد میں روم چلا گیا اور شہنشاہ مارکس آرلیس کا شاہی طبیب بن گیا۔ لیکن چار سال بعد پھر واپس پرگیم آگیا۔ اس نے تشریح عضویات، امراضیات، معالجات اور رصد گاہ میں نئے نئے تجربے کر کے نئے حقائق کا انکشاف کیا۔ جالینوس بڑا پُرنویس، واضح اور زوردار مصنف تھا۔ اس کا شمار دنیا کے مشہور طبی فلاسفر میں کیا جاتا ہے۔ اس نے تقریباً 120 کے قریب کتب تصنیف کیں جو طب، منطق، صرف و نحو، اخلاقیات، فلسفہ اور ادب سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ اس کے غیر معمولی فضل و تبحر، ذہانت و سہل بیانی اور ادعاو تحکم کا نتیجہ ہے کہ اس کے اقتدار میں سولہویں صدی تک کوئی فرق نہیں آیا۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے یونان کی تشریحی و طبی معلومات اور ان کے عملی پہلو کو ایک واحد اور منظم شکل میں پیش کیا۔ اس کی شہرت ایک طبیب کی حیثیت سے برسوں تک بڑھتی چلی گئی۔ اور اسے آخر کار بقراط کے برابر طب کا معلم اعظم تسلیم کرلیا گیا۔ جالینوس نے یونانی اطباء کے عظیم الشان کارناموں کو جس طرح منضبط کر کے آئندہ نسلوں تک پہنچایا وہ اسی کا کارنامہ ہے۔ طب و فلسفہ میں جالینوس کی بہت سی تصانیف عربی ترجموں کی شکل میں منظرِ عام پر آئیں۔ 500ء میں جب فلسفے اور طب کو مسیحی نصاب تعلیم میں قطعی طور پر شامل کرلیا گیا تو نہ صرف جالینوس کی اکثر تصانیف کے محفوظ رہنے کی ضمانت مل گئی بلکہ آئندہ زمانے تک کے لیے اس کا تفوق بھی قائم ہوگیا۔ ساتویں، آٹھویں اور نویں صدی عیسوی میں جالینوس کی جو تصانیف یونانی، درس گاہوں میں پڑھائی جاتی تھیں ان سب تصانیف کے ترجمے آخر کار عربوں کے ہاتھوں میں آگے۔ اور اس طرح عربوں کو اس کی متعدد ایسی تصانیف کا سراغ مل گیا جو متاغر بزنطی دور میں ضائع ہوچکی تھیں۔ یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ متاغر عرب اطبا نہ صرف جالینوس کی جملہ تصانیف بلکہ اس کے طریق کار اور قائم کردہ نتائج پر پوری طرح حاوی تھے اور ان کے ہاں طب کی تعلیم و تدریس میں ان سب کتابوں کا متن ان کی شرحیں اور خلاصے اور ان پر مبنی نئی تالیفات نصاب کے لازمی جزو کے طور پر شامل تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ زمانہ وسط اور دورِ نشاۃ ثانیہ میں جالینوس پر جو کچھ علمی کام ہوا ہے وہ ایک حد تک عربوں کی تالیفات اور اس کی کتابوں کے تراجم ہی کا مرہونِ منت ہے۔

مرسلہ: نادر علی زیدی، پشاور

آ گیا۔
ایک بار اس کے سامنے جب ایک آدمی آ کر بیٹھا تو اس کی آواز نے وینگا کو چونکا دیا۔ اس آدمی کے لہجے اور آواز سے اس کے اندر چھپی ہوئی نفرت اور غصے کا اظہار ہو رہا تھا۔
''لگتا ہے تم شاید کسی اندرونی آگ میں جل رہے ہو۔'' وینگا نے اپنی بے نور آنکھیں اس کی طرف مرکوز کر دیں۔
''ہاں۔ میں کچھ لوگوں کے بارے میں پوچھنے آیا ہوں۔'' اس آدمی نے کہا۔ ''میں انہیں تلاش کرتے کرتے تھک چکا ہوں۔''
''شاید تم انہیں محبت کرنے کے لیے نہیں بلکہ ان سے نفرت کرنے کے لیے تلاش کر رہے ہو۔''
''ہاں، تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔ وہ تین آدمی ہیں۔ اور وہ میرے دو بھائیوں کے قاتل ہیں۔''
''مل جانے کے بعد تم ان کے ساتھ کیا کرو گے؟'' وینگا نے پوچھا۔
''ظاہر ہے۔ خون کا بدلہ خون ہی ہوتا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میں ان سے اپنے بھائیوں کے خون کا بدلہ لوں گا۔''
''اوہ۔'' وینگا نے ایک گہری سانس لی۔ ''تم ایسا کرو۔ کل پھر میرے پاس آؤ۔ میں پتا چلانے کی کوشش کرتی ہوں۔''
دوسرے دن اس نے اس آدمی کو بتایا۔ ''مجھے ان لوگوں کا پتا تو چل گیا ہے لیکن تمہیں نہیں بتا سکتی۔''
''وہ کیوں؟''
''اس لیے کہ تمہارے ستارے اس کے بعد گردش میں آ جائیں گے۔'' اس نے کہا۔ ''تم پر ایسی ایسی مصیبتیں ٹوٹیں گی کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔''
''تو میں اپنے دل میں لگی ہوئی آگ کا کیا کروں۔''
''بھول جاؤ ان کم بختوں کو۔'' وینگا نے کہا۔ ''اپنے سینے میں لگی ہوئی آگ کو بجھانے کی کوشش کرو۔ اور ہاں، کل پھر آنا۔ میں تمہارے لیے کچھ اور مراقبہ کرتی ہوں۔''
وینگا شروع سے یہ کہتی آئی تھی کہ کچھ غیر انسانی مخلوق اس سے ہم کلام ہوتی ہیں اور اسے لوگوں کے حالات بتا دیتی ہیں۔
وہ شخص اس کے بعد بھی وینگا کے پاس آتا جاتا رہا۔ اس کا نام ڈی سی ٹر گستارو تھا۔ کچھ دنوں کے بعد وینگا اور اس آدمی کے درمیان اچھی خاصی دوستی ہوگئی۔ بالآخر دونوں نے شادی کر لی تھی۔
اب اس کی زندگی میں ایک شوہر کا بھی اضافہ ہو گیا تھا۔
اس کے شوہر نے بھائیوں کے انتقام سے تو توبہ کر لی لیکن پھر اس کی ایک اور عادت سامنے آنے لگی جس نے وینگا کو پریشان کر کے رکھ دیا۔
وہ عادت تھی شراب نوشی کی۔ وہ بے انتہا شراب پیا کرتا تھا۔ وینگا اس کو بھی برداشت کرتی رہی۔ اس کے شوہر کا انتقال 1947ء میں شراب نوشی کی کثرت سے ہو گیا تھا۔
وہ جو بھی پیش گوئی کرتی۔ اس کا اسٹاف اسے لکھ لیا کرتا۔
اس کی دو بڑی پیش گوئیاں مکمل طور پر غلط ثابت ہوئیں۔ اس نے کہا تھا کہ 1924ء کا فٹبال چیمپئن وہ ملک ہوگا جس کا نام B سے ہوگا۔
اس نے اس سلسلے میں بتایا تھا کہ سیمی فائنل دو ایسی ٹیموں کے درمیان ہوگا جن کے نام B سے ہوں گے یعنی برازیل اور بلغاریہ۔
لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ برازیل کے ساتھ اس کا مقابل اٹلی تھا۔ اس کی ایک اور بڑی پیش گوئی یہ تھی کہ 2010ء میں ایک خوفناک جنگ کا آغاز ہو جائے گا جو 2014ء تک چلتی رہے گی۔
لیکن یہ بھی غلط ہی ثابت ہوا۔
ان کے باوجود اس کی لاتعداد پیش گوئیاں درست ثابت ہو چکی ہیں۔ وینگا کے حوالے سے ایک دل چسپ بات یہ ہے کہ اسے بابا وینگا کہا جاتا ہے۔
(بابا کا تصور ہمارے ہاں جو ہے، وہ ویسا نہیں ہے، جیسا وینگا کے ساتھ تھا۔ یہ بابا کا لقب ترکی والوں کا دیا ہوا ہے) اس کی صلاحیتوں کا ایک اور دھما کا دار پہلو اس وقت سامنے آیا جب یہ پتا چلا کہ وہ پیش گوئیوں کی آڑ میں جاسوسی کیا کرتی ہے۔ اور اس کی پیش گوئیاں دراصل وہ پیغامات ہیں جنہیں وہ مطلوبہ ایجنسیوں تک پہنچایا کرتی ہے۔
بابا وینگا کا انتقال گیارہ اگست 1996ء کو صوفیہ بلغاریہ میں ہوا تھا۔
یہ غیر معمولی نابینا عورت بلغاریہ، روس اور آس پاس کے ممالک میں بہت زیادہ مشہور ہے۔

مجاہدِ اعظم

محمد اشرف عطاری

چلنے پھرنے سے معذور تھا مگر قوم کو تن کر چلنے کی ترغیب دیتا تھا۔ اس کی آنکھیں بے نور تھیں پھر بھی وہ آزاد مملکت کا خواب دیکھتا تھا۔ اس نے مسلمانوں کو جھنجوڑ کر بیدار کردیا تھا۔ تبھی تو اس کا نام سن کر امریکا و اسرائیل پہ لرزہ طاری ہوجاتا تھا۔ اسرائیلی اس معذور شخص سے اتنے خوفزدہ ہوگئے تھے کہ اس کے خلاف ہوائی فوج کو استعمال کرنے پر مجبور ہوگئے۔

اسرائیل کے خلاف مزاحمتی قوت میں سے ایک بڑی قوت کا ذکرِ خاص

دونوں تقریباً ایک ہی عمر کے تھے۔ بارہ یا تیرہ برس کے۔ ان میں سے ایک کا نام احمد اور دوسرے کا عبداللہ الخطیب تھا۔ عبداللہ ہاتھ پاؤں کا مضبوط تھا جبکہ احمد دبلا پتلا۔ اس کے باوجود احمد نے عبداللہ کو کشتی لڑنے کا چیلنج دے دیا تھا۔ یہ کشتی غزہ کے مہاجر کیمپ میں ہو رہی تھی۔
آس پاس تماشا دیکھنے والے جمع ہو گئے تھے۔ عورتیں، مرد اور بچے۔ یہ سب کے سب پناہ گزین تھے..... وہ بہت بڑا کیمپ تھا۔ اس کیمپ میں وہ لوگ پناہ گزین تھے جو اسرائیلی مظالم سے تنگ آ کر اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور ہوئے تھے۔ ان میں احمد کا خاندان بھی تھا۔

حضرت یعقوبؑ برسوں مسلسل رونے سے نابینا ہو چکے تھے۔ آنکھیں بجھ گئی تھیں مگر دل میں اللہ کی رحمت اور آس کا مقدس دیا ہنوز روشن تھا کہ وہ بہر حال اللہ کے برگزیدہ پیغمبر تھے کوئی عام آدمی نہیں تھے چنانچہ آنسوؤں کی لگاتار جھڑی رحمت آس کا دیا تو کیا بجھاتی الٹا ارد گرد کا گرد و غبار صاف کر کے اس دیے کی لو کو مزید اجالتی، بڑھاتی رہی۔ گویا آنسو دیے کے لیے تیل کا کام دیتے رہے اور یہ مقدس دیا حضرت یعقوب علیہ السلام کے نہاں خانہ دل میں آخر دم تک روشن رہا۔ امید و آس اس قدر پختہ جذبہ، اتنا کامل یقین۔ چشمِ فلک نے ایسا نظارہ کب دیکھا ہوگا کہ مایوسی کے گھور اندھیرے آس کی شمع کے لیے آئینہ بن رہے تھے۔ عزیز از جان بیٹے سے دوری کا وقت اور درد و کرب جتنا بڑھ رہا تھا حضرت یعقوب علیہ السلام اتنا ہی اللہ کے نزدیک تر ہوتے جا رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے پیغمبرانِ کرام کو مختلف آزمائشوں میں ڈالا اور عوام الناس کے لیے مثالیں قائم کیں۔ فرشتے ہر بار سجدۂ آدمؑ پر شکر بجالاتے رہے اور مرحبا کے کلمات بلند کرتے رہے۔ اولاد سے جدائی کا دکھ حضرت یعقوب علیہ السلام کے حصے میں آیا جس میں آپؑ بہ فضلِ خدا ثابت قدم رہے اور اللہ کی آزمائش پر پورے اترے۔ یہ امتحان اس قدر سخت تھا کہ آنکھیں ساتھ چھوڑ گئیں۔ آنکھیں جو مادی وجود کا چراغ ہوتی ہیں، یہ اگر پیدائشی طور پر میسر نہ ہوں تو زندگی تلخیوں اور اندھیروں میں گزر جاتی ہے لیکن اگر پا کر کھو دی جائیں تو زندگی یکسر ہی بے معنی ہو کر عذاب بن جاتی ہے۔ کھوئے ہوئے دنیوی رنگ و نور کی کسک اور چبھن آتی جاتی سانس کو دو دھاری تلوار بنا دیتی ہے لیکن یہاں تو پیغمبرانہ صبر و وقار کا سوال تھا جسے حضرت یعقوب علیہ السلام کو نبھانا تھا اور انہوں نے توفیقِ الٰہی سے اسے بہ خوبی نبھایا۔ وہ مایوسی جیسے کفر کا ارتکاب کیسے کر سکتے تھے البتہ مسلسل رونا ایک اضطراری عمل اور بشری تقاضا تھا جبکہ لوگوں کے نزدیک ان کی اس قدر گریہ وزاری اب اگر قابلِ رحم تھی تو دوسری طرف جاں کا زیاں بھی تھا لیکن گریۂ یعقوبؑ نے جہاں ہر کسی کے لیے عملی نمونہ بننا تھا کہ اللہ کی رحمت سے آخر دم تک بھی مایوس نہیں ہونا ہے کہ ایسا کرنا اللہ کے وجود سے انکار کرنا ہے وہاں دوسری جانب گروہِ عشاق کے لیے بھی ایک قابلِ تقلید مثال بننا تھا۔

ہم نے کیا کیا نہ ترے ہجر میں محبوب کیا
صبرِ ایوب کیا گریۂ یعقوب کیا

قرآن پاک میں داستانِ یوسفؑ کو احسن القصص قرار دیا گیا ہے جس میں باپ کی شفقت و محبت، خواب و تعبیر، بھائیوں کا حسد و انتقام، سفر اور در بہ در ہونے کا احوال۔ سوداگری، غلاموں کا بیوپار، حسن و عشق کی کارفرمائیاں، تریا ہٹ، قید و بند کی صعوبتیں، ہجر و وصال، پیغمبرانہ عزم و استقلال، حق کی تبلیغ، بالآخر حکمت و حکومت کا کامیاب انداز، ملن، خوشی، مسرت، الغرض زندگی کے سارے ہی رنگ نظر آتے ہیں۔ حقائق تمثیلی انداز میں سامنے آتے اور وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ دیگر مذہبی کتابوں اور داستانوں کے برعکس یہاں دیومالائی کرداروں بھوت پریت، پری دیو وغیرہ کا کوئی گزر کوئی ذکر نہیں کہ انسانی ذہن و عقل الجھن کا شکار ہو۔ سب کچھ ممکنہ امر اور فطرت کے مطابق ہے۔ داستان میں آخر کار اعلیٰ ظرفی عفو و درگزر، رحم،

یہ بچہ اپنے باپ کے بغیر اپنے چار عدد بھائیوں اور دو بہنوں کے ساتھ اس کیمپ میں رہتا تھا۔ یہ لوگ القمر انام کے گاؤں سے آئے تھے۔ جب فلسطین پر برطانوی راج تھا تو اس گاؤں میں احمد کی پیدائش ہوئی تھی۔ اس سے بڑے بھائی اور بہن تھے۔ سوائے ایک بہن کے جو اس کی پیدائش کے ایک سال بعد دنیا میں آئی تھی۔

اس کے باپ کا نام عبداللہ یاسین تھا۔ وہ ایک... بیدار مغز سچا مسلمان تھا۔ اسے اس بات پر افسوس ہوا کرتا کہ مسلمان اپنی حالت کیوں نہیں سدھارتے۔ ان کے ساتھ پریشانیاں کیوں لگی رہتی ہیں۔ جب احمد 2 سال کا تھا تو اس کے باپ عبداللہ یاسین کا انتقال ہوگیا.... ساری ذمے داری ماں پر آگئی تھی۔ ماں نے بہت سلیقے سے بچوں کی پرورش شروع کر دی۔

اسی دوران 1948ء میں عرب اسرائیل جنگ شروع ہوگئی.... اسرائیل نے اس گاؤں پر قبضہ کر کے مسلمانوں پر ظلم ڈھانا شروع کر دیا۔ اس وجہ سے احمد کا خاندان بلکہ اور بھی بہت سے مسلمان گاؤں سے نکل کر اس کیمپ میں آ گئے۔ یہیں احمد اور عبداللہ الخطیب کی دوستی شروع ہوئی تھی۔

پھر ایک دن احمد نے اپنے دوست عبداللہ الخطیب کو

کرم اور درد دل کو تخلیقِ آدم کی بنیاد ٹھہرایا گیا ہے۔ دیکھا جائے تو قصہ یوسف و زلیخا کا مجموعی تاثر ہر مذہبی و غیر مذہبی ذہن پر ثبت نقش جماتا نظر آتا ہے۔ اس کے واقعات تقریباً تمام انسانی معاشروں کی عکاسی کرتے ہیں کہ خیر و شر کی کشمکش تو ازلی ہے اور ابد تک رہے گی۔ قرآن پاک میں سورہ یوسف حضرت یوسفؑ کا زندگی نامہ ہی ہے جس میں آپؑ مختلف نشیب و فراز سے گزرتے مگر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہتے ہیں۔ دراصل جملہ انبیائے کرام اللہ تعالیٰ کی طرف سے حسن و خیر کی سوغات لے کر آتے رہے اور پھر حسن و خیر کا یہ سلسلہ تاجدارِ مدینہ کی ذات اقدس پر تمام ہوا۔ داستانِ یوسفؑ نے دنیائے ادب کو بہت کچھ دیا۔ مثلاً تلمیحات، ضرب الامثال، محاورے اشعار و مضامین، نکتہ رسی و بیان آفرینی، اظہار کے نئے رنگ اور ڈھنگ دیے۔ شاعر و ادیب حضرات نے اس سمندر میں خوب خوب غواصی کی اور علم و ادب کے گوہر بے بہا دریافت کیے، ادبی چکا چوند پیدا کی۔ اس ضمن میں یہاں سرسری ساذکر فارسی اور اردو ادب کے حوالے سے مقصود ہے۔ اردو چونکہ فارسی کا دودھ پی کر جوان ہوئی لہٰذا فارسی ترکیب و تلمیحات، برادرانِ یوسفؑ، چاہ یوسفؑ، یوسفؑ کدہ، یوسفؑ بے کارواں، یوسف ثانی، حسن یوسفؑ، سنتِ یوسفی (قید و بند) گریۂ یعقوبؑ، پیر کنعان (حضرت یعقوبؑ)، ماہ کنعاں (حضرت یوسفؑ)، پیراہنِ یوسفؑ، سمیت دیگر بہت سی تشبیہات اردو میں بھی مستعمل ہیں۔ فارسی شعر و ادب کی طرح اردو شعر و ادب نے بھی اس داستان سے جی بھر کے خوشہ چینی کی۔ شعرائے کرام نے نت نئے مضامین نکالے۔

یوں تو فارسی کے بے شمار سخن دانوں نے واقعہ یوسفؑ کے سلسلے میں سخن آرائی کی لیکن یہاں موضوع کی مناسبت سے غنی کاشمیری کا ایک شعر مدِ نظر ہے۔ غنی کاشمیری جو شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر کے ہم عصر تھے۔ مکمل طور پر تہی دامن مگر خوددار اتنے کہ شہنشاہ عالمگیر نے ان سے ملنا چاہا تو انہوں نے قطعی انکار کر دیا اور کبھی نہیں ملے۔ گھر میں ہوتے تو دروازہ بند رکھتے۔ باہر جاتے تو مکان کھلا چھوڑ جاتے۔ کسی عقیدت مند نے پوچھا۔ حضرت ایسا کیوں کرتے ہیں آپ؟ کہنے لگے اس مکان میں قیمتی چیز تو صرف میں ہی ہوں جس کے لیے دروازہ بند رکھتا ہوں۔ اللہ اللہ! اس قدر بے نیازی، خودداری اور استغنا، فارسی کے انہی باکمال شاعر کا یہ شعر ہے جو اس مضمون اور تمام تر سوچ کی بنیاد ہے۔

غنی روز سیاہ پیر کنعاں راتما شاکن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخارا

(اے غنی، ذرا دیکھو تو کہ پیر کنعاں (حضرت یعقوبؑ) کی آنکھ کا نور (بیٹا یوسفؑ) عزیز مصر کی بیوی زلیخا کی آنکھوں کو روشنی و رنگ بخش رہا ہے) یہ شعر کسی بھی تعریف و توصیف سے بالاتر ہے.... اس قدر نکتہ رس و نکتہ آفریں جامعیت سے بھرپور مکمل شعر کہ کسی بھی پہلو سے اس پر انگلی نہیں رکھی جا سکتی۔

حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت یوسفؑ کے غم میں روتے روتے نابینا ہو گئے تھے مگر جیسے ہی حضرت یوسفؑ کی خوشبو پائی تنِ مردہ میں جان پڑ گئی اور بینائی دوبارہ سے لوٹ آئی۔

مرسلہ: محمد ایاز راہی، مانسہرہ

کشتی لڑنے کا چیلنج دے دیا اور دراصل یہی لمحہ اس کی زندگی کا سب سے اہم ٹرننگ پوائنٹ بھی ثابت ہوا۔

کشتی کے دوران عبداللہ الخطیب نے نہ جانے کون سا داؤ مارا کہ احمد زمین پر گرا اور دوبارہ اٹھ نہیں سکا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی کو نقصان پہنچا تھا۔ اس وقت کیمپ میں موجود ڈاکٹر اس کے پاس پہنچ گئے... اور اس کی پوری کمر کو پلاستر کر دیا گیا۔ بے چارہ عبداللہ الخطیب سخت شرمندہ تھا۔ لیکن احمد نے اسے تسلی دی کہ جو کچھ بھی ہوا اس میں تمہارا کیا قصور تھا؟ یہ تو ایک حادثہ تھا۔ جو کسی طرح بھی اور کسی بھی وقت ہو سکتا ہے۔

پینتالیس دنوں تک پلاستر میں رہنے کے باوجود بھی احمد ٹھیک نہیں ہو سکا۔ اس حادثے کے بعد وہ وہیل چیئر پر آ گیا تھا اور ساری زندگی وہیل چیئر ہی پر رہا۔ طرفہ تم یہ ہوا کہ اس کی بینائی آہستہ آہستہ زائل ہوتی چلی گئی۔

ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی کو کچھ ایسا ہی نقصان پہنچا ہے جس نے بینائی کو متاثر کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس کی ماں اور بھائی بہن بہت پریشان تھے۔

کہتے ہیں کہ قدرت جب کوئی چیز لیتی ہے تو اس نقصان کو بہت کچھ دے کر پورا بھی کر دیتی ہے۔ خدا نے احمد کو کسی خاص موقع کے لیے منتخب کر لیا تھا۔ اس لیے اس کے

ساتھ ایسا حادثہ پیش آیا۔

وہ آنکھوں والا ہی رہتا تو شاید اس مقام تک نہیں پہنچ پاتا جو مقام اس کو نابینا ہوجانے کے بعد حاصل ہونا شروع ہوا تھا۔

احمد کے ذہن میں بچپن ہی سے اسرائیل کے خلاف نفرت تھی۔ اس کے گاؤں کے مسلمانوں پر اسرائیل کے مظالم، اس کے خاندان کا گاؤں چھوڑ کر کیمپ میں آجانا۔

اس کا کہنا تھا کہ اگر وہ لوگ ہجرت پر مجبور نہیں کیے جاتے، اپنے گاؤں ہی میں رہتے تو شاید اس کے معذور اور نابینا ہونے کا حادثہ نہیں ہوتا۔ اس نے اس حادثے کو بھی اسرائیل کے کھاتے میں ڈال دیا تھا۔ کیونکہ اسرائیل ہی کی وجہ سے اسے اپنا گاؤں چھوڑنا پڑا تھا۔ اس نے کیمپ اور غزہ کی مساجد میں خطبات دینے شروع کردیے۔

اس کے مخفی جوہر اب سامنے آرہے تھے۔ وہ ایک باکمال اور پُرجوش مقرر ثابت ہوا تھا۔ اس کی تقریریں نوجوانوں کے دلوں میں آگ لگادیتی تھیں۔

اس زمانے میں اس نے الازہر یونیورسٹی میں داخلہ کی کوشش کی لیکن اسے داخلہ نہیں مل سکا۔ اس کے بعد اس نے گھر ہی پر تعلیم حاصل کرنی شروع کردی۔

اس نے فقہ، فلسفہ، سوشیالوجی اور تاریخ وغیرہ پر عبور حاصل کرلیا۔ اس کے خطبات میں چونکہ علمیت اور حقائق ہوا کرتے اس لیے بہت شوق اور توجہ سے سنے جاتے تھے۔

وہ زمانہ اس کی بے روزگاری کا تھا۔ ابھی تک کوئی ایسا وسیلہ نہیں بنا تھا کہ وہ زندگی کی گاڑی کو کھینچ سکتا۔ پھر کسی نے اسے بتایا کہ رملہ کے ایک اسکول میں ایک عربی استاد کی ضرورت ہے۔

وہ انٹرویو کے لیے پہنچ گیا۔ انتظامیہ نے اسے دیکھ کر نوکری دینے سے انکار کردیا۔ ”دیکھیں یہ درست ہے کہ آپ میں صلاحیت ہے لیکن ایک تو آپ وہیل چیئر پر ہیں، دوسرے آپ نابینا ہیں۔ طالب علم آپ سے متاثر نہیں ہوں گے بلکہ آپ کا مذاق اڑائیں گے۔ اسی لیے آپ سے معذرت کی جاتی ہے۔“

”آپ ایک کام کریں۔ صرف ایک بار، صرف ایک بار مجھے طالب علموں کے سامنے آنے کا موقع دیں۔ اگر ناکام رہا تو پھر میں کبھی ملازمت کی بات نہیں کروں گا۔“

انتظامیہ نے اس کی یہ درخواست منظور کرلی۔ طالب علم جمع ہوئے، اور احمد نے انہیں اپنی علمیت اور خطابت سے باندھ کر رکھ دیا اور اس طرح اس کی ملازمت کا آغاز ہوگیا۔

طالب علموں کو بھی وہ اسرائیل کے خلاف اکسایا کرتا تھا۔ اسکول میں ملازمت کے دوران حلیمہ نام کی ایک خاتون اس سے متاثر ہوکر اس کے قریب آگئی۔ اس قربت کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں نے شادی کرلی تھی۔ (اس سے ان کے گیارہ بچے پیدا ہوئے) 1984ء میں وہ ایک اسلامی جماعت سے منسلک ہوگیا۔

یہاں بھی اس کے نظریات وہی تھے۔ وہ اسرائیل اور فلسطین کے درمیان امن مذاکرات وغیرہ کا قائل نہیں تھا۔ کچھ عرصے کے بعد جب اسے اس کے مزاج کے کچھ اور لوگ مل گئے تو اس نے ایک تنظیم کی بنیاد رکھ دی جس کا نام حماس ہے۔

پوری دنیا میں اسرائیل مخالف سب سے بڑی تنظیم۔ اس تنظیم کے وجود میں آتے ہی اس نے کھل کر بولنا شروع کردیا۔

اس کا کہنا تھا کہ فلسطین کو آزاد ایک الگ ملک ہونا چاہیے اور اسرائیل کو صفحہ ہستی سے مٹ جانا چاہیے۔ احمد یاسین کی مقبولیت دن بہ دن بڑھتی چلی جارہی تھی۔

وہ اب پورے عالم اسلام میں ایک جانی پہچانی شخصیت اور باغی لیڈر کے طور پر سامنے آیا تھا۔ لوگ اس سے محبت کرنے لگے تھے۔

اس نے عام لوگوں کے لیے بہت کام کیے۔ اسپتال بنوائے، اسکول بنوائے، لائبریریز بنوائیں۔ وہ ہر سطح پر اسرائیل کا مقابلہ کرنا چاہتا تھا۔

اس پر الزامات لگائے گئے کہ اس نے اسرائیل کے خلاف حملوں کا سلسلہ شروع کروادیا ہے۔ وہ اسرائیل کے خلاف حملوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اسی الزام میں اسے 1984ء میں گرفتار کرلیا گیا۔

اسے عمر قید کی سزا سنائی گئی تھی۔ 1997ء میں اس کی رہائی اسرائیل اور عمان کے درمیان ایک معاہدے کے تحت عمل میں آئی۔ اسرائیل کی خفیہ ایجنسی موساد کے دو ایجنٹ گرفتار ہوئے تھے۔ ان دونوں کی رہائی کے عوض احمد یاسین کی رہائی عمل میں آئی تھی۔

رہائی کے بعد احمد نے پھر حماس کی سرگرمیاں شروع کرادیں۔ اسرائیل کے خلاف مسلح جدوجہد میں تیزی آگئی۔ یہ بات یورپی ممالک کو کب پسند آتی۔ حماس کی مخالفت میں امریکا، جاپان، کینیڈا وغیرہ نے ہنگامہ مچانا شروع کردیا۔ انہوں نے اس تنظیم پر دنیا بھر کے الزامات عائد کردیے۔ اس مہم میں کچھ نادان دوست بھی پیش پیش رہے، جن کے تیل کی صنعت امریکا پر انحصار کررہی تھی۔

احمد کے خیالات کی وجہ سے فلسطین کی حکومت کو بھی اس سے خطرہ محسوس ہوا کرتا۔ اسی لیے وہ کئی بار گرفتار یا نظر بند ہوتا رہا۔

اور جب بھی اس کے ساتھ ایسا معاملہ ہوتا اس کے حق میں مظاہرے شروع ہوجاتے۔ کیونکہ لوگ جانتے تھے کہ وہ حق پر ہے۔ اس کا جرم صرف یہی ہے کہ وہ ایک ظالم اور بے رحم حکومت اسرائیل کے خلاف ہے اور اسی کی کوشش سے فلسطین آزاد ہوسکتا ہے

2003ء میں اس کے آدمیوں نے اسرائیل کی ایک بس پر حملہ کرکے بہت سے لوگوں کو ماردیا تھا۔ اس میں حماس کے دو آدمی بھی گرفتار ہوئے تھے۔

اس گرفتاری کے ساتھ ہی اس کی مخالفت کرنے والے ممالک میں اس کی مخالفت اور بھی تیز ہوگئی۔ اسے عالمی دہشت گرد قرار دیا جانے لگا۔

وہ اسرائیل سے جتنی نفرت کرتا تھا۔ اسرائیل کو بھی اس سے اتنی ہی نفرت تھی۔ کئی بار حملے کروائے۔ لیکن وہ بچتے گئے۔ بالآخر ایک دن جب وہ فجر کی نماز ادا کرکے مسجد سے گھر کی طرف جارہے تھے تو اسرائیلی ہیلی کاپٹر نے ان پر گولیوں کی بوچھاڑ کردی اور وہ شہید ہوگئے۔ یہ واقعہ مارچ 2004ء کا ہے۔

ان ... کا پورا نام شیخ احمد اسماعیل حسن یاسین تھا۔ حماس کے بانی۔ ایک محبِ وطن نابینا عالمِ دین۔ ان کے جنازے میں دو لاکھ سے زیادہ افراد شریک تھے۔

دنیا بھر میں ان کی موت پر واویلا مچ گیا تھا۔ یو این او کے جنرل سیکریٹری کوفی عنان نے مذمت کی تھی۔ عالمِ اسلام اپنے ایک سچے اور بہادر سپاہی سے محروم ہوگیا تھا۔

شیخ احمد معذور اور نابینا تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے ثابت کردیا تھا کہ ظاہری آنکھیں بند ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

برصغیر کی تاریخ پر جب نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں بینا نابیناؤں میں ایک بڑا نام دھریسٹر راشٹر کا نظر آتا جسے ہندو مذہب میں بہت اہمیت دی گئی ہے۔ یہ نابینا راجا دھریسٹر راشٹر کون تھے؟ ہندو مذہب میں ہے کہ ان کے بھگوان برہما سے پیدا ہوئے اتری۔ اتری سے چندرما۔ چندرما سے بدھ۔ بدھ سے ایلانندن۔ ایلانندن سے آئیو، آئیو سے ناہوش، ناہوش سے یباتی۔ یباتی سے پورو پیدا ہوئے اور پورو سے بھرت اور بھرت سے کورو۔ کورو سے شنتانو اور شنتانو سے گنگانند بھیشم، شنتانو اور ستیاوتی سے پیدا ہوئے چترانگد اور بچتر ورے، مگر یہ دونوں بیٹے بھری جوانی میں مارے گئے تو ستیاوتی کی اجازت سے ویاس نے امبالیکا اور امبیکا سے شادی کرلی۔ امبالیکا سے دھریسٹر راشٹر اور امبیکا سے پانڈو پیدا ہوئے۔ دھریسٹر راشٹر نے گندھاری سے شادی کی جس سے سو بیٹے پیدا ہوئے جن میں بڑا تھا دریودھن اور پانڈو کے پانچ بیٹے تھے یودھیسٹر، نکول، ارجون، بھیم اور سہدیو۔ دھریسٹر راشٹر پیدائشی نابینا تھے اس لیے پانڈو کو راجا بنایا گیا۔ پانڈو کو ایک رشی نے بددعا دی کہ جب بھی تو اپنی بیوی کے ساتھ شب بسری کرے گا تو تیری موت ہوجائے گی۔ پانڈو اس غم میں اپنے بیوی بچوں کو لے کر جنگل میں چلے گئے اور اپنی جگہ دھریسٹر راشٹر کو راجا بنا گئے۔ جب پانڈو کے بیٹے جوان ہوئے تو اپنے تخت کی واپسی کا مطالبہ کیا جس کی وجہ سے مہابھارت کی جنگ ہوئی اور اسی جنگ میں کرشن بھگوان نے جو کچھ کہا وہ گیتا کا اشلوک بنا۔ گیتا کا خلاصہ یہ ہے ”جیسا کرم کروگے ویسا پھل دے گا بھگوان۔“ (جیسا عمل کروگے ویسا ہی پھل ملے گا) جس وقت مہابھارت کی جنگ ہورہی تھی اس وقت دھریسٹر راشٹر ہستیناپور میں بیٹھے ایک ایک بات کی خبر رکھ رہے تھے لیکن کسی بھی ایک پارٹی کے حق میں کوئی بیان نہیں دے رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا فتح جس کی ہوگی میں اس کو ہستیناپور کا تخت سونپ دوں گا۔

مرسلہ: رمیش دیوریہ، کراچی

سراب

راوی : شہباز ملک

تحریر: کاشف زبیر

قسط: 76

وہ پیدائشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکار سی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حسین لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب... ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن ودل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر آسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

بابا کا اصرار تھا کہ مجھے کیڈٹ کالج بھیج دیا جائے جبکہ میں آرمی میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ میری محبت سویرا میرے بھائی کا مقدر بنا دی گئی تو میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ ایک روز مری سے واپس آتے ہوئے نادر علی سے ٹکراؤ ہو گیا پھر یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے دشمن تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست۔ پھر تو ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئی تھیں۔ میں دوبارہ وطن لوٹا تو فتح خان سے ٹکراؤ ہو گیا۔ اس کے آدمیوں کو شکست دے کر میں اندرون ملک آ گیا۔ آتے وقت میرے ہاتھ حکومت چین کا ایک بریف کیس آ گیا۔ جو شہلا کے ہاتھ لگ گیا۔ شہلا کو راضی کیا کہ وہ مجھے بینک کے لاکر تک پہنچا دے تاکہ میں چائنیز بریف کیس حاصل کرلوں۔

ہم بینک میں سیف سے بریف کیس نکال چکے تھے کہ شہلا نے فتح خان کے آدمیوں کو بلالیا تھا۔ وہ مجھے یرغمال بنا کر فتح خان کے گھر میں لے آئی۔ فتح خان نے مجھے مجبور کردیا کہ سویرا کو حاصل کرنے کے لیے مجھے ڈیوڈ شا کے ہیرے تلاش کرکے دینے ہوں گے، میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ فتح خان، برٹ شا کو لے آیا جو پاگل ہوچکا تھا۔ پھر اس نے میری طرف سے میل کرکے ایمن کو بھی بلوالیا۔ فتح خان کے آدمیوں پر فائرنگ شروع ہوگئی۔ برٹ شا نے میرے پستول سے فتح خان کو نشانے پر لیا تھا کہ اس کے آدمی نے برٹ شا کو گولی ماردی۔ مرتے وقت برٹ شا بڑبڑایا ''نارتھ...... ہکسٹ'' دم توڑتے ہوئے برٹ شا کی آواز صرف میں نے سنی تھی، تھوڑی دیر میں اندازہ ہوگیا کہ فتح خان نے اندازہ لگالیا ہے کہ اس پوری کارروائی میں میرا ہاتھ ہے، تبھی مائیک سے اعلان ہوا کہ جو بھی ہے، وہ ہاتھ اٹھا کر باہر آجائے۔ وہ راجا صاحب کے آدمی تھے۔ وہاں سے میں محل میں آیا۔ وہاں ایمن بھی موجود تھی۔ اگلے دن ہم پنڈی جانے کے لیے نکلے۔ راستے میں فتح خان نے گھیر کر بے بس کردیا اور ایمن کو خودکش جیکٹ پہنادی جسے اتارنے کی کوشش کی جاتی تو دھماکا ہو جاتا۔ عبداللہ کی کوٹھی میں اطلاع ملی کہ شہلا کا فون آیا تھا۔ میں نے اسے کال کرکے بریف کیس مانگا۔ اس نے بریف کیس دینے کے لیے ویران جگہ مقرر کی۔ ہم وہاں پہنچے اور بریف کیس لے کر چلے تو مجھے شک ہوا اور میں نے بریف کیس ڈھلان پر رکھ دیا۔ وہ دھماکے سے پھٹ گیا۔ ہم واپس ہورہے تھے کہ [illegible] کا فون آیا کہ سویرا کو فتح خان نے حویلی پہنچادیا ہے۔ میں شہلا کے گھر کی تلاشی لینے پہنچا تو باہر سے گیس بم پھینک کر مجھے بے ہوش کردیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو انڈین آرمی کی تحویل میں پایا مگر میں ان کو ان کی اوقات بتا کر نکل بھاگا۔ جیپ تک پہنچا تھا کہ فتح خان نے گھیر لیا۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ کرنل زورو سنگھ نے ہم دونوں کو پکڑ لیا۔ وہ مجھے پھر سے انڈین آرمی کی تحویل میں دینا چاہتا تھا۔ میں نے کرنل کو زخمی کرکے بساط اپنے حق میں کرلی۔ میں دوستوں کے درمیان آکر ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی کہ ایک کوٹھی میں بم دھماکا۔ کوٹھی نادر علی کی تھی جسے کسی نے تباہ کیا تھا۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ مجھے شہلا کی تلاش تھی۔ اس لیے نادر کی کوٹھی کی جانب توجہ دی تبھی خبر ملی کہ شہلا کسی صابر نامی شخص سے ملنے جارہی ہے۔ میں دوستوں کے ساتھ اس کی تلاش میں نکل پڑا۔ کچھ کے ذمے کام یہ لگایا کہ وہ صابر کو پکڑ لیں۔ صابر تو پکڑ میں آگیا مگر شہلا نکل گئی۔ صابر نے بتایا کہ شہلا کالی کوٹھی میں ملے گی۔ ہم وہاں پہنچے تو شہلا آخری سانسیں لے رہی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ مونا وغیرہ کو حویلی بھیج دیا جائے۔ ہیلی کاپٹر ہائر کیا۔ جیسے ہی چوپر بلند ہوا اس پر فائرنگ شروع ہوگئی۔ یہ کام فاضلی کا تھا، ہم نے اسے اغوا کرلیا۔ فاضلی قید میں تھا اور وسیم اسے ہیروئن کا انجکشن لگا کر عادی بنا رہا تھا۔ میں عبداللہ سے ملنے جارہا تھا کہ ڈی ایس پی اکرم چشتی نے مجھے گرفتار کیا اور بے پناہ تشدد کے بعد مرشد کے ہاں پہنچادیا۔ میں نے مرشد کو یرغمال بنا کر وہاں سے نکلنا چاہا تھا کہ فاضلی نمودار ہوا اور اس نے میرے سر پر وار کردیا۔ چوٹ کی وجہ سے میرا سر گھوم رہا تھا۔ مجھے جو عقل سے عاری بنانے کا انجکشن لگا تھا وہ بے اثر ثابت ہوا مگر میں نے عقل سے عاری بنے رہنے کی اداکاری شروع کردی۔ فاضلی نے مجھے اور ایک لیڈی ڈاکٹر کو قید کرلیا تا کہ وہ مجھ پر نظر رکھ سکے۔ میں وہاں سے فرار ہونے لگا تو لیڈی ڈاکٹر ماری گئی۔ میں نے فاضلی کو زخمی کردیا پھر بھی میرا پیچھا کرتا ہوا آیا تھا کہ کچھ لوگوں نے اس پر فائرنگ کردی۔ میں کسی طرح سڑک تک پہنچ گیا اور گاڑی لانے کے لیے فون کردیا۔ پھر ہم نے ساتھیوں کی مدد سے اکرم چشتی کو اغوا کرلیا۔ اسے ہم ایذا دے رہے تھے کہ باہر سے آواز آئی ''پولیس''۔ ہم نے خفیہ کیمروں سے پولیس کی پوزیشن دیکھی پھر اکرم چشتی کی آنکھوں اور کان میں کیمیکل ڈال کر چپکا دیا اور وہاں سے نکل گئے۔ پولیس نے نادر اور چشتی کو اس گھر سے برآمد کرلیا راستے میں عبداللہ کے آدمیوں نے پولیس پر حملہ کرکے نادر کو دوبارہ حاصل کرلیا۔ ہم اس گھر سے نکل کر مانسہرہ کی طرف بڑھنے لگے۔ وہاں وسیم کے ایک دوست کے گھر میں ٹھہرے۔ اس دوست کے بیٹے نے ایک خانہ بدوش لڑکی کو پناہ دی تھی وہ لڑکی مہرو تھی۔ وہ ہمیں بریف کیس تک لے گئی مگر وہاں بریف کیس نہ تھا۔ کرنل زورو سنگھ بریف کیس لے بھاگا تھا۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہوئے چلے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ایک گاڑی پر فائرنگ کررہے ہیں۔ ہم نے حملہ آوروں کو بھگا دیا۔ اس گاڑی سے کرنل زورو سنگھ ملا۔ وہ زخمی تھا۔ ہم نے بریف کیس لے کر اسے اسپتال پہنچانے کا انتظام کردیا اور بریف کیس کو ایک گڑھے میں چھپادیا۔ واپس آیا تو فتح خان نے ہم پر قابو پالیا۔ پستول کے زور پر وہ مجھے اس گڑھے تک لے گیا مگر میں نے جب گڑھے میں ہاتھ ڈالا تو وہاں بریف کیس نہیں تھا۔ اتنے میں میری امداد کو انٹیلی جنس والے پہنچ گئے۔ انہوں نے فتح خان پر فائرنگ کردی اور میں نے ان کے ساتھ جاکر بریف کیس حاصل کرلیا۔ وہ بریف کیس لے کر چلے گئے۔ ہم واپس عبداللہ کی کوٹھی پر آگئے۔ ایک نئی کوٹھی کرائے پر لی تو وہ ڈاکوؤں کا اڈا ثابت ہوئی۔ ان کے چھپے ہوئے خزانے پر ہم نے قبضہ کرلیا اور کوٹھی خالی کرآئے۔ ڈاکوؤں نے مکان مالک کو اغوا کرلیا۔ ہم اسے رہا کرانے ان کے مرکز پر پہنچے اور زبردست مقابلے کے بعد مکان مالک کو رہا کرا کر آرہے تھے کہ کئی جیپ نے ہمارے راستے کو روک لیا۔ تبھی سامنے سے بھی گاڑیاں آگئیں اور ان لوگوں نے ہمیں گھیرنے والی گاڑیوں کے نرغے سے نکال لیا۔ ہم کوٹھی پر پہنچے۔ وسیم کو حویلی بھیج کر مانی اور بیتو کو بلوالیا۔ سفیر کو دبئی بھیجنا تھا اسے ائرپورٹ سے سی آف کرکے آرہے تھے کہ راستے میں ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ وہ گاڑی ممتاز حسن نامی سیاست داں کی بیٹی کی تھی میں نے ایک بار اس کی مدد کی تھی وہ زبردستی ہمیں اپنی کوٹھی میں لے آئی۔ وہاں پہنچ کر احساس ہوا کہ ہم قید ہوچکے ہیں۔ ممتاز حسن ہمیں کسی سے ملوانا چاہتا تھا۔ ہیلی کاپٹر پر جو شخص آیا اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ میرے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔ وہ راج کنور تھا۔ وہ پاکستان میں اس گھر تک کس طرح آیا اس سے میں بہت کچھ سمجھ گیا۔ اس نے مجبور کیا کہ میں ہر ہفتے نصف لیٹر خون اسے دوں۔ بحالت مجبوری میں راضی ہوگیا لیکن ایک روز ان کی چالاکی کو پکڑ لیا کہ وہ زیادہ خون نکال رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر پر حملہ کیا تو نرس مجھ سے چمٹ گئی پھر میرے سر پر وار ہوا اور میں بے ہوش ہوگیا۔ ہوش آیا تو میں انڈیا میں کنور کے محل میں تھا۔ بانو بھی اغوا ہوکر پہنچ چکی تھی۔ وہ لوگ ہمیں گاڑی میں بٹھا کر لے جارہے تھے راستے میں بی ایس ایف والوں نے رکنے کا اشارہ کیا۔

(اب آگے پڑھیں)
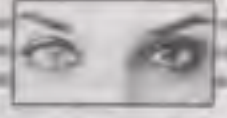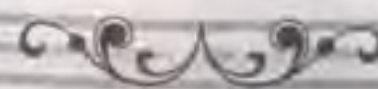
بی ایس ایف کی آمد کا سن کر وہاں سنسنی پھیل گئی تھی اور اس سنسنی کا ستر فیصد یقیناً میری رگوں میں تھا۔ باقی سب کو اتنا فرق نہ پڑتا لیکن بی ایس ایف والے مجھے لے جاتے تو مجھے بہت فرق پڑتا۔ یہ فرق شاید زندگی اور موت کا ہوتا۔ حیات نے بھی فکر مند لہجے میں کہا۔ ''یہ کنجر کہاں سے آگئے۔''

وہ کنور خاندان کا زرخرید تھا مگر تھا تو پاکستانی اور غیر قانونی طور پر انڈیا کی حدود میں موجود تھا اس لیے اس کا فکر مند ہونا بھی لازمی تھا۔ اب جیپ کے ڈیزل انجن کا شور سنائی دینے لگا تھا اور پھر یہ شور آکر اس جیپ کے پاس رکا۔ کسی نے بلند آواز سے پوچھا۔ ''اوئے جیپ میں کون ہے؟''

حیات نیچے اتر آیا۔ ''ہم راج کنور کے آدمی ہیں سرکار۔''

''میں نے پوچھا ہے جیپ میں کون ہے؟'' بولنے والا صاف اردو یا ہندی میں بول رہا تھا اور لہجے سے افسر رینک کا لگ رہا تھا۔

''کیپٹن صاحب......'' حیات نے کہنا چاہا۔

''بکواس بند کرو۔'' کیپٹن نے گرج کر کہا اور شاید اپنے آدمیوں سے بولا۔ ''جیپ کی تلاشی لو۔''

''ایک منٹ کیپٹن۔'' حیات کا لہجہ اچانک بدل گیا۔ ''میرے ساتھ ادھر آؤ میں تمہیں کچھ دکھانا چاہتا ہوں.... ڈرو نہیں۔''

''میں ڈروں گا.....'' کیپٹن نے مشتعل ہوکر گالی دی۔

''تو پھر بات سن لو۔'' حیات ہنس کر بولا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کیپٹن سے کم نہیں تھا۔ اس کے لہجے نے کیپٹن کو اس کی بات ماننے پر مجبور کردیا اور وہ اسے کہیں دور لے گیا اور جب کیپٹن واپس آیا تو اس کا لہجہ بالکل بدلا ہوا تھا اس نے اپنے آدمیوں کو واپسی کا حکم دیا۔ حیات اور وہ تقریباً پانچ چھ منٹ الگ رہے تھے۔ اس دوران میں حیات نے کوئی گیدڑ سنگھی گھمائی تھی جس کے بعد بی ایس ایف کا کیپٹن بالکل رام ہوگیا تھا۔ جیپ اسٹارٹ ہوئی اور بی ایس ایف والے روانہ ہوگئے۔ حیات اور اس کے ساتھی بھی جیپ میں آئے۔ پچھلا خانہ درمیان میں فولادی جالی لگا کر اگلے خانے سے الگ کردیا گیا تھا۔ اس کا دروازہ بھی صرف باہر سے کھل سکتا تھا۔ گویا یہ قیدیوں کے لانے لے جانے کے لیے بنایا گیا تھا۔ بی ایس ایف کے واپس جانے پر میں نے سکون کا سانس لیا۔ بانو میرے برابر میں دبکی بیٹھی تھی۔ جیپ روانہ ہوئی اور اس کے انجن کا شور گونجنے لگا۔ بانو نے آہستہ سے کہا۔ ''انہوں نے آپ کو کیوں اور کیسے پکڑا؟''

''یہ میرے پرانے دشمن کے آدمی ہیں اسی کے لیے میرا خون لیا جارہا تھا مگر اب وہ مجھے براہ راست اپنی تحویل میں دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ دھوکا کررہے تھے بظاہر میرا آدھا لیٹر خون لیتے تھے لیکن میز کے نیچے خفیہ خانے میں موجود کوئی آدمی تھیلی بدل دیتا تھا اور مجھے پتا ہی نہیں چلتا کہ میرا کتنا خون لیا جاچکا ہے۔ اسی لیے میں خلاف توقع کمزوری محسوس کررہا تھا۔ اب دیکھو یہ کیا کرتے ہیں میرے ساتھ۔ میں نے ڈاکٹر کو ماردیا تھا لیکن بدقسمتی سے سر چکرانے کی وجہ سے میں حیات کے قابو میں آگیا اور پھر مجھے ہوش آیا تو میں یہاں تھا۔''

بانو سہمے انداز میں بولی۔ ''یہ بہت خطرناک آدمی ہے۔ وہاں کیسے میاں صاحب کا تابعدار بن کر رہتا تھا لیکن یہ ان کو بھی دھوکا دے رہا تھا۔''

''میاں ممتاز جیسے لوگ ہوتے ہی اس لیے ہیں کہ وہ دوسروں کو دھوکا دیں اور مکافات عمل میں دوسروں سے دھوکا کھائیں۔'' میرا لہجہ تلخ ہوگیا۔

بانو ذرا چپ ہوئی تھی پھر اس نے کہا۔ ''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

میں نے موضوع بدل دیا۔ ''تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟''

''جب میں بے بی کے جانے کے بعد سروس والے دروازے سے باہر آئی تو اچانک ہی کسی نے عقب سے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کے منہ میں دبے ہوئے رومال سے کلوروفارم کی بو آرہی تھی۔ میں نے مزاحمت کی لیکن جیسے ہی سانس لی مجھے ہوش نہیں رہا تھا۔''

''دروازے سے باہر نکلتے ہی؟''

''ہاں بس میں ایک یا دو قدم آگے نکلی ہوں گی۔''

''حیات اور اس کے ساتھی وہاں تھے؟''

''نہیں وہ مجھے نظر نہیں آئے تھے۔'' بانو نے نفی میں سر ہلایا۔ ''پھر مجھے غور کرنے کا موقع ہی کہاں ملا تھا یوں سمجھ لیں کہ ایک دو سیکنڈ لگے تھے۔''

''تمہارے جانے کے کچھ دیر بعد حیات آگیا تھا۔

پھر تمہاری گم شدگی کا پتا چلا تو ممتاز ہاؤس میں تمہاری تلاش شروع ہوگئی تھی۔ آدمیوں سے تلاش کرانے کے بعد بنٹی نے کتوں کی مدد بھی لی تھی مگر تمہارا سراغ نہیں ملا۔ پولیس کو رپورٹ نہیں کی تھی لیکن میاں ممتاز کے آدمی تمہیں پیلس سے باہر تلاش کرتے رہے تھے۔“

”وہ مجھے کیسے تلاش کر سکتے تھے جب کہ اسی دن میں سرحد پار آگئی تھی۔“

”ممتاز ہاؤس میں لگے کیمروں سے بھی کچھ پتا نہیں چلا تھا اور نہ ہی تم مین گیٹ سے نکالی گئی تھیں۔ بنٹی نے بتایا کہ پیلس میں آمدورفت کا ایک خفیہ دروازہ بھی ہے۔“

بانو نے سر ہلایا۔ ”میں نے دیکھا ہے لیکن اسے کیسے کھولا اور بند کیا جاتا ہے میں نہیں جانتی۔“

”مجھے شبہ ہے کہ حیات نہ صرف اس راستے سے واقف ہے بلکہ وہ اسے کھولنے اور بند کرنے کا طریقہ بھی جانتا ہے۔ مجھے اور تمہیں اسی راستے سے نکالا گیا اور کسی کو کانوں کان پتا نہیں چلا۔“

”یہ جتنی آسانی سے ہمیں سرحد پار لے آیا ہے مجھے لگ رہا ہے حیات وہ نہیں ہے جو دکھائی دیتا ہے۔“

میں چونکا۔ ”کیا مطلب؟“

”مجھے یہ پاکستانی نہیں لگتا ہے۔ آپ نے دیکھا بی ایس ایف کا کیپٹن کیسے دم دبا کر چلا گیا۔“

بانو پڑھی لکھی تو تھی اور پھر ممتاز ہاؤس کی پروردہ تھی اس لیے سیاست اور سرحدی معاملات سے عام آدمی کے مقابلے میں زیادہ واقفیت رکھتی تھی۔ خود میاں ممتاز کا تعلق بھی سرحد پار سے ثابت ہو رہا تھا۔ میں نے غور کیا تو اس کی بات درست لگی تھی۔ حیات یہاں آکر اس طرح پراعتماد تھا جیسے کوئی بچہ اپنے گھر میں پراعتماد ہوتا ہے۔ سوال یہ تھا کہ حیات کا تعلق اصل میں کس سرزمین سے تھا۔ اس نے مجھے سورما کہا تھا جو خالص ہندی کا لفظ ہے اسی طرح اللہ کے نام پر اس نے مجھ پر طنز کیا تھا۔ پھر اس کے ساتھی اسے مسلسل بابو کہہ رہے تھے۔ کسی نے اسے ایک بار بھی حیات نہیں کہا تھا۔ اگرچہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ حیات کا تعلق اصل میں کہاں سے تھا۔ وہ پہلے ہی مکمل دشمنی پر آمادہ تھا۔ مگر وہ بھارتی تھا تو اس کا مطلب تھا کہ وہ میاں ممتاز کی جاسوسی کے لیے وہاں موجود تھا۔ وجہ تو واضح ہے۔ میاں ممتاز ایک اہم آدمی ہے اور بہت سے حکومتی راز یقیناً اس کے علم میں بھی ہوتے ہوں گے۔ حیات کے توسط سے یہ راز سرحد پار جاتے ہوں گے۔

بدقسمتی سے ہمارے سیاست دان، میڈیا اور خاص و عام تک عوام بھی بھارت کے معاملے میں سافٹ کارنر رکھتے ہیں۔ انٹیلی جنس کے معاملات سے تو ہم روشن خیالی کے دور میں ہاتھ اٹھا چکے تھے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بھارت کو اس معاملے میں فری ہینڈ مل گیا۔ یہ ایسا ہی تھا کہ آپ بپھرے ہوئے کینہ پرور بیل کے سامنے ہاتھ پاؤں باندھ کر ڈال دیے جائیں کہ وہ آپ کے ساتھ جیسا سلوک چاہے کرے۔ دوسری طرف بھارت کے عزائم دن بہ دن خطرناک ہوتے جا رہے ہیں۔ پانی کی بندش سے لے کر ملک میں جاری فسادات میں اس کا ہاتھ روز روشن کی طرح واضح ہے مگر ساتھ ہی وہ ان معاملات میں بھی پوری طرح سرگرم ہے جن پر ہمارے ارباب اختیار اور ملکی سلامتی کے ذمے داروں کی نظر نہیں گئی ہے۔ حیات کا میاں ممتاز کے گھر میں موجود ہونا اور اس کے معتمد کی حیثیت رکھنا اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ بھارتی کینسر کی طرح ملک کے ہر شعبے میں سرایت کر رہے ہیں اور ہم آنکھیں بند کیے بیٹھے ہیں۔ امن کی آشا کے راگ الاپ رہے ہیں۔

جیپ ناہموار راستوں پر تیزی سے چل رہی تھی۔ اس لیے ہم بھی سکون سے نہیں بیٹھ پا رہے تھے۔ کبھی بانو مجھ پر لڑھک جاتی اور کبھی میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس سے ٹکراتا وہ جب ٹکراتی تو شرمندہ ہو کر معافی مانگتی تھی۔ حالانکہ وہ نازک لڑکی تھی اور اس کے لیے زیادہ مشکل ہو رہی تھی۔ میں نے اس کا حل یہ نکالا کہ دونوں پاؤں دروازے پر جما دیے اور پشت جالی سے ٹکا دی اس طرح میں لڑھکنے سے بچ گیا تھا۔ بانو کے ہاتھ پاؤں کھلے تھے مگر وہاں پکڑنے کے لیے کچھ نہیں تھا اس لیے وہ حرکت میں رہنے پر مجبور تھی۔ باہر تاریکی چھا رہی تھی اور کچھ دیر میں مکمل تاریکی ہوگئی۔ اب جیپ ہیڈ لائٹس کے سہارے سفر کر رہی تھی کیونکہ اس کچے راستے پر کہیں کوئی روشنی نہیں تھی۔

خدا خدا کر کے یہ بیہودہ راستہ ختم ہوا اور جیپ ایک ہموار سڑک پر آئی اگرچہ سڑک بھی اتنی ہموار نہیں تھی لیکن اس کچے راستے کی نسبت کہیں بہتر تھی۔ دن ڈھلنے کے

بعد گرمی کا اثر بھی زائل ہو رہا تھا لیکن جیپ کے اس بند حصے میں گرمی لگ رہی تھی۔ ذرا سکون ملنے کے بعد میں نے بانو سے پوچھا۔ ”ان لوگوں نے تمہارے ساتھ کوئی مس بی ہیو تو نہیں کیا؟“

”نہیں، اللہ کا شکر ہے سوائے قید اور بعض اوقات کھانے پینے کی تکلیف کے اور کوئی تکلیف نہیں دی۔ ورنہ جب ہوش میں آنے کے بعد میں نے خود کو اس جگہ پایا تو مرنے کی حد تک خوفزدہ ہوگئی تھی۔ ایک بے بس لڑکی کے ساتھ کیا ہو سکتا ہے۔ اس کا سوچ کر ہی میں مرنے کی آرزو کر رہی تھی مگر انسان کو موت بھی اپنی مرضی سے کہاں آتی ہے؟“ اس کا لہجہ بے بس ہو گیا تھا۔ میں نے اسے تسلی دی۔

”آدمی پر ایسی مشکلات آتی رہتی ہیں اسے ہمت سے کام لینا چاہیے اور موت کے بجائے اللہ سے آسانی مانگو۔“

وہ افسردگی سے مسکرائی۔ ”میں جانتی ہوں آپ ایسے ہی شخص ہیں جو سخت ترین حالات میں بھی ہار نہیں مانتے ہیں۔ بے بی اکثر مجھے آپ کے بارے میں بتاتی تھیں۔ وہ دنیا میں کسی آدمی سے متاثر ہیں تو وہ آپ ہیں۔ لیکن میں ایک کمزور لڑکی ہوں۔“

”کوئی کمزور یا طاقتور نہیں ہوتا۔“ میں نے ملائمت سے کہا۔ ”یہ ہمارے سوچنے کی بات ہے۔ اصل چیز کامیابی ہے میں نے بڑے بڑے سورماؤں کو مٹی میں ملتے دیکھا ہے اور کمزور لوگ بچ جاتے ہیں۔ میں خود کو کمزور ہی سمجھتا ہوں کہ موت کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہوں وہ جب آئے گی تو مجھے یوں لے جائے گی جیسے شیر کسی کمزور ہرن کو اچک کر لے جاتا ہے۔“

”مجھے موت سے ڈر نہیں لگتا ہے مگر بے آبرو ہو کر مرنے سے بہت ڈر لگتا ہے۔“

”اللہ پر بھروسا رکھو وہ بہتر ہی کرے گا۔“ میں نے اپنے پاؤں کھولتے ہوئے کہا۔ سختی سے دروازے پر جمانے سے وہ اکڑ گئے تھے۔ بانو بھی اب سکون سے بیٹھی تھی۔ رات تاریک تھی اور چاند بھی نہیں نکلا تھا جس سے سمت کا اندازہ ہوتا۔ مگر میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ ہم شمال کی طرف جا رہے تھے جہاں کنوروں کی جاگیر تھی۔ یہ شاید ہماچل پردیش کے شمالی حصے میں تھی۔ بھارت کی یہ ریاست بیک وقت کشمیر، پنجاب، ہریانہ اور اترکھنڈ سے لگتی تھی۔ یہاں زیادہ تر تبتی نسل کے لوگ رہتے تھے اور یہیں دھرم شالہ میں تبت کے روحانی پیشوا دلائی لاما جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ یہاں صرف دلائی لاما ہی نہیں ان کے لاکھوں پیروکار بھی بستے تھے۔ شملہ نامی تاریخی مقام ہے جہاں انگریز وائسرائے گرمیاں گزارنے آتا تھا اور شملہ کو بہت سی تاریخی سیاسی سرگرمیوں کی میزبانی کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ سفر کرتے ہوئے دو گھنٹے گزر گئے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ سندھو کے ڈیرے سے راج کنور ہم سب کو لے گیا تھا تب بھی اس کی جاگیر تک پہنچنے میں چند گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔ راستے میں ایک جگہ رک کر جیپ میں ایندھن بھروایا گیا۔ لیکن اس دوران میں ہمیں پانی کا بھی نہیں پوچھا تھا۔ مجھے پیاس لگ رہی تھی اور یقیناً بانو کو زیادہ لگ رہی تھی مگر اس نے ایک بار بھی شکایت نہیں کی تھی۔

جیسے جیسے رات گہری ہو رہی تھی اور جیپ شمال کی طرف جا رہی تھی موسم سرد ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے ہم اسلام آباد جتنی بلندی پر آ گئے تھے۔ اسلام آباد سطح سمندر سے تقریباً آٹھ سو میٹرز یا تین ہزار فٹ بلند ہے۔ اسی وجہ سے یہاں موسم خوشگوار ہوتا ہے۔ ہماچل پردیش اسلام آباد ریجن کی سیدھ میں آتی ہے اور یہ کشمیر سے نیچے ہے لیکن یہ تقریباً کشمیر جتنے بلند پہاڑوں پر مشتمل ہے اور اس کا شمالی حصہ ہمالیہ کے برف والے حصے سے لگتا ہے جہاں دنیا کی بلند ترین چوٹیاں ہیں۔ اب گرمی زائل ہوگئی تھی اور کسی قدر خنکی محسوس ہونے لگی تھی۔ اس کا یہ فائدہ ہوا کہ پیاس کی شدت کم ہوگئی تھی۔ کچھ دیر بعد جیپ نے جلدی جلدی موڑ کاٹنا شروع کر دیے اور اب اس کا رخ اوپر کی طرف تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ چڑھائی شروع ہوگئی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ بیتو کو خبر بھی نہیں ہوگی کہ میں اس وقت اس کے آبائی علاقے کی طرف جا رہا تھا جہاں سے اسے اور اس کے قبیلے کو مار کاٹ کر نکالا گیا تھا۔

میرا اندازہ تھا کہ کنور پیلس اب ایک گھنٹے کی مسافت پر رہ گیا تھا۔ مگر رات ہونے کی وجہ سے زیادہ دیر لگی تھی اور ہم تقریباً مزید ڈیڑھ گھنٹا سفر کے بعد کنور پیلس کی عالی شان عمارت تک پہنچے تھے۔ جب قبائلیوں نے یہاں حملہ کیا تھا تو یہاں شدید تباہی پھیلی تھی اور خاص طور سے محل اور کلینک قبائلیوں کا نشانہ بنے تھے اور یہاں آگ بھی لگا دی گئی تھی۔

مگر جب جیپ روشنیوں سے جگ مگاتے ہوئے پیلس میں داخل ہوئی تو وہاں اس تباہی کا ذرہ برابر نشان بھی باقی نہیں رہا تھا اور کوئی اجنبی دیکھتا تو وہ بالکل نہیں جان سکتا تھا کہ تقریباً چھ مہینے پہلے یہاں کیا ہوا تھا۔ بہار کا موسم آنے پر مرجھایا ہوا سبزہ اور پودے بھی کھل اٹھے تھے اور اب یہ جگہ پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ خوب صورت ہوگئی تھی۔ مگر اس کے اندر چھپی بدصورتی میں دیکھ اور بھگت چکا تھا اس لیے میں ظاہری خوب صورتی سے دھوکا نہیں کھا سکتا تھا۔ مجھے معلوم تھا یہاں میرے لیے مشکلات ہوں گی اور قسمت ہی ہوگی جو میں یہاں سے زندہ سلامت جاسکوں گا۔

جیپ محل کے بجائے ایک اور چھوٹی عمارت کے پورچ میں رکی۔ یہ قید خانہ تھا اور یہاں پہلے بھی ایک بار میں رہ چکا تھا۔ جیپ کا عقبی دروازہ کھلا اور حیات کے سانولے ساتھی نے مجھے کھینچ کر نیچے اتارا۔ بانو خود اتر آئی تھی۔ وہاں وہ خبیث صورت شخص موجود تھا جس سے میں نفرت کرتا تھا۔ یعنی راج کنور کا دست راست نائیک موجود تھا۔ اس کے چہرے پر مکروہ مسکراہٹ تھی۔ اس نے شدید طنزیہ انداز میں کہا۔ ”کھوش آمدید شہباز جی۔“

”ظاہر ہے میری آمد پر تمہیں خوشی ہوگی تم اپنی پچھلی چوٹیں بھولے نہیں ہوگے۔“

اس کا چہرہ بگڑ کر سور جیسا ہوگیا۔ ”جیادہ کھوش مت ہو اس بار تمہیں پتا چلے گا۔ اس بار کوئی چھڑانے والا بھی نہیں آئے گا۔“

”تمہاری خوش فہمی ہے۔“ میں نے بے پروائی سے کہا۔ حیات خاموش کھڑا تھا اس نے نائیک سے کہا۔

”اب یہ تمہارے سپرد ہے۔“

نائیک نے حریص نظروں سے بانو کی طرف دیکھا۔ ”اور یہ دیوی جی؟“

”اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔“ حیات نے جس طرح دوٹوک انداز میں کہا تھا اس سے مجھے لگا کہ وہ اس سے برتر نہیں تو کم تر بھی نہیں تھا۔ اس نے بانو کا بازو پکڑا اور اسے لے جانے لگا۔ اس نے مزاحمت کی۔

”چھوڑو مجھے۔“

میں نے قدم بڑھایا تھا کہ سانولے نے پستول میری کمر سے لگا دیا۔ ”آرام سے کھڑے رہو۔“

”حیات تم اسے کیوں لائے ہو؟“ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

”میں اسے اپنے لیے لایا ہوں۔“ اس نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”میرا نام حیات نہیں ہے۔“

یہ کہہ کر وہ بانو کو کھینچتا ہوا وہاں سے لے گیا تھا۔ میں فی الحال بانو کی کوئی مدد نہیں کرسکتا تھا اس لیے صرف ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ میں نے سانولے کی طرف دیکھا۔ ”اس کا نام کیا ہے اور تمہارا اصل نام کیا ہے۔“

”وہ رامن بابو ہے اور میں جوشی ہوں۔“

اگرچہ مجھے ایسی ہی امید تھی لیکن یہ جان کر مجھے دھچکا لگا تھا کہ وہ دونوں ہندو تھے۔ بانو اب رامن کے قبضے میں تھی۔ اس کی عزت جس کے لیے وہ خوف زدہ تھی اب واضح خطرے میں دکھائی دے رہی تھی۔ جوشی نے میری ہتھکڑی اور بیڑی کھولی۔ نائیک کے ساتھ قید خانے کا نگران اور اس کے مسلح گارڈز موجود تھے۔ مجھے ان کے حوالے کیا گیا۔ میرے مطالبے پر پہلے مجھے رفع حاجت کا موقع دیا گیا۔ یہ کسی قدر صاف ستھرا لیٹرین تھا۔ شاید اڑتالیس گھنٹے بعد مجھے فارغ ہونے کا موقع ملا تھا اس لیے بڑا سکون ملا تھا۔ اتفاق سے قید خانے میں مجھے وہ کوٹھری ملی جس میں پہلی بار بھی آیا تھا۔ پہلی بار جب میں آیا تو شدید سردی کا موسم تھا اور کوٹھری میں ڈھیر ساری خشک گھاس تھی۔ یہ گرم ترین گھاس قیدیوں کو شدید سردی میں بھی گرم رکھتی تھی اور ان کو اوڑھنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آتی تھی۔ اگرچہ سردی ہوتی تھی مگر وہ قابل برداشت ہوجاتی تھی۔ لیکن اب موسم بدل گیا تھا۔ کوٹھری کے خالی فرش پر صرف ایک چٹائی اور ایک کمبل تھا۔ میں نے چینی نقوش والے نگران سے کہا۔ ”مجھے پیاس لگ رہی ہے۔“

”فکر نہ کر تو شاہی مہمان ہے تجھے سب ملے گا۔“ اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ شاید اسے بھی معلوم تھا کہ مجھے قربانی کا بکرا بنا کر لایا گیا تھا جسے قربان کرنے سے پہلے اچھی طرح کھلایا پلایا جاتا۔ یہاں گارڈز مجھے پہلے کی طرح بیتو جیسے قبائلی لگے تھے۔ ان کے نقوش ویسے ہی تھے۔ کنور خاندان قبائلی بچوں کو اپنے قبضے میں کرکے ان سے کام لیتا تھا۔ ان میں مرد عورت دونوں شامل ہوتے تھے۔ مردوں کو حفاظت اور دوسرے بیرونی کام سونپے جاتے تھے جب کہ

عورتوں کو محل کے اندر ذمے داریاں دی جاتی تھیں اور ان کی سب سے اہم ذمے داری کنور خاندان اور ان کے معزز مہمانوں کی تمام جسمانی ضروریات پوری کرنا تھی۔ یہ سب میں پہلے دیکھ چکا تھا۔ کچھ دیر بعد مجھے منرل واٹر کی ایک بوتل فراہم کی گئی۔ میں پانی پی رہا تھا کہ مجھے کوٹھری کے روشن دان سے رامن کی آواز سنائی دی۔

روشن دان فرش سے کوئی سات فٹ اونچا تھا۔ میں نے اچھل کر اس کے کناروں پر ہاتھ جمائے اور پھر خود کو اوپر اٹھایا۔ سلاخوں کے پار پارکنگ نظر آئی تھی اور وہاں جیپ کے پاس رامن اور جوشی دونوں موجود تھے۔ رامن کہیں جا رہا تھا اور وہ جوشی سے کچھ کہہ رہا تھا۔ بات مکمل کرکے اس نے جیپ آگے بڑھائی۔ جوشی وہیں رہ گیا تھا۔ میں سن نہیں سکا تھا کہ ان دونوں میں کیا گفتگو ہو رہی تھی لیکن رامن کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ کہیں عجلت میں جارہا ہے اس نے ابھی تک وہی میلا لباس پہنا ہوا تھا۔ مجھے امید ہوئی کہ اگر وہ کچھ دن کے لیے دفع ہوا ہے تو بانو اس دوران میں اس سے محفوظ رہے گی۔ جب بانو کے بارے میں اس کے عزائم محسوس کرتا تو میرا خون کھولنے لگتا تھا۔ مگر فی الحال میں مجبور تھا۔ البتہ میں نے دل میں سوچ لیا تھا کہ اگر بانو کو اس سے ذرا سا بھی نقصان ہوا تو میں اسے ہرگز معاف نہیں کروں گا۔

میں سوچ رہا تھا کہ کوئی راستہ ہو کہ بانو محفوظ رہے۔ کنور خاندان اور اس کے سارے چیلے چمچے میرے شدید قسم کے دشمن تھے اگر میں ان سے کہتا کہ بانو سے کوئی برا سلوک نہ کریں تو عین ممکن تھا وہ مجھے اذیت دینے کے لیے میرے سامنے اس سے برا سلوک کرتے۔ یہ انسان کو صرف مطلب برابری کی چیز سمجھنے والے لوگ تھے اور ایک بانو ان کے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی میں سوچ رہا تھا کہ کوٹھری کا دروازہ باہر سے کھلا۔ یہ فولادی دروازہ تھا جس میں اوپری حصے میں سلاخیں لگی تھیں اور باہر سے کوئی اندر دیکھ سکتا تھا۔ دروازہ کھلا تو منشی دل جی کی صورت نظر آئی۔ یہ بڑے کنور کا معتمد خاص تھا جیسے بیگ راجا عمر دراز کا سیکریٹری تھا۔ اس کے ساتھ ایک پٹھان جیسا نظر آنے والے شخص نے بڑی سی ٹرے اٹھا رکھی تھی اور ٹرے سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ یقیناً میرے لیے طعام لایا گیا تھا۔ منشی دل جی اور پٹھان اندر آئے۔ پٹھان نے ٹرے رکھ کر گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا۔

”صیب ام دل نواز خان اے، آپ کا خادم.... آپ کا طعام ام بنایا۔“

منشی دل جی نے کہا۔ ”شہباز جی، یہ مسلمان ہے اور آپ کا کھانا اسی کی ذمے داری ہے۔ جانور بھی یہ خود ذبح کرتا ہے۔“

میں نے سرسری نظر سے ٹرے کی طرف دیکھا اگرچہ یہ دل گردے کا کام تھا کیونکہ میں چوبیس گھنٹے سے بھوکا تھا اور بھوک سے بیتاب تھا۔ مگر میں نے ظاہر کیا کہ فی الحال کھانے کی میری نظر میں کوئی حیثیت نہیں تھی۔ ”منشی جی آپ مجھے یہ بتانے کی کوشش کررہے ہیں کہ کھانا حلال ہے اور مجھے بلا کھٹکے کھالینا چاہیے؟“

”آپ ٹھیک سمجھے شہباز جی۔“

”اس کے بعد آپ میرا خون نچوڑیں گے؟“ میرا لہجہ طنزیہ ہوگیا۔

”آپ جانتے ہیں یہ کام تو بہر صورت ہونا ہے۔“ منشی دل جی کا لہجہ سپاٹ ہوگیا۔

”ایک انسان کے جسم میں کوئی ساڑھے چار لیٹرز خون ہوتا ہے اگر تم لوگ ایک وقت میں کوشش کرو تو شاید چار لیٹرز خون حاصل کرلو لیکن اس کے بعد میرے مردہ جسم سے تمہیں ایک قطرہ خون نہیں ملے گا۔“

”آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔“ منشی دل جی نے عیاری سے کہا۔ ”ڈاکٹر ہدایت کے خلاف آپ کا زیادہ خون لے رہا تھا اور اسے آپ نے خود سزا دے دی۔ لیکن یہاں آپ سے ہفتے میں صرف نصف لیٹر خون لیا جائے گا اور یہ بڑے کنور کے علاج کے لیے کافی ہوگا۔ نصف لیٹر کا مطلب ہے دو مہینے میں آپ ساڑھے چار لیٹرز خون دیں گے اور ڈاکٹر کا کہنا ہے معمولی کمزوری کے سوا آپ کو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔“

”جو ڈاکٹر میرے ہاتھ بلکہ لات سے جہنم رسید ہوا وہ بھی یہی کہہ رہا تھا مگر اس نے کیا کچھ اور تھا اور وہ تم لوگوں کی ہدایت کے مطابق کام کررہا تھا۔“

”بڑے کنور کا کہنا ہے کہ اب ایسا نہیں ہوگا۔ خون آپ کی تسلی کے بعد لیا جائے گا۔“

میں نے دل ہی دل میں بڑے کنور اور اس کی ضمانت کی ایسی کم تیسی کی اور بولا۔ ”منشی دل جی، آپ مزید

بیوقوف نہیں بنا سکتے۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اب میں کچھ نہیں کھاؤں گا۔ آپ لوگ اس مقصد کے تحت مجھے زبردستی ڈرپ یا طاقتور دواؤں سے زندہ نہیں رکھ سکتے کیونکہ مقصد زندہ رکھنا نہیں بلکہ مجھ سے مسلسل خون حاصل کرنا ہے اور یہ اس صورت میں ممکن نہیں رہے گا۔ آپ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں کس قسم کا آدمی ہوں اور جب کوئی فیصلہ کر لوں تو اسے نبھا بھی سکتا ہوں۔"

منشی دل جی کے تاثرات میں فکر مندی محسوس کر کے مجھے یقین ہو گیا کہ میری دھمکی کارگر تھی۔ اگر میں واقعی بھوک ہڑتال پر آ جاتا تو وہ منصوبے کے تحت مجھ سے خون حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ شاید یہ صورت حال اس کے لیے غیر متوقع تھی اس لیے اس نے سر ہلایا اور بولا۔ "میں بڑے کنور تک یہ بات پہنچا دیتا ہوں اس کے بعد وہ جو فیصلہ کریں۔"

"منشی جی میرا فیصلہ کوئی حتمی نہیں ہے ممکن ہے آپ لوگوں کی طرف سے کوئی ضمانت ملے تو میں مان جاؤں۔ ابھی آپ میرے فیصلے میں نرمی کے لیے ایک کام کر سکتے ہیں۔"

منشی دل جی نے پُر امید نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "کون سا کام؟"

"میرے ساتھ ایک لڑکی بھی یہاں لائی گئی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ میں چاہتا ہوں وہ محفوظ رہے اور اسے اچھی طرح رکھا جائے۔"

منشی دل جی نے سر ہلایا اور جانے لگے تو میں نے ان سے کہا۔ "یہ خوان بھی لیتے جائیں۔ جب مجھے بانو کے بارے میں معلوم ہو جائے گا تو میں کھا لوں گا۔"

منشی دل جی کے اشارے پر دل نواز خان نے ٹرے اٹھائی۔ ان کے جاتے ہی فولادی دروازہ بند ہو گیا۔ میں چٹائی پر بیٹھ گیا۔ میرے خیال میں ابھی دس یا گیارہ بجے کا وقت ہوا تھا۔ گویا مجھے لیٹ نائٹ ڈنر دیا جا رہا تھا۔ میری دھمکی پر منشی دل جی کا ردعمل حوصلہ افزا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ بڑے کنور کو میرے خون کی اشد ضرورت تھی۔ ممتاز ہاؤس میں نکالا جانے والا خون شاید ابتدائی علاج کے لیے کافی تھا لیکن اب علاج کو مستقل جاری رکھنے کے لیے مزید اور مسلسل خون کی فراہمی کی ضرورت تھی۔ مجھے امید تھی کہ جلد اس کا ردعمل سامنے آئے گا۔ میرا اندازہ درست نکلا جب نصف گھنٹے بعد کوٹھری کا دروازہ دوبارہ کھلا اور پہلے دل نواز خان اندر آیا وہ اکیلا تھا اور اس کے ہاتھ میں ہتھکڑی اور بیڑی تھی اس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ "صیب ام حکم اے آپ کو یہ پہنا دے۔"

لہجے سے وہ پکا قبائلی لگتا تھا لیکن انڈیا میں بھی اب تک بہت سی جگہوں پر پٹھان صدیوں سے اپنے مخصوص قبائلی انداز میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کی زبان اور طرز معاشرت وہی ہے جو علاقہ غیر کے پٹھانوں کی ہوتی ہے۔ اسے یوں اندر بھیجنے کا مطلب تھا کہ اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی اور اگر میں اسے قابو کر لیتا یا مار دیتا تو ان لوگوں کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مگر میں اس بے چارے سے ان لوگوں کی ملازمت کا انتقام نہیں لے سکتا تھا۔ ممکن ہے اس کی خدمات عارضی طور پر صرف میرے لیے حاصل کی گئی ہوں۔ اس لیے میں نے خاموشی سے ہتھکڑی اور بیڑی پہن لی۔ میرے بے بس ہوتے ہی منشی دل جی ایک گارڈ کے ساتھ نمودار ہوئے۔ یہ قید خانے کا گارڈ نہیں تھا بلکہ یقیناً محل کا گارڈ تھا اور اس کے نقوش نیپالی گورکھاؤں سے ملتے تھے۔ شاید قبائلیوں کے حملے کے بعد محل کے تمام محافظ بدل دیئے گئے تھے۔ اب مقامی قبائلی محل میں نہیں رکھے گئے تھے۔ مجھے تو حیرت تھی کہ اتنے بڑے سانحے کے بعد بھی یہاں قبائلی موجود تھے۔ جب کہ کنور خاندان نے ان کی ساری نسل کو ختم کرا دیا تھا۔ شاید ان کو اعتماد تھا کہ اب یہ لوگ کچھ نہیں کر سکتے تھے یا پھر وہ بنیا فطرت کے مطابق مفت کے ہاتھ آئے غلام چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

منشی دل جی گارڈ کے ساتھ مجھے لے کر روانہ ہوئے۔ قید خانے اور محل کے درمیان کھلی جگہ سے گزرتے ہوئے پتا چلا کہ یہاں رات کو اچھی خاصی سردی ہو جاتی تھی۔ میرے جسم پر گرمیوں کے لحاظ سے کپڑے تھے اور یہ ناکافی تھے۔ راستے میں منشی دل جی نے مجھے بانو کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ میں نے بھی پوچھنے سے گریز کیا جو بھی تھا جلد سامنے آ جاتا۔ عین ممکن تھا کہ میرا اندازہ غلط ہو یہ مجھے اپنے جبر و قوت دکھانے کے لیے لے جا رہے ہوں۔ محل میں داخل ہوئے تو موسم معتدل ہو گیا۔ وہاں ہر طرف رنگ و خوشبو تھی۔ چند مہینے پہلے یہاں جو ہوا تھا اس کا کوئی اثر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ رات کے اس پہر بھی محل میں ملازم موجود تھے اور حسین و دلکش خادمائیں اسی مختصر سے لباس میں گھوم پھر رہی تھیں۔ مجھے اب تک راج کنور کا منحوس چہرہ نظر نہیں آیا تھا۔ شاید اسے مجھ سے دور رہنے کو کہا گیا تھا۔ بڑے کنور جی اور منشی دل جی نرم پالیسی کا چکر چلا رہے تھے۔ جب وہ ناکام رہتے تو مجھے راج کنور اور نائیک کے سپرد کیا جا سکتا تھا۔

بڑا کنور اسی کمرے میں کرسی پر بیٹھا تھا۔ کمرے میں آتش دان جل رہا تھا اور شمال کی طرف کھلی کھڑکی سے سرد ہوا اندر آ رہی تھی۔ بڑا کنور اسی مخصوص چوغے میں تھا جس نے اسے سر سے پاؤں تک ڈھانپ رکھا تھا۔ عام طور سے اس قسم کے چوغے شیطان کے پجاریوں کے لیے مخصوص سمجھے جاتے ہیں۔ اپنی مجبوری یا فطرت کی وجہ سے وہ یہ چوغہ پہننے پر مجبور تھا۔ اصل میں اسے جلد کی بیماری تھی۔ پورے جسم پر سانپ جیسی دھاریاں تھیں اور شاید جلد روشنی سے بھی حساس ہو گئی تھی اس لیے وہ اپنی حفاظت اور دوسروں کی نظروں سے بچنے کے لیے چوغہ پہننے پر مجبور تھا۔ میں اس کے سامنے آیا تو اس نے آہستہ سے سر ہلایا۔ "شہباز ملک تم ایک بار پھر یہاں ہو۔"

"بدقسمتی سے۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"لیکن اب یہاں قبائلی نہیں ہیں جو آپ کو آزاد کرا کے لے جائیں۔" منشی دل جی نے کسی قدر طنزیہ انداز میں کہا۔ وہ مسلح گارڈ سمیت میرے پیچھے موجود تھا۔

"مجھے معلوم ہے وہ سب خود زندگی کی قید سے آزاد کر دیئے گئے ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے قبائلیوں کا حملہ اصل میں تم لوگوں کی سازش تھی تاکہ ان کے خلاف فوجی کارروائی کا جواز پیدا کیا جائے اور پھر ان کا قتل عام کیا جائے۔ حملے میں تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوا بلکہ اس ساری جاگیر سے سیکڑوں گنا زیادہ مالیت کی ہیروں کی کان تمہارے ہاتھ آ گئی۔ ہاں ایک نقصان ہوا کہ تمہاری بہن اس حملے میں ماری گئی تھی یا قبائلیوں کے ہاتھ لگ گئی اور پھر اس کا کچھ پتا نہیں چلا۔"

میں نے جان بوجھ کر سعدیہ کا ذکر کیا۔ کیونکہ راج کنور کی گفتگو اور انداز سے لگا تھا کہ وہ بے خبر ہے کہ اس کی بہن یعنی سابقہ سادھنا عرف آشا اور موجودہ سعدیہ ہمارے پاس ہے۔ مگر یہ ان مکاروں کی کوئی چالاکی بھی ہو سکتی تھی۔ اس کا امکان تھا کہ وہ جانتے ہوں کہ ان کی بہن اصل میں ہمارے پاس ہے اور وہ اسے بھی خاموشی سے تلاش کرا رہے ہوں۔ اگر وہ میاں ممتاز تک رسائی رکھتے ہوں گے تو انہیں یہ بھی معلوم ہو گا کہ مرشد میرا جانی دشمن ہے اور وہ مرشد سے رابطہ کر کے میرے اور میرے ساتھیوں کے بارے میں پوری معلومات لے سکتے تھے۔ ان میں سعدیہ بھی شامل تھی۔ مگر بڑے کنور پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا اس نے صرف سر ہلایا۔ "یہ سب اب ماضی کا حصہ بن گیا ہے۔ میں نے تمہیں حال پر بات کرنے کے لیے بلایا ہے۔"
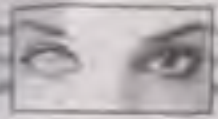
"یعنی آپ میرا خون چاہتے ہیں۔ لیکن منشی جی نے بتا دیا ہو گا کہ اب میں تیار نہیں ہوں اور زبردستی کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا سوائے اس کے کہ ایک شخص مر جائے جو آپ کا دشمن ہے۔"

"تم نے بانو کا ذکر کیا تھا کہ اسے کوئی تکلیف نہ ہو۔" وہ بدستور نرم لہجے میں بول رہا تھا ویسے یہ اس کا انداز تھا۔

"ہاں وہ ایک بے گناہ لڑکی ہے جسے تمہارا آدمی رامن بلاوجہ اٹھا لایا ہے۔ وہ میاں ممتاز کی منہ بولی بیٹی بھی ہے اور جب یہ بات اسے معلوم ہو گی تو یقیناً اس سے تمہارے جو بھی تعلقات ہیں ان پر اثر پڑے گا۔"

"وہ ایک معمولی ملازمہ ہے۔"

"یہ جھوٹ رامن نے بولا ہو گا۔ آپ بانو سے معلوم کر سکتے ہیں اور اگر ایسا نہیں بھی ہے تب بھی میں ایسا چاہتا ہوں اگر آپ کو میرا خون درکار ہے تو اس کی کچھ نہ کچھ قیمت تو ادا کرنی پڑے گی۔"

بڑا کنور خاموش ہو گیا۔ پھر اس نے منشی جی سے کہا۔ "لڑکی کو لے آؤ۔"

منشی دل جی باہر چلا گیا اور چند منٹ بعد وہ بانو کو لے آیا۔ اس نے لباس بدل لیا تھا۔ وہ ساڑی میں تھی اور بہتر حالت میں لگ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے مرجھائے چہرے پر رونق آ گئی۔ بڑے کنور نے اس سے پوچھا۔ "لڑکی تیری ممتاز ہاؤس میں کیا حیثیت تھی؟"

"میں میاں صاحب کی منہ بولی بیٹی اور ان کی بیٹی نور النساء بی بی کی پرسنل سیکریٹری ہوں۔" بانو نے وہی جواب دے کر مجھے حیران کر دیا جو میں چاہتا تھا۔ میں نے منہ بولی بیٹی والی بات اپنی طرف سے کی تھی مگر بانو نے بھی کہہ دیا۔ بڑے کنور نے اشارہ کیا تو منشی دل جی بانو کو واپس لے

گیا۔ اس کے جانے کے بعد بڑے کنور نے مجھ سے پوچھا۔ ”اب کہو تم کیا چاہتے ہو؟“

”سب سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ بانو کی عزت آبرو محفوظ رہے اور اسے یہاں کوئی تکلیف نہ ہو۔ پھر میں چاہتا ہوں کہ اسے واپس ممتاز ہاؤس بھیج دیا جائے۔ اس کے بدلے میں خون کی فراہمی کے لیے تم سے مکمل تعاون کروں گا۔“

بڑا کنور پھر سوچ میں پڑ گیا تھا۔ میری چھٹی حس نے خبردار کیا کہ اس کی خاموشی بلا سبب نہیں تھی۔ یقیناً کوئی ایسی بات تھی کہ بڑا کنور میرے مطالبے پر خاموش ہو گیا تھا۔ اگر بانو کو حیات لایا ہوتا تو شاید اس کے لیے مسئلہ نہیں تھا لیکن اب مجھے لگ رہا تھا کہ اس کے پس پشت کچھ اور چکر تھا۔ کچھ دیر بعد بڑے کنور نے کہا۔ ”فی الحال میں بانو کو واپس نہیں بھیج سکتا۔ اس میں کچھ پیچیدگیاں ہیں لیکن میں وعدہ کرتا ہوں کہ اسے واپس ضرور بھیجوں گا۔ البتہ وہ بالکل محفوظ ہوگی اسے یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔“

بڑے کنور کے وعدے کی میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں تھی۔ جس طرح ڈیوڈ شا میکاولی کا سیاسی پیروکار تھا اسی طرح بھارت کا ہر برہمن چانکیہ کا شاگرد تھا۔ ان کے نزدیک صرف اپنا مفاد اہم ہوتا ہے اور اس کے لیے ہر حربہ اور ہر چیز جائز تھی۔ بہرحال اتنا بھی کافی تھا کہ وہ بانو کو محفوظ رکھنے کا وعدہ کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”مجھے دن میں ایک بار اس سے ملنے کا موقع بھی دیا جائے گا۔“

”اگر تم کہو تو وہ تمہارے ساتھ بھی رہ سکتی ہے۔“ بڑے کنور نے پیشکش کر کے مجھے حیران کر دیا۔

”وہ نازک لڑکی ہے اس قید خانے میں کیسے رہے گی۔“

”تم اب اسی محل میں رہو گے۔ لڑکی تمہارے ساتھ یہاں رہے گی۔“

میں نے سوچا تو مجھے عجیب لگا تھا کہ میں ایک لڑکی کے ساتھ ایک ہی کمرے میں رہوں لیکن میں اور بانو عام حالات میں نہیں تھے۔ ہم یہاں درندوں کے درمیان تھے۔ اگرچہ اس کی کوئی گارنٹی نہیں تھی کہ بانو میرے ساتھ رہ کر بھی محفوظ رہے گی۔ اگر وہ اپنی من مانی کرنا چاہتے تو میں انہیں نہیں روک سکتا تھا۔ بہرحال پھر بھی مجھے تسلی رہتی۔ مجھے بڑے کنور کی پیشکش پر حیرت ہو رہی تھی۔ میں نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے اس صورت میں میں آپ سے تعاون کروں گا۔“

”کل ڈاکٹر تمہارا معائنہ کرے گا۔ اس دوران تمہارا ہر ممکن خیال رکھا جائے گا۔ اگر خون نکالنے کے دوران تمہاری حالت خراب ہوئی تو یہ عمل عارضی طور پر روک دیا جائے گا جب تک تم ٹھیک نہیں ہو جاتے۔“

”میں آپ کا شکر گزار ہوں۔“ میں نے کوشش کی کہ میرے لہجے سے طنز نہ جھلکے۔ بڑے کنور نے منشی دل جی کو اشارہ کیا۔ وہ مجھے لے کر روانہ ہو گیا۔ محل کے الگ تھلگ حصے میں جہاں گورکھا محافظ موجود تھے مجھے ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ یہ خاصا پر آسائش اور سجا سجایا کمرا تھا جس میں دور جدید کی ہر سہولت اور چیز موجود تھی۔ ایک بڑا سا ایل سی ڈی ٹی وی تھا۔ اس کے ساتھ ڈی وی ڈی پلیئر تھا۔ مگر ایک مسئلہ تھا کہ وہاں بڑا سہی لیکن ایک ہی بیڈ تھا۔ بہرحال اس مسئلے کو بھی حل کیا جا سکتا تھا۔ کمرے میں ایک طرف سلائیڈنگ ڈور والی کھڑکی تھی لیکن اس کے باہر بہت مضبوط قسم کی گرل لگی تھی۔ کھڑکی پائیں باغ میں کھل رہی تھی اور اس کے عین سامنے ایک سیب کا درخت تھا۔ جس کی ہری بھری شاخ کھڑکی تک آ رہی تھی۔ فرش پر سرمئی اور سفید دھاریوں والا دبیز قالین تھا۔ ایک طرف آتش دان تھا لیکن اس موسم میں اس کی ضرورت نہیں تھی۔ آتش دان کے پاس دو عدد ڈبل سیٹ والے لیدر صوفے تھے اور ان کے سامنے چھوٹی سی گلاس ٹاپ ٹیبل تھی۔ کمرے کے ساتھ پر تعیش قسم کا واش روم بھی تھا۔ کمرے کا معائنہ کرتے ہوئے میں اپنے فیصلے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

بہ ظاہر بڑے کنور نے بانو کو میرے ساتھ ٹھہرنے کی اجازت دے کر کھلے پن کا ثبوت دیا تھا لیکن یہ اس کی چالاکی بھی تھی۔ بانو میرے ساتھ ہوتی تو میں اس کی طرف سے بے فکر ہو جاتا۔ لیکن ساتھ ہی میں یہاں سے فرار کے بارے میں مشکل سے سوچتا۔ اکیلے آدمی کے لیے کچھ کرنا آسان ہوتا ہے لیکن جب اس کے ساتھ ایک لڑکی یا خاتون ہو تو وہ کوئی بھی قدم سوچ سمجھ کر اٹھاتا ہے۔ بڑے کنور نے ایک زنجیر اور میرے پیروں میں ڈال دی تھی۔ میں جھنجلا رہا تھا۔ اس خبیث رامن کو بھی ضروری تھا کہ بانو کو بھی لے آتا پھر مجھے خیال آیا کہ بانو پہلے اغوا ہوئی تھی اور میں بعد میں اغوا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور بانو اندر آئی۔ اس بار وہ پہلے سے زیادہ خوفزدہ تھی اور مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر اطمینان آ گیا تھا۔ اسے اندر دھکیل کر دروازہ بند کر دیا گیا تھا۔ بانو نے روہانسے لہجے میں کہا۔

”شہباز صاحب یہ سب کیا ہے، یہ کون لوگ ہیں اور مجھے کیوں یہاں لائے ہیں؟“

میں نے گہری سانس لی اور اسے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ”بانو یہ میرے پرانے دشمن ہیں اور تم جانتی ہو یہ مجھ سے کیا چاہتے ہیں لیکن تمہیں کیوں لائے ہیں اس سے میں بھی اتنا ہی بے خبر ہوں۔ پہلے میں سمجھ رہا تھا کہ حیات یعنی رامن تمہیں اپنی مرضی سے لایا ہے۔“

بانو دنگ رہ گئی تھی۔ ”رامن.... وہ مسلمان نہیں ہے؟“

”ہاں وہ نہ صرف ہندو ہے بلکہ انڈین ہے۔ وہ پاکستان میں کسی خاص مقصد کے تحت حیات بن کر رہ رہا تھا۔“

”کیا وہ مجھے اپنے لیے....“ بانو بولتے ہوئے جھجکی۔ ”میرا مطلب ہے وہ کیوں لایا ہے؟“

”میں نہیں جانتا، میں نے یہاں کے بڑے آدمی کے سامنے شرط رکھی ہے کہ تمہیں کچھ نہیں ہونا چاہیے اور تمہیں واپس بھیج دیا جائے تو میں اس سے تعاون کروں گا۔“

بانو کھل اٹھی تھی۔ ”وہی چوٹی والا آدمی نا.... وہ مان گیا ہے؟“

”ہاں وہ راج کنور کا بڑا بھائی ہے۔ اس کا نام مجھے یاد نہیں ہے لیکن سب اسے بڑا کنور کہتے ہیں۔ اس نے میری ایک بات مان لی کہ تم محفوظ رہو گی اور یہاں میرے ساتھ رہو گی لیکن پاکستان واپس بھجوانے والی بات ابھی نہیں مانی ہے۔“

بانو کا جوش و خروش ماند پڑ گیا تھا۔ ”مجھے بھی اس کی قید میں رہنا ہوگا۔ مگر وہ مجھے کیوں روک رہا ہے؟“

”ممکن ہے وہ ابھی میاں ممتاز سے یہ بات چھپانا چاہتا ہو۔ میاں ممتاز کو یہ معلوم ہے کہ میں کلینک میں ڈاکٹر کو قتل کر کے فرار ہو گیا ہوں۔ اگر اسے معلوم ہو گیا کہ میں اصل میں کنور خاندان کے قبضے میں ہوں تو اس کے اور کنور خاندان کے تعلقات متاثر ہوں گے۔“

بانو نے سر ہلایا۔ ”اب سمجھ میں آ رہا ہے اگر میں واپس گئی تو میاں صاحب تک یہ بات پہنچ جائے گی۔“

”بالکل اور ابھی یہ نہیں چاہتا۔“
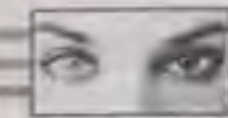
بانو نے گہری سانس لی۔ ”شکر ہے اب میں ذرا مطمئن ہوں ورنہ یہاں آنے کے بعد تو میرا اندیشوں اور فکر سے برا حال ہو گیا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میں درندوں سے بھرے جنگل میں آ گئی ہوں۔“

وہ ٹھیک محسوس کر رہی تھی۔ جنگل کے درندے بھی ان لوگوں کے مقابلے میں رحم دل ہوتے ہیں۔ دروازے پر دستک ہوئی اور پھر دروازہ کھلا۔ اس بار دل نواز خان کھانے کی ٹرالی کے ساتھ آیا تھا۔ اس کے ساتھ گارڈ تھا جو باہر ہی رہا۔ دل نواز خان میز پر کھانا لگانے لگا تھا کہ بانو نے اسے روک دیا۔ ”تم جاؤ، میں دیکھ لوں گی۔“

”آدھے گھنٹے بعد کافی لے آنا۔“ میں نے کہا۔ ”اگر کوئی روکے تو میرا حوالہ دینا۔“

دل نواز خان سر ہلا کر رخصت ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ میرے ساتھ بانو کو دیکھ کر کسی قدر بد مزہ ہوا تھا۔ شاید اس کا ذہن اس منفی پہلو کی طرف گیا تھا جو ایک مرد اور ایک عورت کو ایک جگہ موجود دیکھ کر عام آدمی کے ذہن میں فطری طور پر پیدا ہوتے ہیں۔ بانو نے بھی اس کے تاثرات محسوس کر لیے تھے اور وہ جھینپ رہی تھی۔ ہم نے خاموشی سے کھانا کھایا۔ میں کئی وقت سے بھوکا تھا مگر میں نے ہاتھ روک کر کھایا۔ ابھی مجھے سونا تھا اور پیٹ کی گرانی کے ساتھ نیند مشکل سے آتی۔ کھانا ختم ہوتے ہی دل نواز خان کافی لے آیا تھا۔ میں نے ٹہلتے ہوئے کافی پی۔ دل نواز برتن سمیٹ کر لے گیا تھا اور اس بار اس نے زیادہ تاثرات دکھائے تھے۔ اس کے جانے کے بعد بانو روہانسی نظر آنے لگی جب میں نے کافی ختم کی تو اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔

”آپ نے دیکھا وہ مجھے کس طرح دیکھ رہا تھا۔“

”میں نے بھی محسوس کیا ہے۔ میں نے اسی وقت محسوس کر لیا تھا جب میں نے بڑے کنور کی پیشکش مانی تھی۔ ہماری تہذیب اور معاشرت اس کی اجازت نہیں دیتی کہ مرد اور عورت ایک جگہ رہیں، ہمارا مذہب بتاتا ہے کہ دو مرد اور عورت کے درمیان تیسرا شیطان ہوتا ہے۔ لیکن یہاں ہم دونوں مجبور اور ہنگامی حالت میں ہیں۔ مجھے تمہاری فکر تھی کہ کہیں یہ کوئی مس بی ہیو نہ کریں اور دوسرے مجھے ان پر اعتبار نہیں ہے۔ خاص طور سے بڑے کنور کا بھائی راج کنور پورا شیطان ہے۔ اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ تمہیں

اپنے ساتھ ہی رکھوں لیکن اگر تم سمجھتی ہو کہ ٹھیک نہیں ہے تو تم الگ رہ سکتی ہو۔"

"ہرگز نہیں۔" وہ کانپ اٹھی۔ "یہاں مجھے ہر آنکھ میں شیطان نظر آتا ہے۔"

"تب لوگوں کی فکر نہ کرو اور آرام سے یہاں رہو۔ کوئی ہمارے بارے میں کیا سوچتا ہے ہمیں اس کی پروا نہیں کرنی چاہیے، اگر ہمارا ضمیر مطمئن ہے۔ باقی میری طرف سے تم بے فکر رہو۔"

"آپ کے بارے میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ جسے بی بی باکردار کہیں وہ شخص یقیناً باکردار ہوگا۔"

بانو کی بات سے ہرگز یہ مراد نہیں تھی کہ بنٹی بے بی خود بڑی باکردار تھی۔ اس لیے وہ دوسروں کو کردار کا سرٹیفکیٹ دے سکتی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ بنٹی نے اپنی ناکام تگ و دو کی کہانی بانو کو سنا دی ہوگی جب میں نے اس کا نسائی حملہ کامیابی سے پسپا کیا تھا۔ "بس تو سب اپنے ذہن سے نکال دو اور تم بستر پر لیٹ جاؤ۔"

"آپ....." اس نے جھجک کر پوچھا۔

"میں نیچے قالین پر لیٹ جاؤں گا۔"

"آپ اوپر لیٹ جائیں....."

"یہ میرا حکم ہے۔" میں نے کہا تو اس نے سر ہلا دیا تھا۔

چہل قدمی کرکے میں بہتر محسوس کر رہا تھا اس لیے میں نے باتھ لینے کا فیصلہ کیا۔ میرے جسم پر ممتاز ہاؤس والا لباس تھا اور یہ خاصا میلا ہو گیا تھا۔ میں نے دروازہ بجایا تو گورکھے گارڈ نے باہر سے کھولا وہ اکیلا نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ ایک اور بھی تھا۔ میں نے کہا۔ "مجھے اپنے سائز کا ایک آرام دہ لباس چاہیے اسی وقت اور اگر تم نہیں لا سکتے ہو تو منشی دل جی سے کہو۔"

دس منٹ بعد موٹا سوتی پاجامہ اور کرتہ آ گیا تھا۔ ساتھ میں میرے سائز کی نئی بنیان بھی تھی۔ بانو واش روم سے آ گئی اور ہلکا کمبل لے کر لیٹ گئی تھی۔ شاید اس کے لیے یہاں شلوار سوٹ نہیں ملا تھا یا جان بوجھ کر اسے ساڑی دی گئی تھی جب کہ وہ اس کی عادی نہیں تھی۔ اس کے لیے میں بعد میں بات کر سکتا تھا۔ گرم پانی سے غسل کرکے میری طبیعت ہشاش بشاش ہو گئی تھی۔ غسل مندی، تھکن اور ایک عجیب سی کیفیت تھی وہ سب غائب ہو گئی۔ میں ہلکا کمبل اور تکیہ لے کر قالین پر لیٹا تو پھر مجھے پتا بھی نہیں چلا کہ کب سو گیا اور صبح مجھے بانو نے اٹھایا تھا۔

"اٹھ جائیں، یہ لوگ دو بار ناشتے کا پوچھ چکے ہیں۔"

"اچھا! مجھے پتا ہی نہیں چلا کیا وقت ہو رہا ہے؟"

"نو بج رہے ہیں، کٹاری مونچھوں والا بھی آیا تھا۔" بانو نے کہا اس کی مراد منشی دل جی سے تھی۔ اس کی کٹاری مونچھیں تھیں۔ میں اٹھا اور واش روم سے آیا اس دوران میں ناشتا آ چکا تھا۔ بانو ناشتے کے دوران بار بار ساڑی کا پلو ٹھیک کر رہی تھی شاید اس لیے بھی کہ اسے عادت نہیں تھی اور دوسرے اس کا بلاؤز خاصا مختصر اور ناپ سے [illegible] تھا۔ اس لیے اسے پلو سے ستر پوشی کرنا پڑ رہی تھی۔ ادھر ناشتا کیا اور ادھر منشی دل جی نازل ہو گیا۔ اس نے آتے ہی ناگواری سے کہا۔ "بہت دیر کی ہے آپ نے۔ ڈاکٹر انتظار کر رہا ہے۔"

"ذرا سے انتظار سے وہ مر نہیں جائے گا۔" میں نے کہا۔ "رات مجھے یہ لباس دے دیا تھا لیکن پیروں میں کیا یہی جوتے پہنوں۔"

"ابھی پہن لیں بعد میں....."

"سوری میں ننگے پاؤں جا سکتا ہوں لیکن اس لباس کے ساتھ جوتے نہیں پہن سکتا۔"

خون کے گھونٹ پی کر منشی جی نے میرے لیے سلیپر منگوائے۔ یہ معمولی سے استعمال شدہ مگر شاندار قسم کے چمڑی سلیپر تھے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ جب میں پھنسا ہوا تھا تو انہیں کیوں چھوڑتا جہاں بھی ممکن تھا میں نے اپنی بات منوانے اور ان کی ناک میں دم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ بانو کمرے میں رہی تھی۔ باہر آتے ہی میں نے منشی جی سے کہا۔ "آپ کو خیال ہونا چاہیے کہ ہم انسان ہیں۔ اگرچہ آپ مانتے نہیں ہوں گے لیکن فی الحال ماننے پر مجبور ہیں اس لیے ہمارے ساتھ انسانوں والا سلوک کریں۔ ایک تو ہمیں ضرورت کی تمام چیزیں مہیا کریں۔ بانو کے لیے کسی خادمہ کو بھیجیں جو اس کی ضروریات کے مطابق چیزیں مہیا کرے آپ میری بات سمجھ رہے ہیں کہ خواتین کو کن کن چیزوں کی ضرورت ہو سکتی ہے۔"

"جی سمجھ رہا ہوں۔" منشی جی نے سر ہلایا۔

"دوسرے کمرے میں ایک ڈبل بیڈ ہے اسے ابھی

دو سنگل بیڈز سے تبدیل کر دیں۔ میرا خیال ہے میری واپسی تک یہ سارے کام ہو جائیں گے۔"

"آپ حکم کریں تو ابھی کر دیتے ہیں۔" اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"اتنی جلدی دکھانے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ خاص طور سے جب آپ کو مجھ سے کوئی سرٹیفکیٹ بھی نہیں ملے گا۔" میں نے ہنس کر کہا۔

پہلے کلینک محل کے قریب ایک الگ عمارت میں تھا لیکن اب اسے محل کے ایک حصے میں بنا دیا گیا تھا۔ ایک بڑے ہال نما کمرے میں کلینک کا مکمل سیٹ اپ تھا۔ اس بار ایک خوش شکل نوجوان ڈاکٹر وہاں موجود تھا اور اس کے ساتھ نظر نواز قسم کی نرس تھی۔ منشی دل جی مجھے وہاں گورکھا گارڈ کی نگرانی میں چھوڑ کر خود چلے گئے تھے۔ نرس نے مجھے شارٹ دیا۔ "یہ پہن لیں۔"

ایک طرف اسکرین موجود تھی میں نے اس کے پیچھے جا کر کپڑے اتارے اور شارٹ پہن لیا۔ ڈاکٹر نے مجھے چمڑے کی کاؤچ پر لٹا کر پہلے میرا معمول کا طبی معائنہ کیا۔ بلڈ پریشر، ٹمپریچر، زبان اور آنکھوں کا معائنہ کیا اور پھر اس نے میری جسمانی طاقت جانچنے کے لیے کچھ ٹیسٹ لیے۔ وہاں اس مقصد کے لیے مشینیں موجود تھیں۔ آخر میں اس نے میرے خون، تھوک، ٹشوز اور یورین کے سمپل لیے۔ میں ایک گھنٹا وہاں رہا تھا۔ منشی جی آدھے گھنٹے بعد ہی آ گئے تھے۔ جب ڈاکٹر نے اپنا کام مکمل کر لیا تو میں نے اپنے کپڑے پہنے اور ان کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ میں شعوری طور پر محل کی ساخت سمجھنے اور یاد رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ قید خانہ اور کلینک زیادہ دور نہیں تھے اور شاید میری وجہ سے اس حصے کی سیکورٹی بڑھا دی تھی۔ مجھے کم سے کم نصف درجن مسلح گورکھے دکھائی دیے تھے۔ محل میں بیتو کے قبیلے کا کوئی مرد نظر نہیں آیا تھا۔ یہاں صرف گورکھے تھے۔ ان میں سے دو میرے کمرے کے باہر موجود تھے۔

میں کمرے میں داخل ہوا تو ٹھٹک گیا۔ منشی جی نے بچ بچ پھرتی دکھائی تھی۔ کمرے کا بیڈ تبدیل کر دیا گیا تھا اور اب وہاں دو عدد لکڑی سے بنے سنگل بیڈ تھے لیکن یہ سنگل بیڈ بھی چار بائی سات فٹ کے تھے۔ بانو نے دروازہ بند ہونے کے بعد کہا۔ "شکر ہے ان لوگوں کو خیال آیا اور اب آپ کو نیچے نہیں سونا پڑے گا۔"

"اتنے اچھے نہیں ہیں، ان کو کہنا پڑا ہے تو یہ کام ہوا ہے اور ابھی اور بھی ہوگا۔"

"اور کیا ہوگا؟"

"بس دیکھ لینا۔" میں نے کہا۔ "یہاں میری حیثیت وہی ہے جو ممتاز ہاؤس میں تھی یعنی ایک وی آئی پی قیدی جس کی ہر بات مانی جاتی ہے بشرطیکہ وہ آزاد ہونے کی بات نہ کرے۔"

"جی ہاں میاں صاحب کا حکم تھا کہ آپ کا ہر ممکن خیال رکھا جائے اور ہر بات مانی جائے۔"

مجھے میاں صاحب سے خیال آیا۔ "تم نے کہا تھا کہ تم میاں ممتاز کی منہ بولی بیٹی ہو؟"

وہ جھینپ گئی۔ "میں نے ان لوگوں پر زور ڈالنے کے لیے کہا تھا۔ ویسے میاں صاحب مجھ پر مہربان تھے اور میں نے کبھی ان کے انداز میں اپنے لیے کوئی الگ بات محسوس نہیں کی۔"

میں اس کا مطلب سمجھ رہا تھا۔ عیاش طبع میاں ممتاز میں اتنی انسانیت ضرور تھی کہ اس نے اپنی ایک معمولی پروردہ کو کھلونا بنانے سے گریز کیا تھا۔ بانو متجسس تھی کہ مجھے کہاں لے گئے تھے اور میرے ساتھ کیا ہوا تھا؟ میں نے اسے اختصار سے کلینک کے بارے میں بتایا۔ یہاں ٹی وی تھا۔ میں نے ریموٹ اٹھا کر اسے آن کیا۔ ٹی وی کے ساتھ لاتعداد چینل والا سیٹلائٹ ریسیور بھی تھا۔ اس سے دنیا اور خاص طور سے اس حصے کا ہر چینل دیکھا جاتا تھا۔ جب ملک میں ہوتے تھے تو عام طور سے بیرون ملک کے چینل دیکھتے تھے لیکن اس وقت وطن سے دور ہوئے تو بے اختیار مقامی چینلز کی تلاش ہوئی۔ بڑی دیر بعد جا کر چند پاکستانی نیوز اور انٹرٹینمنٹ کے چینلز کا ایک گروپ ملا۔ بانو بھی خوش ہو گئی تھی۔ نیوز چینلز پر سیاسی جوڑ توڑ دکھایا جا رہا تھا۔ سیاسی پارٹیوں کی مفاہمت کی سیاست کا مرکزی نقطہ کھاؤ اور کھانے دو تھا۔ یہ مفاہمت ان کے ذاتی مفادات کے لیے تھی۔ کچھ دیر بعد میں نے بور ہو کر ریموٹ بانو کے حوالے کر دیا اور وہ ایک چینل سے آنے والا مارننگ شو دیکھنے لگی۔ جس میں میزبان خاتون ایک دیہاتی خاندان کو جمع کرکے آنسو بہا رہی تھی۔ خاندان کسی وڈیرے کے ظلم کا شکار ہوا تھا۔ شو

اتنا متاثر کن تھا کہ بانو کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔

دروازے پر دستک ہوئی اور پھر ایک خادمہ اندر آئی۔ اس نے لباس خادماؤں والا ہی پہن رکھا تھا۔ پہلے میں نے توجہ نہیں دی لیکن پھر دیکھا اور چونک گیا۔ وہ اوشا تھی۔ سپیرے سندھو کی بیٹی اوشا، جو کسی وقت میری دیوانی ہو گئی تھی اور میری خاطر اپنے باپ سے بغاوت کر کے بھاگنے کو بھی تیار ہو گئی تھی۔ اس پر اسے اپنی پشت کی کھال سے محرومی بھی برداشت کرنا پڑی تھی۔ وہی اوشا میرے سامنے موجود تھی۔ مختصر سی چولی میں سینے اور پیٹ کا بڑا حصہ نمایاں تھا اور نیچے اس نے تنگ پاجامے نما کوئی چیز پہن رکھی تھی جو اس کی پنڈلیوں تک آ رہی تھی یہ یہاں کی خادماؤں کا مخصوص لباس تھا۔ اس لباس میں اس کا سیاہ تانبے جیسا سرخ ہو جانے والا رنگ نمایاں تھا۔ شاید یہ موسم اور ماحول کا اثر تھا ورنہ اس سے پہلے وہ سیاہ رنگ کی تھی۔ یہ تانبے جیسا رنگ اسے مزید پرکشش بنا رہا تھا۔ لباس کے علاوہ دیگر سولہ سنگھار بھی کیے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے وہ کنور پیلس کی خادمہ تھی۔ ممتاز ہاؤس میں بانو بھی بہت سج دھج کر رہتی تھی۔ بڑے لوگوں کے ملازم بھی الگ سے نظر آنے چاہئیں۔ جیسے میں حیران تھا اسی طرح وہ بھی دنگ رہ گئی تھی جیسے اسے یہاں میری موجودگی کی توقع نہ ہو۔

”شہباز۔“ اوشا نے بہ مشکل کہا اور لپک کر میرے پاس آئی اس نے میرا بازو تھام لیا تھا۔ ”تم پھر ان کے ہاتھ آ گئے۔“

”بدقسمتی سے۔“ میں نے سرد آہ بھری۔ ”تم کیسی ہو، سندھو کے بارے میں مجھے معلوم ہو گیا تھا مجھے اس کا افسوس ہے۔“

”اس نے جو بویا وہ کاٹ لیا۔“ اوشا افسردگی سے بولی۔ یہاں رہ کر اس کی زبان بھی خاصی حد تک صاف ہو گئی تھی اور اس نے ابھی تک ایک بار بھی اپنا مخصوص لفظ ”رے“ نہیں بولا تھا۔ ”ہم ٹھیک ہیں تم دیکھ رہے ہو اب ہم یہاں ملاجمہ ہیں۔“

”تم یہاں کام کرتی ہو؟“ میں نے انجان بن کر پوچھا۔

وہ مسکرائی۔ ”شہباز بابو انجان بن رہے ہو، ہم یہاں بے مول کی ملاجمہ ہیں۔ سب کرتے ہیں اور بدلے میں بس تن کا یہ کپڑا اور دو وقت کا کھانا ملتا ہے۔“

”ان جیسے لوگوں سے یہی توقع ہو سکتی ہے۔“ میں نے موضوع کو بڑھانے سے گریز کیا ورنہ اوشا سے کچھ بعید نہیں تھا وہ کچھ ناگفتنی قسم کے انکشافات پر اتر آتی۔ کنور پیلس میں عورت کی اور خاص طور سے جب اس کا کسی خاندان سے تعلق نہ ہو کیا وقعت تھی، یہ میں اچھی طرح جان گیا تھا۔ اوشا عرصے سے یہاں تھی اور ظاہر ہے وہ بے بس تھی اس کے ساتھ وہ سب ہوا ہوگا اور ہوتا ہوگا جو کنور پیلس کی دوسری خادماؤں کے ساتھ ہوتا تھا اور ہوتا ہے۔ ”تم یہاں سے نکل کر کہیں جا نہیں سکتیں؟“

”ہم کیسے جا سکتے ہیں؟“ وہ حیرت سے بولی۔ ”یہاں سب گلام ہیں کسی کو باہر جانے کی اجاجت نہیں ہے۔ جو بھاگتا ہے اس پر کتے چھوڑ دیتے ہیں۔ پھر باہر ہمارا ہے کون جس کے پاس جائیں۔ یہاں چھت تو ملی ہوئی ہے۔“

اس چھت تلے اس کے ساتھ جو ہوتا تھا وہ واضح تھا۔ اوشا مجھے دیکھ کر دکھی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ کنور میرے خون کے پیاسے تھے۔ حقیقتاً بھی اور محاورتاً بھی، ایک بار میں قبائلیوں کی وجہ سے ان کے چنگل سے نکل بھاگا تھا مگر ان کے ہاتھ لمبے تھے انہوں نے مجھے دوبارہ پکڑ لیا۔ یہ وہ بات تھی جو اوشا کی سادہ سی سمجھ میں آ سکتی تھی اس لیے میں نے اسے یہی بتایا۔ وہ دکھی ہو گئی۔ ”بھگوان تمہاری رکھشا کرے۔“ اس نے کہا اور پھر چونکی۔ ”لو ہم جس کام سے آئے تھے اور بھول گئے منشی جی کھال اتار دیں گے۔“

”فکر مت کرو جب تک میں یہاں ہوں کوئی تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔“

”سچ شہباز بابو۔“ وہ خوش ہو گئی۔ ”سچ کہو ہم یاد آتے تھے؟“

”یاد۔“ میں بوکھلا گیا کیونکہ بانو سب کچھ بہ غور دیکھ اور سن رہی تھی۔ ”ہاں یاد تو آتی تھی۔“

”تم بھی ہمیں بہت یاد آتے ہو۔“ اس نے حسرت سے کہا۔

”تم کام سے آئی تھیں۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔

”پر تمہیں دیکھ کر سب بھول گئے اب تو منشی جی کھال بھی اتار دیں تو دکھ نہیں ہوگا۔ تمہاری خاطر ایک بار پہلے بھی یہ تکلیف بھوگ چکے ہیں۔“ کہتے ہوئے اس کا انداز ماضی کی طرح نشیلا ہو گیا تھا۔ میں نے دل میں لاحول پڑھی۔ وہ

مظلوم سہی لیکن اس میں ایک خاص قسم کی نسوانی بدمعاشی بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ جب میں اس کے اور اس کے باپ کے قابو میں تھا تب اس نے اس بدمعاشی کا بھرپور مظاہرہ کیا تھا۔ مگر ساتھ ہی وہ میرے کام بھی آئی تھی۔ مگر یہاں اس قسم کی بدمعاشی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اس لیے میں نے ذرا دو ٹوک انداز میں کہا۔

”ماضی کی باتیں بھول جاؤ اور ابھی کے مسائل پر توجہ دو، یہ بتاؤ کہ منشی جی نے تمہیں کس لیے بھیجا ہے؟“

وہ ذرا بجھ گئی اور آہستہ سے بولی۔ ”آپ کو جو چاہیے وہ لا دوں۔“

”ٹھیک، مجھے کچھ لباس چاہئیں۔“

”آپ لکھ کر دے دیں۔“ اس نے ایک رف پیڈ اور کاغذ میرے سامنے کیا۔ ”ہو سکتا ہے کہ بولیں تو ہماری سمجھ میں نہ آئے۔“

میں نے اپنے لباس اور جوتے چپل کے بارے میں لکھ دیا۔ اس کے علاوہ بھی جو سمجھ میں آیا وہ لکھ دیا۔ کون سا میرے اکاؤنٹ سے کچھ جا رہا تھا۔ اپنا پرچہ پھاڑ کر میں نے رف پیڈ بانو کی طرف بڑھا دیا۔ ”تمہیں جس چیز کی ضرورت ہو اس پر لکھ دو، سب بلا تکلف لکھ دو۔“

بانو نے سر ہلایا اور اپنے بیڈ پر بیٹھ کر لکھنے لگی۔ میں نے آہستہ سے اوشا سے کہا۔ ”سنو، میں یہاں ایک معتوب فرد ہوں، کل میں کہاں ہوں کچھ پتا نہیں، لیکن تمہیں یہیں رہنا ہے اس لیے مجھ سے تعلق ظاہر مت کرنا۔ نہ ہی کسی سے میرے بارے میں بات کرنا۔“

”ہم جانتے ہیں لیکن ہم ایسا نہیں کر سکتے۔“ وہ جذباتی ہو گئی۔ ”چاہے یہ ہمیں کتوں کے آگے کیوں نہ ڈال دیں۔“

”اوشا سمجھنے کی کوشش کرو، ہو سکتا ہے کہ تمہارا اور میرا تعلق ان کے علم میں آ جائے تو یہ تمہیں یہاں نہ بھیجیں۔ محل میں خادماؤں کی کمی تو نہیں ہے۔ ممکن ہے کسی وقت تم میری مدد کر سکو۔“

”ہم تمہاری کیا مدد کر سکتے ہیں۔“ اس نے مایوسی سے کہا۔ ”ہاں یہ تم ٹھیک کہتے ہو، ہم اب کسی کو نہیں بتائیں گے۔“

بانو نے اپنا پرچہ لکھ کر اسے موڑ کر اوشا کے حوالے کیا اور پھر اس کے ساتھ دروازے تک گئی اور سرگوشی میں اسے کچھ کہنے لگی۔ اس کی آسانی کی خاطر میں واش روم میں چلا گیا۔ ابھی کیونکہ خون لینے کا مرحلہ دور تھا اس لیے فی الحال چائے کافی پر پابندی نہیں تھی۔ باہر موجود گورکھا گارڈز کو کہنا کافی ہوتا تھا کچھ دیر میں چائے کافی آ جاتی تھی۔ جب اوشا چلی گئی تو بانو نے اس کے بارے میں سوالات کا آغاز کیا۔ میں جانتا تھا وہ لازمی پوچھے گی اس لیے میں نے مناسب جوابات پہلے ہی سوچ لیے تھے۔ جو مختصر اور پُراثر تھے۔ بانو کی تسلی نہیں ہوئی تھی لیکن اس سے آگے وہ پوچھ نہیں سکتی تھی۔ البتہ اس نے یہ ضرور کہا۔ ”آپ سے بہت متاثر لگ رہی ہے۔“

”میرے دوست اور دشمن سب مجھ سے متاثر ہوتے ہیں۔“ میں نے ٹالنے کے انداز میں کہا تو وہ سمجھ گئی اور پھر اس نے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ دوپہر کا کھانا ویسا ہی تھا جیسا کہ میں کچھ عرصے سے کھاتا آ رہا تھا۔ یعنی سادہ لیکن مزیدار اور غذائیت سے بھرپور۔ بانو کی خوراک محدود سی تھی۔ وہ شاید میری خوراک کا چوتھا حصہ بھی نہیں کھاتی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ ”تم اپنی خوراک پر توجہ دو، تم بہت کم کھاتی ہو۔“

”میں اتنا ہی کھاتی ہوں۔“

”نہیں اس سے زیادہ کھاؤ، یہ مت بھولو کہ تم دشمن کی قید میں ہو اور کسی وقت بھی تم پر برا وقت آ سکتا ہے۔ اگر مضبوط ہو گی تو مشکل وقت گزار سکو گی اور مضبوط بننے کے لیے خوراک اور ایکسرسائز پر توجہ دو۔“

اس نے بے توجہی سے کہا۔ ”میں لڑکی ہوں کتنی کوشش کر لوں مضبوط نہیں بن سکتی۔“

”یہ سب سوچ ہے، اللہ نے مرد اور عورت کو بہت مختلف نہیں بنایا ہے۔ عورت صنف نازک ہے لیکن اسے کمزور سمجھنا درست نہیں ہے۔ نازکی اور کمزوری میں فرق ہوتا ہے۔ عورت بھی چاہے تو خود کو مضبوط بنا سکتی ہے۔ بے شک مرد جیسی مضبوطی اور طاقت نہیں آ سکتی ہے لیکن جس حد تک ممکن ہے اتنا تو مضبوط ہونا چاہیے نا۔“

”آپ کہہ تو ٹھیک رہے ہیں۔“ وہ سوچ کر بولی۔ ”تب میں کیا کروں؟“

”ایکسرسائز کرو اور خوراک بہتر بناؤ۔“

”جو ایکسرسائز آپ کرتے تھے؟“

”نہیں ہلکی پھلکی، جیسے واک کرنا، ہلکی دوڑ لگانا، ایسی

جسمانی ایکسر سائز جو چھوٹی جگہ بھی کی جاسکتی ہیں۔ یہاں بھی خاصی جگہ ہے۔" میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ "یہ لوگ شاید ممتاز ہاؤس جیسا جم تو نہ دیں اس لیے مجھے اسی کمرے میں کچھ کرنا ہوگا۔"

درحقیقت کمرا خاصا بڑا تھا یہ شاید پچیس بائی اٹھارہ فٹ کا کمرا تھا۔ میں نے سوچا کہ منشی جی سے کچھ مشینوں کا کہتا ہوں۔ ورنہ میں خود بھی اچھی خاصی ایکسر سائز کر سکتا تھا۔ کھانے کے دو گھنٹے بعد میں نے ہلکی اسکپنگ شروع کی یعنی پنجوں کے بل اچھلنے لگا۔ جسم گرم کرنے کے لیے یہ اچھی ایکسر سائز ہے۔ بانو دل چسپی سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے کرتہ اتار دیا کیونکہ پسینا آنے لگا تھا۔ جب جسم گرم ہوگیا تو نیچے لیٹ کر دونوں ہاتھ گردن پر رکھے اور پاؤں ملا کر انہیں سمیٹنے اور کھولنے لگا۔ یہ خاصی سخت ورزش تھی۔ ذرا سی دیر میں پسینے پسینے ہوگیا تھا۔ بانو نے کہا۔

"دیکھنے میں تو آسان لگ رہی ہے۔"

"لیکن کرنے میں بہت سخت ہے۔ یہ بیک وقت کمر، پیٹ اور پیروں کی ورزش ہے۔"

"کیا میں بھی کروں؟"

"نہیں تم فی الحال واک کرو۔"

"میں نے ایک دو بار بے بی کے ساتھ جم میں ایکسر سائز کی تھی لیکن میرا دل نہیں لگا۔ اس لیے پھر نہیں کی۔"

ایک گھنٹے بعد اوشا ہمارے لیے کپڑے لے آئی تھی۔ اس نے دو عدد بیگ اٹھا رکھے تھے۔ میں نے تولیہ لے کر واش روم کا رخ کیا۔ نہا کر وہی کپڑے پہنے اور باہر آیا تو اوشا بانو کو اس کی چیزیں دے کر بتا کر جا چکی تھی۔ وہ میری موجودگی میں بھی سب بتا اور دے سکتی تھی مگر بانو شرمندہ ہوتی اس لیے میں واش روم چلا گیا تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ ایک ہی کمرے میں رہنا آسان نہیں۔ آدمی کو چاہے وہ مرد یا عورت ہو پرائیویسی درکار ہوتی ہے۔ مجھے خیال آیا کہ اگر منشی جی ہمیں ایسے کمروں میں منتقل کر دے جو برابر ہوں اور درمیان میں رابطے کا دروازہ ہو تو مجھے اور بانو دونوں کو آسانی رہے گی۔ لیکن ایسے کمرے محل میں میسر ہوئے اور منشی جی وہاں منتقل کرنے پر آمادہ ہوں۔ باہر آ کر میں نے دوسرے کپڑے لیے اور پھر واش روم میں جا کر تبدیل کیے۔ میرے بعد بانو اندر گئی اس نے دوسرا سوٹ ساتھ لے لیا تھا۔ یہ اس کا پسندیدہ فراک پاجامہ سوٹ تھا۔ کچھ دیر آرام کر کے میں نے منشی جی سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ گورکھے گارڈ نے کہا۔ "ان کو بتاتا ہے۔"

گورکھے کی اردو یا ہندی واجبی سی تھی۔ مگر وہ سمجھ لیتا تھا اور اپنی بات سمجھا بھی لیتا تھا۔ بانو نہا کر اور لباس بدل کر آئی تو تازہ دم لگ رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ "میرے ذہن میں ایک تجویز آئی ہے۔ میں منشی جی سے بات کرتا ہوں۔ وہ ہمیں دو ایسے کمرے دے دے جو درمیان سے ملے ہوں۔"

وہ ڈر گئی۔ "میں اکیلی رہوں گی۔"

"نہیں تم ایک طرح سے میرے ساتھ ہی رہو گی۔ لیکن تمہاری اپنی پرائیویسی بھی ہوجائے گی۔"

اس نے سوچا اور پھر سر ہلایا۔ "اگر ایسا ہو تو ٹھیک ہے۔ لیکن اس صورت میں میں باہر والا دروازہ اندر سے بند ہی رکھوں گی۔"

"اسے بھی دیکھ لیں گے پہلے منشی جی سے بات کر لیں اور کمرے مل جائیں۔"

منشی دل جی کچھ دیر بعد آیا اور کسی قدر طنزیہ انداز میں بولا۔ "حکم شہباز جی۔"

"منشی جی ایک قیدی آپ کو کیا حکم دے گا۔" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "گزارش کر سکتا ہے، ماننا یا نہ ماننا آپ کے اختیار میں ہے۔"

"ہم تو خود آپ کے رحم و کرم پر ہیں۔" وہ کسی قدر تلخ ہوگیا۔ "بہرحال حکم کریں۔"

"منشی جی ایک تو ہمیں ایسے دو کمروں میں منتقل کر دیں جو درمیان سے ملے ہوں۔ ایک کمرے میں پرائیویسی مشکل ہوجاتی ہے۔"

اس نے سوچا اور سر ہلایا۔ "ہو جائے گا لیکن کل تک ہی ہو سکے گا۔"

"دوسرے مجھے اپنی صحت بہتر بنانے کے لیے کچھ ایکسر سائز ایکوپمنٹ درکار ہیں۔"

"وہ بھی کل تک مل جائیں گے۔" اس نے کہا۔ "آج کسی وقت آپ کے ٹیسٹوں کی رپورٹ آجائے گی اور کل صبح سویرے آپ کو ڈاکٹر سے ملنا ہوگا۔"

"میں تیار رہوں گا لیکن منشی جی کیا میں اس شخص سے

مل سکتا ہوں جو بڑے کنور کے لیے میرے خون سے دوا تیار کرے گا۔"

"مجھے بڑے کنور سے اجازت لینا پڑے گی۔" منشی جی نے کہا۔ اس کے جانے کے بعد بانو نے عجیب نظروں سے مجھے دیکھا۔

"آپ اتنے مطمئن ہیں کہ لگ ہی نہیں رہا ہے کہ آپ دشمن کی قید میں ہیں۔"

"حالانکہ تم مجھے پہلے بھی دیکھ چکی ہو۔ ممتاز ہاؤس میں بھی میں قیدی تھا اور وہاں بھی میں اتنے سکون سے رہ رہا تھا۔ البتہ مجھے موقع ملا تو میں نے اس ڈاکٹر کو دنیا سے رخصت کر دیا جو میرا خون نچوڑ رہا تھا۔ موقع ملتا تو رامن بھی مارا جاتا مگر میری کمزوری کا فائدہ اٹھا کر اس نے مجھ پر قابو پا لیا تھا۔ میں ہمیشہ پر امید رہتا ہوں کہ مجھے موقع ملے گا اور یقین کرو ایک بار بھی مجھے مایوسی نہیں ہوئی۔ میں اس مرحلے سے اتنی بار گزر چکا ہوں کہ اب بالکل عام سی بات لگتی ہے اور یہی وجہ ہے میں اتنا پر سکون رہتا ہوں۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ مجھے ان معاملات کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ میں تو ممتاز ہاؤس سے بھی کم نکلی تھی اس لیے یہ سب میرے بہت دہشتناک ہے۔ یقین کریں آپ نہ ہوتے تو شاید میں اب تک دہشت سے مر چکی ہوتی۔"

رات کے کھانے کے بعد میں نے کچھ دیر چہل قدمی کی اور پھر سونے کے لیے لیٹ گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ بانو لیٹنا چاہتی تھی لیکن میرے سامنے لیٹتے ہوئے جھجک رہی تھی۔ جب میں کمبل اور تکیہ لے کر قالین پر دراز ہوا تو وہ بھی لیٹ گئی تھی۔ بانو کے ساتھ ہونے سے مجھے کوفت تو ہوئی تھی لیکن ساتھ ہی میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے مجھ میں کسی قسم کی دل چسپی نہیں لی تھی بلکہ اس کا انداز بدستور پہلے والا تھا اور وہ مجھے ادب و آداب سے پیش آرہی تھی۔ میری حالت بہتر ہو رہی تھی۔ آرام اور بہترین خوراک سے میری کمزوری تقریباً ختم ہوگئی تھی۔ اگلی صبح میری آنکھ جلد کھل گئی۔ بانو سو رہی تھی۔ میں نے پاجامہ پہنا اور ایکسر سائز کی۔ گزشتہ روز کی نسبت تھکن کم ہوئی تھی۔ مجھے آخری بار خون دیے ہوئے چار دن سے زیادہ کا وقت گزر گیا تھا۔ مگر مجھے امید تھی کہ ہفتہ واری خون لینے کی کوشش نہیں کی جائے گی۔

ایکسر سائز سے فارغ ہو کر میں نے غسل کیا اور باہر آیا تو بانو جاگ گئی تھی۔ اس نے کمبل تہ کر کے رکھ دیے تھے۔ مجھے گڈ مارننگ کہہ کر وہ واش روم میں چلی گئی۔ ٹھیک آٹھ بجے دل نواز خان ناشتا لے آیا۔ جب وہ پہلی بار مجھ سے ملا تو خاصا پرجوش تھا لیکن بانو اور مجھے ایک کمرے میں رہتے پا کر اس کا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ اس وقت بھی اس نے کسی قدر معاندانہ انداز میں ناشتا لگایا۔ اس بار کافی نہیں تھی اور چائے صرف بانو کے لیے تھی۔ یہ بات اس نے واضح کر دی کہ مجھے چائے یا کافی سے منع کر دیا گیا ہے۔ بانو آئی تو ہم نے ناشتا کیا۔ ناشتے کے فوراً بعد منشی دل جی آگیا تھا اور مجھے کلینک لے گیا جہاں ڈاکٹر میرا منتظر تھا۔ اس نے معمول کا چیک اپ کیا اور بولا۔ "کچھ کمزوری ہے لیکن جسم اور خون میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ میں کچھ دوائیں دے رہا ہوں جو دو دن لینی ہیں اس کے بعد دوبارہ چیک اپ ہوگا۔"
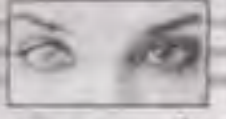
"یعنی ابھی میرا خون نہیں لیا جائے گا؟"

"نہیں دوبارہ چیک اپ کے بعد فیصلہ ہوگا۔" ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلایا۔ اس نے مجھے تین چار طرح کی گولیاں اور ٹیب لیٹس کھانے کے لیے دیں اور بتایا کہ دن میں کتنی بار لینی ہیں۔ میں نے سکون کا سانس لیا کہ ابھی مجھے خون نہیں دینا ہوگا البتہ منشی جی کا موڈ خراب ہوگیا۔ اس نے ڈاکٹر سے کہا۔ "دیکھنے میں تو شہباز جی ٹھیک لگ رہے ہیں۔"

"یہ میرا معاملہ ہے۔" ڈاکٹر نے خلاف توقع رکھائی سے جواب دیا۔ "مجھے معلوم ہے کہ کب ان سے خون لینا مناسب ہوگا۔"

یہ ڈاکٹر اس قسائی نما ڈاکٹر سے مختلف لگ رہا تھا جو پہلے یہاں میرا خون نکالتا تھا اور بعد میں پتا چلا کہ وہ معتوب قبائلیوں اور کنور خاندان کے دشمنوں کے اعضا بھی نکالتا تھا۔ ظاہر ہے اس کے بعد وہ موت کی آغوش میں چلے جاتے تھے۔ مگر کیا کیا جا سکتا تھا۔ میں نے انسانوں کو ایسے ایسے نقابوں کے ساتھ دیکھا تھا کہ ایک بار تو فرشتے بھی دھوکا کھا جائیں۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا جب مجھے ڈاکٹر توفیق جیسے شیطان سے واسطہ پڑا تھا اور اس نے زرین اور مجھ پر جان لیوا وائرس کا تجربہ کیا۔ میری موت کا وقت نہیں آیا تھا اس لیے میں محفوظ رہا تھا لیکن زرین اپنی جان سے گئی تھی۔ اگر یہ ڈاکٹر اتنا ہی اچھا ہوتا تو اس وقت یہاں کنور پیلس میں موجود نہ ہوتا۔ واپسی میں منشی جی مجھے اس کمرے کی طرف نہیں لے

گیا تھا جہاں میں اور بانو رہ رہے تھے بلکہ اس نے اسی راہداری میں ایک اور کمرے کا دروازہ کھولا۔ ”شہباز جی آپ کی خواہش کے مطابق یہ کمرے کھولے گئے ہیں۔ دیوی جی برابر والے کمرے میں ہیں پر درمیان کا دروازہ موجود ہے۔“ کہتے ہوئے اس کا لہجہ معنی خیز ہو گیا تھا۔

میں نے اسے گھورا۔ ”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ آپ دیوی جی کی طرف سے مطمئن رہیں گے۔“ منشی جی نے جلدی سے لہجہ بدل دیا۔ ”آپ نے جو مشینیں کہی تھیں وہ بھی آگئی ہیں۔“

ہم اندر آئے۔ یہ کمرا جدید مگر سادہ انداز کا تھا۔ فرش پر وال ٹو وال کھلتے نیلے رنگ کا کارپٹ تھا۔ ایک طرف چھوٹی سائیڈ دراز کے ساتھ سنگل بیڈ تھا۔ دراز کے ساتھ ٹو سیٹر صوفہ اور اس کے سامنے میز تھی۔ اندر آنے والا دروازہ واش روم کے سامنے کھلتا تھا۔ کمرا ایل شکل کا تھا۔ دروازے کے ساتھ اور واش روم کے بالکل سامنے وارڈ روب تھی۔ کمرے میں ایک طرف ایکسر سائز مشینیں لگی تھیں۔ بیڈ کے عین سامنے ایل سی ڈی ٹی وی اور ڈی وی ڈی پلیئر تھا۔ ریک میں بے شمار ڈی وی ڈیز رکھی تھیں۔ کمرے پر میٹ فنش ہلکا آسمانی رنگ تھا۔ بیڈ کے ساتھ کھڑکی تھی جس پر فیروزی رنگ کے پردے تھے۔ وارڈ روب اور واش روم کے درمیان برابر والے کمرے کا دروازہ تھا۔ منشی جی سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ جب میں نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا تو اس نے خود پوچھ لیا۔ ”کمرا کیسا لگا؟“

”پنچھی کو قید خانے سے کیا فرق پڑتا ہے منشی جی۔“ میں نے سرد آہ بھری۔ ”پنجرہ سونے کا بھی ہو تو پنجرہ ہوتا ہے۔“

اگر منشی جی نے مجھ سے اتفاق کیا تھا تو ظاہر نہیں کیا اور رخصت ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی میں نے برابر والے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ بانو شاید لگی کھڑی تھی کیونکہ دوسرے سیکنڈ میں دروازہ کھل گیا۔ اس نے مجھے دیکھ کر گویا سکون کا سانس لیا۔ ”شکر ہے ورنہ میں پریشان ہو گئی تھی۔ آپ کے جاتے ہی وہ لڑکی آئی اور مجھے یہاں لے آئی۔“

”اوشا؟“ میں نے کہا۔

”ہاں۔“ وہ جھینپ گئی۔ ”بہت بدتمیز ہے مجھ سے ایسے سوال کر رہی تھی کہ مجھے ڈانٹنا پڑا۔“

”وہ ان پڑھ اور بہت معمولی طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ تم اسے بہت پالش شدہ شکل میں دیکھ رہی ہو ورنہ وہ اپنے باپ کے سامنے بھی ایسی باتیں اور حرکتیں کر جاتی تھی کہ ... سوچ بھی نہیں سکتے ہیں۔“

بانو ہچکچائی پھر اس نے کہا۔ ”وہ مجھ سے آپ کے بارے میں کرید کرید کر پوچھ رہی تھی۔“

”کیا پوچھ رہی تھی؟“ میں نے بانو کے کمرے کا جائزہ لیا سوائے ایکسر سائز مشینوں کے یہ بالکل میرے کمرے کی طرح فرنش تھا۔ ہمارے کپڑے اور دوسری چیزیں بھی الماریوں میں آگئی تھیں۔

”یہی کہ میرا آپ سے کیا تعلق ہے؟“ بانو جھینپ کر بولی۔ ”اس پر میں نے اسے ڈانٹ دیا۔“

”تم نے ٹھیک کیا۔ یہاں ہم اپنی خوشی سے نہیں آئے ہیں جو دوسروں کا خیال رکھیں۔ ابھی ہم حاوی ہیں اس لیے جو بات محسوس ہو وہ صاف کہہ دیا کرو۔“

”ڈاکٹر نے کیا کہا ہے؟“ اس نے موضوع بدل دیا۔

”فی الحال تو بچت ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر نے دو دن بعد دوبارہ ٹیسٹ لینے کو کہا ہے۔“

”اللہ کرے وہ آپ کو ان فٹ قرار دے دے۔“

میں اس کی دعا پر ہنسا۔ ”بی بی یہ میچ نہیں ہے کہ ان فٹ ہونے کے بعد مجھے میچ سے نکال دیا جائے۔ اس کے بجائے یہ مجھے دنیا سے رخصت کر دیں گے اور ظاہر ہے پھر تمہارے ساتھ بھی اچھا نہیں ہوگا۔“

وہ سہم گئی۔ ”یہ تو میں نے سوچا نہیں۔“

”دیکھو ابھی وقت ہے۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”خون لینے کا سلسلہ کئی مہینے چلے گا۔ مجھے اللہ کی ذات سے امید ہے ہمیں کوئی نہ کوئی موقع ملے گا۔ بس ہمیں صبر سے انتظار کرنا ہوگا۔“

”لیکن یہ پھر وہی حرکت نہ کریں۔“ بانو نے خدشہ ظاہر کیا۔ ”نصف لیٹر کا کہہ کر زیادہ خون نکال لیں۔“

”نہیں مجھے امید ہے اس بار ایسا نہیں ہوگا۔ وہاں میں کنور خاندان کے پوری طرح قابو میں نہیں تھا اور انہیں یہ خدشہ بھی ہوگا کہ میں فرار نہ ہو جاؤں اس لیے وہ حفظ ماتقدم کے طور پر میرا زیادہ خون لے رہے تھے مگر یہاں میں ان

کے قابو میں ہوں اور سونے کا انڈا دینے والی مرغی کو صرف احمق لوگ ذبح کرتے ہیں۔“

”اگر آپ ان کے قابو میں ہیں تو پھر یہاں سے کیسے نکلیں گے؟“

”اللہ مالک ہے پہلے بھی وہی مدد کرتا آیا ہے، آگے بھی وہی کرے گا اور اگر اس نے کوئی اور فیصلہ کر لیا ہے تو بھی ہمارے پاس راضی بہ رضا رہنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ویسے یہ انہوں نے اچھا کیا ہے کہ ہمیں الگ کمرے دے دیئے۔“

وہ مسکرائی۔ ”ہاں، سچ میں مجھے آپ کے سامنے سوتے ہوئے شرم آتی تھی اور بے چینی کی وجہ سے بڑی مشکل سے نیند آتی تھی۔“

”اب تم آرام سے سو سکو گی۔ درمیان والا دروازہ بھی بند کر لینا۔“

”ایسا نہیں ہے کہ مجھے آپ پر بھروسا نہیں ہے۔“ وہ سنجیدہ ہو گئی۔ ”بات صرف جھجک کی ہے اور یہ دروازہ ہمیشہ کھلا رہے گا۔ البتہ اس دروازے کے اندر کوئی چیز نہیں ہے بند کرنے والی سوائے لاک کے۔“

لاک کو بٹن دبا کر اندر سے بند کیا جا سکتا تھا لیکن اسے چابی کی مدد سے باہر سے کھولا بھی جا سکتا تھا۔ میں نے کہا۔ ”ہم اس معاملے میں مجبور ہیں۔ اگر انہوں نے کچھ کرنا ہوگا تو ہم بند دروازوں کے پیچھے بھی محفوظ نہیں رہیں۔ اس لیے لاک یا اندر سے بند کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ پھر اسے یاد آیا۔ ”اوشا میرے اور آپ کے لیے کچھ اور لباس اور چیزیں لائی ہے۔ میں نے آپ کے کپڑے اور چیزیں آپ کی الماری میں رکھ دی ہیں۔“

میں نے چیک کیا۔ تین مکمل لباس تھے۔ ایک نائٹ سوٹ تھا جو آرام دہ ٹراوزر اور ٹی شرٹ پر مشتمل تھا۔ دو شارٹس تھے اور ایک واش روم سلیپر تھا۔ شیونگ کا مکمل سیٹ نیل کٹر اور کچھ دوسری ضروری اشیا تھیں جن کی ضرورت آدمی کو پڑتی رہتی ہے۔ یہاں بھی واش روم شاندار اور تمام سہولیات سے آراستہ تھا۔ میں نے ایکسر سائز شروع کی تو کچھ دیر میں بانو بھی آگئی۔ اس نے ٹراوزر اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔
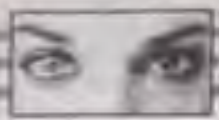
”گڈ تم نے میری بات مان لی۔“

”ہاں پھر یہاں کرنے کے لیے اور کچھ ہے نہیں کیوں نہ میں بھی ایکسر سائز کروں۔“

”پہلے تم رننگ مشین پر چلو۔“ میں نے مشورہ دیا اور پھر اسے عملی طور پر کر کے بھی دکھایا۔ معمولی سی کوشش سے خود بھی سیکھ گئی۔ اس نے مشین پر واک کی اور پھر ہلکی رننگ کی اور اس کے بعد سائیکل چلائی۔ ایک گھنٹے کی ایکسر سائز نے اسے پسینے پسینے کر دیا تھا اور سانس بے قابو ہو رہا تھا۔ میں نے افسوس سے کہا۔ ”تم دیکھنے میں صحت مند لگتی ہو لیکن تمہارا اسٹیمنا بہت کم ہے۔ بہرحال ایک ہفتہ لگ کر کرو گی تو اسٹیمنا بہتر ہو جائے گا۔“

جو کھانا میرے لیے آتا تھا وہی بانو بھی کھاتی تھی۔ اسے سادہ اور غذائیت سے بھرپور خوراک ملی تو سچ مچ چند دنوں میں اس کا اسٹیمنا اور صحت پہلے سے بہتر ہو گئی تھی۔ میں دو وقت ایکسر سائز کرتا تھا اور میرا دورانیہ دو گھنٹے ہوتا تھا لیکن وہ ایک گھنٹا کرتی تھی۔ اس کے لیے یہ بھی کافی تھا۔

تین دن بعد میرے ٹیسٹ دوبارہ ہوئے تھے اور اگلے دن رپورٹ آئی تھی کہ میں اب بالکل فٹ تھا، اس لیے مزید تین دن بعد خون نکالنے کا ہفتہ وار پروگرام دوبارہ شروع کیا جا رہا تھا۔ مسلسل بہترین خوراک اور ایکسر سائز کے بعد مجھے فٹ تو ہونا ہی تھا۔ بانو یہ سن کر پریشان ہوئی تھی کہ میرا خون لیا جائے گا۔

”یہ تو ہونا ہی تھا۔“ میں نے سرد آہ بھر کر کہا۔ ”اسی مقصد کے لیے میری جان کے دشمن میری اتنی خدمت کر رہے ہیں۔ لیکن اسی بہانے میری جان بھی بچی ہے۔“

بانو کی فکر کم نہیں ہوئی تھی۔ مجھے راج کنور کی فکر تھی ان دونوں بھائیوں میں میرے خون کا اصل پیاسا وہی تھا۔ بڑے کنور کو میرا خون صرف علاج کے لیے درکار تھا۔ وہ براہ راست میرا دشمن نہیں تھا مگر راج کنور میرا ذاتی دشمن بن گیا تھا۔ ایک تو وہ کینہ پرور شخص تھا اور دوسرے میں نے کئی مواقعوں پر اسے منہ توڑ جواب دیئے تھے۔ لیکن جب سے میں یہاں آیا تھا مجھے ایک بار بھی اس کی منحوس صورت نظر نہیں آئی تھی۔ ہاں جب آیا تھا تو اس کا چیلا نائیک ضرور دکھائی دیا تھا۔ اس کے بعد سے وہ بھی غائب تھا۔ یقیناً ایسا نہیں تھا کہ وہ مجھے بڑے کنور کے حوالے کر کے بھول گیا تھا۔

بلکہ وہ منتظر ہوگا کہ کب بڑے کنور کا کام ختم ہو اور میں اس کے ہاتھ آؤں۔ اس کا ایک اور چیلا یعنی رامن بھی غائب تھا۔ اگر وہ کنور پیلس آیا تھا تب بھی میرا اس سے سامنا نہیں ہوا تھا۔ وہ بھی بانو ہاتھ سے نکل جانے سے تلملا رہا ہو گا۔ میں جب ان کے ہاتھ آتا وہ یقیناً اپنے دل کی ہر ممکن بھڑاس نکالتے۔ میرے ساتھ بانو بھی ماری جاتی۔ اگرچہ اس کا کوئی قصور نہیں تھا سوائے اس کے کہ وہ ایک حسین اور جوان لڑکی تھی اور اس پر رامن کا دل آگیا تھا۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ میرے ساتھ اغوا ہوئی تھی۔ اگر رامن صرف اسے لے آتا تو یقیناً وہ اب تک اپنی من مانی کر چکا ہوتا۔ میرے خلاف اندر ہی اندر کیا کھچڑی پک رہی تھی میں اس سے فی الحال بے خبر تھا۔

ایک ہفتے بعد بانو نے دوسری ایکسر سائز شروع کر دی تھیں جیسے کمر اور بازوؤں کی۔ وہ بنچ پریس بھی کر رہی تھی۔ نوجوان تھی اس لیے اسے بہت تیزی سے اثر ہوا تھا۔ پہلے وہ ذرا بے ڈول تھی۔ پیٹ بڑا تھا اگرچہ یہ بدنما نہیں لگتا تھا۔ ہمارے مشرقی لباس بے ڈول جسم کو بھی خوب صورت بنا کر پیش کرتے ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں صحت اور جسم کی بہتری کی طرف کم ہی توجہ دی جاتی ہے اور خواتین کا سارا زور اچھے اور خوب صورت لباس پر ہوتا ہے۔ یہی حال بانو کا بھی تھا۔ مگر ایکسر سائز کی تو اس کی شیپ بدل گئی۔ پیٹ کم ہو گیا تھا۔ اضافی چربی چھٹ گئی تھی۔ جسم مضبوط اور اسٹیمنا کہیں بہتر ہوا تھا اب وہ بغیر تھکے ایک گھنٹے کی رننگ یا سائیکلنگ کر سکتی تھی۔ اپنی اس پروگریس پر وہ بہت خوش تھی اور اس کا مطالبہ تھا کہ میں اسے سیلف ڈیفنس بھی سکھاؤں۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ ایک ہفتہ اور لگ کر ایکسر سائز کرے اور خود کو مزید مضبوط بنائے اس کے بعد میں اسے ضرور سکھاؤں گا۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق تین دن بعد میرا خون لیا گیا تھا اور اس بار ڈاکٹر نے مجھے واضح دکھا کر نصف لیٹر خون لیا تھا۔ خون دے کر مجھے کسی قسم کی کمزوری محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اس روز بھی میں نے معمول کے مطابق ایکسر سائز کی تھی۔ اب مجھے ایک ہفتے بعد خون دینا تھا اور جلد ایک ہفتہ گزر گیا۔ مجھے ناشتے کے بعد کلینک لے جایا گیا تھا جب کہ ممتاز ہاؤس میں ناشتے سے پہلے میرا خون لیا جاتا تھا اور وہ طریقۂ کار غلط تھا صبح انسان خالی پیٹ ہوتا ہے اور رات بھر میں اس کی توانائی کا بڑا حصہ خرچ ہو چکا ہوتا ہے ایسے میں خون دینے سے جسم مزید کمزور ہو جاتا ہے۔ اب میں [illegible] کر کے گیا تو مجھے معلوم بھی نہیں ہوا تھا۔ دوسرے ہفتے میں ناشتا کر کے منشی جی کے ساتھ روانہ ہوا۔ کمرے سے [illegible] جی اور گورکھا گارڈ لازمی میرے سر پر ہوتے تھے اگر منشی جی کچھ دیر کے لیے کہیں چلے بھی جاتے تب بھی گارڈ لازمی ہوتا تھا۔ اس روز بھی منشی جی کچھ دیر بعد کلینک سے کہیں چلے گئے تھے۔ میرا خون لیا گیا اور پھر میں گارڈ کے ساتھ واپس روانہ ہوا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے میرے کمرے کی طرف لے جائے گا لیکن اس کے بجائے اس نے درمیان سے راستہ بدل دیا۔ میں رک گیا۔ "یہ کہاں لے جا رہے ہو؟"

"آپ کو بلایا گیا ہے۔"

"کس نے؟"

"آپ دیکھ لینا۔" وہ بولا۔ "دیر مت کریں، مالک ناراض ہوں گے۔"

مجھے خیال آیا کہ کہیں بڑے کنور نے تو نہیں بلایا ہے۔ میں گارڈ کے ساتھ چل پڑا۔ وہ مجھے ایک دروازے تک لایا اور بولا۔ "آپ اندر چلے جائیں۔"

مجھے تعجب ہوا کہ اگر بڑا کنور اندر موجود تھا تو مجھے اس طرح جانے کو کیوں کہا جا رہا تھا جب کہ بڑے کنور سے میری ملاقات کے دوران نہ صرف یہ گارڈ بلکہ منشی دل جی بھی موجود رہا تھا۔ میں ہچکچایا اور دروازہ کھول کر اندر آیا تھا کہ رک گیا۔ سامنے ایک شاہانہ قسم کی کرسی پر راج کنور بیٹھا تھا اور اس کے عقب میں نائیک کھڑا تھا۔ راج کنور سنجیدہ تھا لیکن نائیک دانت پیسنے کے انداز میں مسکرا رہا تھا البتہ ایک چیز مشترک تھی اور وہ ان کی آنکھوں میں میرے لیے نفرت تھی۔ پیچھے دروازہ بند ہو گیا تھا۔ خطرے کے احساس نے مجھے چوکنا کر دیا تھا۔

"شہباز جی۔" راج کنور نے مخصوص طنزیہ انداز میں کہا۔ "بہت دنوں بعد ملاقات ہو رہی ہے۔"

"میں بھی سوچ رہا تھا کہ بہت دنوں سے تم نے یاد نہیں کیا۔"

"تمیز سے بات کرو۔" نائیک غرایا۔

میں نے استہزائیہ نظروں سے نائیک کو دیکھا۔ "راج

کنور تمہارا یہ کتا بھونکتا بہت ہے۔ اسے کاٹنا بھی سکھاؤ۔"

راج کنور کی آنکھوں میں شعلہ سا لپکا تھا اسے اس لہجے کی عادت کہاں تھی۔ نائیک کا بس نہیں چل رہا تھا کہ میری بوٹیاں اڑا دے۔ راج کنور نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "بہت زبان چل رہی ہے تیری۔"

"یہ بتاؤ مجھے یہاں کیوں بلایا؟" میں نے اس کی بات نظر انداز کی۔

"تجھے یہ بتانے کہ بہت جلد تیزی یہ چلنے والی زبان ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جائے گی۔"

"بہت جلد کیوں۔" میں نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ "ابھی کیوں نہیں راج کنور؟"

راج کنور کا چہرہ بگڑ گیا تھا۔ "ابھی سمے نہیں آیا ہے۔"

"اب تم جیوتشی بن رہے ہو۔" میں ہنسا۔ "صاف کیوں نہیں کہتے کہ اپنے بڑے بھائی کے سامنے مجبور ہو۔ ویسے ہمارے ہاں ایک کہاوت ہے کہ خدا کتا بنا دے چھوٹا بھائی نہ بنائے کہیں تم....."

"خاموش۔" راج کنور دہاڑ کر کھڑا ہو گیا اور نائیک یوں اس کے پیچھے سے نکلا جیسے مجھ پر چڑھائی کا مصمم ارادہ کر چکا ہو۔ مگر راج کنور کے اشارے پر سیل ختم ہو جانے والے کھلونے کی طرح رک گیا۔ "اگر میں نے بڑے کنور کو وچن نہ دیا ہوتا تو....." وہ خاموش ہو کر ہونٹ کاٹنے لگا۔

میرا دل چاہا کہ بولوں اسے پتا بھی ہے وچن کہتے کس کو ہیں مگر میں نے محسوس کیا کہ ایک حد آگئی تھی اور اگر میں نے اسے مزید چھیڑا تو کچھ نہ کچھ کر گزرے گا۔ مجھے اپنی فکر تو نہیں تھی لیکن میرے ساتھ بانو موجود تھی اور فی الحال وہی میری واحد کمزوری تھی۔ جب مجھے یہ خیال آیا تو اسی وقت راج کنور نے روپ بدلا اور بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔ "تمہارے ساتھ موجود ناری بہت سندر ہے۔"

"اگر تم اس کے حوالے سے دھمکی دے رہے ہو تو بیکار ہے۔ میں نے بڑے کنور سے کہہ دیا ہے کہ اسے میرا تعاون اس وقت تک حاصل رہے گا جب تک اس لڑکی کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی ہے۔"

"ابھی نہ سہی بعد میں تو ہو سکتی ہے۔" راج کنور کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر یہ خیال کسی الہام کی طرح آیا تھا۔

"راج کنور اس لڑکی کو تم نے رامن سے اغوا کرایا ہے؟"

اس نے سر ہلایا۔ "میں نے اسے میاں ممتاز کے پاس دیکھا تھا۔ مجھے اچھی لگی تو میں نے میاں جی سے مطالبہ کر دیا تھا مگر وہ بگڑ گیا۔"

"اس کا مطلب ہے اس میں کچھ غیرت باقی ہے۔"

"اب یہ غیرت یہاں ہے۔" راج کنور شیطانی انداز میں بولا۔ "میں نے سوچا ہے جب وہ میرے بیڈ روم میں چند راتیں گزار لے گی تو میں خود اسے میاں جی کو واپس بھیج دوں گا۔"

میں نے بے ساختہ اس کی طرف قدم بڑھایا تھا کہ عقب سے سرد سا لوہا آ کر میری گردن سے لگ گیا اور رامن کی آواز آئی۔ "بس سورما، مزید کوئی قدم مت اٹھانا۔"

میرے قدم بے اختیار رک گئے تھے۔ اگرچہ مجھے یقین تھا کہ راج کنور مجھے نقصان پہنچانے کی ہمت نہیں رکھتا ہے لیکن اس وقت رامن کے لہجے میں ایسی کوئی بات تھی جس نے مجھے روک دیا تھا۔ وہ کس وقت اندر آیا مجھے بالکل پتا نہیں چلا تھا۔ شاید جس وقت میں اندر آیا اور گورکھا گارڈ دروازہ بند کر رہا تھا اسی وقت وہ بھی دبے قدموں اندر آگیا تھا اور ممکن ہے دروازہ اسی نے بند کیا ہو جب کہ میں سمجھ رہا تھا کہ یہ گارڈ کا کام ہے۔ میں نے چند گہرے سانس لیے اور خود کو پرسکون کرتے ہوئے راج کنور سے کہا۔ "راج کنور تمہارے یہ الفاظ مجھ پر ادھار ہیں۔ اگر اللہ نے مجھے موقع دیا تو بہت جلد تمہیں ان کی ادائیگی کروں گا۔"

عقب سے رامن ہنسا۔ "میں سوچ رہا تھا اتنی دیر سے تم نے اپنے اللہ کا نام نہیں لیا۔"

اب تک کرسی پر بیٹھا راج کنور اٹھ کر نپے تلے قدموں سے میری طرف آیا اور بالکل میرے چہرے کے سامنے آ کر اس نے سرد ترین لہجے میں کہا۔ "بہت جلد یہ الفاظ حقیقت کا روپ دھار لیں گے اور ممکن ہے یہ سب تمہاری آنکھوں کے سامنے ہو۔"

راج کنور واپس اپنی جگہ بیٹھا تو نائیک تڑپ کر بولا۔ "کنور جی میں آپ کے کارن چپ تھا لیکن اب میں سہن نہیں کر سکتا مجھے انومتی دیں میں اس کی زبان گدی سے کھینچ لوں۔"

مجھے اپنا موڈ بدلنے کا موقع مل گیا اور میں نے راج کنور سے کہا۔ ”اسے انومتی (اجازت) دے دو یا تو یہ میری زبان کھینچ لے ورنہ میں اس کا کچھ اور کھینچ لوں۔ جس کے بعد یہ نمائشی مرد بھی نہ رہے۔“ کہتے ہوئے میرا لہجہ حقارت آمیز ہو گیا۔ نائیک بے تاب ہو کر ایک بار پھر میری طرف لپکا تھا لیکن راج کنور نے پھر اسے روک دیا۔

”ابھی نہیں۔“

میں نے استہزائیہ انداز میں پوچھا۔ ”تم پھر کسی مقابلے کی تاریخ کا اعلان کرنے والے ہو؟“

”آج یہ خون دے کر آیا ہے۔“

مگر میرا موڈ مکمل طور پر بدل گیا تھا اور میں نائیک کو توڑ پھوڑ کر راج کنور کو پیغام دینے کے لیے بیتاب ہو گیا تھا۔ میں نے اسی لہجے میں کہا۔ ”تم فکر مت کرو کنور ایسوں سے تو میں بغیر خون کے بھی نمٹ سکتا ہوں۔“

”ابھی نہیں تمہارا مقابلہ نائیک سے ہو گا لیکن پرسوں اور مقابلے کی جگہ بھی دوسری ہو گی یہ مناسب مقام نہیں ہے۔“

راج کنور کے اشارے پر مجھے واپس بھیج دیا گیا۔ گورکھا باہر موجود تھا۔ وہ بہت چوکس شخص تھا۔ اس کی شاٹ گن یوں اس کے ہاتھ میں ہوتی تھی جیسے جسم کا کوئی حصہ ہو اور عقب سے اس کی نگاہیں ہمہ وقت مجھ پر مرکوز رہا کرتی تھیں۔ اسے اچھی طرح چن کر میرے ساتھ لگایا گیا تھا۔ وہ تقریباً دو ہفتے سے میرے ساتھ تھا اور اب تک ایک بار بھی میں نے اسے لمحے بھر کے لیے غافل نہیں پایا تھا۔ وہ چوبیس گھنٹے چوکس رہنے والے کوبرا سانپ کی طرح تھا۔ میں واپس آیا تو بانو میرے کمرے میں موجود تھی اور بے چین لگ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ تیزی سے میری طرف آئی اور لرزتی آواز میں بولی۔ ”آپ کے جانے کے بعد وہ آیا۔“

”وہ کون؟“

”راج کنور۔“ بانو روہانسی نظر آنے لگی۔ ”وہ کہہ رہا تھا کہ اس نے مجھے اغوا کرایا ہے اور وہ....“ وہ چپ ہو کر ہونٹ کاٹنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اور اندیشے تیر رہے تھے۔

”بانو تم یہ کیوں بھول گئیں کہ ہم دشمن کی قید میں ہیں اور یہ سکون کا عارضی مرحلہ ہے۔ آنے والے وقت میں ہمارے لیے یقیناً عذاب تیار کیے جا رہے ہوں گے۔ میں خود راج کنور سے مل کر آ رہا ہوں۔ اس نے خود مجھ سے بکواس کی ہے۔ افسوس کہ میں اس کی زبان بھی کھینچ نہیں سکا۔“

”شہباز صاحب میرا دل کر رہا ہے کہ اس ذلت کے آنے سے پہلے خودکشی کر لوں۔“

”ہرگز نہیں خودکشی ہمارے مذہب میں حرام ہے۔ کیونکہ خودکشی کرنے والا اللہ سے مایوس ہو جاتا ہے اور مایوسی کفر ہوتی ہے۔“

”تب میں کیا کروں؟“

”حوصلہ رکھو اور اللہ پر بھروسا رکھو، انسانوں کے بس میں کچھ نہیں ہے وہی سب کرنے والا ہے۔ تم خود کو مضبوط کر رہی ہو اس لیے تمہارے منہ سے خودکشی کی بات اچھی نہیں لگتی ہے۔“

بانو نے آنسو صاف کیے۔ ”تب آپ مجھے سیلف ڈیفنس سکھانا شروع کر دیں۔“

میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔ اگر بانو پر کوئی افتاد پڑ جاتی تو وہ کسی حد تک اپنا دفاع کرنے کے قابل تو ہوتی۔ میں نے اسی دن سے اسے سکھانا شروع کر دیا۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں نازک تھے۔ ان سے کسی مرد پر وار کیا جاتا تو وہ اتنا کارگر نہ ہوتا اس لیے ضرورت اس کی تھی کہ پہلے وہ اپنے ہاتھ پاؤں مضبوط کرے۔ میں نے منشی دل جی سے ایک پنچنگ بیگ منگوا لیا تھا اور میں بھی اس پر مشق کرتا تھا۔ میں نے اس کی بلندی کم کی اور بانو کو سکھایا کہ کس طرح پنچ مارتے ہیں اور کس طرح کک چلاتے ہیں۔ شروع میں وہ جلد ہمت ہار جاتی تھی۔ کیونکہ پنچنگ بیگ پر مارنے سے اسے بھی چوٹ آتی تھی دو دن بعد وہ رواں ہو گئی۔ دو ہفتے کی ایکسر سائز سے اس کا اسٹیمنا، طاقت اور وزن تینوں میں اضافہ ہوا تھا۔ رننگ مشین میں وزن بتانے والا آلہ بھی لگا تھا۔ جب بانو نے ایکسر سائز شروع کی تو اس کا وزن پچپن کلوگرام تھا اور قد پانچ فٹ چار انچ تھا۔ قد کے لحاظ سے وزن کسی قدر کم تھا اور وہ نازک اندام لگتی تھی۔ ایکسر سائز کرنے سے اس کی خوراک بڑھی تھی اور اسی تناسب سے وزن بھی بڑھا تھا۔ اب اس کا وزن انسٹھ کلوگرام ہو گیا تھا۔ اس میں یقیناً چربی کم ہوئی تھی اور پٹھوں کا وزن بڑھا تھا۔ ٹانگیں اور بازو مضبوط ہوئے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ باسٹھ یا تریسٹھ کلوگرام وزن اسے زیادہ مضبوط بناتا۔

راج کنور نے مجھے دو دن کا وقت دیا تھا۔ تیسرے دن میں نے ناشتا ہلکا کیا تھا۔ کیونکہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ کس وقت میرا بلاوا آ جائے۔ یہاں آنے کے بعد میرے لیے طے شدہ پروگرام میں پہلی تبدیلی کی جا رہی تھی اور میں اسی کا انتظار کر رہا تھا۔ اس سے پہلے بھی جب دشمن نے کسی مقصد کے تحت مجھے قید کیا تو اس نے پہلے سے طے کیے ہوئے پروگرام کے تحت مجھے قید رکھا اور اسی لحاظ سے میرے فرار کی کوشش کو ناکام بنانے کے اقدامات کیے۔ مجھے موقع اس وقت ملا جب پروگرام میں کوئی غیر متوقع تبدیلی آئی۔ یہاں بھی اب تک میں ایک لگے بندھے معمول کے مطابق زندگی گزار رہا تھا اور اس کے لیے کنوروں نے میری نگرانی اور مجھے فرار سے روکنے کا پورا بندوبست کر رکھا تھا۔ اس دوران میں مجھے کوئی موقع نہیں ملا تھا۔ اس لیے میں نے کسی حرکت سے گریز کیا۔ لیکن اب یہ غیر متوقع تبدیلی آئی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر مجھے موقع ملے تو مجھے اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے یا نہیں کیونکہ فرار کی راہ میں اور بھی کئی رکاوٹیں حائل تھیں۔ جیسے کنور پیلس کی سیکورٹی، پھر انڈیا سے فرار ہونا۔ پہلے بھی مجھے وطن واپسی میں بہت سی دشواریاں پیش آئی تھیں اور اب بھی ایسا لگ رہا تھا کہ میں آسانی سے واپس نہیں جا سکوں گا۔

مگر مجھے یہاں سے نکلنا تو تھا۔ ملنے والے موقع سے فائدہ اٹھانا ہی اصل کامیابی ہوتی اور میں موقع کا انتظار کر رہا تھا۔ بارہ بجے میں ہلکی پھلکی ایکسر سائز سے فارغ ہوا تھا کہ دروازہ کھلا اور منشی جی اندر آئے۔ ان کے چہرے پر فکر مند تاثرات تھے۔ انہوں نے آتے ہی بلا تمہید کہا۔ ”کل آپ راج کنور جی سے ملے تھے۔“

”وہ مجھ سے ملا تھا۔“ میں نے تصحیح کی۔

”کیا آج کوئی بات طے ہوئی ہے؟“ انہوں نے غور سے مجھے دیکھا۔

”منشی جی آپ یہ سب راج کنور سے بھی پوچھ سکتے ہیں اور وہ آپ کو بہتر بتا سکتا ہے مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ آج نائیک مجھ سے اپنے ہاتھ پاؤں تڑوائے گا۔“

”نائیک جائے نرکھ میں۔“ منشی جی نے صاف کہا۔ ”مجھے اور بڑے کنور کو آپ کی فکر ہے کہ آپ کو کوئی نقصان نہ ہو۔“

بینائی سے محروم معروف ہستیاں

- ایز موتھ نائٹ...... برطانوی اداکار
- اسٹالیبر یڈلوکمب...... موسیقار
- فرانسسکو لانڈنی...... چودھویں صدی کا اطالوی موسیقار
- برنارڈ مورن...... معروف ریاضی داں
- جون ملٹن (1608-1674)...... معروف شاعر
- جوزف پلیٹو (1801-1883) ماہر طبیعیات (فزکس)
- جوزف پلیٹزر (1847-1911) معروف پبلشر
- مارلا رن یان (حیات-1969) اولمپک لانگ ڈسٹنس رنر
- ایمون ڈی والیرا (1882-1975) صدر آئر لینڈ
- عبدالرحمٰن واحد (حیات-1940) سابق صدر انڈونیشیا

یک چشم معروف ہستیاں

- ٹیکس آوری (1908-1980) بائیں آنکھ سے محروم
- آندرے ڈی ٹوٹ (1912-2002) فلمی ہدایت کار
- لیزا لوپس...... معروف گلوکارہ، بینڈ (ٹی ایل سی)
- کربی یوکٹ (1961) بیس بال کھلاڑی
- یاگو یوجوبے متویاشی (1607-1650) جاپانی لیجنڈ

بینائی سے محروم مصور

- اسیرن ارمغان...... پیدائشی نابینا تھے
- اونر ڈاپومیئر (1808-1879) فرانسیسی مصور، مجسمہ ساز
- فرانسسکو گویا (1746-1828) معروف مصور
- جوشوا رینالڈ (1723-1792) برطانوی مصور
- کلاڈ مونٹ (1840-1926) معروف مصور، آخری ایام میں سرجری سے بینائی واپس ملی۔

مرسلہ: طارق عزیز خان، رحیم یار خان

بڑے کنور کو میری نہیں بلکہ میری رگوں میں دوڑتے خون کی فکر تھی۔ ”اگر راج کنور نے کوئی دھوکا نہ کیا تو امید ہے مجھے خراش بھی نہیں آئے گی۔“

منشی دل جی ہچکچایا۔ ”بڑے کنور کو اسی کی فکر ہے۔ وہ پہلے ہی دیوی جی کی طرف سے دباؤ میں ہیں۔“ بانو اپنے کمرے میں تھی اس لیے منشی جی نے کھل کر بات کی۔ ”آپ کو پتا تو چل گیا ہے کہ دیوی جی کو راج جی نے بلوایا ہے۔“

”اغوا کرایا ہے۔“ میں نے تلخی سے کہا۔ ”تم اس کے جرم پر الفاظ کا پردہ مت ڈالو۔“

منشی جی نے میری بات نظر انداز کی۔ ”بڑے کنور چاہتے ہیں کہ آپ کو کوئی نقصان نہ ہو۔“

”ظاہر ہے، اس دنیا میں وہی میرے سب سے بڑے خیر خواہ ہیں۔ لیکن کیا بہتر نہیں ہوگا کہ وہ یہ سب اپنے برادر خورد سے کہیں، کیونکہ یہ سب اسی کی فرمائش پر ہو رہا ہے۔ مجھے نمائشی مقابلوں کا کبھی شوق نہیں رہا ہے۔“

منشی جی نے اپنی چندیا سہلائی۔ ”راج جی بہ ضد ہیں کہ یہ مقابلہ ضرور ہوگا۔“

”تب میں کیا کر سکتا ہوں۔“ میں نے شانے اچکائے۔ ”بڑے کنور مقابلہ نہیں چاہتے ہیں اور راج کنور چاہتا ہے۔ میں دونوں کے سامنے بے بس ہوں۔“

”بڑے کنور چاہتے ہیں کہ آپ راج جی سے معافی مانگ لیں اس طرح معاملہ نمٹ جائے گا۔“ بالآخر منشی جی نے وہ بات اگل دی جو کہنے آئے تھے۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔

”اس بار میں خود اپنے سامنے بے بس ہوں۔ میں راج کنور سے معافی نہیں مانگ سکتا۔ اگر میرا کوئی قصور ہوتا تب بھی نہیں مانگتا۔“

منشی جی پریشان ہو گئے۔ ”تب کیا ہو سکتا ہے؟“

”نائیک کا کچھ نہ کچھ ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”اگر بڑے کنور کو میری اتنی ہی فکر ہے تو ان سے کہو کہ یہ مقابلہ اپنی نگرانی میں کرا لیں تاکہ راج کنور کو کچھ کرنے کا موقع نہ ملے۔ باقی میں نمٹ لوں گا۔“

بات غالباً منشی جی کی سمجھ میں آ گئی اور وہ عجلت میں رخصت ہو گئے۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ مقابلے کا وقت قریب تھا اور کچھ ہی دیر میں راج کنور کی طرف سے میرا بلاوا آ سکتا تھا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا جب کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور گارڈ کے ساتھ رامن دکھائی دیا۔ اس نے پستول اٹھا رکھا تھا۔ اس کی نال سے مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا لیکن میں نے حرکت نہیں کی۔ اس پر وہ غراتا ہوا اندر آیا۔ ”سنا نہیں تو نے؟“

”ہاں اب تم نے اصلی آواز نکالی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ویسے میں تمہاری طرح اشاروں کا تربیت یافتہ نہیں ہوں اس لیے مجھ سے زبان سے بات کیا کرو۔“

رامن کا چہرہ آگ کی طرح دہکنے لگا تھا اور جب وہ بولا تو اس کے لہجے میں بھی حرارت تھی۔ ”اوئے سور ما اتنا اونچا مت اڑ کہ منہ کے بل گر پڑے۔“

”مشورے کا شکریہ، مجھے اونچا اڑنے کا شوق نہیں لیکن تم جیسے لوگ مجبور کر ہی دیتے ہیں۔“

”آج تمہیں پتا چل جائے گا۔“ اس نے کہا۔ ”چلو نائیک بے چینی سے تمہارا انتظار کر رہا ہے۔“

”وہ میرا نہیں اپنی شامت کا انتظار کر رہا ہے۔“

”زبان کے بجائے ہاتھ پاؤں چلانے کی تیاری کرو۔“ رامن نے کن انکھیوں سے برابر والے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھا۔ ”یہاں بھی اسے ساتھ ہی رکھا ہے۔“

”افسوس میں غلط سمجھ رہا تھا کہ بانو پر تمہاری نظر ہے۔ اس پر تو تمہارے آقا کی نظر نکلی۔ لیکن تسلی رکھو وہ اسے بھی نہیں ملے گی۔“

”یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔“ وہ بولا۔ ”وہ راج جی کے بعد مجھے ملے گی۔“

”اچھا تم شروع سے جھوٹا اور بچا کچا کھانے کے عادی ہو۔“ میں نے اپنا طیش دباتے ہوئے کہا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

”بس اب چلو۔“ اس نے پستول تان لیا۔ ”کوئی غلط حرکت مت کرنا ورنہ....“

”تم مجھے شوٹ کر دو گے؟“ میرا انداز طنزیہ ہو گیا۔ ”اگر مجھے مار دیا تو اپنے آقا کو کیا جواب دو گے۔“

”تمہیں مارنے پر پابندی ہے لیکن اگر میں تمہارے گھٹنے پر ایک فائر کر دوں تو باقی عمر لنگڑے بھگے کی طرح چلو گے۔“

”اوکے۔“ میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”چلتا ہوں۔“

رامن مجھے لے کر محل کی عمارت سے باہر آیا۔ موسم

مزید خوشگوار ہو گیا تھا کیونکہ مئی کا آغاز تھا۔ میدانوں میں اس وقت یقیناً شدید گرمی پڑ رہی ہو گی لیکن یہاں تقریباً سات ہزار فٹ کی بلندی پر موسم ابھی بھی سرد تھا۔ رات کو اچھا خاصی سردی ہو جاتی تھی اور دن خوشگوار ہوتا تھا یوں سمجھ لیں جیسے مری اور بھوربن کا موسم ہوتا ہے۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی مگر اس میں چبھتی کیفیت نہیں تھی۔ مجھے محل کے مخصوص باغ میں لایا گیا۔ مجھے یاد آیا کہ یہیں میں نے پہلی بار سعدیہ کو دیکھا تھا۔ جب میں گارڈ کی نگرانی میں چہل قدمی کر رہا تھا اور اس نے ایک دیوار کے اوپر سے جھانکا تھا۔ اس نے سوچا بھی نہیں ہوگا کہ میں اس وقت اس کے بھائیوں کے قبضے میں تھا اور وہ ایک بار پھر میرا خون نکال رہے تھے۔ سعدیہ کے ساتھ دوسرے یاد آئے جن کو یاد کرنے سے گریز کر رہا تھا کیونکہ جب اپنوں کو یاد کرتا تو اندر سے ایک وحشت ابھرتی تھی اور دل چاہتا کہ تمام زنجیریں توڑ کر ان لوگوں کے پاس پہنچ جاؤں۔ اس لیے آج کل میری کوشش ہوتی تھی کہ انہیں یاد نہ کروں۔

محل کا خاندان کے لیے مخصوص باغ کچھ انوکھا تھا۔ اس میں دائرے میں مختلف سطحوں والے گھاس، پھولدار پودوں اور آرائشی درختوں کے تختے تھے۔ نیم دائرے میں سیڑھیاں اوپر چڑھتی اور نیچے اترتی تھیں۔ ہر تختے کے گرد دو سے تین فٹ اونچی اور فٹ بھر موٹی سفید پتھروں سے دیوار بنائی گئی تھی۔ مقابلے کے لیے اکھاڑا ایک ایسے ہی تختے کو منتخب کیا تھا۔ تقریباً تیس فٹ قطر کے دائرے میں سوائے بہت سبز اور نفیس گھاس کے کچھ نہیں تھا اس کے ایک طرف تقریباً چھ فٹ اونچی دیوار تھی جو دونوں طرف دائرے میں کم ہوتی ہوئی مخالف سمت میں تین فٹ رہ گئی تھی۔ چھ فٹ والی دیوار کے پیچھے راج کنور موجود تھا جب کہ نیچے نائیک صرف ایک شارٹ میں کھڑا تھا۔ اس کا مضبوط جسم شاید کسی تیل کی مالش سے چمک رہا تھا اور پٹھے بہت نمایاں ہو رہے تھے۔ میں چونکا کیونکہ چھ مہینے پہلے والے نائیک کے مقابلے میں وہ بہت مختلف لگ رہا تھا۔ اس کا جسم نہ صرف متناسب اور مضبوط ہوا تھا بلکہ اس کا کھڑے ہونے کا انداز بتا رہا تھا کہ اس نے فن حرب میں بھی دسترس حاصل کی تھی۔

”شہباز ملک۔“ راج کنور نے گونجتی سی آواز میں کہا۔ ”آج تمہیں پتا چلے گا کہ روپے میں کتنے آنے ہوتے ہیں۔“

میں مسکرایا۔ ”تم نے ثابت کیا کہ تم بنیا قوم سے تعلق رکھتے ہو۔ کاش کہ تم خود میرے سامنے آتے لیکن نائیک بھی برا نہیں ہے اگر یہ ٹوٹ پھوٹ جائے تو برا مت ماننا۔“

”یہ زبان بہت چلاتا ہے۔“ رامن نے گویا شکایت کی۔

”فکر مت کرو آج کے بعد یہ سب چلانا بھول جائے گا۔“ راج کنور نے سفاک لہجے میں کہا۔ ”شہباز ملک تم

ایک ہزار سال قبل مسیح تک نابیناؤں کے پڑھنے یعنی حروف شناسی کا طریقہ Braille System ابھی دریافت نہیں ہوا تھا کہ ہومر اس سے استفادہ کرتا۔ یہ تو بھلا ہو پیرس کے ایک 43 سالہ لوئی بریل کا جس نے اپنی زندگی کی پچیسویں بہار (1834) میں چھ لفظوں کی مدد سے حروف اور ہندسوں کو چھو کر پڑھنے کا ایسا نایاب طریقہ دریافت کیا کہ نابیناؤں کی زندگی میں بہار آ گئی۔ ایسی بہار جس سے کبھی کبھی بینا افراد بھی محروم رہ جاتے ہیں اگر لوئی بریل آج سے 174 سال قبل بریل سسٹم دریافت نہ کرتا تو ممکن ہے شہرہ آفاق اندھی، بہری اور گونگی امریکی خاتون ہیلن کیلر کے ساتھ ساتھ ہزاروں افراد قدرت کی نعمتوں سے بھرپور فائدہ نہ اٹھا سکتے۔ ہیلن نے ساری دنیا کے نابیناؤں کی معذوری ختم کرنے کے لیے ادارے قائم کیے اور کئی زبانیں سیکھیں۔ پاکستان کے پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال نے پاکستان میں نابیناؤں کی فلاح و بہبود کے اداروں کے قیام کے ساتھ ساتھ ان کے مسائل اور جذبات سے معاشرے کو آگاہ رکھنے کے لیے سترہ سال پہلے باقاعدہ ماہنامہ ”سفید چھڑی“ کا اجراء کیا جو بینا افراد کی تربیت کا بھی کردار نبھا رہا ہے۔ اور بھی بہت سے نابیناؤں نے بریل سسٹم سے تعلیم حاصل کی اور ناموری پائی۔

مرسلہ: محمد ایاز راہی، مانسہرہ

نائیک سے مقابلے کے لیے تیار ہو؟''

''اگرچہ میں ایسی احمقانہ حرکتوں میں نہیں پڑتا ہوں لیکن تم نے مجبور کر ہی دیا ہے تو.....'' میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر شانے اچکائے۔

''یہ مقابلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک تم دونوں میں سے کوئی ایک ہار نہیں مان لیتا یا پھر مقابلے کے قابل نہیں رہتا.....''

میں نے ہاتھ اٹھایا۔ ''راج کنور شرائط بیان کرنے کے بجائے اپنے اس پلّے سے کہو کہ مجھے قتل کرنے کی کوشش کرے باقی سب بیکار ہے۔''

راج کنور کا رنگ بدلا تھا کیونکہ میں نے بلاواسطہ اسے کتا قرار دیا تھا مگر اس نے اپنی بے عزتی کو نمایاں کرنے کے بجائے پی جانے کا فیصلہ کیا اور بولا۔ ''تم خود اجازت دے رہے ہو؟''

''ہاں۔''

راج کنور نے غضب ناک ہو کر نائیک کی طرف دیکھا۔ ''نائیک تو نے سن لیا اب اگر یہ مارا بھی گیا تو تجھ پر کوئی دوش نہیں ہے۔''

میں نے محسوس کیا کہ میرے معاملے میں راج کنور بڑے کنور کو بھی بائی پاس کر رہا تھا۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ میرا خون اس کے بھائی کے علاج کے لیے لازمی ہے۔ کیا دونوں بھائیوں میں کوئی کھٹ پٹ ہوتی تھی؟ یا راج کنور کی نیت خراب ہو گئی تھی اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ بڑا کنور صحت یاب ہو؟ اپنی بیماری کی وجہ سے بڑا کنور عملی زندگی سے دور تھا اور جاگیر کا سارا کام راج کنور کے ہاتھ میں تھا۔ ممکن ہے وہ مالک نہ ہو کیونکہ یہودیوں کی طرح ہندوؤں میں بھی بڑے بیٹے کو ساری دولت اور کاروبار کا وارث بنانے کا رواج ہے تاکہ دولت ایک ہی جگہ رہے۔ راج کنور اگر مالک نہیں بھی تھا تو عملاً مالک کے اختیارات وہی استعمال کر رہا تھا اور اس کا بھی امکان تھا کہ بڑا کنور مر جاتا تو وہی مالک ہوتا۔ اس لیے بڑے کنور کا ٹھیک ہونا اس کے مفاد میں نہیں تھا۔

میں سوچ میں تھا اور نائیک نے مجھے غافل سمجھ کر اچانک حملہ کیا۔ وہ میرے نزدیک آیا اور اس نے گھونسا مارنے کی کوشش کی۔ یہ بڑا جاندار وار تھا اگر میرے منہ پر لگتا تو یقیناً مجھے دن میں تارے نظر آجاتے لیکن میں نے سر ایک طرف کر کے اس کا وار ناکام کیا اور میرا گھٹنا اس کے پیٹ میں لگا۔ میں نے جان بوجھ کر زیرِ ناف نہیں مارا تھا ورنہ یہ مقابلہ اسی وقت ختم ہو جاتا۔ نائیک کراہ کر پیچھے گیا۔ مگر فوراً ہی سنبھل گیا تھا۔ اگلے چند واروں سے پتا چلا کہ اس نے خاصی محنت کی تھی۔ وہ فری اسٹائل لڑ رہا تھا۔ اسے اسٹریٹ فائٹنگ تو نہیں کہہ سکتے مگر کچھ ایسا ہی انداز تھا۔ خود میں کسی خاص انداز میں لڑنے کے بجائے اسی انداز کو ترجیح دیتا ہوں۔ ایک مخصوص انداز میں لڑنے سے مخالف اس انداز کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔

جیسے جوڈو اور کراٹے میں حملے سے زیادہ سیلف ڈیفنس کو اہمیت دی جاتی ہے۔ ان میں جارحیت کا عنصر کم ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں تائی کوانڈو اور کنگ فو جارحانہ انداز ہیں۔ خاص طور سے کنگ فو مہلک ہے اس کے بیشتر وار موت کے گھاٹ اتارنے والے ہوتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی ان میں سیلف ڈیفنس کمزور ہوتا ہے۔ ان کا اصل دفاع ان کی جارحیت ہوتی ہے۔ مخالف ان ہی باتوں کا فائدہ اٹھاتا ہے۔ لیکن فری اسٹائل میں اس کا عنصر کم ہوتا ہے۔ اس میں ہر حربہ اور ہر داؤ چلتا ہے۔ بس آدمی کا دماغ اور اس کے ریفلکسز بھی تیز ہونے چاہئیں۔ سب سے اہم بات فری اسٹائل میں چوٹوں کی پروا نہیں کی جاتی ہے جب کہ باقی مخصوص انداز میں لڑنے والوں کی زیادہ توجہ خود کو بچانے پر ہوتی ہے۔ میں نے دیکھا نہیں لیکن سنا ہے کہ اگر فری اسٹائل لڑنے والا تیز طرار ہو تو وہ کسی بھی انداز کے لڑنے والے ماہر ترین فرد کو بھی شکست دے سکتا ہے۔

ایک وار کے بعد ہی نائیک کا سانس تیز چلنے لگا تھا جو اس بات کی نشانی تھی کہ وہ شراب یا اسی قسم کا کوئی نشہ کرتا تھا۔ پے در پے کئی ناکام واروں کے بعد وہ جھنجلانے لگا تھا۔ میں نے اب تک خود سے کوئی وار نہیں کیا تھا اسی کے وار ناکام بناتے ہوئے اسے کچھ چوٹیں لگائی تھیں۔ میں راج کنور اور اس کے پیچھے کھڑے رامن پر بھی نظر رکھے ہوئے تھا۔ ان لوگوں کا کوئی بھروسا نہیں تھا کہ عقب سے وار کر جاتے۔ اچانک راج کنور نے کہا۔ ''اس طرح ہاتھ پیروں کی لڑائی میں فیصلہ دیر سے ہوگا کیوں نہ لاٹھیوں سے لڑائی کی جائے؟''

میں اور نائیک رک گئے تھے۔ نائیک نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ''میں تیار ہوں۔''

یہ پہلے سے طے شدہ پلان تھا۔ پہلے میں نے سوچا کہ انکار کر دوں مگر نائیک تیار تھا۔ اب میں پیچھے ہٹتا تو یہ بھی ان کی فتح ہوتی اس لیے میں نے شانے اچکائے۔ ''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ بلکہ اچھا ہے اب مجھے اس کے گندے جسم کو ہاتھ نہیں لگانا پڑے گا۔''

رامن نے پاس موجود لاٹھیاں ہماری طرف اچھال دیں۔ میں نے نوٹ کیا کہ اس نے خاص طور سے ہمیں لاٹھیاں دی تھیں یعنی جو نائیک کو دینی تھی وہ اسی کی طرف اچھالی اور دوسری میری طرف پھینکی تھی اور انداز دینے والا نہیں بلکہ پھینک کر مارنے والا تھا۔ گھومتی لاٹھی پکڑنے سے میری ہتھیلی پر چوٹ آئی تھی۔ مجھے اس سے پہلے بھی لاٹھی سے لڑنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اگر میں نے اسے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا بھی تھا تو عام سے انداز میں۔ لیکن نائیک نے لاٹھی پکڑتے ہی جس طرح اسے گھما کر اور نچا کر دکھایا تھا اس سے پتا چل گیا کہ وہ لاٹھی کے استعمال کا ماہر تھا۔ یہ مضبوط بانس کی ہلکی اور پانچ فٹ لمبی لاٹھیاں تھیں مگر ان کی چوٹ یقیناً سخت ہوتی۔ البتہ ان سے ہڈی توڑنا مشکل تھا کیونکہ وزن نہیں تھا البتہ گوشت اور پٹھوں کا حشر کیا جا سکتا تھا۔ جیسے ہی نائیک نے لاٹھی گھمائی میں محتاط ہو گیا تھا۔ وہ مسکرایا تو اس کے دانت وحشیانہ انداز میں باہر نکل آئے تھے۔

اس نے اچانک تیزی سے گھما کر لاٹھی ماری تو میں نے بمشکل اس کا وار روکا اور فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ اس کی لاٹھی خاصی وزنی تھی ورنہ اس قوت سے وار نہیں لگتا۔ میری لاٹھی لرز کر رہ گئی تھی۔ اگر میں وار براہ راست روکتا تو یہ ٹوٹ بھی سکتی تھی۔ مگر میں نے وار ترچھا روکا تھا اس لیے بچت ہو گئی۔ تو ان لوگوں کا اصل پلان یہ تھا۔ راج کنور بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ نائیک دوبدو مقابلے میں میرے سامنے نہیں ٹھہر سکتا تھا اور لاٹھی سے لڑائی میں وہ مجھ پر حاوی ہو جاتا۔ پھر لاٹھیوں میں بھی فرق تھا۔ نائیک کو جو لاٹھی دی گئی تھی وہ کہیں زیادہ مضبوط اور وزنی تھی۔ جب کہ مجھے دی جانے والی لاٹھی ہلکی اور کمزور تھی۔ اگرچہ دیکھنے میں دونوں ایک جیسی ہی لگ رہی تھیں۔ پہلے وار کے بعد

ثابت بن قرہ ماہرِ ریاضیات، طبیب اور فلسفی تھے۔ حران میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک اونچے خاندان کے فرد تھے۔ ابتدائی عمر میں صرّاف تھے۔ قیامِ بغداد کے دوران میں انہوں نے فلسفہ اور ریاضی میں مہارت حاصل کی۔ محمد بن موسیٰ انہیں اپنے ہمراہ بغداد لے گیا اور خلیفہ معتضد کی خدمت میں پیش کیا۔ خلیفہ نے اپنے درباری منجموں میں شامل کر لیا۔ بغداد میں ثابت کا بیشتر وقت یونانی علماء کی تصانیف کے ترجمے اور شرح نویسی میں گزرا۔ اس کے علاوہ انہوں نے خود بھی ریاضی میں کتابیں لکھیں۔ فلسفے کا مطالعہ اور مطب کا شغل بھی جاری رکھا اور بغداد ہی میں 26 صفر 288ھ۔ 18 فروری 901ء میں انتقال کیا۔

خلیفہ کے دربار میں ثابت کی بارسوخ شخصیت سے صابیوں کو بہت فائدہ پہنچا۔ ثابت کی سریانی تصانیف جو انہوں نے غالباً حران ہی میں اپنے ہم مذہبوں کے عقائد اور طریق عبادت کے متعلق لکھی تھیں وہ آج کل ناپید ہیں۔ ابن العبری کو جس نے تیرہویں صدی میں انتقال کیا، ان کتب کے متعلق ایک حد تک معلومات تھیں۔ ثابت کی عربی تصانیف کی فہرستیں خودل زون، زوٹر، شٹائنشائڈر، براکلمان اور ویڈیمان نے اپنی کتب میں دی ہیں۔ بہت سا قیمتی اور قابلِ اشاعت مواد اب بھی مخطوطات میں موجود ہے۔

مرسلہ: عدنان احمد، شیخوپورہ

نائیک لاٹھی اپنے دائیں بائیں گھمانے لگا۔ اس طرح یہ اندازہ کرنا دشوار تھا کہ وہ کس طرف سے وار کرے گا۔ میں نے لاٹھی درمیان سے تھام لی اس طرح میں دونوں طرف سے وار روک سکتا تھا۔

''سنبھل کر میاں۔'' نائیک نے کہا اور دائیں طرف سے وار کیا لیکن یہ دھوکا تھا۔ میں نے دفاع کرنا چاہا تو اس نے لاٹھی کا رخ گھماتے ہوئے بدلا اور میرے بائیں پہلو پر وار کیا۔ بچاتے ہوئے بھی لاٹھی کولہے سے ذرا اوپر لگی تھی اور درد کی ایک لہر سی اٹھی تھی۔ فوراً ہی اس نے پیروں پر وار کیا

اور میں بچنے کی کوشش میں نیچے گرا تھا۔ اس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر میرے سر پر وار کرنا چاہا حالانکہ گرے فریق پر وار کرنا کسی بھی لڑائی میں بدترین حرکت تصور کی جاتی ہے۔ میں نے سر بچانے کے لیے لاٹھی سامنے کی تو وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا لاٹھی درمیان سے دو ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ نائیک نے دوسرا وار کرنا چاہا تو میں نے اس کے پیر پر ٹھوکر ماری۔ ایڑی کا یہ وار کارگر ثابت ہوا اور وہ لڑکھڑا کر پیچھے گیا تھا۔ اس دوران میں مجھے اٹھنے کا موقع مل گیا تھا۔

لاٹھی ٹوٹ کر دو حصوں میں بٹ گئی تھی۔ میں نے انہیں تولا اور مجھے لگا کہ اب میں انہیں زیادہ بہتر انداز میں استعمال کر سکتا تھا۔ پیچھے ہٹنے کے بعد نائیک دوبارہ لاٹھی گھماتا میری طرف آیا لیکن میں نے لاٹھی کے بجائے اس کی آنکھوں پر نظر رکھی۔ وہ میرے دائیں پاؤں کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس نے بائیں کا جھکاوا دے کر لاٹھی دائیں پاؤں پر مارنا چاہی تھی، میں تیار تھا۔ جیسے ہی اس کی لاٹھی حرکت میں آئی میں اپنی جگہ سے اچھلا اور ساتھ ہی بایاں ہاتھ پوری قوت سے گھمایا۔ نائیک لاٹھی گھما چکا تھا اس وار کے پیچھے اس کی ساری قوت تھی اور پھر لاٹھی کا وزن بھی تھا۔ یقیناً اس کا مقصد میری پنڈلی توڑنا تھا۔ اس کا وار کارگر ہوتا تو مقابلہ یہیں ختم ہو جاتا۔ لاٹھی میرے پیروں کے نیچے سے گزری اور زور میں گھومتے ہوئے نائیک کا سر میرے سامنے تھا۔ میرے دائیں ہاتھ میں موجود لاٹھی کا ٹکڑا اسپرنگ سے نکلے ہوئے انداز میں لپکا اور اس کے سر سے ٹکرایا۔

نائیک چیخ مار کر پیچھے ہوا۔ کنپٹی سے اس کا سر پھٹ گیا تھا اور یقیناً اسے دن میں تارے نظر آ گئے تھے۔ ممکن ہے کوئی باظرف حریف ہوتا تو میں خود اسے سنبھلنے کا موقع دیتا لیکن نائیک جیسے گھٹیا آدمی کو موقع دینا بالکل مناسب نہیں تھا۔ اس لیے میں نے فوراً ہی اس کے بازو اور پسلیوں پر وار کیے۔ دو لاٹھیوں کا فائدہ یہ ہوا کہ میں الگ الگ جگہوں پر تیزی سے وار کرنے کے لیے آزاد تھا۔ میرے ہاتھ مشین کی طرح چل رہے تھے۔ لاٹھی کے دونوں ٹکڑے نائیک کے سر، جسم اور ہاتھ پیروں پر اتنے تواتر سے پڑ رہے تھے کہ اسے دفاع کرنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ اس کے بجائے ہر ضرب پر اس کی مدافعت کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ ایک کے بعد ایک زخم اس کے جسم اور چہرے پر نمودار ہو رہا تھا۔ میری لاٹھی کو دو ٹکڑے کر کے اس نے خود یہ آفت مول لی تھی۔ کچھ دیر بعد اس کے ہاتھ لاٹھی سنبھالنے کے قابل بھی نہیں رہے تھے۔ وہ اسے پھینک کر ہاتھوں سے اپنا دفاع کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر میرے سامنے یہ بہت مشکل کام تھا۔ اب وہ چیخ و پکار پر اتر آیا تھا اور اپنے مالک کو دہائیاں دے رہا تھا کہ وہ اسے بچائے۔ راج کنور کا چہرہ سپاٹ تھا مگر آنکھوں میں جیسے انگارے دہک رہے تھے ایک بار میں نے نائیک کے سر کو نشانہ بنایا تو راج کنور کی آواز آئی۔ ”بس شہباز رک جاؤ۔“

میرا دل بھی بھر گیا تھا۔ نائیک کی کوئی ہڈی تو نہیں ٹوٹی تھی لیکن وہ اب کم سے کم ایک ہفتہ بیڈ پر دراز ہی رہتا۔ میں نے آخری بار اس کے گھٹنے پر وار کیا اور مڑ کر راج کنور کی طرف دیکھا جو اب اپنے ہونٹ چبا رہا تھا اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ بذات خود میرا خون پی جائے۔ اسے توقع نہیں تھی کہ نائیک ایک بار پھر یوں مجھ سے آسانی سے مار کھا جائے گا۔ نائیک گھاس پر پڑا ہوا کتے کی طرح رونے کے انداز میں کراہ رہا تھا۔ راج کنور نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور پھر ایک جھٹکے سے مڑ کر وہاں سے چلا گیا۔ رامن کے تاثرات بھی اچھے نہیں تھے۔ اس نے مڑ کر کسی کو اشارہ کیا۔ چند لمحے بعد اوپر سے دو ملازم نیچے آئے اور نائیک کو سہارا دے کر وہاں سے لے گئے۔ انہوں نے اس کی اور میری لاٹھی کے ٹکڑے بھی اٹھا لیے تھے۔ اس دوران میں رامن پستول لیے چوکنا کھڑا رہا تھا۔ نائیک کے جانے کے بعد وہ نیچے اتر آیا اور میرے قریب آ کر زہریلے انداز میں بولا۔ ”اس کامیابی پر اکڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کبھی مجھ سے واسطہ پڑا تو......“

”تم بھی آ جاؤ۔“ میں نے اس کی بات کاٹی۔ ”میری سمجھ میں تم لوگ نہیں آئے ہو۔ مجھ سے بلاوجہ کی دشمنی پالی ہے۔ خود سے مقابلے کرا رہے ہو اور جب تمہارا آدمی پٹتا ہے تو روتے بھی ہو۔“

رامن نے میری پیشکش کا کوئی جواب نہیں دیا اور بولا۔ ”اب چلو۔“

وہ مجھے واپس کمرے تک لے آیا۔ میری کمر جہاں لاٹھی لگی تھی، دکھ رہی تھی اور چلنے کے دوران اس میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں لیکن میں نے رامن کے سامنے ظاہر نہیں کیا تھا۔ کمرے میں بانو میری منتظر تھی۔ اس نے بے قراری سے پوچھا۔ ”یہ لوگ آپ کو بے وقت کہاں لے گئے تھے؟“

میں نے بانو کو مقابلے کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ وہ پریشان ہو جاتی۔ میں نے واش روم کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ”بتاتا ہوں۔“

واش روم میں آ کر میں نے ٹی شرٹ اتاری اور آئینے میں کمر کا معائنہ کیا۔ تقریباً چھ انچ لمبا سیاہ نشان بتا رہا تھا کہ اندر گوشت پھٹ گیا تھا اور خون جم گیا تھا۔ میں نے کپڑے اتار کر ٹب میں کسی قدر تیز گرم پانی بھرا اور اس میں کمر ڈبو کر بیٹھ گیا۔ اس سکائی سے بڑا سکون ملا تھا۔ جب درد کم ہو گیا تو میں نے دوبارہ آئینے میں کمر کا معائنہ کیا۔ نشان ہلکا پڑا تھا مگر موجود تھا اور درد بھی باقی تھا۔ میں باہر آیا تو بانو دل نواز سے کھانا لگوا رہی تھی۔ کھانے کے دوران میں نے اسے نائیک سے مقابلے کی مختصر روداد سنائی۔ وہ پریشان ہو گئی۔ ”یہ کیا جہالت ہے.... اس طرح کے مقابلے تو کسی زمانے میں ہوتے تھے۔“

”تم کن خیالوں میں ہو؟“ میں نے نوالہ چباتے ہوئے کہا۔ ”رومن دور گزر گیا ہے لیکن انسانوں کے درمیان خونریز معرکے آج بھی کرائے جاتے ہیں۔ اب تو باقاعدہ ٹورنامنٹ ہوتے ہیں جن میں آدمی اپنے فریق کو موت کے گھاٹ اتار سکتا ہے اور بعض اوقات تو زندہ بچنے والا ہی فاتح ہوتا ہے۔“

بانو کانپ گئی۔ ”ایسا بھی ہوتا ہے۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”اس سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ پہلے لوگ زندگی کے لیے لڑتے تھے اور اب پیسے کے لیے لڑتے ہیں۔ جو فاتح ہوتا ہے وہ اتنا حاصل کر لیتا ہے کہ پھر اسے ساری عمر کچھ کرنے کی ضرورت نہیں رہتی ہے۔“

”آپ کو چوٹ تو نہیں آئی۔“

”کمر پر ایک لاٹھی لگی تھی۔ درد تھا مگر سکائی کے بعد بہتر ہے۔“

”مجھے دکھایئے گا۔“ بانو نے کہا۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے ایک دو دن میں ٹھیک ہو جائے گا۔“

”نہیں اگر چوٹ زیادہ ہے تو میرے واش روم میں میڈیسن ہیں ان میں بام رکھا ہے۔“

میں نے سر ہلایا۔ کھانے کے بعد بانو نے اصرار کیا تو میں نے اسے کمر دکھائی وہ فکر مند ہو گئی۔ ”آپ اسے معمولی چوٹ کہہ رہے ہیں۔ نیل پڑ گیا ہے اور گوشت ابھر آیا ہے۔“

”دیکھنے میں لگ رہا ہے مگر اتنا خطرناک نہیں ہے۔“

”نہیں آپ لیٹیں میں بام لگاتی ہوں۔“ اس نے اتنے اصرار سے کہا کہ مجھے انکار کرنا مناسب نہیں لگا تھا۔ میں بستر پر اوندھے منہ لیٹ گیا اور وہ بام لے آئی۔ نہ جانے بام بہت پر اثر تھا یا اس کی نرم انگلیوں میں مسیحائی کی تاثیر تھی۔ مجھے ایسا لگا کہ میرا درد کھنچ کر نکل رہا ہو — وہ گھٹنے ٹیک کر بستر کے پاس بیٹھی تھی۔ مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا اس لیے چاہنے کے باوجود اسے بس کرنے کو نہ کہہ سکا۔ اس نے خود کچھ دیر بعد پوچھا۔ ”اب کیسا محسوس کر رہے ہیں۔“

”بہت اچھا۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”نہیں ابھی لیٹے رہیں۔ اس سے زیادہ فائدہ ہو گا۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ”میں گرم پانی کی بوتل لاتی ہوں اس کی سکائی سے درد جلد ختم ہو جائے گا۔“

میں ایک بار پھر اوندھے منہ لیٹ گیا۔ وہ ربر کی بوتل میں گرم پانی بھر کر لائی اور اسے میری کمر پر رکھ کر اوپر سے کشن رکھ دیا۔ وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ ”میں تو سوچ رہی تھی کہ اب آپ سے دوستانہ مقابلہ کر کے براہ راست سیکھوں گی مگر آپ کو چوٹ لگی ہے۔“

”کوئی بات نہیں تم اپنی مشقیں جاری رکھو۔ میں ایک دو دن میں ٹھیک ہوتے ہی تمہاری تربیت شروع کرتا ہوں۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”لیکن بانو ایک بات یاد رکھو صرف دفاع ہی سب کچھ نہیں ہوتا ہے، آدمی کو حملہ کرنا بھی آنا چاہیے۔ دوسرے کو تکلیف پہنچانا اور ضرورت پڑنے پر قتل کرنا آسان کام نہیں ہے اس میں بڑا دل گردہ چاہیے ہوتا ہے۔ مگر بعض اوقات ایسا کرنا پڑتا ہے۔“

”قتل کرنا پڑتا ہے؟“ وہ گھبرا کر بولی۔

”اگر تمہاری عزت پر بن آئے تو کیا تم قتل نہیں کرو گی؟ تمہارے پاس بچنے کا اور کیا راستہ ہو گا؟“

اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ بے شک وہ سیلف ڈیفنس کی تربیت لے رہی تھی اور خود کو مضبوط بھی بنایا تھا لیکن بنیادی طور پر ایک نرم خو اور نازک لڑکی تھی۔ اپنی فطرت کے خلاف یہ سب کرنا اس کے لیے آسان کام نہیں تھا اور میں محسوس کر رہا تھا کہ جلد اس پر وہ وقت آنے والا تھا جب اسے

انتخاب کرنا پڑتا۔ اسی لیے میں اس کی جسمانی تربیت کے ساتھ ذہنی تربیت بھی چاہتا تھا۔ میری کوشش تھی کہ وہ خود اپنی حفاظت کی اہل ہو جائے۔ اگر کبھی اس کی عزت کے لیے خطرہ پیدا ہو تو وہ اس کا تدارک کر سکے۔ عام بے بس لڑکیوں کی طرح ہتھیار نہ ڈال دے۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں ایسا نہیں کر سکتی۔''

''تمہیں یہی کرنا ہوگا۔ دیکھو جسمانی مضبوطی اور سیلف ڈیفنس بھی اہم ہے بالکل کسی جدید پستول یا رائفل کی طرح۔ لیکن جب تک آپ اسے استعمال کرنے کی ہمت اور حوصلہ نہیں کرو گی یہ بیکار ہوں گے۔ دفاع لا حاصل ہے۔ فرض کرو کوئی تم پر حاوی ہونا چاہتا ہے اور تم صرف دفاع کرتی رہو گی تو اس سے کچھ نہیں ہوگا۔ تم جارح کو موقع دو گی کہ وہ مسلسل جارحیت کرتا رہے، اسے روکنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اسے مار دیا جائے یا اسے ناکارہ کر دیا جائے۔''

''میں ....'' اس نے تھوک نگل کر کہا۔ ''کیسے کر سکوں گی؟''

''سب سے پہلے تو خود کو ذہنی طور پر تیار کرو۔ اس کے بعد کا مرحلہ آسان ہے۔ تمہاری کمزوری کیا ہے تم ایک نازک لڑکی ہو لیکن ساتھ یہی چیز تمہاری طاقت بھی ہے۔ ایک مرد اس سے آسانی سے دھوکا کھا جاتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ عورت اس پر مہلک وار نہیں کر سکے گی اور جب وہ اس پر وار کرتی ہے تو مرد اپنا دفاع کرنے کے قابل نہیں رہتا ہے۔''

بانو کا تذبذب دور ہو گیا تھا اور اس نے پہلی بار... دلچسپی سے پوچھا۔ ''مہلک وار کیسے کرتے ہیں۔''

میں سکائی کے بعد بہتر محسوس کر رہا تھا اس لیے اٹھ گیا۔ ''آؤ تمہیں بتاتا ہوں۔''

میں اور بانو آمنے سامنے آئے۔ میں نے بانو کی گردن پر نرخرے اور پھر بائیں شانے سے نیچے دل سے ذرا اوپر اشارہ کیا۔ ''یہ ڈیتھ پوائنٹ ہیں۔ ان پر اگر صحیح انداز اور قوت سے وار کیا جائے تو اچھا طاقتور مرد بھی موت کے گھاٹ اتر جاتا ہے۔ اب دیکھو وار کیسے کرتے ہیں۔ وار ہمیشہ توازن اور قوت کا نام ہے۔ انسان بنیادی طور پر کمزور جسم کا مالک ہے اس لیے اسے جارحیت کرتے ہوئے ہمیشہ اپنے جسم کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ اسے نقصان نہ ہو اور وار بھی موثر ہو۔''

میں اسے سکھانے لگا کہ نرخرے اور دل سے اوپر جو شریان دماغ کی طرف خون لے جاتی ہے یہ صرف دماغ کو نہیں بلکہ جسم کے دوسرے اہم اعضا کو بھی خون فراہم کرتی ہے اور یہ جلد کے پاس ایسی جگہ ہے جہاں اسے پٹھوں اور گوشت کی مناسب آڑ میسر نہیں ہے اس لیے اس پر قوت سے وار کیا جائے تو یہ پچک جاتی ہے، زخمی ہونے سے اس پر سوجن آتی ہے اور خون کی روانی رک جاتی ہے۔ اسی طرح نرخرہ بہت نازک مقام ہے۔ اس میں سانس کی نالی اور آواز کا تار ہوتا ہے۔ اگر اس پر ٹھیک سے وار کیا جائے تو یہ پچک جاتا ہے۔ آدمی کی سانس رک جاتی ہے اور اگر نرخرہ زیادہ متاثر ہو تو سانس رکنے سے چند منٹ میں موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔'' میں عمل کے ساتھ زبانی بھی بانو کو سمجھا رہا تھا۔

''اگر ایک عورت یہ وار کرے تو اس کے لیے بہت ضروری ہے کہ مرد کو غافل رکھ کر کرے۔ ورنہ وہ جسم سخت کر لے گا اور وار اتنا موثر نہیں رہے گا۔''

لیکچر کے بعد میں نے اسے پریکٹس کے ذریعے سمجھایا۔ ایک گھنٹے میں وہ خاصی حد تک سمجھ گئی تھی۔ میں نے پنچنگ پر دونوں مقامات کا اسکیچ بنا کر بانو سے کہا کہ وہ اس پر مشق کرے۔ کھڑے رہنے سے چوٹ والی جگہ پر درد ہونے لگا تھا مگر یہ بہت زیادہ نہیں تھا۔ بہر حال میں نے اس دن ایکسر سائز کے بجائے آرام کرتے ہوئے ٹی وی کے سامنے وقت گزارا تھا۔ میری جگہ بانو نے ایکسر سائز اور میری بتائی ہوئی مشقیں کی تھیں۔ وہ کچھ زیادہ ہی فکر مند ہو گئی تھی اور میرے خیال میں یہ بہتر تھا۔ وہ جتنی جلدی سیکھتی اور اپنے دفاع کے قابل ہوتی اس کے لیے اچھا ہوتا۔ ہم دشمن کی قید میں تھے اور کب برا وقت آ جائے کچھ پتا نہیں تھا۔ اگرچہ یہ سب اس کے تحفظ کی ضمانت نہیں تھی۔ مرد شہ زور ترین عورت کو بھی قابو اور بے بس کر سکتا ہے۔ دس حربے ہیں لیکن کچھ ہونا آپ کے لیے نقصان دہ نہیں ہے جتنا کہ نہ ہونا۔

بانو نے ایکسر سائز کے لیے اوشا سے اپنے لیے ڈھیلا ڈھالا لباس منگوا لیا تھا جیسا کہ جوڈو کراٹے کھیلنے والے پہنتے ہیں۔ اس میں وہ آرام سے سب کرتی تھی اور اسے یہ خدشہ بھی نہیں ہوتا تھا کہ جسم نمایاں ہوگا۔ میں نے دیکھا کہ وہ اس معاملے میں بہت احتیاط کرتی تھی۔ مجھے اس کی یہ بات بہت اچھی لگی تھی۔ اتنے دن سے ساتھ رہنے کے باوجود وہ نہ تو ایک حد سے زیادہ بے تکلف ہوئی تھی۔ بلکہ اس کا انداز ادب آمیز سنجیدہ ہی ہوتا تھا دوسرا وہ اوڑھنے چھپنے کا پورا خیال رکھتی تھی۔ بلا ضرورت میرے کمرے میں نہیں آتی تھی اور نہ بلا وجہ بیٹھتی تھی۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو وہ مجھے ملنے والی دوسری تمام خواتین اور لڑکیوں سے مختلف تھی۔ اس دن اس نے اتنی ایکسر سائز اور مشق کی پسینے پسینے ہو گئی تھی اور اس کا سانس بے قابو ہو رہا تھا۔ میں نے اسے روک دیا کہ آج کے لیے اتنا کافی ہے۔ وہ اپنے کمرے میں گئی تھی کہ منشی جی آ گئے۔

''آپ کو بڑے کنور یاد کر رہے ہیں۔''

''میں تو سمجھا تھا کہ وہ میرا اور نائیک کا مقابلہ دیکھنے آئیں گے۔''

''انہوں نے اسی سلسلے میں بلایا ہے۔'' منشی جی نے کہا۔

میں نے راستے میں کہا۔ ''میرا خیال ہے انہوں نے راج کنور سے اس سلسلے میں کوئی بات کی ہوگی۔''

منشی جی چونکے۔ ''آپ نے کیسے اندازہ لگایا؟''

''کیونکہ راج کنور اور اس کے چیلوں نے کوئی حربہ استعمال نہیں کیا۔ اگرچہ چالاکی سے کام لے کر لاٹھیوں سے مقابلہ کرایا تھا۔''

منشی جی پھر چونکے۔ ''لاٹھیوں سے۔'' اس نے تشویش سے کہا۔ ''نائیک بنوٹ کا ماہر ہے۔''

''وہ ماہر ہے تو اس کا یہ حال ہے۔'' میں نے افسوس سے کہا۔ ''آپ نے اسے دیکھ تو لیا ہوگا۔''

''شہباز جی آپ بہت ماہر آدمی ہیں اس لیے اس کا یہ حال ہوا ہے ورنہ وہ تین چار سے اکیلا ہی لڑتا ہے اور کوئی اسے چھو نہیں سکتا ہے۔''

''یہ تین چار بے چارے ملازم ہی ہوں گے۔'' میں نے طنز کیا۔ ''کبھی اس نے آزادانہ مقابلہ کیا ہے جیسے مجھ سے واسطہ پڑ گیا؟''

''نہیں مقابلہ کرتے تو نہیں دیکھا ہے۔'' منشی جی خفت سے بولے۔

''تب اس سے کہیں کہ اس فن کا نام بدنام نہ کرے۔''

بڑا کنور اپنے کمرے میں پردہ نشین موجود تھا۔ اس دن صرف منشی جی اندر آئے گارڈ باہر ہی رہ گیا تھا۔ آداب تسلیمات کے بعد اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''شہباز یہ تم کیا کرتے پھر رہے ہو، تم نے پہلے نائیک کو چیلنج کیا تھا اور اب رامن کو للکارا ہے۔''

میں دم بہ خود رہ گیا تھا۔ ''میں نے...؟ ارے جناب یہ آپ کے بھائی کا کام ہے۔ وہی چاہتا تھا کہ میں نائیک سے لڑوں اور اس بہانے وہ میرا ابھر کس نکلوا سکے لیکن اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہوئی الٹا نائیک کا بھر کس نکل گیا۔''

بڑا کنور چونکا اس نے بے یقینی سے کہا۔ ''تم نے اسے چیلنج نہیں کیا۔''

''صرف اسے ہی نہیں بلکہ میں نے رامن کو بھی نہیں للکارا ہے۔ مجھے قطعی شوق نہیں ہے لوگوں سے بلا وجہ لڑتا پھروں۔''

''اگر تم نے چیلنج نہیں کیا تو پھر مقابلے پر کیوں گئے؟'' اس نے کہا۔ ''تم انکار کر دیتے کوئی تمہیں مجبور نہیں کر سکتا تھا۔''

''معذرت کے ساتھ، میں بھلا کس طرح انکار کر سکتا ہوں جب کہ میں آپ بھائیوں کا مشترکہ قیدی ہوں۔ دوسرے یہ میری عزت نفس کے خلاف ہوتا۔''

''تم اگر قیدی بھی ہو تو صرف میرے ہو۔'' بڑے کنور نے کہا۔

''ایک بار پھر معذرت کے ساتھ اگر آپ کا قیدی ہوں تو راج کنور کس طرح مجھے طلب کر رہا ہے اور گارڈز اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے مجھے اس کے پاس کیوں لے گئے تھے؟'' میرا لہجہ چبھتا ہوا ہو گیا۔

بڑا کنور شاید صورت حال سے بے خبر تھا۔ میرا اندازہ درست تھا۔ سارا انتظام راج کنور کے ہاتھ میں تھا اور بڑا کنور اس کا محتاج تھا۔ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''اب ایسا نہیں ہوگا؟''

میں نے آہستہ سے کہا۔ ''میں آپ سے اکیلے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔''

میری بات پر منشی جی نے برا سا منہ بنایا۔ مگر اس وقت اس کا منہ کھلا رہ گیا جب بڑے کنور نے اسے وہاں سے

جانے کا حکم دیا۔ شاید اسے توقع نہیں تھی کہ اس کے ساتھ ایسا بھی ہوگا۔ جب اس نے کچھ دیر حرکت نہیں کی تو بڑے کنور نے کسی قدر تیز لہجے میں کہا۔ ”تم نے سنا نہیں؟“

”جی سن لیا کنور جی۔“ وہ گھگیایا۔ ”لیکن کیا یہ مناسب ہوگا کہ آپ اس کے ساتھ یہاں اکیلے.....“

”یہ سوچنا تمہارا کام نہیں ہے اب تم جاسکتے ہو۔“

اس بار منشی جی کو حکم کی تعمیل کرنا پڑی تھی اور جب وہ باہر جا رہا تھا تو اس کی آنکھوں میں مجھے اپنے راج کنور اور نائیک جیسی نفرت دکھائی دی تھی۔ اس کا بس چلتا تو اپنی اس بے عزتی پر وہ مجھے قتل کر دیتا۔ جیسے ہی دروازہ بند ہوا میں بڑے کنور کے پاس آیا۔ ”آپ یہ مت سمجھے گا کہ میں آپ کو بہکانے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن گزشتہ تین ہفتے میں جو دیکھا ہے اس سے میرے ذہن میں ایک خیال جڑ پکڑ چکا ہے۔“

”کیسا خیال؟“

”میں خیال بتاتا ہوں لیکن پہلے مجھے اپنے کچھ سوالوں کے جواب چاہئیں اگر آپ انکار کرتے ہیں تو میں اپنا خیال خود تک رکھوں گا۔“

”پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو؟“

”پہلی بات یہ کہ سندھو کے بعد دوسرا ماہر آدمی کہاں سے آیا؟“

”اسے نائیک تلاش کر کے لایا ہے۔“

”دوسری بات کیا اس نے بھی علاج کے لیے میرے خون کا مطالبہ کیا تھا؟“

”ظاہر ہے ورنہ تم یہاں کیوں ہوتے؟“

”میاں ممتاز سے آپ کا کیا تعلق ہے؟“

”میں اور میاں ممتاز لندن میں ایک ہی اسکول میں زیر تعلیم تھے اور وہیں میری اس سے دوستی ہوئی تھی پھر جب مجھے سانپ نے کاٹا اور میری تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا تو میاں ممتاز سے دوستی بھی ختم ہو گئی۔ چند سال پہلے وہ اچانک ہی مجھ سے ملنے یہاں آیا تھا۔ دراصل وہ مجھ سے ملنے نہیں آیا تھا۔ وہ یہاں پائے جانے والے ہیروں کے چکر میں آیا تھا۔ وہ ناتراشیدہ ہیرے خرید کر انہیں باہر سے ترشوانا چاہتا تھا۔ کیونکہ یہاں کے سارے ہیرے بالآخر ہمارے پاس آتے تھے اور ہم آگے سپلائی کرتے تھے اس لیے میاں ممتاز سے ایک کاروباری لنک بن گیا۔“

”میں ان جوابات پر آپ کا شکر گزار ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”بس ایک آخری سوال آپ کے علاج کی [illegible] تیار کرنے کے لیے میرا کتنا خون درکار ہوگا۔“

”اس آدمی کا کہنا ہے کہ ایک من خون چاہیے [illegible] اس میں اتنی دوا تیار ہو جائے گی جو میرے علاج کے لیے کافی ہوگی۔“

علاج کے لیے ایک من خون درکار تھا جب کہ اب تک کوئی سات لیٹر خون حاصل کیا گیا تھا۔ مجھے صحیح سے نہیں معلوم تھا کہ لیٹر خون کا وزن کیا ہوتا ہے اور یہ کلوگرام میں کتنا ہوتا ہے اور سیر میں کتنا آتا ہے۔ مگر میرا اندازہ تھا کہ وزن کے لحاظ سے یہ آٹھ سیر بھی نہیں ہوگا یعنی درکار خون کا صرف بیس فیصد ملا تھا اور باقی خون حاصل کرنے میں سات سے آٹھ مہینے لگ سکتے تھے۔ لیکن پہلے میاں ممتاز کی تحویل میں میرا زیادہ خون لیا گیا یہ سوچے بغیر کہ اس کا مجھ پر کیا اثر ہوگا۔ پھر یہاں راج کنور کھل کر سامنے آ گیا۔ اس نے بغیر پروا کیے کہ میں اس کے بھائی کے لیے کتنا اہم ہوں مجھے ایک بچکانا مقابلے میں نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ اللہ نے مجھے محفوظ رکھا الٹا اسی کا دست راست اس وقت لمبا پڑا ہوا تھا۔ میں نے مناسب الفاظ میں اور محتاط لہجے میں بڑے کنور کو یہ ساری روداد سنائی۔

”جناب مجھے نہیں لگ رہا کہ میرے ساتھ کیا جانے والا سلوک آپ کے حق میں ہے۔ اگر مجھے نقصان ہوا۔ میں مر گیا یا خون دینے کے قابل نہیں رہا تو یہ اصل میں آپ کا نقصان ہوگا۔“

بڑا کنور خاموشی سے سن رہا تھا۔ وہ بہت ٹھنڈے مزاج کا آدمی تھا۔ وہ بہت دھیمے لہجے میں بولتا تھا اور اس کے لہجے میں شاذ ہی جذباتیت کی آمیزش محسوس ہوتی تھی۔ اس وقت بھی وہ بولا تو اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔ ”ٹھیک ہے میں اس بات پر غور کروں گا۔ تم بے فکر رہو اب تمہیں کوئی نہیں چھیڑے گا اور نہ تمہاری مرضی کے خلاف کچھ کیا جائے گا۔“

مگر میں بڑے کنور کی یقین دہانی سے زیادہ مطمئن نہیں تھا اس سے پہلے بھی وہ اس قسم کی کئی یقین دہانیاں کرا چکا تھا مگر میں نے دیکھا تھا کہ راج کنور کے سامنے وہ بے اثر ثابت ہوتی تھیں۔ میں نے سر ہلایا۔ ”لیکن اگر اس کے

برعکس ہوا تو میں خون دینے کے معاملے میں اپنا تعاون واپس لینے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ ایک بات اور، آپ نے بانو کے بارے میں کہا تھا کہ آپ اسے واپس بھیج دیں گے کچھ عرصے بعد اب اس بات کو بیس دن ہو چکے ہیں۔“

”مسئلہ حل نہیں ہوا ہے۔“ بڑے کنور نے کرسی پر پہلو بدل کر کہا۔ ”دراصل اس موقع پر میاں ممتاز سے تعلقات خراب نہیں کیے جاسکتے ہیں۔ اگر بانو واپس گئی تو معاملہ بگڑ جائے گا۔ تمہیں اور بانو کو صبر سے کام لینا ہوگا۔“

”راج کنور کے عزائم بانو کے بارے میں ٹھیک نہیں ہیں وہ اس حوالے سے مجھے براہ راست دھمکی دے چکا ہے۔“

”میں نے کہا نا تم فکر مت کرو تمہاری اور بانو کی پوری حفاظت کی جائے گی۔“ بڑے کنور کا لہجہ ناخوشگوار ہو گیا تھا میں نہیں دیکھ سکا کہ اس نے کیا کیا تھا لیکن دروازہ کھلا اور منشی جی اندر آئے۔ ظاہر ہے وہ اجازت کے بغیر اندر نہیں آسکتے تھے۔ انہیں کوئی اشارہ ملا تھا تبھی وہ اندر آئے تھے۔ بڑے کنور نے حکم دیا۔ ”شہباز ملک کو ان کے کمرے میں پہنچا دو۔“

منشی جی نے راستے میں کہا۔ ”شہباز جی آپ نے میری بے عزتی کر کے اچھا نہیں کیا؟“

”میں نے؟“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”آپ کو بڑے کنور نے کمرے سے جانے کا حکم دیا تھا اور میرا خیال ہے وہ اس کا حق رکھتے ہیں کیونکہ وہ بہرحال مالک ہیں آپ کے، مالک کے حکم میں عزت بے عزتی نہیں ہوتی ہے۔“

منشی جی دانت پیس کر رہ گئے۔ میں نے اسے آئینہ دکھایا تھا کہ نوکر کتنا ہی سر چڑھا کیوں نہ ہو جائے بہرحال وہ نوکر ہی ہوتا ہے۔ وہ چالاک آدمی تھا اس نے جاننے کی کوشش نہیں کی کہ اسے نکال کر میں نے بڑے کنور سے کیا بات کی تھی۔ اسے معلوم تھا میں نہیں بتاؤں گا اور اس کی مزید بے عزتی ہوگی۔ راستے میں مجھے خیال آیا کہ میں نے اس سپیرے کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ جو سندھو کی جگہ بڑے کنور کا علاج کرنے آیا تھا اور اس بدبخت نے میرے ایک من خون کی فرمائش کی تھی۔ جیسے خون نہ ہو پانی ہو۔ منشی جی نے پلٹ کر اس کا جواب نہیں دیا تھا اور بڑے کنور سے میں کہنا بھول گیا تھا میں نے منشی جی کو یاد دلایا تو وہ غرایا۔ ”اسے بھول جاؤ اس سے تمہاری ملاقات نہیں ہو سکتی ہے۔“

”کیا اس لیے کہ میں اس کی حقیقت نہ سمجھ جاؤں کہ وہ بڑے کنور کا علاج کر بھی سکتا ہے یا نہیں۔“ میں نے کہا اور منشی جی کے تاثرات دیکھے بغیر کمرے میں داخل ہو گیا۔ بانو اپنے کمرے میں تھی۔ میں نے بتایا کہ وہ بلا ضرورت میرے کمرے میں نہیں آتی تھی۔ اکثر کھانا بھی اپنے کمرے میں ہی کھاتی تھی صرف صبح کا ناشتا میرے ساتھ کر لیتی تھی۔ شام کے سات بج رہے تھے۔ میں آ کر لیٹ گیا تھا۔ چوٹ والی جگہ بچا رہا تھا کیونکہ وہ بستر پر لگتی تو ٹیس سی اٹھتی تھی۔ دروازے پر دستک ہوئی تو میں نے بلند آواز سے کہا۔ ”آ جاؤ۔“

آنے والی اوشا تھی۔ جب سے میں نے اسے دیکھا تھا وہ تین چار بار سے زیادہ یہاں نہیں آئی تھی۔ پتا نہیں وہ خود محتاط ہو گئی تھی یا پھر اسے منع کیا گیا تھا۔ دو تین بار وہ آئی تو اتفاق سے میں کمرے میں نہیں تھا یا نہا رہا تھا۔ وہ بانو سے بات کر کے اور اسے مطلوبہ چیزیں دے کر چلی گئی۔ میں چونکا کیونکہ خادماؤں والے لباس کے بجائے اپنے ماضی کے حلیے میں تھی یعنی اس نے سادہ ریشمی ساڑی باندھی ہوئی تھی اور اس کے نیچے کچھ بھی نہیں تھا۔ یقیناً اس کا یہ انداز زیادہ ہوش ربا تھا لیکن یہ یہاں کا لباس نہیں تھا۔ اگرچہ جو لباس یہاں خادمائیں پہنتی تھیں وہ بھی کم ہوش ربا نہیں تھا۔ پھر بھی اوشا الگ ہی نظر آ رہی تھی۔ میں اٹھ بیٹھا۔ ”خیریت آج تم اپنے پرانے انداز میں دکھائی دے رہی ہو۔“

شمارہ جولائی 2013ء کی منتخب سچ بیانیاں

ہماری پیش کش..... آپ کا انتخاب

☆ اول: محسنہ..... نگار عابد رحمٰن (لاہور)

☆ دوم: ادائیگی..... عظیم (کراچی)

☆ سوم: عورت ایک پہیلی..... عمران (لاہور)

پہلے دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ بیتی منتخب کیجیے
ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے

"تجھے پسند جو ہے رے۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ ابھرے ہوئے تانبے جیسے سرخی مائل ہونٹ ذرا وا ہوئے تو اندر سے بہت سفید دانت جھلکنے لگے تھے۔ اس کا لہجہ اور بولنے کا انداز بھی پرانا تھا۔

"میری پسند کہاں سے آگئی یہ تو تمہارا بچپن کا پہناوا ہے۔"

"ہاں پر ہمیں معلوم ہے تجھے پسند ہے۔"

"ٹھیک ہے بابا مجھے پسند ہے لیکن آگے بھی تو کہو۔"

وہ میرے پاس آئی اور بیڈ کے پاس قالین پر بیٹھ گئی۔ ساڑی کا پلو بہت زیادہ چوڑا نہیں تھا اور اس کا سرکش شباب جامے سے باہر ہوا جا رہا تھا۔ کچھ اس نے بھی جان کر بے پروائی برتی ہوئی تھی۔ میں نے لاحول پڑھی اور نظروں کو بھٹکنے سے روکا۔ اس نے بال کھلے چھوڑے ہوئے تھے جو اس کے عریاں شانوں اور کمر کی ستر پوشی کر رہے تھے۔ اس میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔ پہلے وہ لڑکیوں کی طرح چھریری تھی حالانکہ شاید لڑکی وہ اس وقت بھی نہیں تھی۔ مگر اب جسم کسی قدر بھر گیا تھا۔ بہتر خوراک کے ساتھ یقیناً دوسری سرگرمیاں بھی اس کی وجہ تھیں۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اس کا ہاتھ گرم ہو رہا تھا۔

"تمہیں بخار ہے؟"

"نہیں رے میرا بدن اسی طرح گرم رہتا ہے۔ تو جانتا تو ہے سپیرے کی بیٹی ہوں، بچپن سے سانپوں کے ساتھ رہی ہوں۔"

"اوشا تم یہاں خوش ہو؟"

"ہاں رے۔" وہ بے پروائی سے بولی۔ "کیا برائی ہے، کھانے اور پہننے کو ملتا ہے، تھوڑا کام کرنا پڑتا ہے اور کوئی تنگ بھی نہیں کرتا۔"

"تنگ سے کیا مراد ہے؟"

"وہی جو تیرے ذہن میں ہے۔" اس نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔ "تو سمجھتا ہے تا ہم یہاں کنوروں کی رکھیل ہیں۔"

"اگر میں ایسا سمجھتا ہوں تو کیا غلط ہے؟"

"ہاں غلط ہے۔" وہ بولی۔ "کوئی مرد میرے پاس نہیں آسکتا سوائے تیرے....."

میں نے پھر لاحول پڑھی اور اس سے ہاتھ چھڑا لیا۔ "لگتا ہے تمہارے دماغ میں پھر پرانا کیڑا کلبلا رہا ہے۔ مجھے معاف رکھو۔"

"سچ کہہ رہی ہوں رے۔" اس نے اصرار کیا۔ "بابا نے بھی کہا تھا کہ بس تو ہی میرا مرد بن سکتا ہے۔"

"مجھ میں ایسی کیا بات ہے؟"

"تو وِش برداشت کر سکتا ہے۔" اوشا نے انکشاف کرنے کے انداز میں کہا۔ میں چونک گیا۔

"کیا مطلب میں زہر برداشت کر سکتا ہوں، کیا تم زہریلی ہو؟"

اس نے سر ہلایا۔ "بچپن میں ایک بار باپو کے سانپ نے مجھے ڈس لیا تھا۔ باپو نے مجھے بچا لیا لیکن میرا جسم وِش کا عادی ہو گیا۔ چند مہینے میں ایک بار مجھے سانپ نہ کاٹے تو میری حالت خراب ہونے لگتی تھی۔ تب باپو اپنے کسی ہلکے وِش والے سانپ سے مجھے ڈسواتا تھا۔ جوان ہونے تک میں وِش کنیا بن گئی تھی۔"

میں دنگ رہ گیا تھا۔ جس زمانے میں زندگی کا مقصد صرف پڑھنا ہوتا تھا تب میں نے بے شمار ایسی کہانیاں پڑھی تھیں جن میں وِش کنیاؤں کا ذکر تھا کہ انہیں بچپن سے زہر دے کر تیار کیا جاتا تھا اور جوان ہوتے ہوتے وہ اتنی زہریلی ہو جاتی تھیں کہ کسی کو کاٹ لیں تو وہ مر جاتا تھا اسی طرح ان سے جسمانی تعلق قائم کرنے والا مرد بھی مارا جاتا تھا۔ انہیں خاص طور سے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ میں اسے ایک خیالی چیز سمجھتا تھا۔ مگر آج اوشا نے بتایا کہ یہ سچ تھا۔ وہ اتنی زہریلی تھی کہ کوئی مرد اس کے پاس نہیں آسکتا تھا۔ میرا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا میں نے پوچھا۔ "تم نے مجھے پکڑا ہوا ہے کیا اس سے بھی زہر میرے جسم میں جا سکتا ہے؟"

وہ پھر نشیلے انداز میں مسکرائی۔ "ابھی تو صرف پکڑا ہے رے، پر کبھی تجھ سے سر سے پاؤں تک لپٹی بھی تھی۔ تب بھی تجھے کچھ نہیں ہوا تھا۔"

جب میں سندھو کی قید میں تھا اور اس نے جڑی بوٹیوں کی مدد سے مجھے بے حس کر دیا تھا تب اوشا نے میری مدد کی تھی اور مجھے جسمانی طور پر متحرک کرنے کے لیے وہ بے لباس ہو کر مجھ سے لپٹ گئی تھی۔ میں جھینپ گیا۔ "میری بات کا جواب نہیں دیا؟"

"ہاں باپو کہتا تھا جسے میں چھوؤں اسے بھی وِش پہنچے گا پر بہت تھوڑا سا، وہ مرے گا نہیں، ہاں جسے میں کاٹ لوں یا کوئی مرد میرے پاس آئے تو وہ نہیں بچے گا۔"

میں نے جھرجھری لی اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے ہمیشہ مجھے بھٹکنے سے محفوظ رکھا تھا۔ اگر میں مضبوط کردار کا نہ ہوتا تو شاید آج زندہ نہ ہوتا۔ میرا اندازہ غلط تھا کہ اوشا یہاں سب کی داشتہ بن کر رہ رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ "کنور جانتے ہیں کہ تم زہریلی ہو؟"

اس نے سر ہلایا۔ "جب یہ لوگ دوبارہ یہاں آئے تو ایک رات راج کنور نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا تھا۔ میں نے اسے بتا دیا کہ میں وِش کنیا ہوں۔ وہ بہت ڈر گیا تھا۔ پھر اس نے مجھے ڈاکٹر کو دکھایا اور اس نے بتایا کہ میرے خون میں اتنا زہر ہے جتنا ایک بڑے ناگ میں ہوتا ہے۔"

مجھے خیال آیا کہ کاش اوشا یہ بات راج کنور کو نہ بتاتی تو آج وہ اس دنیا میں نہ ہوتا لیکن میں نے منہ سے نہیں کہا۔ "دوسروں کو بھی معلوم ہے؟"

"بڑے کنور اور کچھ اور لوگوں کو معلوم ہے۔ بڑے کنور نے مجھ سے بہت سے سوالات کیے تھے۔"

"اس طرح چھونے سے جو زہر سرایت کرے گا اس کا کیا اثر ہوگا؟"

"تجھ پر کچھ نہیں ہوگا رے، تو پہلے ہی وِش والا ہے۔ تبھی تو تجھ پر ناگ دیوتا کا وِش بھی بیکار رہا تھا۔"

"میں نے کبھی کوئی زہر استعمال نہیں کیا۔"

"میں نہیں جانتی پر باپو کہہ رہا تھا کہ تو نے کچھ ایسا کھایا ہے جس سے تیرے خون میں وِش کی سہار ہو گئی ہے۔"

میرا خیال فوری طور پر ان دواؤں کی طرف گیا جو حکیم قادس نے مجھے استعمال کرائی تھیں اور جن میں پراسرار وادی سے لائے گئے پتھر کا سفوف جزاعظم کے طور پر شامل تھا۔ یہ دوائیں زخم بہت تیزی سے بھر دیتی تھیں۔ بلکہ ان کا اثر اب تک تھا۔ میرا زخم غیر معمولی تیزی سے بھر جاتا تھا اسی طرح مجھے عام بیماریاں بھی کم ہوتی تھیں۔ شاید اسی کا ایک اثر یہ بھی تھا کہ مجھ پر مہلک ترین سانپ کے بہت زیادہ زہر نے بھی اثر نہیں کیا تھا۔ میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھا کہ میں اندر سے زہریلا ہو گیا تھا۔ اس دوران میں کئی بار میرے خون کا مکمل ٹیسٹ ہو چکا تھا اگر اس میں زہر شامل ہوتا تو لازمی رپورٹ میں اس کی نشان دہی ہوتی۔ میں نے اوشا سے کہا۔ "میرا نہیں خیال کہ ایسا ہی ہے۔"

مولفتہ القلوب

فتح مکہ کے بعد اسلام لانے والوں کا ایک گروہ مولفتہ القلوب کہلایا۔ جنگِ حنین کے بعد مالِ غنیمت کی تقسیم پر عجیب واقعہ رونما ہوا۔ آپؐ نے دیگر قبائل کو مالِ غنیمت تقسیم کر دیا۔ جس پر انصار ملول ہوئے۔ اس پر آپؐ نے سعد بن عبادہ کو طلب کیا اور روح پرور ملاقات کی۔ جس پر سب کے دل صاف ہو گئے۔ اس کے بعد آپؐ نے کہا کہ اب جو کفار مغلوب ہو کر در اسلام میں داخل ہوئے ہیں ابھی ان کے دلوں کا اعتبار نہیں، لہٰذا تالیفِ قلوب کے لیے میں نے ان کو یہ رعایت بخشی تا کہ ان کے دل ہمیشہ کے لیے نرم پڑ جائیں اور سچے دل سے حامیٔ اسلام رہیں۔ اس کے بعد حضور پُرنورؐ نے ان شرفائے مکہ کا، جو فتح مکہ کے بعد اسلام لائے تھے مولفتہ القلوب نام رکھا۔

جلیلہ میں درج ہے کہ ان کی تین قسمیں تھیں۔ ایک وہ جنہیں آپؐ نے محض اسلام میں داخل ہونے پر خوش کیا جیسے صفوان بن امیہ وغیرہ۔ دوم وہ جو اسلام پر ثابت قدم رہے، جیسے حضرت ابوسفیان۔ سوم وہ جو فساد و شر پھیلاتے تھے۔ انہیں مالِ غنیمت میں سے خاص حصہ دیا جاتا تھا۔ تا کہ اپنی عادتِ بد سے باز رہیں۔ اسے مسلمان خود بھی سمجھتے تھے۔

مرسلہ: عائشہ جونیجو، اونٹاریو، کینیڈا

"یہ بات میں نہیں جانتی پر بہت کچھ ایسا ہوتا ہے جسے ڈاکٹر نہیں جانتے۔" وہ بولتے ہوئے جذباتی ہو گئی۔ "میں تیرے لیے کب سے تڑپ رہی ہوں۔"

میں نے اس سے ہاتھ چھڑا لیا۔ "تو جانتی ہے میں اس قسم کا آدمی نہیں ہوں۔"

"میں بنا دوں گی۔" اس نے کہا اور ساڑی کا پلو گرا دیا۔ میں نے جلدی سے نگاہیں پھیر لیں۔ میں نے پارسائی کا دعویٰ کبھی نہیں کیا اور ہمیشہ خود کو کمزور انسان ہی سمجھا۔

"اوشا اسے ٹھیک کر لو۔ تم مجھے نہیں جانتی ہو اس لیے سمجھتی ہو اس طرح خود کو دکھا کر مجھے اپنا بنا لو گی تو یہ تمہاری بھول ہے۔"

"تب مجھے دیکھتا کیوں نہیں ہے رے۔" اس نے

چیلنج کرنے والا انداز میں کہا اور تن کر کھڑی ہو گئی۔

"کیونکہ ہمیں دیکھنے سے بھی منع کیا گیا ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "اوشا تم اچھی لڑکی ہو خود کو اس طرح تماشامت بناؤ۔"

اگر میں سخت انداز اختیار کرتا اور اسے درشتی سے جھٹک دیتا تو اس کا وہ اثر نہ ہوتا جو نرم لہجے کا ہوا تھا۔

"تب میں کیا کروں، تو نہیں جانتا وش نے مجھے کسی کے قابل ہی نہیں چھوڑا ہے اس نے مجھے اندر سے آگ بنا دیا ہے۔" اس کا لہجہ بھیگ رہا تھا۔ "میں اس آگ کو ٹھنڈا بھی نہیں کر سکتی۔"

وہ کہتے ہوئے قالین پر گر گئی اور اپنے زانوں پر جھکتے ہوئے سسک سسک کر رونے لگی تھی۔ بال ہٹ گئے تھے اور اس پشت دکھائی دے رہی تھی۔ اس سے پہلے میں کچھ کہتا یا کچھ کرتا اچانک بانو کے کمرے کا دروازہ کھلا اور بانو نمودار ہوئی۔ اوشا کو اس حال میں اور روتے دیکھ کر اس کا منہ کھلا رہ گیا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں اسے کچھ کہتا وہ پلٹی اور اپنے کمرے میں چلی گئی اس نے دروازہ بھی بہت آہستگی سے بند کیا تھا اوشا کو اس کے آنے یا جانے کا پتا نہیں چلا تھا۔ مجھے اس مظلوم لڑکی پر ترس آنے لگا۔ قدرت نے اسے حسین بنایا تھا بے شک اس کا رنگ پہلے سیاہ اور اب تانبے جیسا گہرا سرخ تھا لیکن اس کے نقوش اور جسمانی پیچ و خم کسی بھی حسین ترین عورت سے کم نہیں تھے۔ مگر اس حسن و سراپے کے ساتھ اسے زہریلا بنا دیا تھا۔ کوئی مرد اس کے پاس نہیں آ سکتا تھا۔ دوسری طرف اس کے وجود میں موجود زہر نے اسے بے پناہ جذباتی بنا دیا تھا۔ میں خود کئی بار اس کے جذبات دیکھ چکا تھا۔ میں نے بانو کے جانے کے بعد جھک کر اسے شانوں سے تھام کر اٹھایا۔ اس کی ساڑی کا پلو درست کیا اور اسے صوفے پر بٹھا کر پانی دیا۔ اس نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا اور بولی۔ "مجھے جگ دو۔"

میں نے اسے جگ تھما دیا اور وہ اسے بھی پی گئی۔ شاید اس کے اندر لگی آگ اتنی زیادہ تھی کہ اسے بجھانے کے لیے یہ پانی بھی کم پڑ گیا تھا۔ جگ خالی کر کے اسے کچھ سکون ملا تھا اور وہ گہرے سانس لے رہی تھی۔ پھر اس نے ساڑی کا پلو ٹھیک سے لیا۔ اس کا چہرہ جو پہلے آگ کی طرح دہکنے لگا تھا اب نارمل ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے اچانک آگے جھکتے ہوئے میرے سینے سے لگتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ "شہباز تو خطرے میں ہے۔"

پہلے میں کچھ اور سمجھا تھا کہ شاید اسے جذبات کا دوسرا دورہ پڑا ہے لیکن اس کے جملے اور سہمے ہوئے انداز نے میری غلط فہمی دور کر دی۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے اس نے پھر اسی انداز میں سرگوشی کی۔ "آہستہ بول، یہاں ہونے والی بات سنی جاتی ہے۔"

میرے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔ مجھے یہ خیال تو آیا ہی نہیں تھا کہ ان کمروں میں مائک لگے ہوں گے۔ کنور مجھے قید کر کے آرام سے نہیں بیٹھ گئے تھے۔ وہ مجھ پر پوری طرح نظر رکھے ہوئے تھے اور ان کو میری ایک ایک حرکت کا علم تھا۔ اوشا کے اس انداز نے میری چھٹی حس کو بھی جھنجوڑ دیا تھا۔ کمرے میں بات کرنا ٹھیک نہیں تھا اب ایک ہی جگہ بچتی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھاما اور اسے واش روم میں لے آیا۔ یہاں پہلے میں نے نہانے والا شاور کھول دیا اور پھر اوشا کے کان کے پاس آ کر پوچھا۔ "تجھے کیسے پتا؟"

"میں نے راج جی سے سنا، وہ کسی سے کہہ رہا تھا۔ پھر اس نے مجھ سے کہا کہ میں تیرے پاس آؤں اور تجھے رجھاؤں۔ میں تو کب سے تیرے لیے تڑپ رہی تھی۔"

"تم نے یہ نہیں سوچا کہ راج کنور کا مقصد مجھے مارنا ہوگا۔"

"مجھے معلوم تھا پر یہ بھی پتا ہے تو مرے گا نہیں، باپو نے کہا....."

"باپو کا کہا آخری نہیں ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹی۔ "سوچ اگر یہ غلط ہوا تو میں مر جاؤں گا کیا تو مجھے مارنا چاہتی ہے۔"

میرے قریب اس کا جسم کانپ اٹھا تھا۔ "نہیں رے، میں تو تجھ پر جان وار دوں۔"

"اوشا تو نے ٹھیک کہا یہاں میری جان کو خطرہ ہے۔ راج کنور میرا دشمن بن گیا ہے۔ وہ ہر قیمت پر مجھے مارنا چاہتا ہے۔ اس لیے اس نے تجھے بھیجا ہے۔ یہ بتا کہ اگر تو ناکام رہی تو وہ کیا کرے گا؟"

"پتا نہیں شاید سزا دے یا مار دے۔" اس نے سادگی سے کہا۔

"اوشا تو اتنے عرصے سے یہاں ہے تجھے پتا ہوگا کہ باہر جانے کے راستے کہاں ہیں؟"

اس نے سر ہلایا۔ "پتا ہے لیکن سب پر پہرے ہیں۔"

"اوشا مجھ سے ملتی رہنا، راج کنور کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ تم ناکام رہی ہو لیکن ابھی باہر نکل کر میں کچھ ایسی باتیں کروں گا جن سے راج کنور سمجھے گا کہ میں تم سے متاثر ہوں تب تم اس سے کہو گی کہ تم مجھ سے بار بار ملو گی کبھی نہ کبھی تو کامیابی ملے گی۔"

وہ خوش ہو گئی۔ "تو نہ کہتا تب بھی میں یہی کہتی۔ میں تجھ سے بار بار ملنا چاہتی ہوں۔ ایک بات بتا یہ ناری کون ہے؟"

"بانو کی بات کر رہی ہو؟"

"ہاں وہ مجھے اچھی نہیں لگتی ہے۔"

"تمہیں اس سے جلنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ہم صرف کچھ وقت کے ساتھی ہیں۔"

"پر وہ دن رات تیرے ساتھ تو ہے۔" اوشا نے حسد سے کہا۔ "سندر بھی ہے۔"

اوشا بانو کو اپنے پیمانے پر تول رہی تھی حالانکہ وہ بالکل مختلف مزاج کی اور اپنی عزت کی حفاظت کرنے والی لڑکی تھی۔ اوشا بھی بری نہیں تھی لیکن اس نے جس ماحول میں پرورش پائی تھی اور جو اسے پیچھے سے ملا تھا اس میں عورت کی عزت کو کوئی اہمیت حاصل نہیں تھی پھر وہ کنور پیلس کے ہوسناک ماحول میں رہی تھی اور اس نے یہاں مختصر عرصے میں وہ سب دیکھ لیا تھا جو اپنی بیس سالہ زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ اس میں اس حوالے سے رہی سہی جھجک اور شرم بھی باقی نہیں رہی تھی۔ اس کے باوجود میں اسے قصوروار نہیں سمجھ رہا تھا۔ اصل قصوروار اس کا ماحول اور اس کا پس منظر تھا۔ ہم باہر آئے اور میں نے کچھ ڈائلاگ کہے جن سے سننے والے کو لگتا کہ میں بھی اوشا کے حسن سے متاثر تھا۔ کچھ دیر بعد وہ چلی گئی۔ مجھے بانو کا خیال آیا جو اوشا کو میرے کمرے میں اور میرے بستر کے پاس نہ گفتہ بہ حالت میں دیکھ چکی تھی۔ ہم دونوں ہی اس وجہ سے شرمندہ ہوتے۔

مگر بانو سے زیادہ مجھے راج کنور نے فکرمند کر دیا تھا۔ وہ اب کھل کر میری دشمنی پر اتر آیا تھا اور ایسا لگ رہا تھا کہ اسے بڑے کنور کی پروا بھی نہ ہو۔ بلکہ شاید وہ اسے بھی دھوکا دے رہا تھا۔ مجھے تو وہ سپیرا بھی فراڈ لگ رہا تھا جس نے میرے خون سے بڑے کنور کا علاج کرنے کا دعویٰ کیا تھا۔ میں نے صرف سنا تھا کہ اس کے علاج سے بڑے کنور کو فائدہ ہوا تھا مگر بڑے کنور کی حالت بدستور پہلے جیسی تھی۔ وہ اتنا ہی کمزور اور بیمار تھا جتنا میں نے اسے پہلے پایا تھا۔ سندھو کی بات اور تھی اس نے کوشش کر کے بڑے کنور کی بیماری کا علاج دریافت کر لیا تھا۔ یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔ اگر راج کنور کوئی سازش کر رہا تھا تو لازمی بڑے کنور کے ساتھ اس کا نشانہ میں بھی ہوتا۔ وہ مجھے کسی صورت زندہ نہ چھوڑتا۔ نائیک سے مقابلہ بھی اس کی ایک کوشش تھی۔ نائیک کی لاٹھی وزنی اور سخت تھی اس کے چند خطرناک وار کسی بھی انسان کو موت کے گھاٹ اتار سکتے تھے لیکن اس کی یہ کوشش ناکام رہی تھی۔
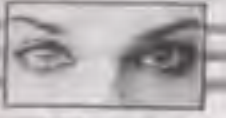
پھر اس نے اوشا کا حربہ آزمایا اسے امید تھی کہ میں اوشا کے حسن و شباب کے آگے پگھل جاؤں گا اور اس کے وجود میں موجود زہر میرا خاتمہ کر دے گا۔ ابھی تک راج کنور ڈھکے چھپے انداز میں کوشش کر رہا تھا۔ بڑے کنور کی وجہ سے وہ کھل کر میرا خاتمہ کرنے کے لیے کوئی کارروائی نہیں کر سکتا تھا ورنہ یہ بہت آسان کام تھا۔ اس کے گرگے ایک اشارے پر مجھے گولی مار سکتے تھے اور میری لاش کسی نامعلوم قبر میں چھپائی جا سکتی تھی۔ صرف بڑے کنور کی وجہ سے وہ کھل کر کچھ کرنے سے رکا ہوا تھا مگر راج کنور کی بیتابی بتا رہی تھی کہ اب وہ کھل کر سامنے آنے میں زیادہ دیر بھی نہیں لگائے گا۔ اس بیتابی کی ایک وجہ شاید بانو بھی تھی جسے وہ اپنے قبضے میں کرنا چاہتا تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی تو میں خیالوں سے باہر آیا۔ "آجاؤ۔"

دروازہ کھلا اور دل نواز خان کھانے کی ٹرالی لے کر اندر آیا۔ وہ کھانا میز پر سجانے لگا تھا اس کے جانے کے بعد میں نے بانو کے دروازے پر دستک دی۔ اس نے دروازہ کھولا۔ وہ جھینپی ہوئی لگ رہی تھی شاید اس منظر کی وجہ سے جو اس نے میرے کمرے میں دیکھا تھا۔ "کھانا لگ گیا ہے۔"

وہ خاموشی سے آ گئی اور ہم نے خاموشی سے ہی کھانا کھایا۔ جب دل نواز خان برتن سمیٹ کر لے گیا تو بانو جانے کے لیے کھڑی ہوئی پھر اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "میں معافی چاہتی ہوں اس طرح اچانک بغیر دستک دیے آپ کے کمرے میں آ گئی تھی۔"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے کہا۔

"آیندہ میں خیال رکھوں گی۔" اس نے کہا پھر جھجک کر بولی۔ "شہباز صاحب میں اتنے عرصے میں آپ کو اچھی طرح جان گئی ہوں اس لیے کوئی بھی بات اور کوئی بھی منظر میرا آپ کے کردار پر اعتماد متزلزل نہیں کر سکتا ہے۔"

"میں اس اعتماد کے لیے شکر گزار ہوں۔" میں نے کہا۔ پھر ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے اسے چپ رہنے کو کہا اور اس کا ہاتھ تھام کر واش روم میں لے آیا۔ اس کے چہرے پر کسی قدر فکر کے تاثرات نظر آئے تھے لیکن اس نے مزاحمت نہیں کی۔ میں نے شاور چلایا اور سرگوشی میں کہا۔ "بانو ہمارے کمرے بگڈ ہیں۔ یہاں مائک لگے ہوئے ہیں اور ہماری آوازیں دوسری جگہ سنی جاتی ہیں۔"

بانو کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "لیکن کیوں؟"

"یہ اس طرح ہم پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ اگر ہم فرار کا یا کوئی ایسا منصوبہ بنائیں جو ان کے خلاف ہو تو یہ پیشگی آگاہ ہو جائیں۔ لیکن اوشا سے ایک خطرناک بات کا علم ہوا ہے۔ راج کنور مجھے حیلے بہانوں سے مارنے پر تل گیا ہے۔"

"اسی لیے اس نے آپ کو زبردستی لڑنے پر مجبور کیا تھا؟"

میں نے سر ہلایا۔ "اوشا کو بھی اسی مقصد کے تحت میرے کمرے میں بھیجا ہے۔"

"وہ اوشا سے آپ کو قتل کرانا چاہتا ہے؟" اس نے تعجب سے کہا۔ "لیکن کیسے؟ وہ تو کمزور سی لڑکی ہے۔"

"وہ کمزور لڑکی بجائے خود ایک خطرناک ترین ہتھیار ہے۔" میں نے کہا اور پھر اوشا کے زہریلے پن کا انکشاف کرتے ہوئے ڈھکے چھپے انداز میں بتایا کہ وہ کس طرح آدمی کو موت کے گھاٹ اتار سکتی ہے۔ بانو جھینپ گئی تھی مگر فوراً تشویش سے بولی۔

"یہ آپ کے لیے بہت خطرناک ہے۔ فرض کریں وہ آپ کو کاٹ لے تب بھی اس کا زہر اثر کرے گا۔"

"وہ مجھ سے مخلص ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن کیا کہا جا سکتا ہے کہ آدمی کب کیا کر گزرے۔"

"میرا خیال ہے وہ آپ کو پسند کرتی ہے۔" بانو نے پہلی بار میرے ذاتی معاملے پر اظہار خیال کیا۔ "لیکن کیا آپ اس پر پورا بھروسا کر سکتے ہیں؟"

"یہی بات ہے سو فیصد نہیں کر سکتا کیونکہ وہ زر پرست ہے اور جو اپنے نفس کے پیچھے بھاگتا ہے وہ کبھی بھی سو فیصد اعتماد کے قابل نہیں ہوتا......" میں نے کہا۔ میں نے بانو کو بڑے کنور سے ہونے والی ملاقات کا نہیں بتایا۔ اگرچہ ہم شاور کے پاس کھڑے ہو کر بات کر رہے تھے اور آواز بھی بس اتنی رکھی تھی جو دوسرے کو سنائی دے مگر امکان تو تھا کہ شاید مائک اتنے طاقت ور ہوں کہ ہماری آواز پھر بھی کیچ کر لیں۔ اس لیے میں بڑے کنور سے ہونے والی گفتگو خود تک محدود رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے بانو سے کہا۔ "اوشا سے بچانے میں تم اہم کردار ادا کر سکتی ہو۔ جب اوشا آیا کرے تم بھی آ جایا کرو۔ اس سے راج کنور کی چال ناکام ہو گی اور وہ اوشا کو موردِ الزام بھی نہیں ٹھہرا سکے گا۔"

اگرچہ بانو کو میرا اوشا کا اتنا خیال رکھنا اچھا نہیں لگ رہا تھا لیکن اس نے مخالفت نہیں کی اور سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے لیکن مجھے کیسے معلوم ہو گا کہ وہ آئی ہے اس وقت بھی میں اتفاق سے آ گئی تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہاں وہ آپ کے ساتھ ہے۔"

"اس کے لیے تم درمیان کا دروازہ کھول کر رکھا کرو اس طرح میرے کمرے کے دروازے پر دستک ہو گی تو تمہیں پتا چل جائے گا اور تم فوراً یہاں آ جانا۔"

"اگر وہ لیٹ نائٹ آئی۔"

"تب بھی تم آ جانا یہ سوچے بغیر کہ یہاں تمہاری موجودگی کو کیا معنی پہنائے جا رہے ہیں۔"

اس کا چہرہ ذرا سرخ ہوا تھا۔ ہم باہر آئے تو وہ دروازہ کھلا چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں نے واپس آ کر کمرے کا جائزہ لیا۔ میں دیکھنا چاہ رہا تھا کہ مائک کہاں چھپایا گیا ہے۔ کمرے کے وسط میں بڑا سا فانوس لگا ہوا تھا جس میں درجن سے بھی زیادہ کینڈل بلب لگے ہوئے تھے اور شیشے کی بہتات تھی یہاں مائک آسانی سے چھپایا جا سکتا تھا۔ فانوس تک رسائی ممکن نہیں تھی کیونکہ اس کا نچلا حصہ زمین سے تقریباً بارہ فٹ اونچا تھا اور یہاں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس پر چڑھ کر میں اتنی بلندی تک پہنچتا۔ میں نے ایل سی ڈی ٹی وی کا معائنہ کیا اور اسے دیوار میں فکسنگ سے نکال کر دیکھا۔ مگر وہاں کچھ نہیں تھا۔ بیڈ اور صوفوں کے پیچھے بھی کچھ نہیں تھا۔ دیواروں پر عام روشنی کے پینل انرجی سیور

لگے تھے۔ وہ بھی میری رسائی سے باہر تھے۔ ایک گھنٹے بعد میں نے تھک ہار کر کوشش ترک کر دی۔ مائک بہت مہارت سے چھپائے گئے تھے۔ بستر پر لیٹا تو کمر کی تکلیف یاد آئی لیکن یہ بہت کم رہ گئی تھی۔ مجھے امید تھی کل تک اتنی کم رہ جائے گی کہ میں معمول کی ایکسرسائز کر سکوں گا۔

اگلے دن سچ مچ میری تکلیف خاصی حد تک کم ہو گئی تھی۔ صبح میں نے ہلکی ایکسرسائز کی اور شام کو پورے ردھم سے ایکسرسائز کرنے لگا۔ بانو دونوں وقت آئی تھی لیکن اب ہم گفتگو میں احتیاط کرتے تھے۔ شام کو میں نے بانو کو حملہ کرنے کی اصلی مشق کرائی۔ وہ مجھ پر حملہ کرتی اور میں اپنا دفاع کرتا تھا۔ چند دنوں کی مشق سے اس کے ہاتھ پیروں میں سختی آ گئی تھی اور وہ ٹھیک سے وار کرنے لگی تھی۔ مجھے امید تھی کہ اس پر کوئی برا وقت آیا تو وہ آسانی سے ہتھیار نہیں ڈالے گی۔ جسم کے ساتھ میں اس کے ذہن کو بھی سخت بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اگلے روز میں نے بھی حملے کی مشق کی اور بانو دفاع کرتی رہی۔ دو دن میں اس نے مزید بہتری دکھائی تھی۔ تیسرے ہفتے کے آخر تک اس کا وزن اکسٹھ کلو گرام ہو گیا تھا۔ شانوں، بازوؤں اور ٹانگوں کا وزن بڑھنے سے اس کے وار کی شدت میں اضافہ ہوا تھا۔ تیسری بار خون دینے کے لیے جانے سے پہلے میں نے اس سے آدھے گھنٹا مقابلہ کیا تھا اور وہ تھکے بغیر لڑتی رہی تھی۔ کوئی بھی خاص گفتگو ہم واش روم میں شاور چلا کر کرتے تھے۔ اس وقت بھی ہم واش روم میں آئے تھے۔ میں نے تعریفی انداز میں کہا۔

"تم بہت تیزی سے سیکھ رہی ہو۔"

"اس کے لیے میں آپ کی شکر گزار ہوں۔"

"بانو تم میں سیکھنے کی حیرت انگیز صلاحیت ہے۔ صرف تین ہفتے میں ایک نازک اندام لڑکی سے درمیانے درجے کی ماہر لڑاکا میں تبدیل ہونا ہر لڑکی کے بس کی بات نہیں ہوتی ہے۔ اس کا مطلب ہے تم ذہنی لحاظ سے بھی مضبوط ہو۔ اصل تبدیلی ذہن کی ہی ہوتی ہے۔ تم نے اپنی خوراک اور اپنا وزن بڑھایا ہے۔"

"سچ کہوں تو مجھے لگتا ہے کہ اب راج کنور جیسے شخص کو میں آسانی سے شکست دے سکتی ہوں۔"

"جسمانی شکست ممکن ہے لیکن تم بھول رہی ہو راج کنور کی اصل طاقت اس کی حیثیت اور اس کے آدمی ہیں۔ اس لیے صرف جسمانی شکست کوئی معنی نہیں رکھتی ہے۔ جب تک تم اپنا ذہن بھی استعمال نہیں کرو گی اس پر حاوی نہیں آ سکتی ہو۔"

مقررہ وقت پر منشی جی اور ایک نیا گارڈ مجھے لینے آئے۔ کمرے کے باہر اب بھی وہی گورکھا ہوتا تھا لیکن آنے جانے کے لیے یہ نیا گارڈ تھا۔ شاید یہ بڑے کنور کا اعتماد کا آدمی تھا اور وہی کرتا جو بڑا کنور کہتا۔ حسب معمول میرا خون نکالا گیا اور پھر مجھے واپس کمرے میں چھوڑ دیا گیا۔ بانو اپنے کمرے میں تھی لیکن دروازہ بند ہوتے ہی وہ آئی۔ اس کا سرخ چہرہ اور تیز سانس بتا رہی تھی کہ وہ ہیجان میں تھی اور یقیناً کوئی خاص بات ہوئی تھی۔ اس نے اشارہ کیا اور میں اس کے ساتھ واش روم میں آیا۔ واش روم میں جاتے ہوئے میں کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیتا تھا تاکہ کوئی اچانک اندر نہ آ سکے۔ شاور چلاتے ہی بانو نے میرے کان میں کہا۔ "آپ کے جانے کے بعد راج کنور پھر آیا تھا۔"

میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہونے لگی۔ "کیا کہہ رہا تھا وہ؟"

بانو کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔ "وہ ذلیل شخص اس لیے آیا کہ....." وہ کہتے کہتے رک گئی۔ "آپ جانتے ہیں نا وہ کیا چاہتا ہے؟"

میں اچھی طرح جانتا تھا کہ راج کنور کیا چاہتا تھا لیکن مجھے بانو کا انداز اچھا لگا۔ اس نے رونے یا روہانسا ہونے کے بجائے طیش اور تندی کے ساتھ مجھے بتایا تھا۔ وہ غصے میں تھی اور میں یہی چاہتا تھا۔ وہ اپنی جذباتیت کو کمزوری کے بجائے اپنا ہتھیار بنا لے۔ "میں سمجھ رہا ہوں وہ کس قسم کا شخص ہے اور کیا کہہ سکتا ہے۔ یہ بتاؤ تم نے کیا جواب دیا؟"

"دل تو چاہ رہا تھا کہ اسے ہاتھوں سے جواب دوں وہ اکیلا اندر آیا تھا لیکن باہر اس کے چیلے یقیناً موجود تھے۔ اس لیے میں نے صبر سے کام لیا میں نے اسے کہا۔ "میں اس کے قبضے میں ہوں وہ چاہے تو مجھے زبردستی ....حاصل کر سکتا ہے لیکن اپنی خوشی سے میں مر کر بھی اس کے پاس نہیں آؤں گی۔"

”تم نے بالکل ٹھیک جواب دیا۔ اس کا کیا ردعمل تھا۔“

”اس کی صورت بگڑ گئی تھی۔ کہنے لگا کہ میں چاہوں یا نہ چاہوں مجھے اس کی خواہش پوری کرنا ہی پڑے گی۔“

”بانو ابھی وہ اپنے بھائی کی وجہ سے مجبور ہے۔ اس وجہ سے باتوں سے کام نکالنے کی کوشش کر رہا ہے جب اس پر بھائی کا دباؤ نہیں رہے گا تو وہ طاقت کے استعمال پر اتر آئے گا۔“

”میں کیا کروں، مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔“

”ڈرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”یہ بتاؤ تمہارے پاس کوئی پنسل جیسی لمبی اور نوکیلی چیز ہے۔“

”نہیں ایسی کوئی چیز....“ وہ کہتے کہتے رکی جیسے اسے کچھ یاد آیا ہو۔ ”ہاں جوڑے والی سلاخ ہے۔ یہ پانچ انچ لمبی اور سخت لکڑی کی بنی ہوئی ہے ایک طرف نوک ہے۔“

”اسے لے کر آؤ۔“

بانو اپنے کمرے سے جوڑا سلاخ لے آئی۔ یہ ایک طرف سے خاصی نوکیلی تھی اگر اسے قوت سے مارا جاتا تو یہ جسم کے نرم حصے میں گھس سکتی تھی، جیسے گردن میں۔ اس کے دوسری طرف والا حصہ کسی قدر گول چھوٹے سائز کے اخروٹ جیسا تھا۔ میں نے اخروٹ والا حصہ ہتھیلی میں رکھ کر سلاخ درمیانی انگلی سے نکالی۔ یوں میرے گھونسے پر ایک نوکدار ہتھیار کا اضافہ ہو گیا تھا میں نے بانو سے پوچھا۔ ”کیسا ہے؟“

اس نے اشارے سے بتایا کہ بہترین ہے۔ میں نے وار کرنے کا بتایا کہ اس سے کس طرح کام لیا جا سکتا ہے۔ اسے سمجھایا کہ وہ اسے جوڑے سے اچانک نکال کر کس طرح سامنے والے کے حلق میں اتار سکتی تھی۔ یہ وار نہ صرف کسی کو موت کے گھاٹ اتار سکتا تھا بلکہ اسے مرنے سے پہلے خاموش بھی کرا دیتا۔ بانو نے اس کی مشق کی اور خوش نظر آنے لگی اس نے مبہم انداز میں کہا۔ ”یہ بہت زبردست ہے۔“

”بس تو اس کی مشق کرتی رہو۔“

بار بار واش روم میں جانا راج کنور کو مشکوک کر سکتا تھا اس لیے بانو نے متبادل طریقہ نکالا۔ اس نے اوشا سے رف پیڈ اور پنسل حاصل کر لی تھی۔ اب ہم اس سے لکھ کر بات کر سکتے تھے۔ بانو نے مجھ سے اوشا کے بارے میں پوچھا۔ ”وہ کیوں نہیں آ رہی ہے؟“

میں نے جواب لکھا۔ ”ممکن ہے راج کنور کے خیال میں وہ ناکام رہی ہو اور اس نے اسے دوبارہ نہ بھیجا ہو۔“

”مجھے گڑبڑ لگ رہی ہے۔ راج کنور کا یہاں آنا ٹھیک نہیں ہے۔ فرض کریں وہ کوئی سازش کر جاتا ہے مجھے اور آپ کو نقصان پہنچا دیتا ہے تو اس کا بھائی اسے مار تو نہیں دے گا یا اس سے تعلق ختم نہیں کر لے گا۔“

میں نے تائید کی۔ ”سامنے کی بات ہے، بڑے کنور کے لیے بھائی زیادہ اہم ہے۔“

”اس لیے مجھے لگ رہا ہے کوئی گڑبڑ ہے، ہمیں ہوشیار رہنا چاہیے۔“

”ہم اس سے زیادہ اور کیا ہوشیار ہو سکتے ہیں؟“

اس نے تجویز دی۔ ”ہمیں اپنے کمروں کے دروازے اندر سے بند رکھنے چاہئیں۔“

”میں ایسا ہی کرتا ہوں۔“

سچی بات ہے میں بھی محسوس کر رہا تھا کہ میرے اردگرد کچھ زیادہ ہی سناٹا طاری تھا۔ ایسا سناٹا جیسا کہ طوفان آنے سے پہلے ہوتا ہے۔ راج کنور اور اس کے دونوں دست راست یعنی نائیک اور رامن میرے جانی دشمن تھے اور وہ بالکل چپ تھے۔ اگر وہ کچھ کر نہیں پا رہے تھے تب بھی چھیڑ تو کر سکتے تھے۔ راج بانو سے بات کرنے آیا تھا مگر مجھے اس نے نائیک سے مقابلے کے بعد بالکل نظر انداز کر رکھا تھا۔ اس بار بھی نصف لیٹر خون لینے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑا تھا میں نے ایکسرسائز معمول کے مطابق کیں اور مجھے کمزوری محسوس نہیں ہوئی تھی۔ البتہ بھوک کچھ زیادہ ہی کھل کر لگ رہی تھی۔ رات کے کھانے کے لیے بانو آئی تو اس نے ریشم جیسے کپڑے کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ یہ ٹراؤزر نما پاجامے اور کرتے نما شرٹ پر مشتمل تھا لیکن ساتھ میں بڑا سا دوپٹا تھا۔ وہ رف پیڈ اور پین ساتھ لائی تھی۔ پچھلا لکھا ہوا پھاڑ کر فلیش میں بہا دیتی تھی۔ دل نواز خان کے جانے کے بعد اس نے لکھا۔

”آج آپ کا خون لیا گیا، یہاں کوئی دھوکا تو نہیں کر رہے ہیں؟“

”بہ ظاہر تو ایسا نہیں لگ رہا ہے کیونکہ میں کمزوری محسوس نہیں کر رہا ہوں۔ جب کہ ممتاز ہاؤس میں جب میرا کئی گنا زیادہ خون لیا جا رہا تھا تب میں شدت سے کمزوری محسوس کرتا تھا۔“

”پھر بھی آپ محتاط رہیے گا۔“ اس نے لکھا اور منہ سے بولی۔ ”آج میں نے نیا سوٹ پہنا ہے۔“

”یہ تم پر اچھا بھی لگ رہا ہے۔“ میں نے تعریف کی تو وہ خوش ہو گئی۔ وہ لیے دیے رہتی تھی لیکن تعریف تو ہر عورت اور لڑکی کو اچھی لگتی ہے۔

”اوشا نہیں آئی کئی دن سے اس سے کچھ کام بھی تھا۔“

”ضروری نہیں ہے وہ آئے اگر تمہیں کام ہو تو گارڈ سے کہہ کر اسے بلا لیا کرو۔“

”کل بلا لوں گی۔ اگر آپ کو کچھ چاہیے تو بتا دیں میں اس سے کہہ دوں گی۔“

”اس سے کہنا کچھ صاف تولیے لا دے اور ایک نائٹ سوٹ مزید منگوا لینا اسی ناپ کا ہو۔ یہ میلا ہو گیا ہے اور اس کے علاوہ کوئی اور نائٹ سوٹ نہیں ہے۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”میں کہہ دوں گی۔“

کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ دل نواز خان برتن لینے آیا تو مجھے نیند آ رہی تھی۔ سستی اور ہلکی سی تھکن کا احساس تھا۔ شاید یہ خون دینے کا نتیجہ تھا۔ میں اندر سے دروازہ بند کر کے بستر پر لیٹا اور چند لمحے بعد ہی گہری نیند میں ڈوب گیا تھا۔ مجھے ہلکا سا شبہ بھی نہیں ہوا کہ کھانے میں کوئی چیز شامل تھی جس نے غیر محسوس انداز میں مجھے سونے پر مجبور کر دیا تھا۔ میری آنکھ کھلی تو ناک میں کسی تیز چبھنے والی بو موجود تھی۔ مجھے چھینک آئی اور میں اٹھ بیٹھا۔ فوراً ہی چکر آیا تھا اور کھلی آنکھوں کے سامنے کمرا ڈولتا ہوا لگا تھا مگر زور سے سانس لینے پر وہی تیز چبھتی بو آئی اور اس نے یک دم ذہن صاف کر دیا۔ اس بار میں نے واضح انداز میں دیکھا۔ میرے پاس وہی گورکھا گارڈ کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی شیشی تھی اور اسی سے وہ چبھنے والی تیز بو اٹھ رہی تھی۔ بو امونیا کی تھی۔ گارڈ میرے ہوش میں آتے ہی پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اس کے پیچھے اوشا کھڑی تھی۔

”یہ کیا ہے تم اندر کیسے آئے؟“ میں نے سر جھٹک کر کہا۔ مگر گورکھا گارڈ میرے سوال کا جواب دیے بغیر باہر چلا گیا تھا اور پھر رامن اندر آیا۔

”ہوش آ گیا تمہیں؟“ اس نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔ اب مجھے گڑبڑ کا احساس ہو رہا تھا۔ اتنی رات گئے گورکھا گارڈ، اوشا اور پھر رامن کا کمرے میں آنا اور مجھے ہوش آنے سے پہلے کانوں کان خبر نہ ہونا کسی بڑی گڑبڑ کی نشان دہی کر رہے تھے۔ یقیناً اس سے پہلے میں بے ہوش تھا۔ میں نے بستر سے اٹھنا چاہا تو رامن نے پستول نکال لیا اور سخت لہجے میں بولا۔ ”اپنی جگہ بیٹھے رہو۔“
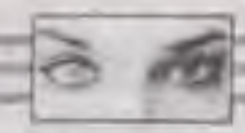
میں واپس بیٹھ گیا اور اوشا کی طرف دیکھا۔ ”اوشا یہ سب کیا ہے؟“

مگر اوشا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ مخصوص انداز کی ساڑی میں تھی اور اس کی آنکھیں کسی ناگن کی طرح چمک رہی تھیں۔ اس نے جواب نہیں دیا خاموش کھڑی رہی۔ اچانک مجھے بانو کا خیال آیا۔ ”رامن، بانو کہاں ہے؟“

”اپنے کمرے میں نہیں ہے۔“ اس نے جواب دیا، لہجے میں واضح شرارت تھی۔ اس بار میں اس کی پروا کیے بغیر اٹھا اور بانو کے کمرے تک آیا وہ کمرے میں نہیں تھی میں نے واش روم بھی چیک کر لیا۔ میں واپس کمرے میں آیا تو میری رگوں میں خون کی جگہ کوئی گرم سی چیز دوڑ رہی تھی۔ میں نے رامن سے پوچھا۔

”بانو کہاں ہے؟“

جواب میں اس نے ٹی وی کا ریموٹ اٹھا کر اسے آن کیا اور پھر ایک چینل لگایا۔ میں اچھل پڑا تھا کیونکہ ایک شاہانہ قسم کے بیڈ روم میں گول جہازی سائز بیڈ پر بانو بے حس و حرکت لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے وہی ریشمی لباس پہنا ہوا تھا جو بغیر دوپٹے کے اس کے جسم کے ساتھ لگ کر اسے نمایاں کر رہا تھا۔ سانسوں کی آمد و رفت کے ساتھ ڈوبتا ابھرتا جسم بتا رہا تھا کہ وہ سو رہی ہے یا بے ہوش ہے۔ میری رگوں میں آگ بڑھ رہی تھی۔ میں نے دانت پر دانت جماتے ہوئے پوچھا۔ ”رامن یہ کہاں ہے۔“

”راج جی کے بیڈ روم میں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”لیکن یہ محفوظ ہے اور صبح تک محفوظ رہے گی اگر تم نے....“

”کیا میں نے....؟“

رامن کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ”اگر تم نے اوشا کے ساتھ رات گزار لی تو....“

(جاری ہے)

اندھیرے اجالے

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم!
بینا نابینا نمبر کا اشتہار ماہنامہ پاکیزہ میں دیکھا تو اپنی روداد لکھ بھیجنے پر غور کرنے لگی۔ میں کوئی رائٹر نہیں ہوں، ہاں ڈائجسٹ پڑھنے کا شوق بہت ہے پھر بھی اپنی کہانی لفظ بہ لفظ لکھ رہی ہوں۔ امید ہے آپ کو بھی پسند آئے گی۔
رانی
(سکھر)

میں جھاڑیوں میں دبکی ہوئی تھر تھر کانپ رہی تھی اور دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی کہ مجھے نظر آنے لگے۔ مگر میری آنکھوں کے آگے تاریکی تھی۔ آس پاس درندوں کی طرح پھرتے لوگوں کی آوازیں، جن میں حیوانی غراہٹیں نمایاں تھیں، مجھے تلاش کر رہی تھیں اور اگر میں ان کو مل جاتی تو میرے ساتھ بہت برا ہوتا۔ وہ سب ہوتا جس سے میں بچ کر بھاگی تھی۔ مگر ایسا لگ رہا تھا کہ جلد میں پکڑی جاؤں گی۔ کیونکہ وہ سب آنکھوں والے تھے اور میں بنا آنکھوں کی تھی۔

مگر اللہ چاہتا تو مجھے آنکھیں مل جاتیں۔ ایک بار مجھے آنکھیں مل جاتیں تو میں ان سے بچ سکتی تھی، کہیں جا کر پناہ لے سکتی تھی۔ مگر یہاں میری نظروں کے سامنے بدستور گہرے سیاہ بادل تھے۔

☆☆☆

میں پیدا ہوئی تو اماں اور بابا نے بہت خوشی منائی تھی۔ میں ان کی شادی کے پندرہ سال بعد پیدا ہوئی تھی اور بہ ظاہر بالکل ٹھیک ٹھاک لگ رہی تھی۔ خوب صورت اور پیارے نقوش والی بچی تھی۔ مجھ سے پہلے میرے سات بہن بھائی پیدا ہوئے جن میں سے چار مردہ اور ادھورے تھے۔ تین جو زندہ پیدا ہوئے وہ بھی چند دن یا چند ہفتے زندہ رہ کر چل بسے۔ ان میں بھی نقص تھا۔ ڈاکٹروں کے مطابق وہ زندہ رہتے تو ابنارمل رہتے۔ اس لیے ان کا مر جانا ہی بہتر تھا لیکن یہ تو کوئی میرے ماں باپ سے پوچھتا کہ اولاد کا مر جانا کیسا ہوتا ہے۔ پورے نو مہینے ماں باپ کیسے کیسے خواب دیکھتے ہیں اور جب اس خواب کی بھیانک تعبیر سامنے آتی ہے تو اپنی اولاد کے ساتھ وہ بھی مر جاتے ہیں۔ اوپر سے زندہ رہتے ہیں مگر اندر سے مر جاتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی اس اولاد کو ساری عمر نہیں بھولتے جو پیدا ہو کر مر جائے اور اس کے بعد بے شک اللہ انہیں کئی صحت مند بچے عطا کرے۔ دس بچے بھی ایک اولاد کا غم کم نہیں کر سکتے۔ اماں اور بابا کے تو سات بچے اس طرح سے آ کر چلے گئے۔

ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ یہ مسلسل خاندان میں شادیوں کا نتیجہ تھا۔ کئی صدیوں سے ہمارے خاندان میں آپس میں شادیاں ہو رہی تھیں اور باہر شادی کا کوئی رواج نہیں تھا۔ بلکہ خاندان سے باہر شادی کرنا کسی گناہ سے کم نہیں سمجھا جاتا تھا۔ چاہے اس کے لیے بے جوڑ اور بے تکی شادیاں کیوں نہ کرنی پڑیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خاندان محدود ہوتا چلا گیا اور اماں اور بابا تک آتے آتے خاندان میں بس چند لوگ بچے تھے اور ان میں سے بھی اکثر بوڑھے ہو چکے تھے۔ شادی شدہ جوڑا جو خاندان کی نسل آگے چلا سکتا تھا وہ اماں اور بابا تھے۔ اصل میں ہم سید خاندان سے ہیں۔ کئی صدی پہلے جب ہمارے آباؤ اجداد وسط ایشیا سے آ کر سندھ میں آباد ہوئے تو اس وقت ان کا اوڑھنا بچھونا علم تھا۔ وہ پڑھتے اور پڑھاتے تھے، خاص طور سے دین کا علم سکھاتے تھے۔ پھر ان کو حکمرانوں کی طرف سے کچھ زمین ملی اور خاندان کے لوگ کاشت کاری بھی کرنے لگے۔

پھر رفتہ رفتہ علم سے دلچسپی کم ہوتی گئی اور زمین سے تعلق بڑھ گیا۔ ایک زمانے میں سب سے بڑا خاندان اور سب سے زیادہ زمین والا ہمارا خاندان تھا۔ پھر خاندان اور زمین دونوں سکڑنے لگے تھے۔ بابا تک آتے آتے مشکل سے چند ایکڑ زمین بچی تھی۔ جس سے ہمارا عزت کے ساتھ گزارہ ہو جاتا تھا۔ ہم سکھر شہر سے کچھ دور رہتے تھے۔ یہاں زمین کے ساتھ پہلے بڑی سی حویلی تھی مگر جب خاندان کم ہوا اور زمین بھی کم رہ گئی تو بابا نے اس کا کچھ حصہ چھوڑ کر باقی زمین کو باغ میں بدل دیا تھا۔ یہاں کھجور کے درخت لگائے تھے۔ زمین پر کاشت کرنے کے ساتھ بابا سرکاری اسکول میں ٹیچر بھی تھے۔ اسکول تو بس ایسے ہی چلتا تھا۔ زیادہ تر بند پڑا رہتا تھا اور ٹیچر گھر بیٹھے تنخواہ وصول کرتے تھے۔ اصل میں مقامی وڈیروں کا حکم تھا کہ اسکول کو بس نام نہاد چلایا جائے اور یہاں طلبا کو تعلیم نہ دی جائے۔ اسکول پرائمری تھا اور پڑھے بغیر سو فیصد طلبا پاس ہو جاتے تھے اس لیے لوگ بھی بچوں کو اسکول نہیں بھیجتے تھے۔ بابا کو یہ سب اچھا نہیں لگتا تھا مگر وہ کیا کر سکتے تھے۔

میں پیدا ہوئی تو اماں اور بابا کو ہمہ وقت یہی خطرہ رہتا تھا کہ میں بھی اپنے بہن بھائیوں کے نقشِ قدم پر نہ چل پڑوں۔ وہ میرا بہت خیال رکھتے تھے۔ میرا نام رانی رکھا گیا تھا کیونکہ میں ان کے دلوں کی رانی تھی۔ مگر جب میں ایک سال کی ہو گئی تو انہیں اطمینان ہوا۔ اس وقت تک میں چلنے پھرنے کے لائق ہو گئی تھی مگر چیزوں سے بہت ٹھوکر کھاتی تھی اور گرتی پڑتی رہتی تھی۔ اماں بابا اس بات سے بہت پریشان تھے۔ ان کو کبھی خیال بھی نہیں آیا کہ میری آنکھوں میں بھی کوئی مسئلہ ہو سکتا ہے کیونکہ میری آنکھیں بہت خوب صورت اور شفاف تھیں۔ بہ ظاہر ان میں کوئی نقص نہیں تھا۔ ایک سال کی ہونے پر بابا نے مجھے سکھر کے ایک اسپتال میں لے جا کر دکھایا تو انکشاف ہوا کہ مجھے دکھائی نہیں دیتا ہے اور عجیب بات یہ تھی کہ آنکھوں میں کوئی نقص نہیں تھا۔ میری آنکھیں بالکل ٹھیک تھیں اس کے باوجود میں دیکھ نہیں سکتی تھی۔

ڈاکٹروں نے بابا سے کہا۔

"بچی کی آپٹک نرو میں کوئی مسئلہ ہے آپ اسے کراچی کے کسی بڑے آئی اسپتال میں دکھائیں۔"

یہ سن کر بابا پریشان ہو گئے تھے کیونکہ ہم مالی طور پر اتنے مضبوط نہیں تھے کہ بابا مجھے لے جا کر کراچی میں میرا

علاج کراتے۔ بہر حال میں ان کی اکلوتی اولاد تھی اور اگر میرے علاج کے لیے انہیں اپنا سب فروخت کرنا پڑتا تو وہ اس سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ جب بابا نے اماں کو ڈاکٹر کی بات بتائی تو وہ پریشان ہو گئیں پھر انہوں نے کہا۔ ”سائیں، رانی کبھی کبھی تو بہت گرتی ہے جیسے اسے کچھ نظر نہیں آ رہا ہو اور کبھی کبھی بالکل ٹھیک چلتی ہے جیسے سب نظر آ رہا ہو۔“

یہ سن کر بابا کو امید ہوئی تھی کہ شاید ڈاکٹر کی بات غلط ہو اور مجھے کچھ کچھ نظر آتا ہو۔ اس وقت میں اتنی چھوٹی تھی کہ اماں اور بابا کو نہیں سمجھا سکتی تھی کہ کبھی مجھے نظر آتا تھا اور کبھی بالکل نظر نہیں آتا تھا۔ جب نظر آتا تو بالکل صاف دکھائی دیتا اور جب نظر نہیں آتا تو آنکھوں کے سامنے تاریک پردہ چھا جاتا۔ جس کے پار ہلکی سی جھلک بھی نظر نہیں آتی تھی اور نہ ہی روشنی کا احساس ہوتا تھا۔ میں اتنی چھوٹی تھی کہ اس بات سے پریشان بھی نہیں ہوتی تھی۔ کچھ عرصے بعد کھجور کی فصل اتری تو بابا نے رقم ہاتھ میں آتے ہی مجھے اور اماں کو لے کر کراچی کا رخ کیا۔ یہاں مجھے ایک اچھے آنکھوں کے اسپتال میں دکھایا تو یہاں بھی ڈاکٹروں نے وہی بات کی کہ میری آنکھیں بالکل ٹھیک تھیں لیکن ان کے پیچھے آپٹک نرو میں کوئی مسئلہ تھا جس کی وجہ سے مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔ انہوں نے اماں کے شبہے کی تصدیق کی کہ شاید کبھی کبھی مجھے نظر آتا ہوگا لیکن میری یہ بینائی کس حد تک تھی وہ یہ نہیں بتا سکتے تھے۔ ان کے پاس میری بیماری کا کوئی علاج نہیں تھا۔ بے چارے اماں اور بابا جیسے مجھے لے کر گئے تھے ویسے ہی واپس لے آئے۔

جب میں ذرا بڑی ہوئی اور مجھے بات کرنی آئی تو میں نے بتایا کہ مجھے کبھی کبھی نظر آتا ہے لیکن اکثر نظر نہیں آتا تھا۔ یوں سمجھ لیں کہ اگر مجھے دو گھنٹے نظر آتا تھا تو اس کے بعد بائیس گھنٹے نظر نہیں آتا تھا۔ پھر نظر آنے یا نہ آنے کا کوئی وقت مخصوص نہیں تھا، کبھی اچانک ہی نظر آنا شروع ہو جاتا اور پھر اچانک ہی بند ہو جاتا۔ کبھی دن میں دو تین بار نظر آتا تھا اور کبھی دو تین دن تک کچھ نظر نہیں آتا۔ جب تک بچی تھی مجھے اس کا اتنا احساس نہیں تھا مگر جب بڑی ہونے لگی اور خاص طور سے جب بابا نے اسکول میں داخل کرایا تو مجھے بہت مشکل ہونے لگی۔ ابھی اچھی بھلی میں دیکھ رہی ہوتی تھی اور اچانک ہی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا تھا۔ روشن دنیا کے بعد دن میں ایسی تاریکی کیسے دل کو خوف اور گھبراہٹ سے بھر دیتی ہے یہ صرف وہی جانتا ہے جس پر گزرتی ہے۔ اسکول جانے کا موقع کم ملتا تھا کیونکہ آئے دن چھٹیاں ہوتی تھیں اور پھر تعلیم کا معیار بھی خاص نہیں تھا اس پر بھی جب اسکول کھلتا تو عام طور سے میں دیکھنے سے قاصر ہوتی تھی۔

بابا نے اس کا حل یہ نکالا کہ مجھے اسکول جانے سے روک دیا۔ ایک تو نابینا ہونے کے بعد مجھے مسئلہ ہو جاتا تھا میں دوسروں کے سہارے کی محتاج ہو جاتی تھی، دوسرے وہاں پڑھائی ہی نہیں ہوتی تھی۔ بابا نے مجھے خود گھر میں پڑھانا شروع کر دیا۔ وہ خود کالج سے گریجویٹ تھے اس لیے مجھے آسانی سے پڑھا سکتے تھے پھر وہ تقریباً ہر وقت گھر میں رہتے تھے اس لیے جیسے ہی مجھے نظر آنا شروع ہوتا وہ پڑھانے بیٹھ جاتے تھے۔ اماں بہت چیختی تھیں کہ بچی کو کچھ اور کرنے دو مگر بابا اس معاملے میں ان کی ایک نہیں سنتے تھے۔ وہ اماں سے کہتے۔ ”یہ تعلیم ہی اس کے کام آئے گی جب ہم نہیں ہوں گے۔“

آج میں سوچتی ہوں تو بابا ٹھیک کہتے تھے۔ دن میں جو دو تین گھنٹے دکھائی دیتا تھا بابا مجھے پڑھنے میں لگاتے تھے۔ چھ سال کی عمر میں وہ پھر مجھے کراچی آنکھوں کے اسپتال لے گئے تھے اور جب ڈاکٹروں کو پتا چلا کہ مجھے کبھی بالکل ٹھیک نظر آتا ہے تو وہ حیران ہوئے تھے اور صرف میری نظر چیک کرنے کی خاطر انہوں نے مجھے اسپتال میں روکا اور جیسے ہی مجھے نظر آنا شروع ہوا انہوں نے مختلف طریقوں سے میری آنکھوں کا معائنہ کیا تھا اور نظر بھی چیک کی۔ وہ اور حیران ہوئے جب میری نظر بالکل درست پائی گئی اور مجھے ہر چیز واضح دکھائی دے رہی تھی۔ چیزوں کے رنگ بھی بالکل ٹھیک نظر آ رہے تھے۔ مجھے یاد ہے ایک خوب صورت سے داڑھی والے ڈاکٹر انکل نے بابا سے کہا۔

”شہاب صاحب، میری نظر سے آج تک ایسا کیس نہیں گزرا ہے، مجھے لگ رہا ہے اس کی آپٹک نرو کے ساتھ بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ دماغ میں جو حصہ دیکھنے والا ہوتا ہے وہاں کوئی گڑبڑ ہے۔“

”تو ڈاکٹر صاحب اس کے لیے کچھ کریں۔“ بابا پڑھے لکھے تھے اس لیے وہ ڈاکٹر کی بات سمجھ رہے تھے۔

”اگر ہمارے بس میں کچھ ہوتا تو ہم ضرور کرتے لیکن یہ دماغ کا معاملہ ہے اور وہ بھی اندر کا، آپ بتائیں ہم اس کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟“ ڈاکٹر نے بے بسی سے کہا۔ ”اس مرض کے لیے تو دوائیں تک نہیں ہیں۔“

بابا مجھے واپس لے آئے۔ انہوں نے پہلے ہی اپنی بساط سے بڑھ کر میرا علاج کرانے کی کوشش کی تھی مگر ڈاکٹروں نے صاف جواب دے دیا تو اب وہ کیا کر سکتے تھے؟ ڈاکٹروں سے مایوس ہو کر حکیموں، ہومیو پیتھک اور روحانی علاج کی کوشش بھی کی لیکن مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ میں اسی طرح اندھیروں اجالوں میں بڑی ہوتی چلی گئی۔ پرائمری تک میں بابا والے اسکول میں پڑھتی رہی اور ہر سال اول آتی تھی۔ مگر اس لیے نہیں کہ بابا وہاں ٹیچر تھے بلکہ میں اپنی ذہانت سے امتحان دیتی تھی۔ پڑھنے میں شروع سے تیز تھی۔ میری یادداشت ایسی تھی کہ جو چیز ایک بار پڑھتی یا سنتی وہ مجھے ازبر ہو جاتی تھی اور شاذ ہی ایسا ہوتا تھا کہ مجھے دوبارہ اسے دیکھنے یا سننے کی ضرورت پیش آئے۔ بابا اس بات سے بہت خوش اور حیران ہوتے تھے، وہ اکثر کہتے۔

”رانی تُو تو کمپیوٹر ہے۔“

آج سے پندرہ سال پہلے شہروں میں بھی کمپیوٹر عام نہیں تھا اور اسے دفتر کی مشین سمجھا جاتا تھا۔ گاؤں دیہات میں بہت کم لوگوں نے اس کا نام سنا تھا مگر بابا جانتے تھے۔ جب میں ان سے پوچھتی کہ کمپیوٹر کیا ہوتا ہے تو وہ مجھے بتاتے تھے مگر اس وقت میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ جب پڑھنے کے قابل ہو گئی تو بابا مجھے رسالے لا کر دیتے تھے۔ جب دیکھنے کے قابل ہوتی تو انہیں پڑھتی تھی۔ خود بابا بھی ہر مہینے سکھر جا کر ڈھیروں رسالے، اخبارات اور کتابیں لے آتے تھے۔ پھر سارے مہینے انہیں پڑھتے تھے۔ شروع میں انہوں نے مجھے بچوں والے رسالے لا کر دیے۔ پھر میں کچھ بڑی ہوئی تو بابا جو رسالے لاتے تھے وہ بھی پڑھنے لگی۔ مگر اماں اور بابا سے چھپ کر، کیونکہ وہ سمجھتے کہ میں ابھی اتنی بڑی نہیں ہوئی ہوں لیکن میری ذہنی بڑھوتری ان کے اندازے سے زیادہ تھی۔ میں جو پڑھتی تھی وہ سمجھتی بھی تھی۔

جیسے جیسے بڑی ہو رہی تھی میری بینائی کا دورانیہ بھی کسی قدر بڑھ گیا تھا، اب اوسطاً چوبیس میں سے چار پانچ گھنٹے بینائی والے ہوتے تھے اور باقی وقت تاریکی میں گزرتا تھا۔ اسکول جانے والی عمر میں مجھے اس چکر سے وحشت ہوئی تھی مگر جیسے جیسے بڑی ہوتی گئی اور دنیا کے بارے میں جانتی گئی تو میری وحشت کم ہوتی گئی۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ اس دنیا میں لاکھوں نہیں کروڑوں لوگ ایسے ہیں جو بالکل نہیں دیکھ پاتے ہیں۔ مجھے تو قدرت نے پھر بھی کچھ بینائی دی تھی۔ میں اس نعمت سے بالکل تہی دست نہیں تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ دیکھنا

کتنی خوب صورت بات ہے۔ اس لیے مجھے جو چند گھنٹے ملتے تھے اس کے بعد میں آنے والے اندھیروں پر صبر کر لیتی تھی۔ پہلے مجھے خوف ہوتا تھا کہ کہیں ایک بار تاریکی ہونے کے بعد روشنی آئے ہی نا تو میں کیا کروں گی۔ اب مجھے تاریکی سے خوف کم آتا تھا مگر جب یہ تصور آتا کہ مجھے اس کے ساتھ ساری عمر گزارنی پڑے گی تو میرا دل رکنے سا لگتا تھا اور میں بے اختیار اللہ سے دعا کرتی کہ میری تھوڑی سہی لیکن بینائی برقرار رہے۔

میں تاریکی والے حصے میں سوتی، کھاتی پیتی اور ایسے کام کرتی تھی جو میں دیکھے بغیر بھی کر سکتی تھی۔ اگر کرنے کو کچھ نہ ہوتا تو صحن میں نیم کے درخت سے لگے لکڑی کے صوفہ نما جھولے پر بیٹھ جاتی اور پرندوں کی چہکاریں سنتی۔ مجھے یہ چہکاریں بہت اچھی لگتی تھیں۔ بابا نے میری دلچسپی دیکھ کر میرے لیے کچھ پرندے لادیے تھے۔ ان کی دیکھ بھال میں کرتی تھی اور جب تاریکی ہوتی تو ان کے پاس آجاتی۔ ان سے باتیں کرتی۔ جب روشنی ہوتی تو میں پڑھتی تھی یا اماں اور بابا کو دیکھتی۔ مجھے ان دونوں کو دیکھنا بہت اچھا لگتا تھا۔ میں ان کے تقریباً بڑھاپے کی اولاد تھی۔ جب میں پیدا ہوئی تو بابا چالیس سال کے اور اماں اڑتیس سال کی تھیں۔ بچوں کے غم اور میری فکر نے ان کو قبل از وقت بوڑھا کر دیا تھا۔ مگر وہ مجھے دنیا میں سب سے اچھے لگتے تھے۔ جب اماں کہتیں کہ میں شادی کر کے ان سے دور چلی جاؤں گی تو میرے دل میں شادی کا اشتیاق نہیں آتا تھا اس کے بجائے اماں اور بابا سے دوری کے خیال سے مجھے رونا آجاتا تھا۔

مگر جب میں چودہ پندرہ سال کی ہوئی اور ان تبدیلیوں سے روشناس ہوئی جو ہر جوان ہوتی لڑکی کا مقدر ہوتی ہیں تب مجھے معلوم ہوا کہ مجھے یہاں سے جانا ہی ہوگا، یہ بھی ہر لڑکی کا مقدر ہوتا ہے کہ وہ بالآخر ماں، باپ کو چھوڑ کر کسی اجنبی یا جانے پہچانے شخص کے ہمراہ چلی جاتی ہے۔ اماں بابا کے مقابلے میں زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھیں شاید پرائمری ہی پاس کی تھی مگر ویسے بہت سوجھ بوجھ تھی۔ اماں نے مجھے زمانے کی اونچ نیچ اور احتیاطوں کے بارے میں بتایا جو ہر ماں کو اپنی جوان ہوتی بیٹی کو بتانی چاہیے۔ میں ذہین تھی اس لیے اماں کی بات آسانی سے سمجھ جاتی تھی۔ اس لیے اب خود بھی احتیاط کرنے لگی۔ پہلے بھی میں خود سے کبھی گھر سے باہر نہیں جاتی تھی کیونکہ کسی وقت بھی بینائی جواب دے جاتی اور میرے لیے راستہ تلاش کرنا مشکل ہو جاتا.... اب میں اماں یا بابا کے ساتھ کہیں جاتی بھی تھی تو ان کے ساتھ ہی رہتی تھی۔ ایک لمحے کو بھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑتی تھی۔ اماں تو جانتی تھیں پر بابا ہنستے۔

"رانی تو تو ہٹلر ہو جاتی ہے۔"

"بس بابا مجھے اکیلے رہنے سے ڈر لگتا ہے۔"

پرائمری کے بعد بابا نے کچھ دور واقع لڑکیوں کے ہائی اسکول میں میرا داخلہ کرا دیا۔ میں اسکول نہیں جاتی تھی۔ بابا سے گھر میں پڑھتی اور جب پیپرز دینے کا وقت آتا تو بابا مجھے ساتھ لے جاتے اور وہی میرا پیپر لکھتے تھے، میں بولتی جاتی تھی۔ البتہ جب میٹرک میں آئی تو مشکل پیش آئی تھی کیونکہ بورڈ کی طرف سے اجازت نہیں تھی اس لیے ایک آٹھویں کلاس کی لڑکی نے میرے پیپر لکھے تھے۔ اس کا بندوبست بابا نے کیا تھا۔ پندرہ سال کی عمر میں، میں نے میٹرک کر لیا تھا۔ اماں چاہتی تھیں کہ اب میں آگے نہ پڑھوں پر بابا آگے پڑھانا چاہتے تھے۔ انہوں نے اماں کو سمجھایا۔ "ذرا سوچ ہمارے خاندان میں اس کے لائق کوئی نہیں ہے۔ اگر اس کی شادی کہیں باہر کی تو ایسی لڑکی کو کون بیاہ کر لے جائے گا جسے کبھی نظر آتا ہے اور کبھی نظر نہیں آتا۔"

اماں دنگ رہ گئیں۔ "سائیں اس کی شادی باہر کرو گے ایسا ہمارے خاندان میں کب ہوا ہے؟"

"اب ہوگا۔" بابا نے سنجیدگی سے کہا۔ "ہمارے بزرگوں کی غلط رسموں نے آج اس خاندان کا نام مٹا دیا ہے۔ ہمارے بچے بھی اسی وجہ سے جیتے نہ رہے اور رانی کی آنکھوں کا مرض بھی اسی وجہ سے ہے۔ خاندان میں شادی ٹھیک نہیں ہوتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ رانی کے بچے صحت مند ہوں اسے وہ دکھ نہ ملیں جو ہم نے سہے ہیں۔"

یہ سن کر اماں کی تھوڑی بہت مخالفت بھی دم توڑ گئی کیونکہ انہیں دنیا میں سب سے زیادہ عزیز میں تھی۔ مجھ سے بڑھ کر ان کے لیے کچھ نہیں تھا۔ وہ فوراً بابا کی بات مان گئیں۔ اس وقت مجھے کچھ پتا نہیں تھا۔ یہ اماں نے مجھے بعد میں بتایا جب میں ماسٹر کر رہی تھی اور میری شادی کی بات چل رہی تھی۔ میٹرک کے بعد میں نے انٹر بھی اسی اسکول سے کیا اور پھر بابا نے سکھر کے ایک کالج میں میرا داخلہ کرا دیا۔ وہاں ایک پروفیسر بابا کے دوست تھے اس لیے مجھے داخلہ مل گیا اور میں گھر میں رہ کر پڑھنے لگی۔ میری مشکل دیکھتے ہوئے مجھے حاضری سے استثنا مل گیا تھا۔ پیپرز میں اسی طرح دیتی تھی۔ گاؤں کی کوئی لڑکی میرے ساتھ جاتی تھی۔ میں بولتی جاتی اور وہ لکھتی جاتی۔ بابا نے احتیاطاً دو تین لڑکیوں کے گھر والوں سے بات کر لی تھی کہ اگر کوئی ایک نہ جا سکے تو دوسری چلی جائے تاکہ میرا پیپر نہ رکے۔ ہمارے سید ہونے کی وجہ سے گاؤں کے لوگ عقیدت رکھتے تھے اور پھر بابا نے سب سے بہت تعلقات بنا کر رکھے تھے اس لیے لوگ ہمہ وقت کام آنے کو تیار رہتے تھے۔

گریجویشن کے دوران بھی یہی معمول برقرار رہا اور میں نے بیس سال کی عمر میں بہت اچھے نمبروں کے ساتھ گریجویشن کر لیا تھا۔ میری فرسٹ ڈویژن آئی تھی۔ اس دن بابا بہت خوش تھے انہوں نے پورے گاؤں کو مٹھائی کھلائی تھی۔ میری خواہش تھی کہ میں آگے پڑھوں۔ بابا کو بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ مگر اب میں داخلہ لے کر نہیں پڑھ سکتی تھی کیونکہ کوئی یونیورسٹی مجھے گھر میں رہ کر پڑھنے کی اجازت کہاں دیتی۔ کالج میں تو بابا کی سورس تھی اس لیے کام چل گیا۔ ماسٹر مجھے پرائیویٹ ہی کرنا تھا۔ میں نے خیر پور یونیورسٹی میں انرولمنٹ کرا لیا۔ میری تو خواہش تھی کہ کراچی یونیورسٹی سے پڑھتی لیکن وہ دور بہت تھی۔ امتحان کے دنوں میں وہاں رکنا مشکل تھا۔ خیر پور میں بابا کے ایک دوست تھے جہاں ہم رک سکتے تھے۔ اماں نے اعتراض کیا تو بابا نے کہا۔

"گھر میں بیٹھی ہے اچھا ہے کچھ پڑھ لے۔"

"کوئی رشتہ آگیا تو؟"

"تو شادی کر دیں گے پھر اس کا شوہر پڑھائے گا۔" بابا نے اماں کو مطمئن کرنے کے لیے کہا۔ یہی اماں چاہتی تھیں کہ اب میری شادی کر دی جائے۔ بابا ان سے متفق تھے مگر ابھی کوئی رشتہ نہیں تھا تو شادی کہاں سے کرتے۔ بات وہی تھی کہ خاندان میں میرے لیے کوئی رشتہ نہیں تھا اور بابا کا خاندان میں کرنے کا ارادہ بھی نہیں تھا۔ باہر سے کوئی رشتہ آیا نہیں تھا۔ ایک تو ہم مالی لحاظ سے کمزور تھے اور دوسرے میری آنکھوں کا مسئلہ تھا۔ سوائے چند قریبی لوگوں کے باقی دور کے رشتے دار اور جاننے والے مجھے مکمل نابینا ہی سمجھتے تھے۔ مجھے ماسٹر کی اجازت دے دی گئی پہلے سال کے پیپرز دینے کے لیے میں بابا کے ہمراہ کچھ پہلے ہی خیر پور آگئی۔ کیونکہ ابھی کسی ایسی لڑکی کا بندوبست بھی کرنا تھا جو میرے پیپرز لکھتی۔ اتفاق سے شمر چاچا کی بیٹی مل گئی

ادبیاتِ عالیہ میں یونان کا معروف نابینا شاعر ہومر کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ رزمیہ نظموں اوڈیسی اور ایلیڈ کے خالق ہومر اور بینائی سے محروم پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کی چند مشترک باتوں میں سے بامقصد بغاوت اور عالمگیریت کے عناصر نمایاں ہیں۔ ہومر ہزار سال قبل مسیح کی جنگی تاریخ کو اپنے اشعار میں محفوظ کرتے ہوئے دورانِ جنگ بڑی بڑی شیطانی قوتوں کے خلاف بغاوت کی منظر کشی کرتا اور مظالم کی مخالفت کرتا ہے۔ "اوڈیسی" کے خالق کا خیال ہے کہ انسان اپنے عزم و ہمت سے دیوتاؤں کے فیصلوں کو بدل سکتا ہے اسی طرح پروفیسر اقبال کے کلام سے آمرانہ نظام کے خلاف بغاوت کی بو آتی ہے۔

کوئی تو سلطنتِ جور پر شب خوں مارے
جور ہی خون بہائے یہ ضروری تو نہیں
قبائے عدل یہاں تار تار آج بھی ہے
نئی سحر کا ہمیں انتظار آج بھی ہے

ان کے اشعار سے جھلکتا ہے کہ انسان صبح شام اپنی سماجی بقا کی جنگ لڑ رہا ہے۔ اسے نہ صرف آمرانہ اور شیطانی قوتوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنا ہے بلکہ اسے اپنی تقدیر کو بھی خود سنوارنا ہے لہٰذا وہ دعا کے کلمات کو عاجزانہ شکایت کی صورت میں بارگاہِ خداوندی میں یوں پیش کرتا ہے۔

تیرے ہر کام میں ہے مصلحت پر تیری دنیا میں
کوئی بھوکا، کوئی بے گھر ذرا اچھا نہیں لگتا
کرم کی بارشوں کا اے خدا، انکار کس کو ہے
کوئی دھرتی رہے بنجر ذرا اچھا نہیں لگتا

مرسلہ: محمد ایاز راہی، مانسہرہ

انہی کے ہاں ہم رکے تھے۔ وہ کالج میں بابا کے دوست رہے تھے۔ رشنا گریجویشن کر رہی تھی۔ وہ میرے پیپرز لکھنے کو تیار ہو گئی۔ یہاں آنے سے پہلے میں نے بابا سے کہا کہ کسی کو مت بتایئے گا کہ مجھے نظر آتا ہے۔ بس یہی بتایئے گا کہ مجھے بالکل نظر نہیں آتا ہے۔ اصل میں مجھے لوگوں کے ردِعمل سے الجھن ہوتی تھی۔ یہ بات ان کے لیے عجوبے سے کم نہیں ہوتی تھی اور وہ سوال کرتے یا شک کرتے، مجھے دونوں باتیں پسند نہیں تھیں۔ اس لیے بابا نے یہاں مجھے مکمل نابینا ہی ظاہر کیا تھا۔

جس دن پیپر ہوتا بابا مجھے اور رشنا کو یونیورسٹی چھوڑتے تھے اور جب پیپر ہو جاتا تو واپس لے جاتے۔ لیکن اس دن اتفاق سے بابا جس ٹیکسی میں آرہے تھے وہ راستے میں خراب ہو گئی۔ میں اور رشنا پیپر دے کر ہال سے باہر آگئے تھے اور گیٹ کے پاس کھڑے ہو کر انتظار کر رہے تھے۔ اتفاق سے اس وقت میری آنکھیں دیکھ رہی تھیں۔ یہ بات رشنا کو نہیں پتا تھی وہ اکثر اس وقت بھی مجھے نابینا سمجھ کر میری پوری مدد کر رہی ہوتی تھی جب مجھے نظر آتا تھا۔ طلبا اور طالبات آجا رہے تھے۔ اچانک ہی ایک خوش شکل اور خوش پوش نوجوان ہماری طرف آیا۔

”معاف کیجئے گا کیا آپ کو کنوینس کی ضرورت ہے۔“

”جی نہیں ہماری گاڑی آنے والی ہے۔“ میں نے جواب دیا جب کہ رشنا نروس ہو گئی تھی۔ وہ ایک گھٹے ہوئے ماحول کی پروردہ تھی جہاں کسی غیر مرد سے بات کرنے کا تصور بھی نہیں تھا۔ مگر میں پُراعتماد تھی۔

”آپ یہیں سے آئی ہیں۔“ وہ بات کرنے پر آمادہ تھا۔

”اگر آئی بھی ہیں تو آپ کو کیا؟“ اس بار میں نے سخت لہجے میں کہا۔

”آپ تو ناراض ہو گئیں۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”میں تو آپ کی مدد کرنا چاہ رہا تھا۔“

”اگر آپ کی مدد کی ضرورت ہوئی تو ہم کہہ دیں گے۔“

”میرا نام شفیق شاہ ہے۔“ وہ بولا۔ ”میں سامنے موجود ہوں۔“

اس کے جانے پر رشنا نے سکون کا سانس لیا اور بولی۔ ”ادی یہاں یونیورسٹی میں میرے بھائیوں کے کئی جاننے والے پڑھتے ہیں اگر انہوں نے دیکھ لیا تو میری شامت آ جائے گی۔“

”کیا تمہارے بھائیوں کے جاننے والوں نے تمہیں دیکھا ہے؟“

”نہیں ادی۔“ وہ سادگی سے بولی۔ ”آپ جانتی ہیں ہمارے ہاں کتنا سخت پردہ ہے۔“

میں نے عبایا پہنا ہوا تھا لیکن منہ کھلا تھا۔ البتہ رشنا چادر میں پوری طرح لپٹی ہوئی تھی اور اس کی آنکھوں کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”جب انہوں نے دیکھا نہیں اور یہاں بھی تم پوری طرح پردے میں ہو تو دیکھنے والے کو کیا پتا چلے گا کہ تم کس کی بہن ہو۔“

وہ بے چاری شرمندہ ہو گئی۔ ”ادی مجھے خیال ہی نہیں آیا۔ اللہ ادی آپ کو نظر نہیں آتا پر آپ کتنی پُراعتماد اور حوصلے والی ہو۔ میرے تو ہاتھ کانپ رہے تھے۔“

بابا کے یہ دوست اس حد تک روشن خیال تھے کہ اپنی لڑکیوں کو تعلیم دلا رہے تھے لیکن پردے کے معاملے میں وہ اتنے سخت تھے کہ ان کی عورتوں کی ایک جھلک بھی کوئی غیر مرد نہیں دیکھ سکتا تھا۔ کچھ دیر میں بابا آگئے تو میری فکر دور ہوئی۔ ویسے میں سمجھ گئی تھی کہ ضرور گاڑی میں مسئلہ ہوا ہوگا ورنہ بابا کسی اور وجہ سے ہرگز دیر نہ کرتے۔ پیپرز دینے کے لیے ہم دو ہفتے وہاں رہے اور پھر واپس گھر آگئے۔ میرے پیپرز بہت اچھے ہوئے تھے۔ مجھے یقین تھا اس بار بھی فرسٹ ڈویژن آئے گی۔ میں آتے ہی دوسرے سال کی تیاریوں میں لگ گئی۔ میں نے ماسٹر کے لیے سندھی ادب کا انتخاب کیا تھا اور اس کے لیے مجھے بہت پڑھنا تھا جب کہ میری بینائی کم وقت کے لیے ہوتی تھی اس لیے میں اپنی ساری توجہ اسی پر دینا چاہتی تھی۔ اسی لیے جب دیکھنے کے قابل ہوتی تو کتابیں لے کر بیٹھ جاتی تھی۔

ایک رات میری آنکھ کھلی تو میں دیکھ سکتی تھی۔ دوبارہ نیند نہیں آئی اس لیے ٹیبل لیمپ جلا کر پڑھنے لگی۔ رات گہری تھی اور سناٹا تھا اس لیے مجھے ایسا لگا جیسے اماں اور بابا آپس میں بات کر رہے ہوں۔ آواز مدھم تھی لیکن مسلسل آرہی تھی۔ مجھے تعجب ہوا کہ وہ رات دو بجے کیا بات کر رہے ہیں۔ میں اٹھ کر دروازے تک آئی۔ میرا کمرا اماں اور بابا کے کمرے کے ساتھ تھا اور ایک دروازہ اس طرف بھی کھلتا تھا۔ اگر رات کو کبھی مجھے خوف محسوس ہوتا یا کوئی بات ہوتی تو میں اماں کے پاس چلی جاتی تھی۔ بابا باہر والے کمرے میں سوتے تھے۔ میں نے کان لگا کر سنا تو بابا کہہ رہے تھے۔

”رشتہ اچھا ہے..... پیسے والے لوگ ہیں اور لڑکا بھی ٹھیک ہے۔“

”پر دور کے لوگ ہیں اور لڑکا کراچی میں رہتا ہے، پتا نہیں وہاں کیا کرتا ہے؟“ اماں نے تشویش سے کہا۔

”ثمر لغاری کے توسط سے رشتہ آیا ہے۔“ بابا نے اپنے خیرپور والے دوست کا نام لیا جن کے گھر ہم رکے تھے۔ ”اس کے جاننے والے لوگ ہیں۔“

”انہیں ہمارے بارے میں کیا پتا؟“

”پتا نہیں، اصل میں وہ بھی سید ہیں اور شاید رشتے کا مسئلہ ہوگا اس لیے ثمر لغاری نے رانی کا بتایا ہوگا۔“ بابا بولے۔ ”میں تو کہہ رہا ہوں ایک بار بات کر کے دیکھ لیتے ہیں۔ رانی خوش رہے گی۔ لڑکا پڑھا لکھا بھی ہے۔“

میری خوشی کے نام پر اماں ہمیشہ مان جاتی تھیں۔ اس بار بھی وہ مان گئیں۔ ”ٹھیک ہے سائیں جیسے آپ ٹھیک سمجھیں۔ اگر رانی خوش رہے گی تو ٹھیک ہے ہم سے دور بھی رہے تو گوارا ہے۔“

”یہی تو میں کہتا ہوں اصل خوشی رانی کی ہے۔ پھر کراچی شہر میں اسے زیادہ سہولتیں ملیں گی۔“

پندرہ سولہ سال کی عمر تک مجھے شادی کا اتنا پتا نہیں تھا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اس کی فکر نہیں تھی اور جب شادی کا خیال آتا تو میں یہی سوچتی کہ میں اماں اور بابا کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ مگر جیسے جیسے ذہن پختہ ہوتا گیا اور میں جان گئی کہ شادی ایک لازمی فطری اور معاشرتی ضرورت ہے تو مجھے فکر لاحق ہو گئی کہ ایک ایسی لڑکی سے کون شادی کرے گا جو نابینا پن کا شکار ہے اور جسے بس کبھی کبھی دکھائی دیتا ہے۔ ہمارے گاؤں میں دو نابینا لڑکیاں تھیں اور دونوں ہی کی شادی نہیں ہوئی۔ ایک کی تو منگنی بھی ہو گئی تھی مگر اس کے منگیتر نے انکار کر دیا اور کچھ عرصے بعد کہیں اور شادی کر لی تو لڑکی نے مٹی کا تیل خود پر چھڑک کر خودکشی کر لی تھی۔ دوسری لڑکی اب بڑھاپے کی سرحد پر تھی اور اس کا کوئی رشتہ ہی نہیں آیا تھا۔ مجھے خیال آتا کہ ایسے ہی میرا رشتہ بھی نہیں آئے گا۔ مگر اس خیال سے مجھے تشویش نہیں ہوتی تھی بلکہ ایک طرح کا اطمینان محسوس ہوتا تھا کہ اب میں ہمیشہ اماں اور بابا کے ساتھ رہوں گی۔ میں نے یہ سوچا نہیں تھا کہ وہ میرے ساتھ ہمیشہ رہیں گے یا نہیں۔ بابا باسٹھ برس کے اور اماں ساٹھ کی ہو گئی تھیں۔ گاؤں دیہات میں یہ آخری عمر سمجھی جاتی ہے۔ کھاتے پیتے لوگوں کی بات الگ ہے لیکن عام لوگ بس اتنا ہی جیتے ہیں۔ معمولی خوراک اور علاج کی عدم دستیابی کی وجہ سے بعض اوقات چھوٹی سی بیماری بھی جان لیوا بن جاتی ہے۔

اس رات اماں اور بابا کی باتیں سن کر مجھے فکر لگ گئی تھی کہ مجھ سے کون شادی کرنے کو تیار ہو گیا۔ یقیناً ثمر چاچا نے لڑکے والوں کو میرے بارے میں بتایا ہوگا۔ پھر بابا کہہ رہے تھے کہ سید لوگ تھے اور کھاتے پیتے بھی تھے، ان کو لڑکیوں کی کیا کمی تھی۔ مگر اصل بات کا اماں اور بابا کو علم تھا۔ مجھے بے چینی لگ گئی تھی کیونکہ بابا تو راضی لگ رہے تھے۔ انہوں نے اماں کو بھی راضی کر لیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اماں جلد مجھ سے بات کریں گی اور میں اس فیصلے کو رد نہیں کر سکوں گی۔ مجھے نہیں یاد کہ اماں یا بابا نے میرے متعلق کوئی فیصلہ کیا ہو اور میرے منہ سے اس کے خلاف کچھ نکلا ہو۔

گاؤں میں میری تین چار بچپن کی سہیلیاں تھیں۔ ہم ایک عمر کے تھے اور ساتھ کھیل کر جوان ہوئے تھے۔ مجھے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی اس لیے وہ ہمارے گھر آجاتی تھیں۔ جب جوانی آئی اور راز و اصرار کھلنے لگے تو ہماری گفتگو کا انداز بھی بدل گیا۔ ہم ایک دوسرے کو سرگوشیوں میں بتاتے تھے۔ ہماری ایک سہیلی کی صرف پندرہ برس کی عمر میں شادی ہو گئی تھی۔ وہ اچھی شکل صورت کی تھی لیکن تمام لڑکیوں میں میں ہی سب سے زیادہ خوب صورت تھی۔ اماں اور بابا

جرأت

ان کا اصل نام یحییٰ امان تھا لیکن وہ شیخ قلندر بخش کے نام سے مشہور ہیں۔ جرأت تخلص ہے۔ دہلی کے رہنے والے اور میاں جعفر علی حسرت کے شاگرد تھے۔ وہ جوانی ہی میں آنکھوں سے معذور ہو گئے تھے۔ غزل ان کا خاص مضمون ہے۔ آپ کا انتقال 1870ء میں لکھنؤ میں ہوا۔

سر فرانس جوزی کیمبل

فرانس جوزی کیمبل (1832-1914) نے مونٹ بلانک ایگر، جنگ فراؤ اور میٹر ہارن پہاڑ سر کیے۔ وہ چار سال کی عمر سے نابینا تھا۔

علی بن سیدہ

ایک مشہور بغدادی عالم جس نے نابینا ہونے کے بعد محض یادداشت سے 32 جلدوں میں انسائیکلوپیڈیا تصنیف کی۔

مرسلہ: احمد یار خان، کوئٹہ

کہتے کہ میں سچ مچ رانی لگتی ہوں تو مجھے یقین نہیں آتا تھا کیونکہ ہر ماں باپ کو اپنی اولاد پیاری لگتی ہے۔ مگر جب سہیلیوں نے بھی بتانا شروع کیا کہ میں بہت خوب صورت ہوں تب مجھے یقین آنے لگا۔ شادی شدہ سہیلی نے مجھ سے کہا۔ ''رانی میرا شوہر میرے لیے پاگل ہے جبکہ میں اتنی خوب صورت نہیں ہوں۔ تیرے شوہر کا کیا حال ہوگا۔''

میں شرما جاتی۔ ایسی باتیں کانوں میں پڑتی رہیں تو رفتہ رفتہ مجھے اپنی دلکشی کا پورا یقین آگیا تھا۔ گورا سرخ رنگ، حسین چہرہ اور خاص طور سے آنکھیں بہت اچھی تھیں۔ متناسب جسم، نرم و نازک سے ہاتھ پاؤں کیونکہ اماں نے کبھی کوئی سخت کام کرنے ہی نہیں دیا۔ انہوں نے سچ مچ مجھے رانی بنا کر رکھا ہوا تھا۔ اللہ نے عارضی نابینا پن دیا تھا لیکن ساتھ ہی اچھا ذہن دیا اور اسے استعمال کرنے کا سلیقہ دیا۔ میں جو کام کرتی اچھے طریقے سے کرتی تھی۔ پہننے اوڑھنے کا سلیقہ تھا۔ بات کرنے کا طریقہ آتا تھا۔ لہجے میں اگر ہلکا سا سندھی انداز نہ جھلک رہا ہو تو سننے والا مجھے شہر کی لڑکی ہی سمجھتا۔ گھر میں میرا کمرا بالکل شہری انداز میں سجا ہوا تھا۔ بابا نے فرنیچر بھی ایسا ڈلوایا تھا۔ میرے کپڑے وہ خود جا کر سکھر سے لاتے تھے۔ اماں کو سلائی آتی تھی اور میرے کپڑے وہی سیتی تھیں۔ جب کوئی ڈیزائن والا سوٹ بنانا ہوتو میں درزی سے سلوا لیتی تھی۔

مجھے خیال آیا کہ شاید میری شخصیت دیکھ کر ان لوگوں نے رشتہ بھیجا ہو۔ جب میں ثمر چاچا کے گھر تھی تو وہاں ان کی بہت ساری جاننے والی عورتیں آتی رہتی تھیں۔ میری بہت سی عورتوں اور لڑکیوں سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ حیران ہوتی تھیں کہ میں نابینا ہونے کے باوجود ماسٹر کر رہی تھی۔ ان میں سے کئی مجھے سراہتی بھی تھیں۔ شاید ان میں سے کسی نے رشتہ بھیجا ہو۔ اماں نے مجھ سے اس دن بات نہیں کی تھی جب کہ میں سارا دن بے چینی سے منتظر رہی تھی کہ کب وہ بات کرتی ہیں۔ پھر رات ہوگئی۔ شام کے وقت چند گھنٹے کے لیے نظر آنا شروع ہوا تھا تو میں پڑھنے میں مصروف ہوگئی تھی پھر مغرب ہوتے ہی باہر کے ساتھ آنکھوں کے سامنے بھی اندھیرا آگیا تھا۔ کھانے کے وقت بابا ہوتے تھے اور ان کے ہوتے ہوئے اماں بات نہیں کرسکتی تھیں۔ میں سونے کے لیے لیٹی تو کچھ دیر بعد اماں آگئیں۔

''رانی سوگئی ہے کیا؟''

''نہیں اماں لیٹی تھی۔'' میں اٹھ بیٹھی۔ ''کوئی بات ہے؟''

''ہاں۔'' اماں پاس بیٹھ گئیں اور دھیمے لہجے میں بولیں۔ ''رانی تیرا ایک رشتہ آیا ہے۔''

میرا سر جھک گیا اور چہرہ بھی سرخ ہوگیا ہوگا۔ ''جی اماں....''

''تیرے بابا کو اچھا لگا ہے۔ پر میرا دل گھبرا رہا ہے۔''

''کیوں اماں؟'' میں نے بے ساختہ پوچھا۔

''لڑکا کراچی میں رہتا ہے، تو دور چلی جائے گی۔''

''اس کے گھر والے کہاں رہتے ہیں؟''

''خیر پور میں۔'' اماں بولیں۔ ''پر تو تو کراچی چلی جائے گی۔''

''تب آپ بابا کو منع کردیں۔''

''نہیں کرسکتی..... پر تو.....''

''میں؟'' میں نے گھبرا کر کہا۔ ''میں بابا سے بالکل بات نہیں کرسکتی۔''

''میں بھی نہیں کرسکتی۔'' اماں نے ٹھنڈی سانس لی۔

اماں میری فکر اور محبت میں یہ بات نظر انداز کر رہی تھیں کہ میں اکیس کی ہو چکی تھی اور بائیسویں میں لگی ہوئی تھی۔ شادی کے لحاظ سے ہمارے گاؤں میں یہ عمر بہت زیادہ سمجھی جاتی تھی۔ اگر کوئی لڑکی بیس سال کے بعد بھی گھر میں بیٹھی رہے تو اسے معمول سے ہٹ کر سمجھا جاتا ہے۔ میں کیونکہ پڑھ بھی رہی تھی اس لیے میرے پاس جواز تھا لیکن میری سہیلیاں کئی سال پہلے شادی شدہ ہوگئی تھیں۔ اب تو ان کے کئی بچے بھی تھے۔ شاید اسی لیے بابا نے فیصلہ کرلیا تھا۔ میں نے بابا کو منع کرنے سے انکار کیا تو اماں کی رہی سہی امید بھی ختم ہوگئی۔ البتہ میں نے اماں سے بابا کو کہلوا دیا کہ ان لوگوں کو بھی یہ بتایا جائے کہ میں مکمل نابینا ہوں۔ کبھی کبھی نظر آنے والی بات نہ بتائی جائے۔ بابا اس بات پر حیران ہوئے تھے لیکن وہ مان گئے۔ بابا نے ثمر چاچا سے بات کی اور ایک ہفتے بعد جنید کے گھر والے ہمارے ہاں آئے۔ جنید کے والد رحمان شاہ اور والدہ کے ساتھ ایک بہن بھی تھی۔ وہ دو دن ہمارے ہاں رکے۔ اماں بابا نے بساط سے بڑھ کر ان کی خاطر تواضع کی تھی۔ دوسرے دن انہوں نے جانے سے پہلے اماں بابا سے کہہ دیا۔ ''ہمیں رانی پسند آئی ہے، اب آپ ہمارے گھر آؤ گے۔''

اماں نے جنید کی والدہ سے کہا کہ رانی کے ساتھ بینائی کا مسئلہ ہے اور اس کے ٹھیک ہونے کا بھی امکان

نہیں ہے۔ اس لیے وہ سوچ لیں تاکہ بعد میں کوئی مسئلہ نہ ہو، اس پر انہوں نے عجیب سی بات کی۔ ''یہ جنید کا مسئلہ ہے وہ خود دیکھے گا۔ رانی اس کے ساتھ رہے گی۔''

جنید تو جوانی سے کراچی میں رہتا آیا تھا۔ وہ میٹرک کے بعد وہاں چلا گیا تھا اور پھر وہیں رہ کر پڑھتا رہا۔ اس نے کراچی یونیورسٹی سے ماسٹر کیا اور سندھ سیکریٹریٹ میں کسی افسر گریڈ پر کام کر رہا تھا۔ ان کی وسیع زمینیں تھیں اور پیچھے سے کھلا پیسا آرہا تھا۔ اس لیے جنید تنخواہ سے ہٹ کر کراچی میں ٹھاٹ سے رہتا تھا۔ ان کا کلفٹن میں بنگلا تھا وہ جنید کے زیرِ استعمال تھا۔ اس کے تین بھائی اور تھے لیکن وہ خیر پور میں ہی رہتے تھے۔ دو بہنیں تھیں جو خاندان میں بیاہی گئی تھیں۔ وہ لڑکیوں کی شادی خاندان میں کرتے تھے لیکن بہو باہر سے بھی لے آتے تھے۔ البتہ سید ہونا شرط تھی۔ میں اس شرط پر پوری اترتی تھی۔ اماں نے جنید کے بارے میں بتایا تو میں سوچ میں پڑ گئی کہ اس کی ماں نے مجھے اس کا مسئلہ کیوں قرار دیا تھا۔ رشتہ تو وہ لے کر آئے تھے اور جو رشتہ لاتا ہے وہی ذمے دار ہوتا ہے۔ پھر انہوں نے ایسی بات کیوں کی۔ اماں کے ذہن میں بھی یہ بات تھی، انہوں نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

''رانی کہیں لڑکے نے تجھے ثمر لغاری کے ہاں دیکھا تو نہیں.....''

''اماں وہ سخت پردے والے لوگ ہیں، زنانے میں باہر کا کوئی آدمی نہیں آسکتا.... تو لڑکا مجھے کہاں سے دیکھے گا۔''

بہرحال کچھ عرصے بعد اماں اور بابا گئے تھے۔ گھر میں میرے لیے ملازمہ کو چھوڑ گئے تھے۔ یہ ویسے کام کرکے چلی جاتی تھی لیکن میری وجہ سے یہیں رک گئی تھی۔ وہ دو دن بعد آگئے۔ میں نے محسوس کیا کہ اماں اور بابا دونوں خوش تھے۔ اماں نے بتایا کہ انہوں نے بہت اچھے طریقے سے پوچھا۔ لڑکا بھی اچھا تھا۔ وہ آیا ہوا تھا۔ بابا اس سے خوش تھے کیونکہ وہ پڑھا لکھا اور شہری نظر آنے والا لڑکا تھا۔ بابا کسی ایسے ہی آدمی سے میری شادی کرنا چاہتے تھے۔ مجھے شرم آرہی تھی لیکن میں نے اماں سے پوچھ لیا۔ ''لڑکے والوں نے اس کی کوئی تصویر نہیں دی؟''

''میں نے کہا تھا۔ اس کی ماں نے کہا بھی تھا کہ دے گی لیکن پھر نہیں دے سکی میرے بھی ذہن میں نہیں رہا۔''

اماں نے بتایا کہ وہ لوگ میرے پیپرز ہوتے ہی شادی کرنا چاہتے تھے۔ میں نے سکون کا سانس لیا کہ مجھے کم سے کم پیپرز دینے کی مہلت مل گئی۔ اگر شادی کرکے کراچی چلی جاتی تو پتا نہیں پھر موقع ملتا یا نہیں۔ حالانکہ اب خیر پور میری سسرال بننے والا تھا مگر آگے کے بارے میں کیا کہا جاسکتا تھا۔ پیپرز میں چند مہینے رہ گئے تھے۔ جب پیپرز کا وقت آیا تو بابا مجھے دوبارہ خیر پور ثمر چاچا کے ہاں لے گئے۔ رشنا کا رشتہ طے ہوگیا تھا۔ وہ اب گھر سے باہر نہیں جاسکتی تھی۔ اس لیے مجھے ایک اور لڑکی سے پیپرز لکھوانے پڑے۔ بہرحال یہ مرحلہ بھی طے ہوگیا۔

☆☆☆

میرا تھکن سے برا حال تھا کیونکہ خیر پور سے کراچی تک کار میں مسلسل آٹھ گھنٹے بیٹھنا پڑا تھا۔ شادی ہونے کے بعد میں صرف دو گھنٹے سسرال میں رکی جس کے دوران میں رسومات ادا کی گئیں۔ پہلے میکے سے سسرال تک تین گھنٹے کا سفر کرکے آئی تھی میرا خیال تھا کہ ابھی سسرال میں رکوں گی۔ مگر مجھے بتایا گیا کہ ابھی مجھے کراچی جانا ہے۔ نئی نویلی دلہن تھی۔ مجھ میں احتجاج کی ہمت نہیں تھی۔ پتا نہیں کیا بات تھی کہ مجھے اس طرح کراچی لے جایا جا رہا تھا۔ کار میں میرے ساتھ صرف جنید تھا اور میں اپنے عروسی جوڑے کی وجہ سے پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ اتفاق کی بات تھی کہ شادی کے بعد اب تک مجھے ایک بار بھی دکھائی نہیں دیا تھا اور میں نے جنید کو بھی نہیں دیکھا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ سیٹ پر لیٹ جاؤں مگر خود پر جبر کرکے بیٹھی رہی۔ البتہ جب ہمت جواب دینے لگی تو میں نے آہستہ سے کہا۔

''میں بہت تھک گئی ہوں۔''

''لیٹ جاؤ۔'' جنید نے مشورہ دیا۔ اب تک میرے اور اس کی درمیان بس چند جملوں کا تبادلہ ہوا تھا اور کار میں اکیلے ہونے کے باوجود جنید نے مجھ سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ پوری توجہ سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ روانہ ہونے سے پہلے میری نندوں نے زبردستی مجھے کھانا کھلایا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اب کراچی تک کچھ نہیں ملے گا اس لیے پیٹ بھرلوں۔ راستے میں جنید نے دو جگہوں پر کار روکی تاکہ واش روم سے ہو آئیں۔ موسم سرد تھا اس لیے اس نے چائے منگوائی تھی۔ مگر میں تازہ دم نہیں ہوئی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ بیڈ مل جائے اور میں سو جاؤں۔ ساتھ ہی جنید کا سرد رویہ بھی میرا دل توڑ رہا تھا۔ آج ہماری شادی ہوئی تھی اور اس نے مجھ سے اب تک ایسے بات نہیں کی تھی جیسے شوہر نئی بیوی سے کرتے ہیں۔

میری خواہش تھی کہ آج میری آنکھیں روشن ہو جائیں۔ میں جنید کو دیکھ سکوں۔ اس گھر کو دیکھوں جو میرا گھر ہوتا۔ مگر افسوس یہ خواہش پوری نہیں ہوئی۔ البتہ ہم بنگلے پہنچے تو جنید کا رویہ یک دم ہی بدل گیا۔ وہاں صرف چوکیدار تھا۔ ایک باورچی تھا اور ایک ملازمہ تھی جو صفائی ستھرائی اور کپڑے دھونے کے لیے آتی تھی۔ ابھی دونوں چھٹی پر تھے۔ ہم رات بارہ بجے پہنچے تھے۔ جنید نے کار کا دروازہ کھولا اور مجھے بازو سے پکڑ کر نیچے اتارا پھر خلافِ توقع کمر کے گرد ہاتھ دے کر مجھے بہت پیار سے اندر لے گیا۔ میں تھکن سے چور تھی لیکن اس کی محبت نے ساری تھکن اتار دی۔ میں کب بے خبر سو گئی مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ صبح میری آنکھ کھلی تو دن ہی نہیں میری آنکھیں بھی روشن ہو گئی تھیں۔ جنید میرے برابر میں پڑا بے سدھ سو رہا تھا۔ میں نے اسے دیکھا اور جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔ یہ تو وہی یونیورسٹی والا لڑکا تھا جو مجھ سے بلاوجہ فری ہونے کی کوشش کر رہا تھا اور اب وہ میرا شوہر تھا۔ میں نے پاس سے دیکھا تو میرا رہا سہا شبہ بھی دور ہو گیا۔ بستر ہلنے سے اس کی نیند ٹوٹ گئی۔ مجھے دیکھتے پا کر وہ ہلکے سے مسکرایا۔

''لگتا ہے تم دیکھ رہی ہو؟''

میں گھبرا گئی۔ ''نہیں میں کہاں دیکھ سکتی ہوں وہ تو بس.....''

''میں نے سنا ہے جو دیکھ نہیں سکتے ان کی سماعت بہت تیز ہوتی ہے۔ کیا تم نے آواز سے مجھے نہیں پہچانا؟''

میں نے اسے دیکھ کر پہچان لیا تھا مگر انجان بھی تو بننا تھا۔ ''نہیں تو، کیا آپ پہلے مجھ سے ملے ہیں؟''

''یاد کرو یونیورسٹی سے تم پیپر دے کر نکلی تھیں، ایک لڑکے نے تم سے بات کی تھی۔''

''وہ آپ.....''

''میں ہی تھا۔'' اس نے جملہ مکمل کیا۔ ''وہیں تو تم پر مر مٹا تھا۔ میں نے اسی روز عہد کیا تھا کہ میری بیوی تم بنو گی۔ دیکھ لو آج تم میری بیوی ہو۔''

میں ڈر گئی تھی۔ ''کیا آپ کو میری بات بری لگی تھی۔ میں نے آپ سے سخت لہجے میں بات کی تھی اور اب آپ.....''

''ڈونٹ بی سلی۔'' وہ میرے پاس ہو گیا۔ ''یہ محبت تھی، چاہت تھی جس نے مجھے مجبور کیا اور میں تمہیں بتا نہیں سکتا کہ میں نے کس طرح گھر والوں کی مخالفت کے باوجود تمہیں حاصل کیا۔''

''وہ راضی نہیں تھے۔'' میں نے کہا۔ اب میری سمجھ میں سسرال والوں کا رویہ آ رہا تھا۔ بظاہر تو سب ٹھیک تھا لیکن مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ کہیں کوئی گڑبڑ ہے۔ ''اسی وجہ سے آپ نے وہاں رکنا گوارا نہیں کیا؟''

''ہاں۔'' اس نے سر ہلایا۔ ''اماں نے صاف کہہ دیا ہے کہ اب تم میری ذمّے داری ہو اور ان کی ذمّے داری صرف شادی تک تھی۔''

میں بے ساختہ رو دی تھی۔ میری شادی کی پہلی صبح تھی اور مجھے سننے کو مل رہا تھا کہ سسرال والوں نے صرف بیٹے کی پسند سمجھ کر مجھے قبول کر لیا تھا۔ ''کیا اس لیے کہ میں نابینا ہوں دیکھ نہیں سکتی؟''

جنید محبت سے میرے آنسو صاف کرنے لگا۔ اس نے کہا۔ ''تم فکر کیوں کرتی ہو میں ہوں نا۔''

جنید کی محبت نے مجھے سرشار کر دیا تھا۔ ''مجھے اس بات پر بھی رونا آ رہا ہے کہ میں کوئی ذمّے داری پوری طرح نہیں اٹھا سکتی اور نہ آپ کے کام کر سکتی ہوں۔''

''اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ یہاں ہر کام کے لیے ملازم ہے۔ تمہیں صرف نگرانی کرنا ہوگی۔''

میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ مجھے کھاتا پیتا شوہر ملا تھا ورنہ وہ متوسط طبقے کا ہوتا اور ملازم نہ رکھ پاتا تو میں گھر کے کام کیسے کرتی؟ اب مجھے اس طرف سے اطمینان تھا اور جہاں تک جنید کا تعلق تھا مجھے یہ جان کر سکون ملا تھا کہ اس نے مجھے محبت سے حاصل کیا تھا۔ جب میری بینائی ہوتی تو میں جنید کے ذاتی کام کر سکتی تھی۔ شادی کی اس پہلی خوب صورت صبح میرا دل چاہا کہ میں جنید کو بتا دوں کہ مجھے کبھی کبھی دکھائی دیتا ہے لیکن شاید اندر سے میری چھٹی حس نے روک دیا تھا۔ جنید کا بنگلا چھوٹا تھا۔ اس میں اوپر نیچے تین بیڈ روم اور ایک بڑی سی نشست گاہ کے ساتھ ہی کچن اور ڈائننگ روم تھا۔ پیچھے کی طرف چھوٹا لان تھا اور آگے کی طرف بڑا لان تھا۔ جنید نے بتایا کہ بنگلا چھ سو گز پر تھا۔ چند دن میں، میں اس جگہ کی عادی ہو گئی تھی اور جب مجھے دکھائی نہیں دے رہا ہوتا تھا تب بھی میں آرام سے چلتی پھرتی تھی۔ البتہ جب جنید یا ملازمہ ہوتی تو میں احتیاط کرتی تھی اور دیکھنے کے باوجود نابیناؤں کے انداز میں چلتی اور حرکت کرتی تھی۔ ملازمہ اور شیف آ گئے تھے۔ میرا کام ان کی نگرانی تھا۔ ملازمہ چپ رہنے والی اور اپنے کام سے کام رکھنے والی عورت تھی۔ اگر میں اس سے بات کرتی تو وہ

مختصر جواب دیتی تھی۔ بعض اوقات تو وہ مجھے کچھ خوف زدہ بھی لگتی تھی۔ اگر میں اس سے زیادہ بات کرنے کی کوشش کرتی تو کسی بہانے میرے سامنے سے ہٹ جاتی تھی۔

جنید سیکشن آفیسر تھا لیکن اس کو گاڑی بھی ملی ہوئی تھی۔ ایک اس کی ذاتی گاڑی تھی۔ یہ چوڑے ٹائروں والی اور نئی قسم کی جیپ تھی جس پر ڈھیروں لائٹس اور سجاوٹ کا سامان لگا ہوا تھا۔ وہ صبح دفتر جاتا اور شام ساڑھے پانچ چھ بجے تک آ جاتا تھا۔ اس کے بعد گھر میں رہتا یا کہیں جاتا بھی تو کچھ دیر کے لیے ہی جاتا تھا۔ گھر آتے ہی موبائل فون بند کر دیتا تھا۔ پھر اس کا وقت میرے ساتھ گزرتا تھا اور یہ وقت اتنے والہانہ انداز میں گزرتا کہ میں اپنی قسمت پر ناز کرنے لگتی تھی۔ ایک دن اس نے مجھ سے کہا۔ ''رانی میں نے تیرے جیسی حسین عورت نہیں دیکھی۔''

''مجھ سے پہلے کتنی عورتیں دیکھی ہیں۔'' میں نے ایسے ہی شوخی سے کہا تو وہ گڑبڑا گیا تھا۔ اس وقت مجھے دکھائی دے رہا تھا اور میں واضح طور پر اس کے تاثرات دیکھ رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔

''نہیں تو۔'' وہ بولا۔ ''میں دیکھنے کی بات کر رہا ہوں۔ ادھر کراچی میں ایک سے بڑھ کر ایک صورت دکھائی دیتی ہے پر تیرے جیسی کوئی نہیں ہے۔''

''آپ دوسری عورتوں کو دیکھتے ہو؟'' میں نے منہ بسورا۔

''یہاں عورتیں خود کو دکھاتی ہیں۔ اگر تو دیکھنے والی ہوتی تو دکھاتا۔''

''ہائے اللہ ان کو شرم نہیں آتی ہے۔''

''شرم۔'' وہ عجیب سے انداز میں ہنسا۔ ''شرم تو اب گاؤں دیہات میں نہیں رہی ہے، یہ تو شہر ہے۔''

مجھے یہاں آئے ہوئے دو ہفتے ہوئے تھے اور ابھی تک جنید مجھے کہیں باہر لے کر نہیں گیا تھا۔ میں نے اس بنگلے سے باہر قدم نہیں رکھا تھا۔ میں نے اس سے دو تین بار کہا کہ مجھے باہر لے کر چلے لیکن وہ ٹال گیا۔ میں سمجھ گئی شاید وہ مجھے باہر لے جا کر اپنا تماشا نہیں بنوانا چاہتا تھا۔ البتہ وہ روز ہی میرے لیے کچھ نہ کچھ لے کر آتا تھا۔ کبھی کھانے کو، کبھی کوئی سوٹ اور کبھی کوئی اور چیز لے آتا۔ لیکن ایک شام وہ گھر آیا اور اس نے مجھ سے کہا۔ ''رانی تیار ہو جا آج تجھے ایک جگہ لے جاؤں گا۔''

''کہاں.....؟''

''یہ نہ پوچھ، بس یوں سمجھ لے کہ شادی کی خوشی میں اپنے دوستوں اور جاننے والوں کو پارٹی دے رہا ہوں۔''

میں خوش ہو گئی۔ ''میں کوئی جوڑا نکالتی ہوں۔ اماں نے اتنے سارے بنا کر دیے ہیں ایک بھی نہیں پہنا اب تک۔''

جنید نے منہ بنایا۔ ''وہ بھی کوئی پہننے والے ہیں۔ میں تمہارے لیے ساڑی لایا ہوں وہ پہن کر چلنا۔''

میں فکرمند ہو گئی۔ ''ساڑی..... وہ تو میں نے کبھی نہیں پہنی۔''

''فکر مت کرو، تیار ساڑی ہے اور شادو مدد کر دے گی۔'' جنید نے ملازمہ کا کہا۔ ''اس میں تم بہت اچھی لگو گی۔''

مجھے نہیں معلوم تھا کہ ساڑی کیسی تھی مگر میں جنید کی خاطر پہننے کو تیار ہو گئی۔ مجھے نظر آ رہا تھا اور جنید جب اندر آیا تو اس کے ہاتھ میں کوئی چیز نہیں تھی تو ساڑی کہاں تھی۔ میں نے کہا۔ ''مجھے دو، میں چھو کر دیکھوں کیسی ہے؟''

جنید نے اپنی الماری سے ایک شاپر نکال کر مجھے تھما دیا اور خود واش روم کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ ''دیکھ لو اور پھر تیاری شروع کر دو ہمیں سات بجے جانا ہے۔''

میں نے ساڑی نکال کر دیکھی، یہ جھلملاتے سیاہ کپڑے کی ساڑی تھی اور یقیناً مجھ پر اچھی لگتی مگر جب میں نے بلاؤز دیکھا تو پریشان ہو گئی۔ یہ چھوٹا سا بلاؤز تھا جس میں میری کمر اور پیٹ دکھائی دیتا۔ بازو بھی چھوٹے سے تھے۔ میں نے کبھی ایسا لباس نہیں پہنا تھا۔ جب جنید واش روم سے آیا تو میں نے اسے کہہ بھی دیا۔ وہ بے پروائی سے بولا۔ ''تو اب پہنو..... یہاں تو سب چلتا ہے اور یہ تو بہت عام لباس ہے۔''

''مجھے شرم آئے گی۔''

''کوئی بات نہیں تم جاتے ہوئے چادر پہن لینا۔'' جنید نے کہا تو میں کسی قدر مطمئن ہو گئی۔ مجھے ساڑی پہننے کے لیے ملازمہ کی مدد کی ضرورت نہیں تھی۔ بے شک میں نے پہلے کبھی پہنی نہیں تھی لیکن مجھے طریقہ آتا تھا۔ مگر جنید کو مطمئن کرنے کے لیے میں نے ملازمہ کی مدد لی۔ تیار ہو کر جب میں نے خود کو آئینے میں دیکھا تو بہت اچھا لگا مگر ساتھ ہی بہت شرم بھی آئی تھی۔ بلاؤز اتنا مختصر تھا کہ شانے تک نظر آ رہے تھے۔ مگر چادر تلے سب چھپ گیا تھا اس لیے میں نے اتنا محسوس نہیں کیا۔ جنید بھی تیار ہو گیا۔ ہم سات بجے روانہ ہوئے اور سی ویو کے پاس ایک بنگلے میں پہنچے۔ اتفاق سے اس وقت بھی مجھے دکھائی دے رہا تھا۔ یہ بہت شاندار اور بڑا بنگلا

تھا۔ اس کے پورچ میں نصف درجن بڑی اور قیمتی گاڑیاں کھڑی تھیں اور بنگلے کے باہر بھی کچھ گاڑیاں موجود تھیں۔ جنید مجھے لے کر بنگلے کے اوپری حصے میں واقع ہال میں آیا جہاں بہت سے لوگ جمع تھے، جتنے مرد تھے اس سے زیادہ عورتیں تھیں اور انہوں نے جیسے کپڑے پہن رکھے تھے ان کو دیکھتے ہوئے مجھے اپنی ساڑی بہت شریفانہ لباس لگی تھی۔ میری آنکھیں پھٹی رہ گئی تھیں۔ اگر جنید اس وقت میری طرف متوجہ ہوتا تو چونک جاتا مگر یہاں آتے ہی اس کی ساری توجہ ان جامے سے باہر خواتین کی طرف ہو گئی تھی۔ وہ مختلف لوگوں سے سلام دعا کر رہا تھا اور پھر میرا تعارف بھی کرا رہا تھا۔ وہ جب مجھ سے سلام دعا کرتے تو میں بہ مشکل جواب دے پاتی تھی۔ ایک ادھیڑ عمر سانولے رنگ کا آدمی مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے جنید سے کہا۔

"تیری زال شرماتی ہے، اس کی شرم تو کم کرو بابا۔"

مجھے اس کی بات عجیب سی لگی تھی لیکن جب جنید نے سرگوشی میں مجھ سے کہا کہ میں چادر اتار دوں تب اس کی بات سمجھ میں آئی۔ میں نے انکار کیا۔ "نہیں، مجھے شرم آئے گی یہاں تو بہت سے غیر مرد ہیں۔"

"میں کہہ رہا ہوں۔" وہ خفگی سے بولا۔ "چادر اتار دو یہاں عجیب سی لگ رہی ہو۔"

"پلیز جنید....." میں نے التجا کی۔ "میرا جسم نظر آرہا ہے۔"

"یہاں یہ عام سی بات ہے، اگر تم دوسری عورتوں کا لباس دیکھو تو تم نے بہت سارا لباس پہن رکھا ہے۔"

میں دیکھ رہی تھی۔ میرا انکار برقرار رہا تو جنید کا موڈ خوفناک ہو گیا اور اس نے اس لہجے میں مجھے حکم دیا کہ مجھے چادر اتارنا ہی پڑی تھی۔ اس وقت وہاں موجود سارے مرد مجھے دیکھ رہے تھے اور جیسے ہی میں نے چادر اتاری ان کی آنکھوں میں ایسی چمک آئی تھی کہ میرا دل چاہا کہ زمین پھٹے اور میں اس میں سما جاؤں۔ اسی سانولے آدمی نے کہا۔ "واہ جنید بابا..... تیری زال تو ہیرا ہے۔"

میں نے پلّو ٹھیک کیا مگر وہ تھا ہی کتنا جو مجھے چھپاتا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ یہاں سے بھاگ جاؤں۔ میری گھبراہٹ محسوس کر کے جنید مجھے ذرا دور بیٹھی کچھ خواتین تک لایا۔ وہ اسی کلاس کی تھیں جس کلاس کے یہ مرد تھے۔ مگر وہ عورتیں تھیں اور ان کے سامنے میں خود کو بااعتماد محسوس کر رہی تھی۔ انہوں نے کسی قدر استہزائیہ انداز میں لیکن مجھ سے بات کی۔ ان کا خیال تھا کہ میں گاؤں سے آئی ہوں اس لیے مجھے بات کرنے کا سلیقہ اور الفاظ نہیں ہوں گے لیکن جب کچھ دیر بات کی تو حیران ضرور ہوئی تھیں، اس کے بعد ان کا انداز بدل گیا۔ ان میں سے ایک اسی سانولے مرد کی بیوی تھی اور یہ اس کی تیسری بیوی تھی۔ یہ وادو کا ایک وڈیرا نیاز علی شاہ تھا۔ پہلی بیوی اس کی حویلی میں تھی دوسری شادی اس نے حیدرآباد کے ایک سیاسی خاندان میں کی تھی اور تیسری بیوی شوبزنس سے تھی۔ مگر اب وہ صرف بیوی تھی شوبزنس چھوڑ چکی تھی۔ ان عورتوں کے پاس بیٹھنے کے باوجود میری بے چینی کم نہیں ہوئی تھی۔ میں جلد از جلد اس محفل سے اٹھ جانا چاہتی تھی۔ کچھ دیر بعد تمام مرد اٹھ کر کہیں چلے گئے۔ کچھ دیر بعد واپس آئے تو سب بہکے ہوئے لگ رہے تھے۔ مجھے شبہ ہوا کہ وہ پی کر آئے تھے۔ جنید کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ جنید کا حلقہ احباب ایسا نکلے گا میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ شکر ہے کھانا جلدی لگ گیا اور کھانے کے فوراً بعد میں نے جنید سے کہا۔

"میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے پلیز گھر چلیں۔"

"کیا ہوا؟" اس نے بدمزگی سے کہا۔ "ابھی تو ٹھیک تھی۔"

"بس دل گھبرا رہا ہے۔"

جنید جانا نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ جس طرح دوسری عورتوں سے گھل مل کر بات کر رہا تھا ایسا لگ رہا تھا جیسے ان سے دیرینہ تعلقات رہے ہوں۔ مجھے رونا آرہا تھا مگر میں یہاں رونا نہیں چاہتی تھی۔ میرے اصرار پر وہ مجبور ہو گیا مگر اس کا موڈ خراب تھا۔ اس نے سارے راستے مجھ سے بات نہیں کی اور تیز ڈرائیو کرتا رہا۔ گھر آتے ہی میں نے کپڑے بدلے اور جنید سے کہا۔ "آیندہ میں نہ اس قسم کا لباس پہنوں گی اور نہ ہی آپ کے ساتھ کسی پارٹی میں جاؤں گی۔"

"تم میری بیوی ہو۔" اس نے غرا کر کہا۔ "تمہیں وہی کرنا ہوگا جو میں تم سے کہوں گا۔"

"آپ مجھ سے جان بھی مانگیں گے تو میں دے دوں گی لیکن یہ سب نہیں کروں گی۔ اگر آپ نے دوبارہ کہا تو میں آپ کے بابا سے بات کروں گی۔ میرا رشتہ وہ لینے آئے تھے میں ان کی ذمے داری بھی ہوں۔"

اپنے باپ کا ذکر آتے ہی جنید کے چہرے کا رنگ جس طرح بدلا تھا اس سے مجھے لگا کہ وہ اپنے باپ سے ڈرتا تھا۔ اس نے جلدی سے کہا۔ "میں تو ایسے ہی کہہ رہا تھا، بابا سے کہنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"اگر آپ مذاق کر رہے تھے تو واقعی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے سکون کا سانس لیا۔ ورنہ وہ اپنی بات پر ڈٹ جاتا تو میرے پاس سوائے ہتھیار ڈالنے کے اور کوئی راہ نہیں تھی۔ کچھ بھی صحیح وہ میرا شوہر تھا اور میری بیک بھی اتنی مضبوط نہیں تھی کہ میں ماں باپ سے مدد لے سکتی۔ میری کسی مشکل پر وہ صرف جل کڑھ سکتے تھے اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ جنید ایک مہینے بعد مجھے خیرپور اور سکھر لے جائے گا مگر یہاں دو مہینے گزر گئے۔ میں نے اس سے کئی بار کہا لیکن وہ دفتر کی مصروفیات کا بہانہ کر کے ٹالتا رہا۔ اس دوران فون پر میری اماں اور بابا سے بات ہوتی رہتی تھی، سسرال سے صرف میرے سسر کا فون آتا تھا تو وہ مجھ سے بات کر لیتے تھے ورنہ باقی کسی اور کو مجھ سے مطلب نہیں تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے یوں لگتا تھا کہ وہ میرے لیے فکرمند ہیں۔ بار بار مجھ سے خیریت پوچھتے اور یہ کہتے کہ مجھے کوئی تکلیف یا پریشانی تو نہیں ہے۔ جب میں ان کو بتاتی کہ میں بہت خوش ہوں اور مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے تو وہ مطمئن ہو جاتے۔ پھر وہ کہتے کہ مجھے ذرا بھی کوئی مسئلہ یا پریشانی ہو تو میں ان کو کال کروں۔ ان کے انداز سے لگتا تھا کہ انہیں جنید کی طرف سے یہ اندیشہ لاحق تھا کہ مجھے اس سے کوئی تکلیف ہو سکتی ہے۔ درحقیقت سوائے اس ایک پارٹی والے واقعے کے مجھے جنید سے کوئی تکلیف نہیں پہنچی تھی۔ وہ گھر میں میرا پورا خیال رکھتا تھا۔ میں جو چاہتی مجھے لا کر دیتا تھا۔ اپنے طور پر بھی بہت کچھ لے آتا تھا۔ سوائے دفتر کے باقی وقت میرے لیے تھا۔ جیسا کہ ہوتا ہے شادی کے شروع دنوں میں مرد میں وارفتگی اور دیوانگی بہت زیادہ ہوتی ہے تو ایسا ہی جنید میں بھی تھا اور ہر عورت کی طرح مجھے بھی اپنے شوہر کی یہ دیوانگی اپنے لیے اچھی لگتی تھی۔ پھر مجھے ہر سہولت اور آسائش دی ہوئی تھی۔ پورا گھر میرے ہاتھ میں تھا۔ میں جو چاہے کرتی اور جو چاہے پکواتی تھی۔ شادی کے پہلے دن جنید نے مجھے دس ہزار روپے دیے تھے۔ میں نے منع کیا۔

"مجھے کیا کرنے ہیں، جو چاہیے آپ سے کہہ دوں گی۔"

"یہ تمہارا جیب خرچ ہے چاہے تو خرچ کرو یا جمع کر لو ویسے چیزیں تو میں ہی لا کر دوں گا۔"

دوسرے مہینے بھی اس نے مجھے دس ہزار دیے تھے۔ میرا ہر طرح سے خیال رکھنے کے باوجود وہ مجھے گھر لے جانے پر آمادہ نہیں تھا۔ مجبوراً مجھے سسر سے کہنا پڑا۔ انہوں نے جنید سے کہا اور وہ مجھ سے بولا۔ "تمہیں بابا سے کہنے کی کیا ضرورت تھی جب مجھے فرصت ملتی میں تمہیں گھر لے جاتا۔ ویسے میرا ارادہ اگلے ہفتے کا ہو رہا تھا۔"

"وہ تو بابا نے پوچھا تو ایسے ہی میرے منہ سے نکل گیا۔" میں نے جلدی سے کہا مجھے یہ سن کر خوشی ہو رہی تھی کہ اگلے ہفتے میں گھر جا رہی تھی۔ "ہم کتنے دن وہاں رکیں گے؟"

"زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ۔" جنید نے میری امیدوں پر پانی پھیرتے ہوئے کہا۔

میں تو سوچ رہی تھی کہ ہفتہ دس دن صرف اماں بابا کے پاس رکوں گی اور کل ایک ہفتے کے لیے جا رہے تھے تو مجھے ایک دو دن سسرال میں بھی رکنا پڑتا اور پھر ایک دن جانے اور آنے میں بھی لگ جاتا تو باقی کیا بچتا۔ میں نے جنید سے کہا۔ "پلیز کچھ دن کے لیے اور رک جائیں۔ میں شادی کے بعد پہلی بار اماں بابا کے گھر جا رہی ہوں۔"

"نہیں بس ایک ہفتہ ہو گا اور میں تمہیں چھوڑ کر نہیں آؤں گا کیونکہ اب میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا ہوں۔"

جنید نے کہا تو میں اندر سے خوش ہو گئی۔ مگر اوپر سے ناراض رہی۔ کوشش کرتی رہی کہ وہ مجھے کچھ دن کے لیے تو چھوڑ دے مگر اس نے انکار کر دیا کہ اسے ایک ہفتے بعد واپس آنا تھا اور پھر مجھے کون چھوڑنے آتا۔ ایک ہفتے بعد ہم روانہ ہوئے۔ پہلے دو دن میں سسرال میں رکی۔ سسرال والوں کا رویہ توقع کے مطابق سرد تھا۔ خاص طور سے ساس کا اور دیور بھی بس ایک حد تک بات کرتے تھے۔ مجھے پہلی بار پتا چلا کہ میرے تینوں دیور اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ جنید سے بڑے اسد ایگری کلچر یونیورسٹی میں پروفیسر تھے اور انہوں نے ابھی تک شادی بھی نہیں کی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ اپنے پیشے سے شادی کر چکے تھے اور دوسری بیوی کی گنجائش نہیں تھی۔ ان سے دو بڑوں کی شادی ہو چکی تھی اور وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ خوش تھے۔ مجموعی طور پر میرے سسرال کا ماحول بہت اچھا تھا۔ یہاں جاگیردارانہ گھٹن نہیں تھی۔ میری جیٹھانیاں بھی اچھی تھیں۔ ساس کا سلوک اگر اچھا نہیں تو برا بھی نہیں تھا۔ رکھ رکھاؤ وہ پورا کرتی تھیں۔ جس دن میں اور جنید سکھر جا رہے تھے میرے سسر رحمان شاہ نے مجھے بلایا۔ اس وقت جنید کسی کام سے حویلی سے باہر گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے میرے سلام کا جواب دے کر پوچھا۔ "بیٹی تو جنید کے ساتھ خوش ہے۔"

"جی بابا۔" میں نے کہا۔ "وہ میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔"

انہوں نے اسی طرح کے چند سوال اور کیے جیسے جاننا چاہ رہے ہوں کہ جنید میرے ساتھ کوئی غلط سلوک تو نہیں کرتا ہے یا مجھے کسی غلط کام کے لیے تو مجبور نہیں کرتا ہے۔ میرے دل میں آئی کہ اس پارٹی کا احوال بتا دوں جہاں جنید مجھے لے گیا تھا مگر وہ بات پرانی ہو گئی تھی اور پھر جنید میری بات مان گیا تھا کہ آئندہ وہ مجھے کسی پارٹی میں جانے کا نہیں کہے گا اس لیے میں کہتے کہتے رک گئی۔ کچھ دیر بعد جنید آ گیا اور ہم سکھر روانہ ہو گئے۔ اماں اور بابا بے تابی سے میرے منتظر تھے۔ دونوں نے یوں مجھے گلے لگایا جیسے میں ان کے وجود کا کوئی بچھڑا ہوا حصہ ہوں۔ جنید ایک رات وہیں رکا تھا اور اس نے مجھ سے کہا۔ ”تیرے اماں بابا تجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ اگر تجھے کوئی تکلیف ہو گی اور ان کو پتا چلا تو یہ جیتے جی مر جائیں گے۔“

”اللہ نہ کرے۔“ میں لرز گئی تھی۔ ”وہ بچ مچ مر جائیں گے اللہ ان کا سایہ ہمیشہ میرے سر پر رکھے۔“

جنید اگلے روز چلا گیا۔ وہ تین دن بعد مجھے لینے آیا۔ اماں بابا مجھے دیکھ کر نہال تھے۔ اماں بلائیں لیتی نہیں تھک رہی تھیں اور بابا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اتنے دن کا لاڈ چند دن میں اٹھا لیں۔ گرمی آ چکی تھی اور بابا نے بتایا کہ اس بار کھجور کی فصل بہت اچھی ہو رہی تھی۔ کھجور کے دام بھی بڑھ گئے تھے اور انہیں امید تھی کہ اچھی رقم ملے گی تب وہ اور اماں مجھ سے ملنے کراچی آئیں گے۔ میں سن کر خوش ہو گئی تھی۔ میری بھی خواہش تھی کہ اماں بابا کچھ دن میرے پاس آ کر رہیں۔ مجھے امید تھی کہ جنید کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ تین دن بعد وہ مجھے لینے آ گیا۔ میں اماں بابا کو چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی تھی لیکن مجبور تھی۔

سکھر سے ہم سیدھے کراچی پہنچے تھے۔ یہ سفر خاصا طویل تھا لیکن میں نے انجوائے کیا کیونکہ ایک بار میں چند گھنٹوں کے لیے دیکھنے کے قابل ہو گئی تھی۔ فصلیں لہلہا رہی تھیں۔ جا بہ جا کھجور، کیلے اور آم کے باغات تھے۔ دوپہر کا کھانا ہم نے ایک ہوٹل میں کھایا تھا۔ اس وقت بھی میں دیکھ رہی تھی اس لیے جنید کو ذرا تعجب ہوا تھا۔ اس نے پوچھ لیا۔ ”تم دیکھ کر کھا رہی ہو؟“

”ہاں۔“ میں نے بھی مزے لینے کے لیے اقرار کر لیا مگر لہجہ ایسا رکھا کہ جیسے مذاق کر رہی ہوں۔

”سچ مچ؟“

”ہاں کبھی کبھی مجھے نظر آنے لگتا ہے۔“ میں اسی انداز میں بولی۔

وہ کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا پھر ہنس دیا۔ ”تم بے وقوف بنا رہی ہو۔“

”میں نے سچ بتا دیا آگے آپ کی مرضی اعتبار کریں یا نہ کریں۔“ میں نے مزے سے کہا۔ سچ اور کچھ دیر آرام کر کے ہم تازہ دم ہو گئے تھے اور رات سے پہلے کراچی پہنچ گئے۔ میں تھکن اور راستے کی گرد اتارنے کے لیے نہا رہی تھی کہ باہر جنید کے موبائل کی بیل بجنے کی آواز آئی۔ وہ کہیں اور تھا اس لیے ریسیو نہیں کیا۔ میں نہا کر باہر آئی تو دوبارہ بیل بجی۔ میں نے موبائل ٹٹول کر اٹھایا تھا کہ اسی لمحے مجھے دکھائی دینے لگا۔ اسکرین پر کسی نیاز علی شاہ کا نام آ رہا تھا۔ لیکن اس سے پہلے میں کال ریسیو کرتی جنید وہاں آ گیا۔ میں انجان بن گئی۔ جنید نے تیزی سے آ کر موبائل لے لیا۔ میں نے چونک کر کہا۔ ”آپ کہاں تھے کب سے بیل بج رہی ہے۔“

”میں باہر تھا۔“ وہ بولا اور کال ریسیو کرتا ہوا باہر چلا گیا۔ میں نے اتنا ہی سنا۔ ”ہاں پروگرام ڈن ہے.... میں آ ؤں گا.... ہاں ہاں اسے بھی لے آؤں گا۔“

کچھ دیر بعد وہ آیا تو میں نے انجان بن کر پوچھا۔ ”کس کی کال تھی؟“

”ایک دوست کی۔“ اس نے نام بتانے سے گریز کیا۔

”کسے ساتھ لے جانے کو کہہ رہے تھے؟“

”ایک دوست کو لے کر جانا ہے پارٹی ہے۔“ وہ بولا۔

”اچھا میں سمجھی شاید مجھے لے جانے کا کہہ رہے ہیں۔“ میں نے کہا تو اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور اس کے چہرے کا رنگ یوں بدلا جیسے میں نے اس کی چوری پکڑ لی ہو۔

”تمہیں میں پرسوں لے جاؤں گا یہ پارٹی کل ہے۔“

”مجھے کہاں لے جائیں گے؟“

”بس ہے ایک جگہ..... سمجھو تو تمہارے لیے سرپرائز ہے۔“ وہ بولا تو اس کا لہجہ معنی خیز لگا تھا۔ مگر میں نے زیادہ توجہ نہیں دی البتہ مجھے فکر لاحق ہوئی تھی کہیں پھر ویسی پارٹی میں نہ لے جائے۔

”میں کسی پارٹی میں نہیں جاؤں گی اور نہ ہی ایسی ڈریسنگ کروں گی۔“

”فکر مت کرو، مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ تمہاری کیا نیچر ہے، اب میں تم سے کسی ایسے کام کا نہیں کہوں گا۔“

میں نے سکون کا سانس لیا۔ اگلے دن دفتر سے آنے کے بعد جنید تیار ہو کر اس پارٹی میں چلا گیا جس کے لیے اسے نیاز کی کال آ رہی تھی۔ اس نے بتایا نہیں کہ کال نیاز کی تھی مگر میں نے یوں توجہ نہیں دی کہ نیاز سے بس اس پارٹی کی حد تک سامنا ہوا تھا۔ اس کے بعد جنید نے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔ شاید اس لیے بھی اس نے نیاز کا نام نہیں لیا۔ مجھے یہ شخص زہر لگا تھا۔ اس کی باتیں اور اس کی آنکھیں دونوں میں گندگی تھی۔ میں اس سے دور تھی اور پشت کر کے بیٹھی تھی تب بھی مجھے لگ رہا تھا کہ اس کی نظریں مجھ پر مرکوز ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ جنید نے یہ سب برداشت کیسے کیا، کیونکہ بہ ظاہر وہ میرے معاملے میں حساس تھا۔ یہاں تک کہ شیف کو بلا اجازت اوپر آنا منع تھا اور وہ کھانا بنانے کے اوقات میں ہی اندر کچن میں آتا تھا اور وہیں تک محدود رہتا تھا۔ وہ صبح آٹھ بجے آتا تھا اور شام سات بجے چلا جاتا تھا۔ شادو دس بجے آتی تھی اور اس کی چھٹی رات نو بجے ہوتی تھی۔ اگر جنید گھر میں نہیں ہوتا تو وہ اس وقت تک رکتی تھی جب تک جنید نہیں آ جاتا تھا یا وہ دیر سے آتا تو شادو رات کو بھی رک جاتی تھی۔ وہ تقریباً پچاس برس کی عام سے عورت تھی۔ شوہر چرسی تھا اور اسے بیوی کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ یہاں ملازمت کر کے اپنا اور چار بچوں کا پیٹ پال رہی تھی۔ رات کو رکتی تو جنید اسے زیادہ تنخواہ دیتا۔ اس لیے وہ خوشی سے رک جاتی تھی۔

دوسرے دن جنید دفتر سے آیا تو اس نے آتے ہی مجھے تیار ہونے کو کہا۔ میں نے پہلے ہی ایک لباس منتخب کر لیا تھا۔ یہ چوڑی دار پاجامہ فراک تھا۔ میں نے اسے بہت شوق سے سلوایا تھا اور اب تک ایک بار بھی پہننے کا موقع نہیں ملا۔ میں تیار ہوئی تو جنید حیران رہ گیا تھا۔ ”یہ لباس تم پر کس قدر سج رہا ہے۔“

”سچ میں؟“ میں خوش ہو گئی۔

”ہاں میں نے تو سوچا نہیں تھا کہ اس قسم کے لباس تم پر کتنے اچھے لگتے ہیں ورنہ اس دن پارٹی میں تمہیں ایسا ہی کوئی لباس پہننے کو کہتا۔ خیر اب پہنا کرنا۔“

اس وقت مجھے نظر نہیں آ رہا تھا اس لیے میں نے سادہ ہیئر اسٹائل بنایا اور سادہ میک اپ کیا لیکن جنید کا کہنا تھا کہ میں اس میں بھی بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اس نے لباس تبدیل نہیں کیا تھا اور دفتر والے سوٹ میں تھا ورنہ اس سے پہلے جب پارٹی میں مجھے ساتھ لے کر گیا تھا تب اس نے بڑے اہتمام سے لباس پہنا تھا۔ ہم روانہ ہوئے تو شام ہو چکی تھی اور گرمیوں

ابوالعلاء معری

احمد بن عبداللہ بن سلیمان عرب شاعر اور حکیم بالمعری چار سال کا تھا کہ چیچک کے حملے سے اس کی بصارت ختم ہو گئی۔ بصارت سے محرومی کے باعث اسے دوسروں پر اعتماد نہ رہا جس سے وہ احساسِ کمتری میں مبتلا ہو گیا۔ اس کا حافظہ بلا کا تھا۔ اس نے لسانی اور دینی علوم کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ ادب اور علم و حکمت کے شائق عالمِ اسلم کے کونے کونے سے اس کے پاس آتے اور اس سے شعر گوئی اور ادب کا فن سیکھتے۔

شیخ عبدالعزیز بن باز

مدینہ منورہ یونیورسٹی کے چانسلر اور سعودی عرب کے مذہبی امور کے وزیر رہے۔ نابینا ہونے کے باوجود اپنے ملک کے جید علما میں شمار ہوتے ہیں۔

حافظ فتح محمد

آپ امرتسر کے رہنے والے تھے۔ بچپن میں بینائی کھو بیٹھے۔ عمر کا آخری حصہ مکہ مکرمہ میں گزارا۔ اہلِ حدیث عالم کے طور پر بہت شہرت پائی۔ کبھی کبھار حرم شریف میں درس بھی دیا کرتے تھے۔ شریعت کالج سعودی عرب سے فارغ التحصیل بھی ہوئے۔ اہلِ علم میں ان کا بہت احترام کیا جاتا تھا۔ ان کی ذاتی لائبریری بہت قابلِ قدر تھی۔ انہوں نے شادی نہیں کی تھی۔ ان کی اچانک وفات کے بعد ان کی لائبریری ضائع ہو گئی۔ حافظ صاحب کا حافظہ بلا کا تھا۔ ان کی سماعت اور چھونے کی حس بھی غضب کی تھی۔ اپنے خاص احباب کو ہاتھ ملانے سے یا بات کرنے سے پہچان لیا کرتے تھے۔

ڈاکٹر مقبول احمد

ہندوستان میں ایک اچھوت ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں اپنے والد کے ہمراہ اسلام کے سایۂ عاطفت میں آئے۔ چھوٹی عمر میں چیچک سے دونوں آنکھیں ضائع ہو گئیں۔ انہوں نے تعلیم جاری رکھی اور بعد میں جامعۃ الازہر (مصر) سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ بہت زندہ دل علمی شخصیت تھیں۔

مرسلہ: نعمان بشیر، لاہور

کی وجہ سے ذرا طویل شام تھی۔ کھلی کھڑکی سے نم ہوا کے جھونکے آنے لگے تو مجھے اندازہ ہوا کہ ہم ساحل کے ساتھ والی سڑک پر سفر کر رہے ہیں۔ ہوا میں مخصوص مہک تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''آپ مجھے سی سائیڈ لے جا رہے ہیں؟''

''ہاں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''آج تمہیں بہت مزہ آئے گا۔''

مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ مجھے کہاں لے جا رہا تھا؟ مگر گاڑی خاصی دیر تک چلتی رہی۔ شروع میں آس پاس گاڑیوں کا شور تھا لیکن آخر میں بالکل خاموشی چھا گئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا ہم کسی سنسان سڑک پر سفر کر رہے ہوں۔ جب سفر مسلسل جاری رہا تو میں نے اکتا کر پوچھا۔ ''ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

''بس پہنچ گئے۔'' جنید نے کہا اور گاڑی گھما کر روک دی۔ وہ نیچے اترا پھر اس نے مجھے بھی نیچے اتارا۔ یہاں سمندر کی لہروں کی ہلکی سی آواز آرہی تھی۔ لگ رہا تھا سمندر پاس ہی ہے۔ مگر کوئی دوسری آواز نہیں تھی۔ میں نے ایک بار پھر جنید سے پوچھا۔

''یہ کون سی جگہ ہے؟''

''یہاں میرے ایک دوست کا کاٹیج ہے، سمندر سے زیادہ دور نہیں ہے آج رات ہم یہیں رکیں گے۔''

میرا دل دھڑک اٹھا۔ ''کاٹیج..... یہ جگہ تو ویران لگ رہی ہے۔''

''یہ ڈیفنس میں ہی ایک جگہ ہے۔ یہاں خاموشی اور سکون ہے۔ مجھے اچھی لگتی ہے اس لیے تمہیں بھی یہاں لایا ہوں۔'' جنید نے کہا اور میرا ہاتھ تھام کر آگے بڑھا۔ اس نے چابی سے کوئی دروازہ کھولا اور مجھے اندر لے آیا۔ میں اندر آئی تو بہ ظاہر خاموشی تھی لیکن نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگا جیسے وہاں کوئی اور بھی موجود ہے۔ جنید نے مجھے ایک جگہ بٹھایا اور پھر مجھے کولڈ ڈرنک کی بوتل دی۔ ''تم بیٹھو، میں ذرا گاڑی سے سامان لے آؤں۔''

''کیسا سامان؟''

''بابا کیا کھانا پینا نہیں ہے اور ہمارے نائٹ سوٹ بھی تو چاہئیں۔''

جنید کے جانے کے بعد میں کولڈ ڈرنک کا سپ لینے لگی تھی کہ اچانک کہیں کھٹکا سا ہوا۔ پھر کسی کا ہلکا سا قہقہہ سنائی دیا۔ یہ قہقہہ جنید کا نہیں تھا اور کاٹیج کے باہر سے آواز آئی تھی۔ میں چوکنا ہو گئی جب یہاں کوئی اور نہیں تھا تو پھر یہ آواز کہاں سے آئی؟ اس لمحے مجھے شدت سے خواہش ہوئی کہ میری بینائی آجائے اور اللہ نے سن لی۔ مجھے دکھائی دینے لگا۔ میں جس کمرے میں بیٹھی تھی یہ چھوٹی سی نشست گاہ تھی اس میں صرف ایک سیون سیٹر صوفے کی گنجائش تھی۔ درمیان میں گلاس ٹاپ میز تھی۔ اس کے ساتھ ایک کمرے کا دروازہ تھا۔ نشست گاہ کے ساتھ لاؤنج تھا اور یہیں باہر جانے والا دروازہ تھا۔ لاؤنج کے آخر میں چھوٹا سا کھلا کچن تھا۔ میں دبے قدموں دروازے تک آئی اور لاؤنج کی کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر دیکھا تو جنید کے ساتھ نیاز کھڑا تھا۔ یک لخت میرے اندر خطرے کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ نیاز یہاں کیوں آیا تھا اور جنید اس سے کیا بات کر رہا تھا۔ میں نے ان کی باتیں سننے کے لیے کھڑکی کا پٹ ہلکا سا کھولا۔ فوراً ہی نیاز کی آواز آئی وہ کہہ رہا تھا۔

''بابا اپنا کام پکا سمجھو..... دو دن بعد ایڈیشنل سکریٹری کا اپائنٹ منٹ تمہارے پاس ہوگا۔''

''ہاں سائیں۔'' جنید نے خوشامدی لہجے میں کہا۔ ''میں بھی اس خشک کرسی سے اکتا گیا ہوں۔ اتنی پیدا نہیں ہے جتنے میرے خرچے ہیں۔ اب تو بابا نے بھی رقم بند کر دی ہے۔''

''فکر مت کرو بابا، اس سیٹ پر آگئے تو سمجھو وارے نیارے ہوں گے۔ چند سالوں میں خود زمین لے لو گے۔'' نیاز نے کہا پھر لہجہ بدل کر بولا۔ ''وہ بعد میں کوئی گڑبڑ تو نہیں کرے گی۔''

جنید ہنسا۔ ''اسے کیا پتا چلے گا سائیں، میں اسے بوتل دے آیا ہوں اب تک تو وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی بھول گئی ہو گی۔ جب تک اسے ہوش آئے گا آپ یہاں سے جا چکے ہوں گے اور میں اس کے ساتھ ہوں گا۔''

میں سن رہ گئی تھی۔ میں بچی نہیں تھی جوان کی باتیں میری سمجھ میں نہ آتیں۔ جنید جو میرا شوہر تھا وہ بے غیرتی سے ایک غیر مرد سے میرا سودا کر رہا تھا تاکہ اونچی پوسٹ حاصل کر سکے اور اس پوسٹ سے اتنا حرام کمائے جو اس کے اخراجات کے لیے کافی سے زیادہ ہو۔ میں نے بوتل چکھی بھی نہیں تھی مگر مجھے چکر آنے لگے تھے۔ پھر خطرے کا احساس مجھے تیزی سے ہوش میں لے آیا۔ میں نے کھڑکی بند کی اور جلدی سے واپس نشست گاہ میں آئی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں تو میں بوتل لے کر صوفے پر بیٹھ گئی اسی لمحے باہر کا دروازہ کھلا۔ میں نے تھوڑی سے کوک صوفے کے پیچھے گرا دی تھی تاکہ آنے والا سمجھے کہ میں اس میں سے کچھ پی چکی ہوں۔ آنے والا نیاز

تھا اس کی دلی خواہشات اس کے چہرے پر دکھائی دے رہی تھیں۔ میرے اندر نفرت کی لہر اٹھی اور میرا دل چاہا کہ اسے قتل کر دوں۔ وہ جن نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ میری آنکھیں نیم وا تھیں اور میں ایسا تاثر دے رہی تھی جیسے مجھے ہوش نہیں ہے۔ وہ میری طرف جھکا تھا کہ میرا ہاتھ خود بہ خود حرکت میں آیا اور بوتل پوری قوت سے اس کے سر پر لگی۔ اس وار کے پیچھے میری تمام قوت اور نفرت تھی۔ اس کے حلق سے عجیب سی آواز نکلی اور وہ نیچے قالین پر گر گیا۔

میں نے جھک کر دوبارہ بوتل اس کے سر پر ماری اور جب تیسری بار ماری تو وہ ٹوٹ گئی تھی۔ حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ پہلے ہی بے ہوش ہو گیا تھا۔ میں کچھ دیر اپنی پھولی سانس پر قابو پاتی رہی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اکیلا ہی اندر آیا تھا ورنہ کوئی اور ہوتا تو اتنا شور تو سن لیتا البتہ باہر کسی کے لیے سن لینا ممکن نہیں تھا۔ میں نے اپنا پرس اٹھایا اور باہر کی طرف آئی۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ یہ دیکھ کر میرا خون خشک ہو گیا کہ وہاں چار عدد بدمعاش قسم کے لمبے تڑنگے آدمی تھے۔ وہ یقیناً نیاز کے آدمی تھے۔ ذرا دور ایک بڑی لگژری گاڑی کھڑی تھی۔ وہ بھی نیاز کی تھی۔ جنید کی گاڑی نہیں تھی۔ شاید وہ مجھے اس کے حوالے کر کے خود کہیں چلا گیا تھا۔ شدتِ غم سے میں اندر سے ٹوٹنے لگی تھی۔ جسے میں اپنا محافظ سمجھتی تھی وہی رہزن نکلا تھا۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کر دیا کہ کوئی اور نہ آسکے۔ پھر میں پیچھے کی طرف آئی۔ کچن کے ساتھ ایک چھوٹا سا دروازہ تھا مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ کس طرف کھل رہا تھا لیکن جب اسے کھولنے پر مجھے کھلی جگہ دکھائی دی تو میرا رکا سانس بحال ہوا تھا۔ فرار کی ایک راہ تو تھی اور اس طرف جھاڑیاں بھی تھیں۔ میں کاٹیج سے باہر آئی اور تیزی سے جھاڑیوں کی طرف لپکی اور میں بروقت جھاڑیوں میں داخل ہوئی تھی کیونکہ اسی لمحے عقب سے نیاز کے چلّانے کی آواز آئی۔ وہ ہوش میں آکر دروازے تک چلا آیا تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ لہولہان سر کے ساتھ کھڑا تھا اور شاید اسے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ اس کے چلّانے پر اس کے محافظ دوڑے آئے تھے۔ وہ انہیں بتانے لگا کہ میں اسے دھوکے سے وار کر کے بھاگ گئی ہوں۔ اس نے دہاڑ کر کہا۔

''تلاش کرو اسے، اب اس میں تمہارا حصہ بھی ہوگا۔''

یہ سنتے ہی اس کے چاروں آدمی تیزی سے حرکت میں آئے تھے۔ نیاز کی بات سن کر میرا خوف سے برا حال ہو گیا۔ وہ ذلیل شخص مجھے ان کتوں کے حوالے کرنے کی بات کر رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہاں سے کس طرف جاؤں کیونکہ ہر طرف جھاڑیاں تھیں اور ان میں راستہ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ یہاں رکی رہتی تو جلد پکڑی جاتی اس لیے ان لوگوں سے دور جانے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ مجھے جھاڑیوں میں ہی تلاش کر رہے تھے اور ان کے بولنے کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ اس وجہ سے بھی مجھے ان سے دور رہنے میں آسانی ہو رہی تھی۔ پھر اچانک ہی میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا آگیا۔ ایک لمحے کو میرا دل رکا تھا۔ اس موقع پر جب مجھے آنکھوں کی سب سے زیادہ ضرورت تھی تو میری بینائی جواب دے گئی تھی۔ اب میں کہاں جاتی اور کیسے جاتی۔ یقیناً راستہ نظر نہیں آتا اور میں بھٹک کر واپس بھی جا سکتی تھی۔ مجھے یہی سمجھ میں آیا کہ چھپ جاؤں۔ میں نے ٹٹول کر ایک ایسی جھاڑی تلاش کی جس میں کانٹے نہیں تھے اور پھر اس میں ممکن حد تک گھس کر بیٹھ گئی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں چھپی ہوں یا نظر آرہی ہوں۔ اپنے طور پر احتیاط کر لی تھی۔

ان لوگوں کی آوازیں قریب آرہی تھیں۔ میں خود میں سمٹ رہی تھی، میری حالت اس بٹیر کی سی ہو رہی تھی جو شکاریوں سے ڈر کر چھپ گیا ہو اور اس میں اڑنے کی ہمت بھی نہ ہو۔ اب وہ اتنے قریب تھے کہ اگر میں زور سے سانس لیتی تو وہ سن لیتے۔ میں نے ڈر کر سانس بھی روک لیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اب تب میں وہ مجھے دیکھ لیں گے۔ مگر اسی لمحے کتوں کے بھونکنے کی آواز آئی اور پھر کسی نے فائر کیا تو نیاز کے آدمی چلّاتے ہوئے واپس بھاگے تھے۔ فائر کرنے والے چلّا چلّا کر کہہ رہے تھے کہ کون ہے اور ان کے ساتھ کتے بھونک رہے تھے۔ پھر کسی نے کہا۔ ''ارے یہ تو عورت ہے۔ تم یہاں کیوں بیٹھی ہو؟''

''یہ میرے پیچھے لگے تھے۔'' میں نے جواب دیا۔

''ڈرو مت وہ بھاگ گئے ہیں۔ یہ ہمارا پلاٹ ہے۔ ہم سمجھے کہ چور آگئے ہیں۔'' آدمی نے کہا وہ لہجے سے پڑھا لکھا اور مہذب لگ رہا تھا۔ ''بہن باہر آجاؤ۔''

☆☆☆

یہ بھی اندرونِ سندھ کے رہنے والے تھے۔ ان کا پورا خاندان اس بڑے سے بنگلے میں رہتا تھا۔ جس آدمی نے مجھے

بچایا تھا وہ اسی خاندان کا ایک فرد تھا۔ مجھے اندر عورتوں کے پاس پہنچا دیا گیا اور میں نے فوری طور پر اپنے سسر کو کال کی۔ ان کو ڈھکے چھپے انداز میں بتایا کہ جنید نے میرے ساتھ کیا کیا تھا اور پھر اپنے محسن سے بات کرائی۔ اتفاق سے وہ لوگ میرے سسرال والوں کے واقف کار نکلے تھے۔ میرے سسر نے کہا۔ ”مجھے اسی کا خدشہ تھا۔ تبھی میں تم سے بار بار پوچھتا تھا۔ تم نے اس کے چنگل میں پھنس کر غلطی کی۔“

اس وقت میں نے نہیں پوچھا کہ میں نے کیسے غلطی کی کیونکہ وہاں دوسرے لوگ بھی تھے۔ کچھ دیر میں جنید نیاز علی شاہ کے ساتھ وہاں پہنچ گیا اور میرا مطالبہ کیا لیکن میں نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ جنید اور نیاز دھمکیاں دینے لگے لیکن جب میں نے جنید کو بتایا کہ میں اس کے بابا سے بات کر چکی ہوں تو وہ دم دبا کر وہاں سے چلا گیا۔ میرے سسر رحمان شاہ اگلے دن اسد کے ہمراہ آئے تھے۔ انہوں نے میرے میزبانوں کا شکریہ ادا کیا اور مجھے لے کر فوری واپس خیر پور روانہ ہو گئے۔ خیر پور آ کر مجھ پر مزید کچھ انکشافات ہوئے تھے۔ جنید نے گھر والوں سے میرے بارے میں جھوٹ کہا تھا کہ میں اس کے عشق میں پاگل ہو رہی ہوں اور اگر میری شادی اس سے نہ ہوئی تو میں گھر سے بھاگ کر اس کے ساتھ کورٹ میرج کر لوں گی۔ اس سفید جھوٹ پر میں دنگ رہ گئی تھی۔ اسی وجہ سے میری ساس اور سسرال والوں کا رویّہ میرے ساتھ سرد تھا۔

جنید جواں عمری سے خراب صحبت کا شکار تھا اور بری راہوں پر چل نکلا تھا۔ اگرچہ وڈیرے خاندانوں میں اب اسے برائی نہیں سمجھا جاتا ہے لیکن رحمان شاہ نے اپنی اولاد کی تربیت مختلف انداز میں کی تھی۔ جنید ہی بگڑا ہوا نکلا تھا تو اس کا بائیکاٹ کر دیا گیا تھا۔ وہ پہلے بھی شہر میں ایک شادی کر چکا تھا اور اس کی بیوی نے پُراسرار طور پر خودکشی کر لی تھی۔ پولیس نے پہلے جنید کو گرفتار کیا لیکن پھر اچانک چھوڑ دیا اس وقت بھی رحمان شاہ نے اس کی کوئی مدد نہیں کی۔ پھر جب مجھ سے شادی کا معاملہ آیا تو وہ شریف بن گیا اور باپ سے کہا کہ وہ بری راہیں چھوڑ کر شریفانہ گھریلو زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔ اس کے گھر والوں کو یقین نہیں آیا تھا مگر پھر بھی وہ مان گئے۔ خاص طور سے اس جھوٹ کے بعد کہ میں بھی اس سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ میں نے حقیقت بتائی کہ مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ جنید کی اس ذلیل اور گھٹیا حرکت کے بعد رحمان شاہ اور اس کے بھائیوں نے اس سے تمام تعلقات ختم کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اسے بلوایا گیا لیکن اس نے آنے کے بجائے مجھے طلاق نامہ بھیج دیا۔ میں بھی یہی چاہتی تھی اس شخص کے ساتھ رہنا ناممکن تھا۔

اس دوران میں میری سسرال والوں نے اماں اور بابا کو بلا لیا تھا۔ جب ان کو پتا چلا کہ میرے ساتھ کیا ہوا تو وہ دکھی ہو گئے تھے مگر پھر انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اللہ نے مجھے جنید کی مکروہ سازش سے محفوظ رکھا تھا۔ رحمان شاہ بہت شرمندہ تھے کیونکہ جنید بہرحال ان کا بیٹا تھا۔ انہوں نے بابا سے کہا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جنید کے گناہ کی تلافی کیسے کروں۔ میرا خون اتنا بدکردار نکلے گا میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔“

”اس میں آپ کا اتنا قصور نہیں ہے سائیں۔“ بابا نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”کاش آپ ایک بار اشارتاً بتا دیتے کہ جنید نے کیسے آپ کو رشتہ لانے پر آمادہ کیا ہے تو اسی وقت حقیقت کھل جاتی۔“

”بس یہی غلطی ہوئی اور اس معصوم بچی کی زندگی خراب ہوئی۔“ وہ بولے۔ ”میرے پاس تلافی کا ایک موقع ہے اگر آپ مانیں۔“

رحمان شاہ کی تجویز یہ تھی کہ میری شادی اسد شاہ سے کر دی جائے۔ وہ بھی راضی تھے۔ بابا نے اماں سے کہا اور اماں نے مجھ سے پوچھا تو میں مان گئی کیونکہ اسد جنید سے بالکل مختلف اور پڑھے لکھے انسان تھے۔ بات طے ہو جانے کے بعد میں عدت گزارنے اماں بابا کے ساتھ چلی گئی۔ اللہ کا شکر ہے کہ میں بچے جیسی کسی آزمائش سے بھی محفوظ رہی۔ چھ مہینے بعد میری شادی اسد شاہ سے ہو گئی اور میں ان کے ساتھ اب یونیورسٹی کی طرف سے ملے بنگلے میں رہ رہی ہوں۔ اسد شاہ کے اصرار پر میں ایم فل بھی کر رہی ہوں اور ساتھ ہی اپنے پہلے بے بی کے دنیا میں آنے کا انتظار کر رہی ہوں۔ کیونکہ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ مجھے اس کیفیت سے نجات مل گئی ہے یعنی کچھ ٹھہر ٹھہر کر اندھیرے کی چادر تن جانا۔ کئی کئی پہر کے لیے نابینا ہو جانا۔ ان دنوں کچھ اس طرح اعصابی تناؤ کا شکار رہی کہ دماغ دباؤ کی وجہ سے صحیح خط پر کام کرنے لگا۔ اندھیرے کا وقفہ کم سے کم ہوتا چلا گیا اور یہی نہیں آنکھوں کی طرح میری زندگی میں بھی اندھیروں کے بعد اجالے آتے چلے گئے۔ مجھے یقین ہے یہ اجالے اب ہمیشہ قائم رہیں گے۔

پرائی خوشبو

قابلِ احترام معراج رسول صاحب
السلام علیکم!
بینا نابینا نمبر کا اشتہار دیکھ کر میں نے بھی ایک دوست کی بپتا قلم بند کرنے کی ٹھان لی۔ اسے نہایت آسان الفاظ میں لکھا ہے۔ امید ہے اسے شائع کرکے شکریہ کا موقع ضرور دیں گے۔

انور علی
(کراچی)

بشیر نام تھا اس کا۔ ایک صحت مند، باڈی بلڈر قسم کا ہنس مکھ نوجوان جس کے قہقہے ہوٹل میں گونجا کرتے۔ وہ پنجاب کے کسی علاقے کا رہنے والا تھا لیکن روزگار کے لیے کراچی آ کر آباد ہو گیا تھا۔

وہ ہمارا دوست تھا۔ ہم اس کے لطیفوں سے خوب لطف اندوز ہوا کرتے۔ اس کے سنانے کا انداز ہی بہت زبردست تھا یعنی اسے لطیفے سنانے کا فن آتا تھا۔

اس کا معمول یہ تھا کہ اپنی ملازمت سے آنے کے بعد

ورزش کرنے چلا جاتا۔ وہاں سے آتا تو اس کا وقت ہم دوستوں کے ساتھ گزرتا۔

عام طور پر ہم شام کے وقت اس کے گھر چلے جاتے جہاں رات گئے تک محفلِ یاراں سجا کرتی۔ اس دوران بیکری سے کھانے پینے کی چیزیں بھی منگوالی جاتیں۔

بہت بے فکری کی زندگی تھی۔ میں نے اس شخص کو کبھی اداس نہیں دیکھا لیکن ایک دن جب وہ کچھ پریشان سا دکھائی دیا تو ہم سب کو پریشانی سی ہوگئی۔ ''کیا بات ہے بھائی، اتنے اداس کیوں دکھائی دے رہے ہو۔'' میں نے پوچھا۔

''بھائی، کہانی کچھ ایسی ہوگئی ہے کہ مجھے گاؤں جانا پڑے گا۔ اس نے بتایا'' کم از کم پندرہ بیس دنوں کے لیے۔''

''خیریت؟''

''میرے گھر والے میری شادی کر رہے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''ارے۔ پھر تو یہ خوشی کی بات ہوئی نا۔ اس میں اتنی اداسی کیا ہے۔''

''یار...... بات کچھ اور ہے۔''

''کیا تم اس لڑکی کو جانتے ہو؟'' میں نے ایک خیال کے تحت پوچھا۔

''ہاں یار، وہ میرے چاچا کی بیٹی ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''اس کو تو میں بچپن سے جانتا ہوں۔''

''چلو، تو پھر مبارک ہو۔'' میں نے کہا۔ ''اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔''

''اب کیا بتاؤں۔'' وہ ایک گہری سانس لے کر خاموش ہوگیا۔

ہمارے لاکھ کریدنے پر بھی اس نے ہمیں کچھ نہیں بتایا تھا۔ ایک شام اس نے بتایا کہ وہ کل شادی کے لیے پنجاب جا رہا ہے۔ ہم سب نے اسے مبارکبادیں دیں لیکن وہ بجھا بجھا سا رہا تھا۔

وہ اپنے مکان کو تالا لگا کر گیا تھا۔ اس کی واپسی پندرہ بیس دنوں کے بعد اچانک ہوئی تھی۔ ہم سب اسے ہوٹل میں دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔ سب بہت گرم جوشی کے ساتھ ملے تھے۔

''یار، میری واپسی کل رات ہوئی ہے۔'' اس نے بتایا۔

''اکیلے آئے ہو یا؟''

''اکیلے کیوں آتا۔ اب تو ایک لاحقہ بھی ساتھ لگا ہوا ہے۔''

''یار تو پھر دعوت تو ڈیو ہوگئی نا؟''

''کیوں نہیں۔'' وہ مسکرا دیا۔ ''کل رات کا کھانا ہوٹل میں میری طرف سے ہوگا۔''

اس نے دوسری رات اچھی خاصی دعوت کا اہتمام کر ڈالا تھا۔ پچھلے دنوں کے برعکس اب وہ خوش دکھائی دے رہا تھا۔

پچھلے دنوں اس پر جس قسم کی اداسی طاری تھی، وہ اب نہیں رہی تھی۔

ہمیں بھی یہ دیکھ کر خوشی ہوئی تھی کہ اس نے نئے حالات سے سمجھوتا کر لیا تھا۔

میں نے تنہائی میں اس سے دریافت کیا۔ ''ہاں یار، اب بتا۔ بیوی سے خوش ہے نا۔''

''ہاں یار، بہت خوش ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''وہ اتنی خدمت گزار ثابت ہو رہی ہے کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔''

''یار، یہ تو بہت اچھی بات ہوئی۔ خدا تم کو نئی زندگی مبارک کرے۔''

وہ اس کے بعد بھی خوش اور مطمئن ہی دکھائی دیا۔ شادی اس کو راس آ گئی تھی لیکن اس نے ابھی تک اپنے گھر نہیں بلایا تھا اور نہ ہی اس نے بیوی سے ملانے کی بات کی تھی۔

میں نے ایک دوبار اس سے کہا بھی کہ میں بھابی کو اپنے ہاتھوں کوئی تحفہ دینا چاہتا ہوں لیکن وہ بات کو ٹال گیا تھا۔ پھر ایک دن ایک ایسی ضرورت پڑ گئی کہ مجھے اس کے گھر جانا پڑا۔

اس بار بھی وہ معمول کے مطابق دروازے ہی پر کھڑا باتیں کرتا رہا تھا۔ پھر نہ جانے کیا سوچ کر اس نے خود ہی کہا۔ ''آؤ یار... اندر آ جاؤ۔''

یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے گھر میں آنے کی دعوت دی تھی۔ میرا مطلب ہے اپنی بیوی کو گاؤں سے لانے کے بعد۔ شاید اس وقت اس کی بیوی گھر پر نہیں ہوگی یا کوئی اور بات ہوگی۔

اس نے مجھے اس کمرے میں لے جا کر بٹھا دیا جہاں ہم اکثر بیٹھا کرتے تھے۔ وہ اس وقت بہت سنجیدہ ہو رہا تھا۔ اس نے میرے سامنے بیٹھ جانے کے بعد کہا۔ ''یار، ہو سکتا ہے کہ تمہارے ذہن میں یہ ہو کہ آخر میں تم لوگوں کو گھر کیوں نہیں بلاتا ہوں اور اپنی بیوی سے کیوں نہیں ملواتا ہوں۔''

''ارے نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' میں نے کچھ کہنا چاہا۔

''نہیں، تمہارے ذہن میں یہ بات ضرور ہوگی۔ یار، اصل کہانی یہ ہے کہ میں ایک طرح کی شرمندگی کی وجہ سے نہ تو تم لوگوں کو اپنے گھر میں بلایا کرتا تھا اور نہ ہی میں نے اپنی بیوی کو تم لوگوں کے سامنے کیا ہے۔''

''یار، کس بات کی شرمندگی، یہی نا کہ وہ بے چاری گاؤں کی ہوگی۔ اس کو شہری زندگی کے مینرز نہیں معلوم ہوں گے۔''

''نہیں بھائی، معاملہ کچھ اور ہے۔'' وہ بے حد سنجیدہ ہو رہا تھا۔ ''ایک منٹ ٹھہرو، میں اسے بلا رہا ہوں۔'' پھر اس نے آواز دی۔ ''ریحانہ، ریحانہ، یہاں آ جاؤ۔''

کچھ دیر بعد اس کی بیوی پردہ ہٹا کر کمرے میں داخل ہوئی، میں حیران ہو کر کھڑا ہوگیا۔ وہ ایک نابینا لڑکی تھی۔ صورت شکل کی بہت بہتر، جوان العمر، لیکن بالکل نابینا۔

وہ کمرے میں آ کر کھڑی ہوگئی تھی۔ ''ریحانہ، یہ میرے دوست انور علی ہیں۔'' بشیر نے تعارف کروایا۔

''السلام علیکم۔''

''کیسی ہیں بھابی۔'' میں نے سلام کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔ اس وقت میری آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

''ٹھیک ہوں بھائی۔'' اس نے جواب دیا۔

بشیر نے سہارا دے کر اسے کرسی پر بٹھا دیا تھا۔ اس وقت اس کی مجبوری سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ بے چارہ اس لیے اپنی بیوی کو پوشیدہ رکھتا ہوگا کہ ہم کہیں اس کا مذاق نہ اُڑائیں۔

میں عجیب بوجھل دل سے باتیں کرتا رہا۔ اس کی بیوی بھی اپنے طور پر گفتگو میں حصہ لے رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ معذرت کر کے اٹھ کر اندر چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد کچھ دیر تک کمرے میں خاموشی رہی، بشیر نے اپنی گردن اس طرح جھکا رکھی تھی جیسے اس نے کوئی جرم کیا ہو۔

ٹاور آف لندن

لندن میں ایک قلعہ نما محل۔ 11 ویں صدی عیسوی میں نارمنوں نے اس کی تعمیر کی۔ 15 ویں صدی عیسوی سے اٹھارویں صدی عیسوی تک اس کی حیثیت سرکاری جیل خانے کی رہی۔ ان دنوں یہ برطانیہ کے اہم اور مقبول ترین تفریحی مقام کی حیثیت سے مشہور ہے، کیونکہ یہاں اسلحہ خانہ اور عجائب گھر قائم کیا گیا ہے۔ یہاں جن مشہور قیدیوں کو قتل کیا گیا ان میں تھامس مور، این بولین، کیتھرائن ہاورڈ، لیڈی جین گرے، ارل آف ایکس اور سٹریفورڈ، اور ڈیوک آف مون موتھ شامل ہیں۔

مرسلہ: عارف اللہ، کراچی

''بشیر بھائی، میں اس موقع پر اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ تم اس وقت ایک امتحان سے گزر رہے ہوگے۔ خدا نے تمہیں جس آزمائش میں ڈالا ہے، اگر تم اس سے پار نکل گئے تو پھر تمہارے لیے آخرت میں بہت کچھ ہوگا۔''

''یہ تو ہے۔'' بشیر نے ایک گہری سانس لی۔ ''لیکن اب جو میں کہنا چاہتا ہوں، وہ بھی سن لو، یہ میرے چاچا کی بیٹی ہے۔ نو سال کی عمر میں اس کی آنکھیں چلی گئی تھیں۔ تم نے یہ دیکھا ہوگا کہ میں اپنی شادی کے ذکر پر کچھ خوش نہیں تھا۔ تم لوگوں کو بتا بھی نہیں پا رہا تھا کہ میں جس سے شادی کرنے جا رہا ہوں، اس کی آنکھیں نہیں ہیں، لیکن......''

''لیکن کیا۔''

''لیکن یہ کہ میں اس شادی سے ناخوش نہیں ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''بلکہ میں فخر محسوس کرتا ہوں۔''

''خدا کرے ایسا ہی ہو۔''

''ایسا ہی ہے۔ میں نے کہا تھا نا کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ میری بیوی کتنی خدمت گزار ہے۔ آنکھیں نہ ہونے کے باوجود اس نے مجھے اتنا آرام اور اتنا سکون دیا ہے کہ

جس کی مثال نہیں مل سکتی۔"

"واقعی یہ تو بہت کمال کی بات ہے۔"

"ہاں، کمال کی بات ہے۔ ریحانہ کی حسیں بہت تیز ہیں۔ وہ جانتی ہے کہ میرے کپڑے کہاں رکھے رہتے ہیں، میرے جوتے کہاں ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ کچن کا سارا کام بھی وہی سنبھالتی ہے۔ اس کے ہاتھوں میں بہت ذائقہ ہے۔ میں اس کی آسانی کے لیے چولہا جلا دیتا ہوں یا گرم پتیلی وغیرہ اتار لیتا ہوں۔ بس اس کے علاوہ کچھ نہیں کرنا پڑتا۔ وہ جانتی ہے کہ مسالے کہاں رکھے ہیں، چائے کی پتی چینی اور دیگر چیزیں کہاں ہیں۔ وہ بالکل آنکھوں والوں کی طرح کام کرتی ہے۔ خود میں بھی کبھی کبھی حیران ہو کر رہ جاتا ہوں۔"

"خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں ایسی بیوی دی ہے۔"

"ہاں یار۔"

ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ ریحانہ بہت سلیقے کے ساتھ ایک ٹرے لے کر داخل ہوئی۔ اس میں چائے اور دیگر لوازمات تھے۔ اس کی سلیقہ مندی پر حیرت ہو رہی تھی۔ وہ اتنی ہی دیر میں بغیر کسی مدد کے خود ہی چائے بنا کر لے آئی تھی۔ نابینا ہونے کے باوجود اس کی یہ بصیرت دیکھنے کے قابل تھی۔

بشیر نے آگے بڑھ کر ٹرے اس کے ہاتھ سے لے لی۔ ریحانہ بھی ایک طرف جا کر بیٹھ گئی تھی۔ ہم پھر باتیں کرنے لگے۔ اس کی باتوں میں بھی ذہانت تھی۔

اس نے پنجاب کے ایک اسکول سے بریل سسٹم کے تحت انٹر کیا تھا اور اس کا ارادہ آگے پڑھنے کا تھا۔ اس کی باتیں بہت شگفتہ تھیں۔ اس سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ اس میں حسِ مزاح بھی موجود ہے۔

سچ یہ ہے کہ اس عورت نے مجھے متاثر کر لیا تھا۔ کوئی کمی نہیں تھی اس میں، وہ صرف آنکھوں سے نابینا تھی۔

اگر اس کی آنکھیں واپس آجاتیں تو وہ لاکھوں میں ایک ہو سکتی تھی۔

میں کچھ دیر بعد واپس آگیا۔ میں ایک انتہائی خوش گوار تاثر لے کر لوٹا تھا۔

بشیر کی بیوی اس کے لیے خوش قسمت ہی ثابت ہو رہی تھی۔

اسی دوران بشیر کو..... دوسری ملازمت مل گئی۔ تنخواہ پہلے سے زیادہ تھی اور ترقی کے امکانات بھی تھے۔ میں نے جب اسے مبارکباد دی تو ہنس کر بولا۔ "ہاں بھائی، یہ سب اسی نیک بخت کی وجہ سے ہے۔ اس نے مجھے اتنا سکون دیا ہے کہ میں بہت آرام اور سکون سے آیندہ کے لیے جدوجہد کر سکتا ہوں۔"

ایک دن اس نے مجھ سے کہا۔ "یار، تمہاری بھابی تو عجیب ضد کر رہی ہے۔"

"وہ کیا۔"

"کہہ رہی ہے فلم دکھانے لے چلو۔"

"تو لے جاؤ، اس میں کیا برائی ہے۔"

"بھائی خود سوچو۔ وہ بے چاری بالکل نابینا ہے۔ اس کو کیا نظر آئے گا۔ کچھ سمجھ میں آئے گا؟"

"اس کی خواہش ہے تو لے جاؤ۔ اور ویسے بھی اس کی زندگی میں کوئی تفریح تو ہے نہیں۔ کچھ دیر گھر سے باہر رہ کر خوش ہی ہو جائے گی۔"

"ٹھیک ہے یار..... تم کہتے ہو تو لے جاؤں گا۔"

دو چار دنوں کے بعد جب ملا تو بہت پُرجوش اور حیران ہو رہا تھا۔ "بھائی..... تمہاری بھابی نے تو کمال ہی کر دیا۔"

"کیا کمال دکھا دیا۔"

"میں اس کو فلم دکھانے لے گیا تھا کنیز، تم جانتے ہو کیسی زوردار فلم ہے۔ میرا خیال تھا کہ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا ہوگا لیکن اس نے تو اس طرح انجوائے کیا ہے، جس طرح آنکھوں والے کرتے ہیں..... بلکہ ہم سے بھی زیادہ، میں نے گھر واپس آکر جب پوچھا تو اس نے پوری فلم کی کہانی سنا دی، یہاں تک بتا دیا کہ کس موقع پر کس کے کیا تاثرات تھے۔"

"یہ تو واقعی حیرت کی بات ہے۔"

"ہاں، کہہ رہی تھی کہ میں آوازوں سے سب کچھ سمجھ لیتی ہوں۔ اتار چڑھاؤ، تاثرات، سب آوازوں سے پتا چل جاتا ہے۔ اس لیے اسے کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی۔ وہ پہلے بھی چار پانچ فلمیں دیکھ چکی ہے، اس کے گھر والے اسے لے جایا کرتے تھے۔"

کسی نابینا کی ایسی صلاحیت کم از کم پہلی بار میرے سامنے آرہی تھی یا تو بشیر کی بیوی غیر معمولی طور پر ذہین تھی، یا پھر ہر نابینا میں کچھ اسی قسم کی صلاحیت ہوا کرتی ہے۔

میں اس کے بعد بھی کئی بار بشیر کے گھر گیا۔ اس کی

بیوی میرے سامنے آکر بیٹھ جاتی۔ ہم بہت دیر تک باتیں کرتے رہتے۔ اس کی بیوی مجھے اپنا دوست اور ہمدرد سمجھنے لگی تھی۔

یہی حال میرا بھی تھا۔ وہ چونکہ چشم بصیرت رکھنے والی عورت تھی۔ اس لیے میں اپنے معاملات میں اس سے مشورے بھی لیا کرتا اور اس کے مشورے بہت مفید ہوا کرتے تھے۔

اس عورت نے بشیر کی زندگی میں خوشیوں کے رنگ بھر دیے تھے۔ چونکہ یہ سب کچھ ہماری آنکھوں کے سامنے کا تھا۔ اسی لیے ہم بجا طور پر یہ کہہ سکتے تھے کہ ریحانہ کی نابینائی نے اس کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔

وہ میاں بیوی اپنی دنیا اور اپنی زندگی میں بہت خوش اور مطمئن تھے۔

پھر یہ ہوا کہ بشیر سے کچھ دنوں تک ملاقات نہیں ہو سکی۔ کچھ دنوں کے بعد وہ ملا تو بہت بجھا بجھا اور اداس تھا، میں نے اس سے وجہ پوچھی تو بے زار ہو کر بولا۔ ”چھوڑ یار، لگتا ہے اب عورت کا دماغ خراب ہونا شروع ہو گیا ہے۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہو؟“

”ہاں بھئی، میں تو ہر طرح سے اسے اطمینان دلانے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔ اس کا خیال رکھتا ہوں۔ اس کے باوجود اس کا شک ختم نہیں ہوتا۔“

”آخر کس بات کا شک ہے اس کو۔“

”اس کا خیال ہے کہ میں نے کسی اور عورت سے دوستی کر لی ہے۔“ اس نے بتایا۔

”کمال ہے، بھابی کو یہ شک کیسے ہوا؟“

”مجھے نہیں معلوم، یار، تم ہی اس سے معلوم کرنے کی کوشش کرو۔ وہ تم سے مانوس بھی ہے، تم کریدو گے تو وہ تمہیں بتا بھی دے گی۔“

بشیر کے کہنے پر میں نے جب ریحانہ سے ملاقات کی تو اسے دیکھ کر بہت افسوس ہوا۔ وہ بے چاری نابینا عورت بہت ٹوٹی ہوئی تھی۔

میں نے اس سے کہا۔ ”بھابی، آپ تو بہت ہمت والی ہیں، پھر آپ کو کیا ہوا، بشیر سے اتنی ناراضی کس لیے۔“

”بھائی صاحب، ایک بات بتائیں، کیا نابینا کے سینے میں دل نہیں ہوتا۔ کیا اس کے جذبات نہیں ہوتے، کیا وہ اپنے شوہر کی بے وفائی پر اس سے ناراض نہیں ہو سکتی۔“

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں لیکن آپ کو کیسے پتا چلا کہ بشیر آپ سے بے وفائی کر رہا ہے۔ کس نے بتایا ہے آپ کو؟“

”کسی نے نہیں۔ مجھے کون بتانے والا ہے، آپ ان کے دوست ہیں۔ آپ خود معلوم کر لیں کہ منگل کو انہوں نے کس عورت کو اپنے آپ سے قریب کیا تھا۔“

”یہ تو آپ نے عجیب بات بتا دی۔“

”پلیز، ان سے معلوم کریں۔“ اس نے کہا۔ ”اس کے بعد ہی میں آپ کو کچھ بتاؤں گی۔“

میں نے بشیر سے بات کی۔ ”دیکھو، تم مجھے سچ سچ بتاؤ، کچھ چھپانے کی کوشش مت کرنا۔ تم یہ بتاؤ منگل کو تم نے کس عورت کو خود سے قریب کیا تھا۔“

”عورت کو۔“ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اسے یاد آ گیا۔ ”ہاں، وہ ایک حادثہ ہو گیا تھا۔ میں اور میرے دفتر کی ایک لڑکی سیڑھیوں سے اتر رہے تھے کہ اچانک اس کا پیر پھسل گیا۔ وہ بے چاری کئی سیڑھیاں نیچے جا گری۔ اس کی حالت ایسی تھی کہ وہ اٹھ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کے ٹخنے میں فریکچر ہو گیا تھا۔ مجبوراً میں اسے گود میں اٹھا کر نیچے لے آیا تھا اور دفتر کی گاڑی سے ہاسپٹل پہنچایا۔ بس اتنی سی بات ہوئی تھی، لیکن تمہیں کس نے بتایا؟“

”تمہاری بیوی نے۔“

”اسے کیسے معلوم ہوا۔“ وہ حیران رہ گیا تھا۔ ”میں نے تو اسے کچھ نہیں بتایا۔“

”یہ ایک معما ہے۔ کیوں نہ بھابی سے معلوم کیا جائے۔“

ہم دونوں نے ریحانہ کو یہ کہانی سنا دی۔ اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”خدا کا شکر ہے، میری غلط فہمی دور ہو گئی۔“

”لیکن ریحانہ تمہیں یہ کیسے پتا چلا؟“ بشیر نے پوچھا۔

”بہت آسانی سے۔“ ریحانہ مسکرا دی۔ ”اس شام آپ کے جسم سے کسی غیر عورت کی خوشبو آ رہی تھی۔“

میں اور بشیر دونوں ہی یہ سن کر دنگ رہ گئے تھے۔

کیا حس تھی۔ ایک تو وہ بشیر کی بیوی تھی، پھر نابینا بھی تھی اور قدرت نے اس کی حسیات میں کیسا کمال بھر دیا تھا۔ کیا آنکھوں والوں میں ایسی کوئی مثال مل سکتی ہے؟

□

بڑا آدمی

جناب ایڈیٹر صاحب

السلام علیکم!

محبت انسان کو معراج بخشتی ہے مگر یہ قربانی کی طلبگار ہے۔ یہ سرگزشت بھی محبت کے ایک تکون کی ہے، کیسی عجیب ہے یہ روداد، خود آپ بھی ملاحظہ کریں۔

جنید
(لاہور)

میں اُسے قبرستان میں ایک قبر پر فاتحہ پڑھتے ہوئے دیکھا کرتا۔

وہ اکیلا نہیں ہوتا تھا، بلکہ اس کے ساتھ ایک نوجوان بھی ہوتا۔ شاید وہی نوجوان اسے قبرستان تک لایا کرتا۔ لیکن خود فاتحہ پڑھنے کی بجائے ایک طرف جا کر کھڑا ہو جاتا۔

میں اس کے چہرے پر بے زاری کے احساسات دیکھا کرتا تھا جیسے وہ قبرستان آ کر بور ہو رہا ہو۔

میرا قبرستان میں آنا جانا اس لیے تھا کہ مجھے راشدہ سے بہت محبت تھی مجھے اور یہی محبت اس کی موت کے بعد بھی اس سے دور نہیں جانے دیتی تھی۔ میں اس کی یادوں سے اپنے آپ کو کسی بھی لمحے خالی محسوس نہیں کرتا تھا۔

میں اکثر جمعرات اور جمعہ کے دن آیا کرتا تھا اور یہاں مجھے وہ نابینا شخص دکھائی دے جاتا جو ایک نوجوان کے ساتھ فاتحہ خوانی کے لیے آیا کرتا تھا۔

وہ پچاس اور پچپن کے درمیان کا ایک معقول انسان دکھائی دیتا تھا۔ اس کا لباس بھی بہت معقول ہوا کرتا تھا۔ اس کے ساتھ آنے والا نوجوان آج کل کے نوجوانوں ہی کی طرح تھا، بے پروا سا۔

میں نے اسے کبھی فاتحہ خوانی کرتے نہیں دیکھا اور یہی بات میرے لیے تجسس کی تھی۔ اتفاق یہ تھا کہ قبر پر کوئی کتبہ وغیرہ بھی نہیں تھا جس سے یہ اندازہ ہوتا کہ وہ قبر کس کی ہے۔

اگر کسی رشتے دار یا خاندان کے کسی بزرگ وغیرہ کی ہوتی تو اس نوجوان کو بھی فاتحہ پڑھنا چاہیے تھی یہ صرف اس نابینا کا فرض تو نہیں تھا۔

ایک دن جب مجھ سے برداشت نہیں ہوا تو میں خود اس نوجوان کے پاس پہنچ گیا۔ اس وقت وہ نابینا معمول کے مطابق قبر کے پاس ہی موجود تھا۔

"ہاں بیٹے ایک بات تو بتاؤ۔" میں نے اس نوجوان کو مخاطب کیا۔

"جی فرمائیں۔"

"یہ قبر کیا تمہاری والدہ کی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں جناب، میری والدہ ابھی زندہ ہیں۔" اس نے بتایا۔

"اور یہ صاحب کون ہیں۔" میں نے اشارہ کیا۔

"یہ میرے والد ہیں۔" اس نے بتایا۔

"سمجھ گیا۔ تو پھر یہ قبر تمہارے کسی رشتے دار وغیرہ کی ہوگی۔ شاید دادا یا دادی کی۔" میں نے کہا۔

"نہیں جناب، ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ قبر کسی رشتے دار کی نہیں ہے۔"

"حیرت کی بات ہے۔ تو پھر؟"

"یہ آپ خود ابو سے پوچھ لیں۔" وہ بے زاری سے بولا۔ "میں تو خود ان کو یہاں لا کر بور ہوتا ہوں۔"

"اچھا۔" میں ہنس پڑا۔ "تمہاری بے زاری تو تمہارے چہرے پر لکھی ہوتی ہے۔"

"تو کیا کروں میں۔ انسان کو پچاس کام ہوتے ہیں۔ ان کی ہر ہفتے یہی ضد ہوتی ہے کہ قبرستان چلو۔ مجبوراً لے کر آنا پڑتا ہے۔"

"تم تو اور بھی حیرت زدہ کر رہے ہو۔" میں نے کہا۔ "تمہیں کم از کم معلوم تو ہوگا کہ یہ کس کی قبر ہے۔"

"میں نے کہا نا کہ آپ ابو سے پوچھ لیں۔ وہ آپ کو سب بتا دیں گے۔" اس نے کہا۔

اس دوران وہ نابینا فاتحہ وغیرہ سے فارغ ہو کر نوجوان کو آواز دے رہا تھا۔ "شہزاد، شہزاد۔"

"اچھا میاں، تمہارے ابو بلا رہے ہیں۔ تم تو جاؤ، لیکن میں ان سے خود معلوم کروں گا۔"

دو چار ہفتوں کے بعد موقع مل ہی گیا۔ میں معمول کے مطابق فاتحہ خوانی میں مصروف تھا کہ وہی دونوں قبرستان میں داخل ہوئے۔

قبر کے پاس آکر نوجوان نے اپنے باپ سے کہا۔ "اچھا ابو، آپ جب تک فاتحہ وغیرہ پڑھ لیں، میں گاڑی چیک کرا کے آتا ہوں۔"

"بیٹے، زیادہ دور نہیں نکل جانا۔"

"نہیں، میں آدھا گھنٹے میں واپس آجاؤں گا۔ آپ یہیں رہیے گا۔"

نوجوان نے مجھے سلام کیا اور قبرستان سے باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں انتظار کرتا رہا کہ وہ کب فاتحہ وغیرہ سے فارغ ہوتا ہے اور جیسے ہی فارغ ہوا، میں جلدی سے اس کے پاس پہنچ گیا۔

"السلام علیکم جناب!" میں نے اسے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔" اس نے سلام کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔ "کون صاحب۔"

"جناب میرا نام جنید ہے۔" میں نے بتایا۔ "میں اکثر جمعرات اور جمعہ کو فاتحہ خوانی کے لیے آیا کرتا ہوں۔"

"اچھی بات ہے۔" اس نے گردن ہلائی۔ "ہمیں جانے والوں کو بھولنا نہیں چاہیے۔"

"جناب، میں ایک بات آپ سے پوچھ سکتا ہوں۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔"

"میں تو اپنی مرحومہ بیوی کی قبر پر فاتحہ کے لیے آیا کرتا ہوں اور آپ؟"

"میں...." وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ پھر دھیرے سے بولا۔ "میں محبت کی قبر پر فاتحہ پڑھنے آتا ہوں۔"

"سمجھ گیا۔ یہ شاید آپ کی بیوی یا اس کے رشتے دار کی قبر ہے۔ جس سے آپ نے کبھی محبت کی ہوگی۔"

"نہیں بھائی، اسے قبر مت کہو۔ یہ محبت کا تاج محل ہے۔ علامت ہے محبت کی۔ یہ اس کی قبر ہے جس سے میرا رشتہ بہت عجیب تھا۔ لوگ تو اس رشتے کا نام لینا پسند نہیں کرتے۔ لیکن میں اس کی قبر پر فاتحہ کے لیے آیا کرتا ہوں۔"

"میں نہیں سمجھا جناب۔" میں الجھ کر بولا۔ "آخر یہ کس کی قبر ہے؟"

"میرے رقیب کی۔" اس نے بتایا۔

"رقیب کی؟" میں حیران رہ گیا تھا۔

"ہاں رقیب کی۔" اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ "میں نے اپنے رقیب کی موت کے بعد اس سے محبت کی ہے۔ کیونکہ میں اس کا حق ادا نہیں کر سکتا۔"

"آپ تو مجھے حیران کیے دے رہے ہیں جناب!" میں نے کہا۔

"نہیں۔ زندگی میں ایسا بھی ہوتا ہے۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "کہانیاں تو اسی طرح بنتی ہیں۔ شاید تم میری کہانی سننا چاہتے ہو۔"

"جی جناب۔ اب تو تجسس ہوگیا ہے۔" میں نے کہا۔ "ورنہ میں بے چین ہی رہوں گا۔ سوچتا ہی رہوں گا کہ آخر یہ سب کیا ہے۔"

"فرصت ملے تو میرے گھر آجانا۔" اس نے کہا۔ "میرے بیٹے سے پتا معلوم کر لینا۔"

☆☆☆
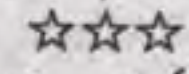
اس ملاقات کے کوئی ایک ہفتے کے بعد میں اس نابینا شخص کے خوبصورت ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔

ویسے مجھے یہ اندازہ تو پہلے ہی ہوگیا تھا کہ وہ پیسے والے لوگ ہیں۔ ان کا شاندار گھر اور گھر کی سجاوٹ بھی یہی بتا رہی تھی۔

میں نے جب اس نوجوان سے اس کے گھر کا ایڈریس معلوم کیا تو وہ ہنس پڑا تھا۔ "آخر چین نہیں آیا آپ کو، کہانی سننے کے لیے بے چین ہو ہی گئے۔"

"ہاں میاں۔ تمہارے ابو نے صاحبِ قبر سے اپنا تعلق بتا کر مجھے حیران کر دیا ہے۔"

"اور آپ نے ابو سے بات بھی کر لی۔"

"ہاں، اسی لیے تو انہوں نے مجھے بلایا ہے۔" میں نے کہا۔ "تاکہ وہ مجھے کچھ بتا سکیں۔"

"آپ ضرور آئیں تاکہ ابو کی بھی گھٹن نکلے۔ بہت دنوں سے اس کہانی کو اپنے سینے میں دبائے بیٹھے ہیں۔ اچھا ہے اسی بہانے ان کا ذہن ہلکا ہو جائے۔"

تو میں اس طرح ان کے گھر پہنچ گیا۔

بہت شاندار مکان تھا۔ لوگ بھی مہذب تھے۔ میں نے وہاں ایک دو اور نوجوانوں کو دیکھا جو اس نابینا کے بیٹے تھے اور سب کے سب باپ کا احترام کرنے والے۔ اسی لیے مجھے بھی بہت احترام کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بٹھا کر میرے سامنے بہت سلیقے سے چائے اور دوسرے لوازمات رکھ دیے گئے تھے۔

کچھ دیر بعد وہ نابینا بھی میرے سامنے آکر بیٹھ گیا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اس نے کہنا شروع کیا۔ "سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ داستان کہاں سے شروع کروں۔ اپنے آپ سے یا شرجیل اور سارہ سے۔"

"یہ شرجیل اور سارہ کون ہیں جناب۔"

"سارہ میری بیوی ہے۔" اس نے بتایا۔ "اور شرجیل وہ نوجوان ہے جو میرا رقیب تھا۔ جس نے سارہ سے محبت کی تھی۔ ایسی محبت بھی بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ اسی لیے تو میرے دل میں اپنے اس رقیب کے لیے احترام ہے۔"

"ویسے آپ پہلے آدمی ہیں جو اپنے رقیب کا ذکر اس انداز سے کر رہے ہیں۔ ورنہ عام طور پر تو لوگ اس رشتے کو گالیاں ہی دیتے آئے ہیں۔"

"لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "ویسے بھائی، یہ بہت اچھا ہوا کہ تم مجھ سے میری کہانی سننے میرے پاس آگئے، ورنہ میں گھٹتا ہی رہتا۔"

"میں بھی بے چین ہو رہا تھا اسلم صاحب۔" میں نے کہا۔ اس نے مجھے اپنا نام اسلم بتایا تھا۔

"یہ ایک کامیاب کاروباری شخص اور ایک حسرت زدہ محروم انسان کی کہانی ہے۔" اس نے کہا۔ "یہ وہی ازلی مثلث ہے جس پر ہزاروں کہانیاں لکھی گئی ہیں لیکن اس کا انداز مختلف ہے۔"

"میں سن رہا ہوں اسلم صاحب۔" میں نے بتایا۔

"دونوں ایک دوسرے سے بے پناہ پیار کرتے تھے۔" اس نے کہا۔ "یعنی سارہ اور شرجیل۔ سارہ کے جنون کی کیفیت کا تو میں نہیں بتا سکتا لیکن شرجیل کے لیے کہہ سکتا ہوں کہ اس جیسے محبت کرنے والے کم ہی ہوا کرتے ہیں۔ اس کا عشق پرانے زمانے کے کرداروں کی طرح تھا جو محبت کی راہ میں فنا ہو جاتے ہیں۔ جان کی بازی ہار دیتے ہیں اور اُف بھی نہیں کرتے۔"

بولتے بولتے وہ خاموش ہو کر سوچنے لگا۔ شاید اس طرح وہ اپنے گزرے دنوں کو یاد کر رہا تھا۔

"خیر۔" اس نے کچھ دیر بعد پھر بتانا شروع کیا۔ "جنید میاں، دونوں ایک دوسرے کو بہت پسند کرتے تھے۔ ایک بات بتا دوں کہ مجھے اپنی بیوی سارہ پر بہت اعتماد ہے۔ جانتے ہو اس اعتماد کی وجہ کیا ہے۔ حالانکہ مجھے یہ بات بھی معلوم تھی کہ سارہ کسی سے محبت کرتی ہے۔ اس کے باوجود میں نے اس پر پہلے بھی آنکھ بند کر کے بھروسا کیا تھا اور آج بھی کرتا ہوں۔"

"یہ تو آپ کے ظرف کی بات ہے جناب۔"

"نہیں، میرے ظرف کی نہیں۔ ان کے عشق کی بات ہے۔" اسلم نے کہا۔ "یہ دو مختلف چیزیں ہوا کرتی ہیں۔ اگر معاملہ صرف پسند ناپسند یا پیار وغیرہ کا ہو تو ہزار قسم کے خدشے ہوا کرتے ہیں۔ لیکن بات جب عشق، خالص عشق کی ہو تو پھر اور کوئی جذبہ درمیان میں نہیں آتا۔"

"یہ آپ نے بہت گہری بات کہہ دی جناب۔"

"ہاں، نابینا ہو جانے کے بعد بہت سی حقیقتیں مجھ پر کھلنے لگی ہیں۔" اس نے بتایا۔

"تو کیا آپ شروع سے۔۔"

"نہیں بھائی، میں شروع سے بالکل ٹھیک تھا۔" اس نے بتایا۔ "ایک کامیاب کاروباری انسان۔ میری اپنی فرم تھی جو آج بھی ہے۔ جس کو میرے بیٹے سنبھال رہے ہیں۔ مکمل بینائی تھی مجھ میں ..... زندگی میں میری آنکھیں کبھی خراب نہیں ہوئیں۔ پھر ایک دم سے اندھیرا چھا گیا۔"

"ایسا کس طرح ہو گیا اسلم صاحب۔" میں نے پوچھا۔

"شوگر۔" اس نے بتایا۔ "دنیا کا انتہائی موذی مرض۔ یہ صرف ایک ہی مرض نہیں ہے، بلکہ اس کا پورا خاندان ہوا کرتا ہے۔ یہ اپنے ساتھ بے شمار آفتیں لے کر آیا کرتا ہے۔"

"جی ہاں۔ یہ تو ہے۔۔"

"خیر۔ تو میں یہ بتا رہا تھا کہ سارہ اور شرجیل ایک دوسرے سے عشق کرتے تھے۔ لیکن ازل سے آج تک اس عشق کی راہ میں ایک رکاوٹ رہی ہے اور وہ ہے معاشی مجبوری۔ شرجیل ایک عام سی زندگی گزار رہا تھا۔ ایک اخبار میں ملازم تھا اور وہاں کی سیلری ایسی نہیں تھی کہ وہ سارہ کے ساتھ فراغت کی زندگی گزار سکے۔"

"کیا سارہ کا تعلق دولت مند گھرانے سے تھا۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ پیسے والے لوگ تھے۔" اس نے بتایا۔ "بہت کچھ تھا ان کے پاس۔ اسی لیے انہیں سارہ اور شرجیل کا ساتھ پسند نہیں تھا۔"

"وہی پرانی کہانی۔" میں نے کہا۔

"ہاں، وہی پرانی کہانی جو عنوان بدل بدل کر ہر دور میں سامنے آتی رہی ہے۔" وہ دھیرے سے بولا۔ "اور اس کہانی میں ایک رقیب بھی تھا، اور وہ رقیب میں تھا۔ جو ان دونوں کے درمیان آ رہا تھا۔"

"کیا آپ سارہ کو چاہتے تھے۔"

"ہاں، میرے ڈیڈ اور اس کے ڈیڈ ایک دوسرے کے دوست تھے۔" اس نے بتایا۔ "میں نے اپنی زندگی باہر گزاری تھی۔ اسی لیے یہاں کے حالات نہیں جانتا تھا۔ پھر یہ ہوا کہ میں نے پاکستان آ کر بزنس شروع کر دیا اور اسی دوران سارہ سے میری ملاقات ہو گئی۔"

"وہ پہلی ہی نظر میں مجھے پسند آ گئی تھی۔ میں نے ہر حال میں اس کو حاصل کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ کم از کم میرے لیے تو کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ والدین ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ کوئی مالی پریشانی نہیں تھی۔ خاندانی معیار بھی ایک جیسا تھا۔ اسی لیے جب میں نے اپنا رشتہ بھیجا تو اسے فوراً قبول کر لیا گیا۔"

"اور سارہ۔ اس کا کیا ردِعمل تھا۔"

"وہ بھی بہت کھری لڑکی نکلی تھی۔ اس نے ایک دن ملاقات کر کے مجھے شرجیل کے بارے میں سب کچھ بتا دیا کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے۔ اس نے مجھ سے کچھ نہیں چھپایا تھا۔"

میں نے کسی طرح اس سے شرجیل کا ایڈریس معلوم کر لیا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ سارہ جیسی لڑکی جس شخص سے محبت کرتی ہے وہ خود کیسا ہوگا۔"

"میں شرجیل سے ملا۔ پہلی نگاہ میں مجھے اس میں کوئی خاص بات معلوم نہیں ہو سکی لیکن جب اس سے باتیں شروع ہوئیں تو اندازہ ہوا کہ وہ بہت بڑا انسان ہے۔"

"اس کے پاس پیسے نہیں ہوتے تھے۔ اس کے باوجود وہ ایک خوددار انسان تھا۔ اس نے سارہ سے عشق کیا تھا۔ عشق جس کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ جسے کسی پیمانے میں تولا نہیں جا سکتا۔"

"کیا آپ نے اسے بتا دیا تھا کہ آپ کون ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، میں نے بھی اس سے کچھ نہیں چھپایا تھا۔ میں نے بتا دیا کہ میں سارہ کو پسند کرنے لگا ہوں اور اس سے شادی کرنے والا ہوں۔"

"پھر تو اس کا رویّہ بہت خراب ہو گیا ہوگا۔"

"نہیں۔ اس کے برعکس وہ مجھ سے اور گرم جوش ہو گیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ محبت کا نام ہے اپنے محبوب کو خوش دیکھنا۔ چاہے وہ کہیں بھی ہو۔ کسی کے بھی ساتھ ہو۔ اسے خوش رہنا چاہیے۔ محبوب کی یہی معراج ہوتی ہے کہ اپنے چاہنے والے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھے۔"

اس نے کہا کہ وہ سارہ کو خوش نہیں رکھ سکتا تھا کیونکہ اس کے پاس وسائل نہیں ہیں۔ وہ ایک غریب انسان ہے۔ سارہ تو ایک پھول کی طرح ہے جو اس کے پاس آ کر کچھ دنوں کے بعد مرجھا جائے گی۔ اسی لیے وہ اس کے ساتھ شادی کر کے اس سے زیادتی نہیں کرے گا۔ اپنی خوشی کی خاطر اپنے محبوب کو مفلسی کی آگ میں جھونک دینا خودغرضی ہے اور وہ یہ خودغرضی کبھی نہیں کر سکتا۔"

"کمال کا آدمی تھا۔"

"اسی لیے تو میں اس کا احترام کرتا ہوں۔" اسلم نے کہا۔ "ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔ وہ بھی ایک

حضرت ابوالحسن شاذلی افریقہ کی ایک بستی میں 593ھ میں پیدا ہوئے اور تربیت شاذلہ میں ہوئی۔ اسی مناسبت سے آپ کو شاذلی کہا جاتا ہے۔ آپ علم ظاہر میں باکمال تھے اور مناظرہ میں مشہور تھے۔ آپ نے علوم کی تحصیل کے بعد سیاحت کی اور حج کیے۔ حضرت ابوالحسن شاذلی نابینا تھے۔

....

حکیم عبدالوہاب انصاری دہلوی عرف حکیم نابینا دہلی کے مشہور طبیب، ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے بڑے بھائی تھے۔ آپ نابینا تھے۔ حیدر آباد دکن میں نواب محبوب علی خان، نظام دکن کے شاہی معالج بھی تھے۔ آپ مریض کی حالت نہیں پوچھتے تھے اور خود نبض ٹٹول کر تشخیص کرتے تھے کہ مریض حیران رہ جاتے تھے۔ ایک دفعہ مہاراجا سرکشن پرشاد، وزیراعظم دکن کے بچوں کی نبض دیکھنے کوٹھی پر تشریف لے گئے۔ انہوں نے بیگمات اور بچوں کی نبضیں دیکھیں۔ کسی سے حال نہیں پوچھا خود ہی مریض کی کیفیت بیان کرتے جاتے تھے اور بیمار تصدیق کرتا جاتا تھا۔

....

بغداد کا طبیب ابوالحسن اپنے وقت کا عظیم معالج تھا۔ اپنی عمر کے آخری بیس سالوں میں وہ نابینا ہونے کے باوجود کامیاب معالج رہا۔

....

جان ملٹن (1608-1674) کا شمار انگریزی زبان کے عظیم شعرا میں ہوتا ہے۔ اس کی رزمیہ نظم Paradise Lost بہت مشہور ہے۔ وہ (52-1651) میں بینائی کھو بیٹھا لیکن اپنا علمی کام جاری رکھا۔ وہ ایک جگہ لکھتا ہے "وہ مجھے نابینا ہونے کا طعنہ دیتے ہیں حالانکہ میں نے تو حصولِ آزادی کی کوشش میں اپنی بینائی کھودی۔ وہ مجھ پر بزدلی کا الزام دھرتے ہیں حالانکہ جب تک میں اپنی بینائی اور تلوار استعمال کر سکتا تھا۔ ان میں سے بڑے بڑے دلیروں کو بھی خاطر میں نہ لاتا تھا۔ پھر مجھے بدنمائی کے لیے ملامت کی جاتی ہے حالانکہ میرے زمانہ حسن میں مجھ سے زیادہ حسین کوئی نظر نہ آتا تھا۔ میں اپنی بصارت کھو جانے پر ایک حرفِ شکایت بھی لب پر نہ لایا۔ رات کی تاریکی تو میرے چاروں اطراف میں پھیلی ہوئی ہے لیکن ایک ملکوتی وجود میرے لیے نورانی جگمگاہٹ کا سامان پیدا کرتا رہتا ہے۔"

مرسلہ: احمد جاوید، سکھر

مثال ہی تھا۔ اس نے... سارہ کی خوشی کے لیے سارہ سے اپنی محبت کی قربانی دے دی۔"

اسلم بولتے بولتے خاموش ہوگیا تھا۔ شاید ایک بار پھر یادوں نے اس پر یلغار کردی ہو۔

بہت دیر بعد اس نے اپنی گردن اٹھائی۔ "پھر یہ ہوا بھائی کہ سارہ سے میری شادی ہوگئی۔"

"پھر شادی کے بعد سارہ کا آپ سے کیا رویّہ رہا۔"

"نارمل! جس طرح مشرقی لڑکی کا رویّہ ہوا کرتا ہے۔" اس نے بتایا۔ "وہ انتہائی وفادار اور شوہر پرست بیوی ثابت ہوئی۔ شادی کے بعد اس نے کبھی احساس بھی نہیں ہونے دیا کہ اس کی کسی اور کے ساتھ وابستگی تھی۔"

"ہاں۔ ہمارے یہاں کی ہر عورت کا یہی کردار ہوا کرتا ہے۔" میں نے کہا۔

"کئی برس گزر گئے۔ میں کاروبار کرتا رہا۔ اس دوران شرجیل کے بارے میں نہیں معلوم ہوسکا کہ وہ کہاں ہے اور کیا کررہا ہے۔ پھر یہ ہوا کہ میں شوگر کے موذی مرض کا شکار ہوگیا۔"

"اوہ...!" میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہہ سکا تھا۔

"میں نے بہت علاج کروایا۔ میرے پاس پیسے تھے لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ سب سے پہلے میری کڈنی تباہ ہوگئی۔ ڈاکٹرز نے بتایا کہ اگر آپ کی کڈنی تبدیل نہیں ہوئی تو آپ کی موت لازمی ہے۔

بے چاری سارہ کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔ وہ خود اپنا گردہ دینا چاہتی تھی۔ لیکن بلڈ میچ نہیں کررہا تھا۔ دوسری طرف ڈاکٹرز بھی کوشش کررہے تھے لیکن ناکامی ہورہی تھی۔ بالآخر اخبار میں اشتہار دے دیا گیا اور اشتہار کے جواب میں جو شخص آیا، اس کے بارے میں اندازہ لگا سکتے ہو۔"

"وہ یقیناً شرجیل ہوگا۔"

"ہاں، وہی شرجیل۔ اور یہ کیسا اتفاق تھا کہ اس کی ہر چیز میچ کرگئی تھی۔ اب صرف ایک کام تھا کہ اس کا گردہ نکال کر مجھے لگا دیا جاتا۔ اور اس وقت اس نے پیسوں کی ڈیمانڈ کردی۔"

"پیسوں کی۔" میں بھی سن کر چونک گیا تھا۔

"ہاں۔ اس نے پانچ لاکھ مانگے تھے۔" اسلم نے بتایا۔ "اور جب یہ بات سارہ کو معلوم ہوئی تو اس پر بھی سکتہ ہوگیا تھا۔ اس نے صرف اتنا کہا تھا۔ دے دیں۔ ہوسکتا ہے اس بے چارے کو اس کی ضرورت ہو۔"

"بہرحال میں نے پانچ لاکھ دے دیے۔ اس نے اپنا گردہ دے دیا۔ آپریشن کامیاب ہوا تھا۔ کم از کم میرے لیے تو کامیاب ہی تھا۔ جبکہ شرجیل کی حالت بگڑتی چلی گئی۔ اسے کسی قسم کا انفیکشن ہوگیا تھا۔"

"اوہ...!" میں نے ایک گہری سانس لی۔ "تو یہ انجام ہوا اس شخص کا۔"

"اپنی موت سے پہلے اس نے ہم دونوں سے ملنے کی خواہش کی تھی۔ ہم جب اس کے پاس پہنچے تو اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بکس تھا۔

اس نے وہ بکس سارہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "سارہ، تمہیں یاد ہے، ایک بار تم میرے ساتھ جیولرز کی شاپ پر گئی تھیں۔ تمہیں وہ نیکلس پسند آیا تھا۔ لیکن میں وہ نہیں دلا سکتا تھا۔ کیونکہ وہ ساڑھے تین لاکھ کا تھا۔ اور جب اسلم صاحب سے مجھے پانچ لاکھ ملے تو سب سے پہلے میں نے تمہارا نیکلس خرید لیا۔ یہ میری طرف سے اپنی شادی کا تحفہ قبول کرلو۔"

"او خدا، گریٹ! کیسا آدمی تھا۔" میں بے ساختہ بول اٹھا۔

ہاں، وہ ایسا ہی آدمی تھا۔ اتنا ہی گریٹ۔ محبت کرنے والے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اسی لیے میں ابھی تک اس کی قبر پر جا کر فاتحہ خوانی کرتا ہوں۔ اس کا احترام کرتا ہوں۔ یہ ٹھیک ہے کہ شوگر نے میری بینائی چھین لی ہے۔ لیکن وہ شخص جاتے جاتے میرے اندر کی آنکھیں کھول گیا ہے۔"

یہ کہانی پیار کی کہانی تھی۔

جو برسوں تک مجھے یاد رہی۔ اس کے بعد میں بیرونِ ملک چلا گیا۔ وہاں سے واپس آکر دوبارہ جب اپنی بیوی کی قبر پر گیا تو قبرستان کا نقشہ ہی بدلا ہوا ملا۔

نہ تو مجھے اپنی بیوی کی قبر مل سکی اور نہ ہی اس سچی محبت کرنے والے کی۔ ورنہ میں بھی اس کی قبر پر فاتحہ خوانی ضرور کرتا۔
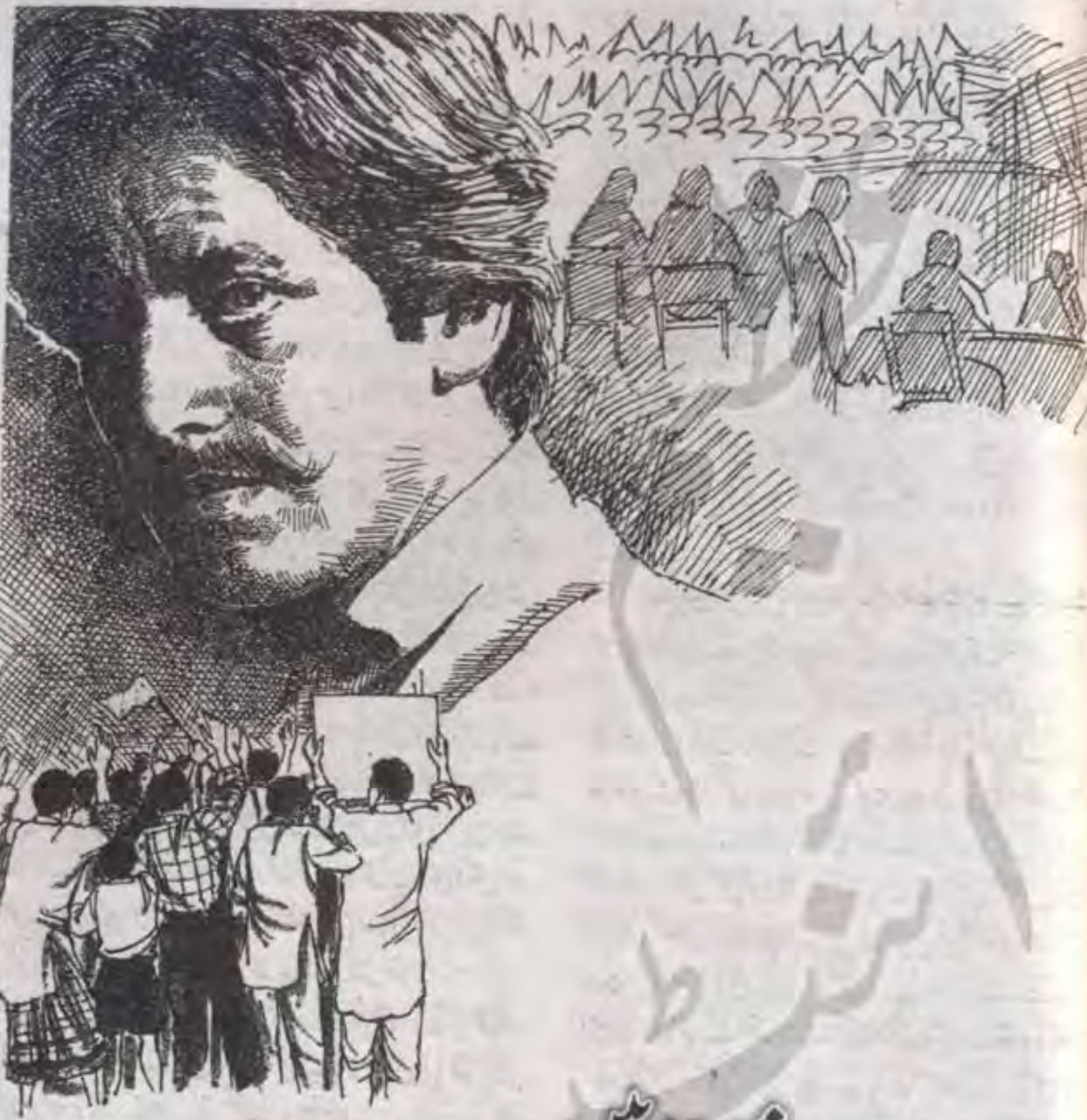
محدود بیں

جناب معراج رسول
السلام علیکم!
بینا نابینا نمبر کا اشتہار دیکھا تو مجھے اپنا ایک ملازم یاد آگیا، اس کی خوبیوں نے مجھے گرویدہ کرلیا تھا مگر میں نے اس کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔ اس میں غلطی کس کی تھی یہ قارئین ہی بتاسکتے ہیں۔

عدنان
(کراچی)

میں ایک عام فرد ہوں، چھوٹا سا کاروباری ہوں البتہ میرے انداز سے دوسرے سمجھتے ہیں کہ میں نہ جانے کتنا بڑا کاروباری ہوں۔ میری چھوٹی سی ایک فیملی ہے۔ بیوی اور دو بچے، خاندان بھی زیادہ بڑا نہیں ہے۔ صبح دفتر جاتا ہوں اور شام کو گھر واپس آتا ہوں۔ میری زندگی کا محور میرا بزنس اور میرا گھر ہے۔ زیرِ تحریر جو واقعہ ہے اس کا تعلق میرے بزنس سے ہے۔ اس لیے گھر کا احوال غیر ضروری ہو گا۔ میں امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس کرتا ہوں اس کے

ساتھ ہی میری ڈسٹری بیوشن فرم ہے۔ دونوں بزنس الگ ہیں مگر ایک دوسرے سے ملے ہوئے بھی ہیں۔ یہ فرم میرے والد صاحب نے قائم کی تھی اور اس وقت وہ چھوٹی سی ڈسٹری بیوشن کمپنی تھی پھر انہوں نے اسے ترقی دی اور امپورٹ ایکسپورٹ کا لائسنس بھی حاصل کر لیا۔ یہ جنرل بزنس تھا یعنی کوئی خاص فیلڈ نہیں تھی۔ ہاں یہ تھا کہ صارفین کے آئٹمز ہمارا خاص شعبہ تھا اور اس میں سب آجاتا تھا۔

شہر کے ایک مصروف کاروباری علاقے میں ایک بڑی بلڈنگ کے دوسرے فلور پر میرا دفتر تھا۔ یہ جگہ والد صاحب کے زمانے میں لی تھی۔ ان کے انتقال کے بعد جب میں مالک بنا تو میں نے دفتر میں بنیادی تبدیلیاں کرائیں۔ عام طور سے امپورٹر ایکسپورٹر اور ڈسٹری بیوشن کرنے والوں کے دفاتر عام سے اور پرانی عمارتوں میں ہوتے ہیں۔ میری مراد درمیانے درجے کے بزنس سے ہے، جیسا کہ میرا بزنس تھا۔ یہاں شو، شا اور چمک دمک کا خیال نہیں رکھا جاتا ہے کیونکہ یہاں عام آدمی کا گزر نہیں ہے جو یہ سب چیزیں دیکھتا ہے۔ ہمارے پاس جو کلائنٹ آتے ہیں وہ صرف بزنس سے غرض رکھتے ہیں۔ اسی طرح والد صاحب نے بھی دفتر کو سادہ رکھا تھا حالانکہ یہ بڑی اچھی اور خوب صورت عمارت میں تھا۔ دفتر میں صفائی ستھرائی تو نظر آتی تھی لیکن چمک دمک اور جدید انداز نہیں تھا۔

میں نے کراچی یونیورسٹی سے ایم بی اے کیا تھا اور پھر کچھ عرصے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں کام بھی کیا تھا۔ میں جدید کاروبار کے طریقے سیکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے جب کمپنی میرے ہاتھ میں آئی تو میں نے دفتر میں اپنی من پسند تبدیلیاں شروع کر دیں۔ اس کی انٹیریئر ڈیکوریشن میں تبدیلی لا کر دیواروں پر لکڑی کے پینل لگوائے۔ چھتوں پر ڈیزائن اور ان میں لائٹس لگوائیں۔ فرنیچر تبدیل کیا۔ رفتہ رفتہ میں دفتر کو اپنے مطلب کا کرنے میں کامیاب رہا۔ والد صاحب نے کمپیوٹر منگوائے تھے لیکن ان سے کام نہیں لیا جا رہا تھا۔ میں نے پورے دفتر کو کمپیوٹرائزڈ کر دیا۔ بزنس کا سارا ریکارڈ کمپیوٹر میں آگیا۔ اس سے اکاؤنٹس کے شعبے میں بہت آسانی پیدا ہوئی اور پہلے جہاں چھ افراد کام کرتے تھے اب وہاں صرف تین افراد سے کام چلنے لگا۔

لیکن میں نے اضافی افراد کو نکالا نہیں بلکہ انہیں مارکیٹنگ میں لے آیا۔ وہ صرف اکاؤنٹس کے تربیت یافتہ تھے اس لیے ان کو مارکیٹنگ کے کورس بھی کرائے۔ والد صاحب نے شروع سے پالیسی رکھی تھی کہ وہ صرف اس لیے کسی ملازم کو فارغ نہیں کرتے تھے کہ کمپنی میں اس کی ضرورت نہیں تھی، ہاں ملازم خود چھوڑ کر جائے یا کوئی بڑا گھپلا کر جائے یا ایسی ہی کسی سرگرمی میں ملوث ہو تو اسے نکالتے تھے۔ انہوں نے ان پچیس سالوں میں شاید نصف درجن افراد کو بھی ملازمت سے نہیں نکالا تھا اس لیے میں نے بھی یہ پالیسی جاری رکھی۔ اس سے ملازموں میں تحفظ کا احساس رہتا تھا اور وہ پورے دل و جان سے کمپنی کے لیے کام کرتے تھے۔ دفتر میں کوئی دو درجن ملازم تھے۔ ان میں سات خواتین اور لڑکیاں تھیں اور باقی مرد حضرات تھے۔ ٹیلی فون آپریٹر ایک خاتون تھیں اور وہ والد صاحب کے زمانے سے چلی آرہی تھیں۔

اس بزنس میں فون آپریٹر اہم کام کرتا ہے کیونکہ سارا کام ہی فون سے چلتا ہے اور صبح سے شام تک سینکڑوں فون آتے ہیں۔ ہوشیار اور تجربے کار آپریٹر جانتا ہے کہ کس کلائنٹ کی بات کرانی ہے، چاہے اگلا آدمی مصروف کیوں نہ ہو اور کسے شائستگی سے سوری کرنا ہے کہ ان کا مطلوبہ آدمی مصروف ہے۔ وہ خود فارغ ہونے پر اسے کال کرا دے گا، پھر وہ کال بھی کراتا ہے۔ اس سے کلائنٹس مطمئن ہوتا اور آسانی محسوس کرتا ہے۔ یہ چیز بزنس پر غیر محسوس انداز میں بہت اچھا اثر ڈالتی ہے۔ بزنس دینے والا چاہتا ہے کہ اسے اہمیت دی جائے اور جب اسے اہمیت ملتی ہے تو وہ پھر اسی سے بزنس کو ترجیح دیتا ہے۔ یہ بات معمولی گروسری بزنس میں بھی اہم ہے۔ دکان دار گاہک کو اہمیت دے گا تو وہ دس دکانیں چھوڑ کر اس کے پاس آئے گا۔ والد صاحب نے ان خاتون کی خود تربیت کی تھی اور وہ بہت اچھا کام کر رہی تھیں۔ بلکہ مجھ سے زیادہ وہ کمپنی کلائنٹس کو جانتی تھیں ان کو نمبر اور آواز سے پہچان لیتی تھیں۔ ہمارے کلائنٹس ان کے کہنے پر اتنا ہی اعتبار کرتے تھے جتنا والد صاحب یا میرے کہنے پر اس لیے جب دو سال پہلے انہوں نے ملازمت چھوڑنے کا کہا تو میں فکر مند ہو گیا۔

”خیریت مسز کریم؟..... آپ کو کوئی شکایت ہے؟“

”نہیں عدنان صاحب۔“ وہ بولیں۔ ”دراصل کریم صاحب ریٹائر ہو گئے ہیں اور اب گھر پر اکیلے بور ہوتے ہیں۔ میرا انتظار کرتے ہیں، آپ کو پتا ہے بچے سب شادی کر کے اپنے گھر کے ہو گئے ہیں۔ ان کو کمپنی کی ضرورت ہے۔“

”تو کریم صاحب سے کہیں اس دفتر میں آجایا کریں۔“

مسز کریم ہنسیں۔ ”آپ جانتے ہیں اٹھارہ گریڈ کے افسر ریٹائر ہوئے ہیں، بادشاہی کرتے رہے ہیں اب نوکری کہاں کریں گے۔“

”یہ تو ہے۔“ میں نے تائید کی۔ ”تو کیا آپ نے فیصلہ کر لیا ہے؟“

”بالکل میں آج سے ٹھیک تین مہینے بعد آپ کے دفتر میں نہیں ہوں گی۔ تین مہینے بھی اس لیے کہ ایک دو مہینے تو نیا آپریٹر تلاش کرنے میں لگ سکتے ہیں اور ایک مہینا میں اسے تربیت دوں گی۔“

میں نے سکون کا سانس لیا۔ ورنہ وہ اچانک چلی جاتیں تو مجھے بہت ہی مشکل پیش آتی۔ میں نے ان سے کہا۔ ”اس صورت میں آپ کو اجازت ہے لیکن نیا آپریٹر آپ ہی چوائس کریں۔ اخبار میں ایڈ دے دیں اور انٹرویو بھی خود کریں۔“

”اس کے لیے الگ سے ٹائم نکالنا ہوگا آفس ٹائمنگ میں تو ایک لمحے کی فرصت نہیں ملتی ہے۔“ وہ بولیں۔ ”لیکن میں کر لوں گی۔“

شروع سے پالیسی تھی کہ ملازمین کے کام میں دخل اندازی کے بجائے ان سے حاصل ہونے والے نتائج پر نظر رکھی جائے۔ دفتر میں ملازم کم تھے لیکن سب تجربے کار اور اپنے شعبوں میں ماہر تھے اور اپنے کام کے پوری طرح ذمے دار تھے۔ اس لیے مجھے ہر چیز پر سر نہیں کھپانا پڑتا تھا اور میں پوری توجہ بزنس کو دیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ خراب اقتصادی حالات میں بھی کمپنی بہت اچھا نفع کما رہی تھی۔ مسز کریم نے دو دن بعد مجھے بتایا کہ اخبار میں نئے فون آپریٹر کے لیے اشتہار دے دیا ہے اور ایک ہفتے بعد انٹرویو ہوں گے۔ اُمید واروں کو ای میل سے سی وی اور کانٹیکٹ نمبر بھیجنے کو کہا گیا ہے اس لیے جو امیدوار موزوں لگے گا صرف اسے ہی انٹرویو کال کی جائے۔ مسز کریم نے اپنی سنڈے کی چھٹی کی قربانی دی اور اسی دن انٹرویو کا اہتمام کیا۔ پیر والے دن میں دفتر پہنچا تو انہوں نے میرے سامنے تین نام رکھ دیئے۔ ان میں ایک لڑکی تھی اور دو مرد تھے۔

”مسز کریم سلیکشن آپ کا ذمہ ہے؟“

”جی سر لیکن مجھے تینوں ایک جیسے لگے۔ اس لیے میں نے فیصلہ آپ کے حوالے کر دیا ہے۔ آپ ان میں سے جسے چاہیں منتخب کر لیں ویسے مورال سپورٹ کے لحاظ سے وجاہت نامی نوجوان زیادہ مستحق ہے۔“

میں چونکا۔ ”مستحق..... وہ کیسے؟“

”ہی از بلائنڈ سر۔“ مسز کریم نے کہا۔ ”اس نے باقاعدہ فون آپریٹر کا کورس کیا ہے۔ ہر طرح کے پینل کو آپریٹ کر لیتا ہے۔ کمپیوٹر بھی استعمال کر سکتا ہے۔ ویسے باقی دو بھی یہ سب کر سکتے ہیں۔“

اب مسز کریم نے گیند میرے کورٹ میں پھینک دی تھی اس لیے مجھے اس معاملے کو دیکھنا ہی تھا۔ میں نے ان تینوں کو دوبارہ بلانے کے بجائے صرف وجاہت کو بلا لیا۔ مسز کریم اس سے متاثر لگ رہی تھیں اور جب میں نے دیکھا تو میں بھی متاثر ہوا تھا۔ وہ خوش شکل اور خوش پوش نوجوان تھا۔ اس نے آنکھوں پر سیاہ عینک لگا رکھی تھی اور یہ بھی اس پر جچ رہی تھی۔ عمر چوبیس سال تھی اور وہ پہلے بھی ایک کمپنی میں فون آپریٹر کی جاب کر رہا تھا۔ لیکن یہاں سیلری پیکیج اچھا تھا اس لیے اس نے یہاں اپلائی کر دیا۔ اس کی حال ہی میں شادی ہوئی تھی اور اتفاق سے اس کی بیوی بھی نابینا تھی اور ایک سرکاری ادارے میں فون آپریٹر کی جاب کر رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”تم نے کسی گورنمنٹ جاب کے لیے کیوں اپلائی نہیں کیا؟“

”سر مجھے یہ چیز پسند نہیں ہے کہ میری صلاحیت کی بجائے میری معذوری کی بنیاد پر ملازمت دی جائے یہی وجہ ہے کہ میں نے گورنمنٹ جاب کے لیے اپلائی نہیں کیا۔ تین سال سے میں ایک پرائیویٹ کمپنی میں کام کر رہا ہوں اور وہ میرے کام سے مطمئن ہیں۔“

اس کے پاس کمپنی سرٹیفکیٹس موجود تھے۔ وہ گریجویٹ تھا اور اس نے فون آپریٹر کا کورس بھی کیا ہوا تھا۔ وہ جدید ترین فون باکس پر کام کرنے کا تجربہ رکھتا تھا۔ مجھے اس کا انتخاب کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں ہوئی۔ اگرچہ مسز کریم نے اس سے مانگا نہیں تھا لیکن اس نے اپنا سول سرجن کا جاری کیا ہوا ڈس ایبلٹی کا سرٹیفکیٹ بھی پیش کیا تھا۔ ایک مہینے بعد وہ اپنی کمپنی سے استعفا دے کر آگیا اور مسز کریم کو صرف کوڈز کے معاملے میں اس کی تربیت کرنا پڑی تھی۔ اس کے نابینا ہونے کی وجہ سے دوسرا سسٹم لیا گیا تھا جو نابینا فون آپریٹرز کے لیے خصوصی طور پر تیار کیا جاتا ہے۔ اس نے صرف ایک مہینے میں پوری طرح مسز کریم کی جگہ سنبھال لی تھی۔ جب میں اس کی کارکردگی سے مطمئن ہو گیا تو میں نے مسز کریم کو ریٹائر ہونے کی اجازت دے دی۔ وہ کمپنی کے چند سینئر کارکنوں میں سے تھیں اس

لیے انہیں بہت اچھے طریقے سے رخصت کیا گیا۔ ان کے جو واجبات بن رہے تھے اس میں اپنی طرف سے کچھ رقم کا اضافہ کرکے ان کو ادا کیے گئے اور تقریباً پورے دفتر نے ان کو گفٹس دیئے تھے۔

چند مہینے بعد وجاہت نے دفتر میں اس طرح اپنی جگہ بنالی کہ لوگ مسز کریم کو بھول گئے تھے۔ وہ خوش مزاج اور اپنی معذوری سے قطع نظر سب سے گھلنے ملنے والا شخص تھا۔ ایک مہینے کے اندر اس نے تمام اہم کلائنٹس سے ذاتی جان پہچان کرلی تھی اور ان کے بزنس کے لحاظ سے ان کو ڈیل کرنے لگا تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ کس کلائنٹ کا مجھ سے یا مطلوبہ فرد سے فوری رابطہ کرانا ہے اور کسے مصروف ہونے کی صورت میں دیر سے بھی رابطہ کرایا جاسکتا ہے۔ میں نے اطمینان محسوس کیا تھا کیونکہ جس طرح مسز کریم ڈیل کرتی تھیں مجھے لگ رہا تھا کہ شاید کوئی دوسرا فرد اس طرح ڈیل نہ کرسکے مگر وجاہت نے اپنی صلاحیت اور کام اور لگن سے باآسانی ان کی جگہ حاصل کرلی تھی۔ اسی لیے چھ مہینے بعد اس کی تنخواہ میں بیس فیصد اضافہ کردیا اور اب وہ مسز کریم جتنی تنخواہ لے رہا تھا۔ وہ اس کا حقدار بھی تھا۔

میری روز آتے جاتے وجاہت سے سلام دعا ہوجاتی تھی کیونکہ اس کا براہ راست مجھ سے کوئی تعلق نہیں تھا سوائے اس کے کہ جب کوئی کال ٹرانسفر کرنی ہو اور مجھے کوئی کال کرنی ہوتی تھی تو میرے پاس براہ راست ڈائلنگ کی سہولت تھی اور مجھے وجاہت سے نہیں کہنا پڑتا تھا۔ جب کہ دفتر کے باقی لوگ کہیں کال کرنے کے لیے وجاہت سے کہتے تھے۔ وقت گزرتا گیا۔ ایک سال ہونے پر اس کا دوسرے ملازمین کی طرح انکریمنٹ لگا اور پھر اسے بھی بونس ملا تھا۔ اگر کمپنی کو اچھا پرافٹ ہوتا تھا تو اس کا کچھ حصہ ملازمین کو منتقل کیا جاتا تھا اور انہیں عام طور سے چھوٹی اور بڑی عید پر دیا جاتا تھا۔ ان مواقعوں پر ملازمت پیشہ لوگوں کو اضافی رقم کی ضرورت ہوتی ہے۔ انکریمنٹ دینے کے ایک ہفتے بعد اس نے پورے دفتر کو مٹھائی کھلائی۔ ایک ڈبا میرے پاس بھی لے کر آیا۔ میں کچھ اور سمجھا۔ ”یہ کیا..... انکریمنٹ کی مٹھائی کھلادی سب کو۔“

”نہیں سر میرا بیٹا ہوا ہے۔“

”مبارک ہو۔“ میں نے کہا۔ ”پہلا بچہ ہے تمہارا؟“

”جی سر آپ بھول رہے ہیں میں نے بتایا تھا کہ میرے شادی کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا ہے۔“

میں نے ایک بار پھر اسے مبارک باد دی اور اگلی تنخواہ میں اسے ہزار روپے بچے کے لیے اضافی دیئے تھے۔ وہ خوش ہوگیا تھا۔ مجھے اس کے گھریلو حالات کے بارے میں زیادہ نہیں معلوم تھا۔ ملازمین کا مکمل خیال رکھنے اور ان سے خوشگوار تعلق رکھنے کے باوجود میں ان سے ایک حد تک ہی ملتا تھا۔ اس کی تربیت بھی والد صاحب نے مجھے دی تھی کہ ملازمین سے کبھی گھریلو تعلق نہ رکھو ورنہ اس سے کام میں مشکلات آتی ہیں۔ کیونکہ مالک اور ملازم دونوں کی توقعات بدل جاتی ہیں۔ میں اپنے ملازمین کے گھریلو حالات سے بہت کم واقف تھا اور برسوں پرانے والد صاحب کے ساتھ کام کرنے والے ملازمین کے بارے میں معمولی سی معلومات رکھتا تھا جیسے شادی شدہ ہیں اور اتنے بچے ہیں۔ فلاں جگہ رہتے ہیں۔ اس سے آگے علم نہیں تھا۔

ایک دن میں دفتر سے نکلا تو مجھے وجاہت بس اسٹاپ پر کھڑا دکھائی دیا۔ مجھے نہ جانے کیا خیال آیا کہ میں نے اس کے پاس گاڑی روک دی تو وہ چونکا اور ذرا پیچھے ہوا تھا۔ مجھے تعجب ہوا کہ اسے تو نظر نہیں آتا ہے تو اس نے ٹریفک کے اتنے شور میں کیسے جان لیا کہ کوئی گاڑی اس کے پاس رکی ہے اور میری کار کی آواز بھی معمولی سی تھی۔ بس ہلکی سی سرسراہٹ جیسی آواز آتی تھی۔ میں نے فرنٹ سیٹ کا شیشہ نیچے کیا۔ ”وجاہت کہاں جانا ہے؟“

وہ ذرا آگے جھکا۔ ”سر آپ..... میں گھر جارہا ہوں میری وین نہیں آئی ہے اب کسی رکشے کا انتظار کررہا ہوں۔“

دفتر کی ٹائمنگ صبح نو سے شام چھ بجے تک تھیں اور ٹھیک چھ بجے تمام ملازمین دفتر سے نکل جاتے تھے اگر کسی روز کوئی خاص کام ہوتا جسے بہرصورت تکمیل تک پہنچانا ہوتا تھا تو میں اور متعلقہ افراد رک جاتے تھے مگر عام اسٹاف چھٹی کرجاتے تھے۔ عام طور سے سب ساتھ ہی نکلتے تھے۔ مجھے ذرا دیر ہوئی تھی اس لیے وجاہت مل گیا ورنہ اس سے پہلے بھی کئی بار اسی وقت سڑک سے گزرا ہوں گا لیکن وہ نظر نہیں آیا یا میں نے دھیان نہیں دیا تھا۔ آج اتفاق سے وہ نظر آگیا تھا۔ میں نے پیشکش کی۔ ”میں تمہیں ڈراپ کردیتا ہوں۔“

اس نے سوچا اور کار میں آگیا۔ ”تھینک یو سر، آج وین نہیں آئی تھی اور رکشے والے سے سر کھپانا پڑتا اسے راستہ نہیں آتا تو مشکل ہوجاتی۔“

”تم وین سے آتے جاتے ہو؟“

”جی سر..... ورنہ اسٹاپ سے گھر جانے میں مشکل ہوتی ہے وین گھر کے سامنے سے پک کرتی ہے اور وہیں اتار دیتی ہے۔“

مجھے جان کر حیرت ہوئی کہ وہ گلشن اقبال کے ایک اچھے علاقے میں رہتا تھا۔ وجاہت نے اصرار کیا کہ میں اسے روٹ پر ایسی جگہ اتار دوں جہاں سے وہ رکشا لے لے۔ ”کوئی مسئلہ نہیں ہے یہ علاقہ میرے راستے میں آتا ہے میں آرام سے ڈراپ کردوں گا۔“

میں یونیورسٹی روڈ پر گلستان جوہر میں رہتا تھا۔ وجاہت گلشن میں ایک نئے بنے فلیٹ کمپلکس میں رہتا تھا اور اس کا گھر گراؤنڈ فلور پر تھا۔ میں نے اسے بالکل سامنے اتارا تھا۔ وہ شکریہ ادا کرکے نیچے اترا پھر اس نے ہچکچا کر کہا۔ ”سر میری خواہش ہے کہ آپ ایک کپ چائے میرے ساتھ لیں۔ میری وائف بہت اچھی چائے بناتی ہے۔“

میں نے انکار کرنا چاہا۔ ”کوئی بات نہیں، تم تھکے ہوئے ہو، پھر کبھی.....“

”پلیز سر، آپ نے میرے بیٹے کو بھی نہیں دیکھا ہے۔ حالانکہ آپ نے اسے گفٹ دیا تھا۔“

مجبور ہوکر میں نیچے اتر آیا، اس نے کال بیل بجائی۔ یہ اچھے بڑے بنے فلیٹس تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ ایک سو گز کے رقبے پر ہوگا۔ اس میں دو بیڈ رومز ایک ڈرائنگ اور لاؤنج تھا جس کے ساتھ ہی کچن بھی تھا۔ سیڑھیاں الگ سے تھیں اور وجاہت کے فلیٹ میں جانے کا راستہ الگ سے تھا وہاں سامنے کشادہ جگہ پر پھولدار اور خوب صورت پودوں کے گملے رکھے تھے۔ اندر سے ایک نوجوان اور خوبصورت عورت نے دروازہ کھولا۔ اس کی آنکھوں کا مخصوص انداز بتا رہا تھا کہ وہ پیدائشی نابینا تھی۔ اس نے خوشی سے کہا۔ ”آپ آگئے؟“

”ہاں۔“ وجاہت جلدی سے بولا۔ ”آج میرے باس بھی ساتھ ہیں۔“

”عدنان صاحب۔“ وہ بولی گویا وہ مجھے جانتی تھی۔ ”اندر لے کر آؤنا۔“

ہم لاؤنج میں آئے۔ اس کے ساتھ ہی ڈرائنگ روم تھا۔ فلیٹ بہت صاف ستھرا اور بہترین فرنش تھا۔ لاؤنج میں ہی اوپن کچن تھا۔ وجاہت مجھے ڈرائنگ روم میں لایا۔ یہ بھی خوب صورتی سے اور مناسب فرنیچر سے آراستہ تھا۔ صاف ستھرا جیسے یہاں کی باقاعدگی سے صفائی کی جاتی ہو۔ میں نے اس کے گھر کی تعریف کی تو وہ خوش ہوگیا۔ ”یہ سب شاہینہ دیکھتی ہے۔“

”جاب کے ساتھ ساتھ؟“

”جی سر اس کی دو بجے چھٹی ہوجاتی ہے اور وہ گھر آکر سارے کام کرتی ہے۔“

”اپنا فلیٹ ہے؟“

”جی سر کچھ رقم تھی، کچھ شاہینہ کا زیور بیچا اور نصف ادائیگی پر یہ فلیٹ لے لیا، اب نصف قسطوں میں ادا کرتے ہیں۔ قسط کچھ زیادہ ہے لیکن ہم دونوں جاب کرتے ہیں اس لیے قسط کی رقم نکل ہی آتی ہے۔“

وجاہت باہر چھڑی استعمال کررہا تھا لیکن اندر اس نے اپنی چھڑی تہ کرلی اور مجھے ڈرائنگ روم میں چھوڑ کر پورے اعتماد کے ساتھ اندر چلا گیا۔ اسے معلوم تھا کہ کون سی چیز کہاں ہے۔ اگر کوئی اجنبی شخص اسے حرکت کرتے دیکھتا تو وہ کبھی یقین نہ کرتا کہ وہ نابینا ہے۔ شاید یہ مسلسل اسی جگہ چلنے پھرنے کا نتیجہ تھا کہ اسے سب یاد ہوگیا تھا۔ شاہینہ بھی اسی طرح آرام سے حرکت کررہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ کپڑے بدل کر اور فریش ہوکر آیا۔ اس نے گود میں اپنا چند مہینے کا بیٹا اٹھا رکھا تھا۔ ”سر یہ ہے میرا بیٹا۔“

وہ تیار ہوا اور صاف ستھری حالت میں تھا اور اس کے پاس پاؤڈر اور دوسری چیزوں کی ملی جلی خوشبو آرہی تھی۔ بچہ بہت پیارا سا اور صحت مند تھا۔ اس نے ماں باپ دونوں سے خوب صورتی حاصل کی تھی اور اس کی آنکھیں بہت خوب صورت تھیں۔ میں نے تعریف کی تو وجاہت خوش ہوگیا۔ ”سر سب یہی کہتے ہیں کہ راحت بہت خوب صورت ہے۔ لیکن ہم ماں باپ اسے نہیں دیکھ سکتے۔“

”تم لوگ اسے چھو کر دیکھ سکتے ہو۔ ویسے اولاد کو ماں باپ ہمیشہ دل کی آنکھ سے دیکھتے ہیں اس لیے انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ان کی اولاد دیکھنے میں کیسی ہے۔“

”ٹھیک کہہ رہے ہیں سر، اولاد کو ماں باپ اندر کی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔“

میرا خیال تھا کہ وجاہت گھر آنے کے بعد عینک اتار دے گا لیکن وہ اس وقت بھی سیاہ عینک لگائے ہوئے تھا۔ وہ مجھ سے بات کررہا تھا اور کچھ دیر میں اس کی بیوی شاہینہ ٹرالی لے کر آئی اس میں چائے اور گھر کے بنے بعض دوسرے لوازمات تھے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ یہ سب اس نے خود بنائے تھے۔ وہ نابینا ہونے کے باوجود امور خانہ داری میں ماہر لگ رہی تھی۔ اس کا اصرار تھا کہ میں رات کا کھانا کھا کر

جاؤں لیکن میں نے معذرت کر لی۔
"پیشگی اطلاع کے بغیر میں ڈنر ٹیبل سے غائب نہیں ہوتا ہوں بیوی بچے اس کا بہت برا مناتے ہیں۔"
یہ پہلا موقع تھا کہ میں اپنے کسی ملازم کے گھر گیا تھا۔ یہ اتفاق تھا مگر مجھے وجاہت کی گھریلو زندگی دیکھنے کا موقع مل گیا۔ یہ واقعی حیرت انگیز تھا کہ دونوں میاں بیوی نابینا تھے اور اس کے باوجود دونوں جاب بھی کرتے تھے اور اپنا گھر بھی خود دیکھتے تھے۔ ان کا بچہ تھا جس کی دیکھ بھال بھی وہ خود کرتے تھے۔ ان کے گھر کوئی رشتے دار نہیں تھا۔ کوئی ملازم نہیں تھا جو ان کی مدد کرتا۔ وہ سارا کام خود کرتے تھے اور اس کے باوجود ان کا گھر بہت اچھی طرح سجا ہوا اور صاف ستھرا تھا۔ اس مہنگائی کے دور میں انہوں نے کوشش کر کے اپنا فلیٹ بھی خرید لیا تھا۔ اس روز مجھے صحیح معنوں میں خوشی ہوئی تھی کہ ایسا باہمت اور حوصلے والا نوجوان میری کمپنی میں کام کرتا ہے۔ دونوں میاں بیوی جو کماتے تھے وہ ان کے گزارے کے لیے کافی تھا۔ وجاہت اور شاہینہ نے پسند کی شادی کی تھی اور شروع میں دونوں کے خاندانوں نے مخالفت کی تھی ان کا خیال تھا کہ دو نابینا مل کر زندگی نہیں گزار سکتے۔ کوئی ایک بینا ہو تو بھی مشکلات کم ہوتیں۔ مگر ان دونوں نے اپنی ہمت سے سب کے خیالات کو غلط ثابت کر دیا۔ یہ سب وجاہت نے مجھے ڈھکے چھپے انداز میں بتایا۔
اگلے روز میں دفتر پہنچا تو وجاہت نے معمول کے مطابق سلام دعا کی اور اپنی کسی بات سے ظاہر نہیں ہونے دیا کہ میں کل اس سے ملا تھا یا اس کے گھر گیا تھا۔ میں نے اسے منع نہیں کیا تھا لیکن میری خواہش تھی کہ وہ اس بات کا کسی سے ذکر نہ کرے۔ ورنہ ایک مثال سامنے آ جاتی اور کل کو کوئی اور ملازم مجھے گھر آنے کو کہتا تو میرے لیے انکار ذرا مشکل ہو جاتا۔ اس لیے میں وجاہت کی اس بات سے بھی خوش ہوا تھا۔ وہ نہ صرف تعلیم یافتہ تھا بلکہ مینرز سے کسی اچھے خاندان کا فرد لگتا تھا۔ دفتر میں وہ سب سے ملتا جلتا تھا لیکن ایک رکھ رکھاؤ کے ساتھ، کسی سے اس کی بے تکلفی ایک حد سے زیادہ نہیں تھی۔ وقت گزرتا رہا اور وجاہت کو کمپنی میں جاب کرتے ہوئے دو سال ہو گئے تھے۔ ایک دن میں بیگم اور بچوں کے ساتھ شاپنگ پر تھا۔ ہم ایک شاپنگ مال میں گئے۔ بیگم بچوں کے ساتھ خریداری میں لگ گئیں اور میں کیفے ایریا میں آ بیٹھا۔
"عدنان صاحب آپ۔" مسز کریم کی آواز آئی۔ وہ میرے عقب میں کھڑی تھیں۔
"مسز کریم، کیسی ہیں آپ بہت دنوں بعد دیکھ رہا ہوں۔" میں نے گرم جوشی سے کہا وہ ریٹائرمنٹ کے بعد دو تین بار دفتر میں ملنے آئی تھیں۔
"آپ دیکھ رہے ہیں بالکل ٹھیک ہوں۔"
میں نے ان کے لیے چائے اور اسنیکس منگوائے۔ دفتر کے بارے میں بات ہو رہی تھی۔ اچانک انہوں نے کہا۔ "عدنان صاحب، وجاہت کے بارے میں دفتر میں جو باتیں ہوتی ہیں کیا آپ ان سے واقف ہیں؟"
میں چونکا۔ "کیسی باتیں؟"
مسز کریم نے گہری سانس لی۔ "اس کا مطلب ہے آپ کچھ نہیں جانتے۔ میرا سجاد صاحب اور ممتاز احمد سے رابطہ ہے۔" سجاد صاحب اکاؤنٹنٹ ہیں اور ممتاز احمد ایڈمن آفیسر۔ "ان لوگوں کا کہنا ہے کہ دفتر میں یہ تاثر ہے وجاہت نابینا نہیں ہے۔"
اس بار میں زیادہ حیران ہوا تھا۔ "کیا مطلب؟"
"یہ تو میری سمجھ میں بھی نہیں آیا کیونکہ میں دس دن اس کے ساتھ رہی ہوں اور مجھے کبھی محسوس نہیں ہوا کہ وہ نابینا نہیں ہے۔ مگر صرف سجاد صاحب اور ممتاز ہی نہیں دفتر کے کئی اور لوگ بھی یہ بات محسوس کر چکے ہیں۔"
میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ ممکن نہیں ہے۔ میں اس کے گھر جا چکا ہوں اس کی بیوی سے ملا ہوں وہ بھی نابینا ہے۔ وہ اتنا بڑا فراڈ کیسے کر سکتا ہے۔"
"مگر دفتر والے کسی وجہ سے تو کہہ رہے ہوں گے۔" مسز کریم نے اصرار کیا۔ "آپ جانتے ہیں، یہ سب پڑھے لکھے اور میچور لوگ ہیں۔"
"اگر انہوں نے آپ سے یہ بات کی ہے تو انہوں نے وہ وجہ نہیں بتائی جو انہیں ایسا سمجھنے پر مجبور کر رہی ہے۔"
"بظاہر تو کوئی وجہ نہیں ہے لیکن کچھ مشکوک باتیں ہیں۔ ایک تو وجاہت مستقل سن گلاس لگا کر رکھتا ہے۔ آج تک کسی نے اسے ان کے بغیر نہیں دیکھا ہے۔ دوسرے وہ کبھی کبھی ایسا بی ہیو کرتا ہے جیسے اسے نظر آتا ہو۔"
مسز کریم کی بات سے اچانک مجھے وہ واقعہ یاد آ گیا جب میں نے سڑک کے ساتھ کھڑے وجاہت کے سامنے گاڑی روکی تھی اور وہ چونک گیا تھا۔ مگر یہ واقعہ کوئی ثبوت نہیں تھا۔ میں نے سر جھٹکا اور مسز کریم سے کہا۔ "اس کی آنکھیں عیب والی ہوں گی اس لیے وہ کسی کو دکھانا پسند نہیں

کرتا ہوگا، دوسرے بھی بھی ایسا ری ایکٹ کرنا بھی کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ میں نے اسے دیکھا ہے، اپنے گھر میں وہ اس طرح اطمینان سے گھومتا پھرتا ہے کہ اسے دیکھنے والا نابینا تسلیم کر ہی نہیں سکتا ہے۔ پھر وہ اگر نابینا نہیں ہے تو بن کر کیا کرے گا؟ یہ کوئی سرکاری جاب تو ہے نہیں جس کے لیے کوئی ایسا فراڈ کرے۔ نہ ہی وہ نفسیاتی مریض لگتا ہے۔ میرا خیال ہے یہ صرف وہم ہے ان لوگوں کا۔"
"ہو سکتا ہے، سچی بات ہے مجھے بھی اس کا یقین نہیں آیا تھا لیکن میں نے سوچا کہ آپ کے علم میں آنا چاہیے کہ دفتر میں کیا ہو رہا ہے۔ بات ایسی ہے کہ کوئی آپ سے براہ راست اس پر بات نہیں کر سکتا ہے۔"
"آپ نے اچھا کیا جو بتا دیا ویسے کیا وجاہت کو علم ہے کہ اس کے بارے میں دفتر میں کیا تاثر پھیل رہا ہے؟"
"میرا نہیں خیال کہ اسے کچھ پتا ہوگا۔ لیکن ہو سکتا ہے اس نے کسی سے سن بھی لیا ہو۔ نابینا لوگوں کی سماعت ویسے بھی تیز ہوتی ہے۔ خود میں بعض اوقات آپس میں بات کرتے لوگوں کی سرگوشیاں بھی سن لیتی تھی۔ اسی طرح ممکن ہے اس نے بھی سن لی ہوں۔"
دفتر اس طرح کا تھا کہ اکاؤنٹس اور خواتین کا سیکشن الگ تھا۔ میرا کمرا الگ تھا اور اسی طرح کچھ اوپری درجے کے افسران کے لیے ایک کمرا الگ تھا۔ اس کے علاوہ باقی سارا عملہ ایک بڑے سے ہال میں بیٹھتا تھا۔ وہیں وجاہت کا کیبن بھی تھا جو صرف دیواروں کی حد تک تھا اور اوپر سے کھلا ہوا تھا۔ اس لیے ساری آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ پہلے یہ اوپر سے بند تھا لیکن مسز کریم نے گرمی اور آواز گونجنے کی شکایت کی تو چھت ہٹا دی گئی تھی۔ مسز کریم کی بات نے مجھے سوچنے پر مجبور تو کیا تھا لیکن اتنا نہیں کہ میں وجاہت کو بلا کر اس سے اس بارے میں کوئی بات کرتا اس کے بجائے میں نے سجاد صاحب کو طلب کیا اور ان سے وضاحت چاہی۔ انہوں نے تسلیم کیا۔ "دفتر میں مجھ سمیت کچھ لوگوں نے یہ بات محسوس کی ہے۔"
"آپ نے کیا محسوس کیا؟"
"میں واش روم میں گیا تو وجاہت آئینے کے سامنے کھڑا یوں بالوں میں کنگھی پھیر رہا تھا جیسے ہم دیکھ کر کنگھی کرتے ہیں میری آمد سے وہ چونکا تھا اور پھر اس نے جلدی سے کنگھی جیب میں رکھ لی۔"
دفتر کے دوسرے کچھ لوگوں نے بھی ایسی ہی بات نوٹ کی تھی۔ مگر اس سے ہٹ کر دفتر میں کسی کو وجاہت سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ وہ اپنی ذمے داری کا پورا خیال رکھتا تھا اور سب سے خوش اخلاقی سے پیش آتا تھا، اس میں ایک خاص بات یہ تھی کہ حد درجے خوددار تھا۔ دفتر میں کئی افراد جو بائک پر آتے تھے اور گلشن کے آس پاس رہتے تھے، انہوں نے اسے پیشکش کی تھی کہ وہ وین والے کو اتنا کرایہ دینے کے بجائے ان کے ساتھ آ جایا کرے۔ مگر اس نے انکار کر دیا۔ وہ وین کے ڈھائی ہزار روپے دیتا تھا مگر اس نے کسی کا احسان لینا گوارہ نہیں کیا۔ میں نے سجاد صاحب سے کہا۔ "جب اس سے دفتر میں یا دفتر کے لوگوں کو کوئی مسئلہ نہیں ہے تو پھر میرا خیال ہے اس پر زیادہ بات کرنے یا اس کو سنجیدہ لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ دیکھیں اگر اس نے ایسی کوئی بات سن لی تو یقیناً اس کی بہت دل آزاری ہوگی۔"
سجاد صاحب سینئر آدمی تھے سمجھ گئے کہ یہ میرا مشورہ نہیں بلکہ حکم ہے۔ انہوں نے کہا۔ "ٹھیک ہے سر میں دوسروں کو سمجھا دوں گا۔"
سجاد صاحب ایک طرح سے منیجر کی حیثیت بھی رکھتے تھے کیونکہ دفتر میں منیجر کی پوسٹ نہیں تھی اور اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ چیف اکاؤنٹنٹ کی حیثیت سے وہ دفتر پر پوری طرح نظر رکھ سکتے تھے۔ یوں میرے خیال میں بات آئی گئی ہو گئی۔ میں نے مسز کریم سے رابطہ رکھا تھا اور انہوں نے دوبارہ اس بارے میں مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ اس کے کوئی چھ مہینے بعد میں اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کی سالگرہ کا گفٹ لینے کے لیے ایک گفٹ شاپ میں گیا۔ ابھی وہاں کھلونے دیکھ رہا تھا کہ مجھے وجاہت کی آواز آئی۔ وہ سیلز مین سے کہہ رہا تھا۔ "مجھے بالکل سفید رنگ کا ٹیڈی بیئر چاہیے۔"
"کس سائز کا جناب؟" سیلز مین نے پوچھا۔
"میرا بیٹا دو سال سے کم ہے۔"
سیلز مین ایک ٹیڈی بیئر نکال لایا۔ "اس کے لیے یہ ٹیڈی بیئر ٹھیک رہے گا جناب، بالکل درست سائز ہے۔"
میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وجاہت نے ٹیڈی بیئر پکڑا اور فوراً بولا۔ "اس کے کان آف وائٹ ہیں۔ میں نے کہا تھا مجھے بالکل سفید چاہیے۔"
میں نے دیکھا کہ سیلز مین کو بھی حیرت ہو رہی تھی کہ وجاہت نے کس طرح جان لیا کہ ٹیڈی بیئر کے کان آف وائٹ ہیں جب کہ یہ بہت غور سے دیکھنے پر معلوم ہو رہے تھے اور اسے تو سرے سے نظر نہیں آتا تھا۔ سیلز مین نے اس

سے معذرت کی۔ ”سوری سر ہمارے پاس تو یہی ہے اس کے علاوہ باقی کلر میں ہیں۔“

”ٹھیک ہے میں کہیں اور دیکھ لیتا ہوں۔“ وجاہت نے کہا اور چھڑی ٹیکتا ہوا شاپ سے باہر نکل گیا۔ میں سیلز مین کے پاس آیا۔

”میرا خیال ہے یہ صاحب جو ابھی باہر گئے ہیں نابینا ہیں۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ اس نے کہا۔ ”وہ بالکل نابینا لوگوں کے انداز میں اندر آئے اور مجھ سے ٹیڈی بیئر مانگا۔“

میں نے وہ ٹیڈی بیئر اٹھا کر اس کا معائنہ کیا۔ واقعی اس کے کان بہت ہلکے سے آف وائٹ تھے اور غور سے دیکھنے پر باقی سفید رنگ سے الگ نظر آتے تھے۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ وجاہت کو کیسے پتا چلا۔ کیا وہ سچ مچ نابینا نہیں تھا اور اسے نظر آتا تھا۔ میں سوچ میں اتنا گم ہو گیا کہ سیلز مین کو پوچھنا پڑا۔ ”جی سر آپ کو کیا چاہیے؟“

میں چونکا اور پھر اسے بتانے لگا کہ مجھے کیا چاہیے تھا۔ اس نے میری مدد کی اور ایک مناسب کھلونا پسند کر لیا۔ اسے پیک کرا کے میں باہر آیا تو وجاہت ایک اور دکان سے خوش خوش نکل رہا تھا اس نے اپنی پسند کا ٹیڈی بیئر حاصل کر لیا تھا۔ وہ سڑک کے کنارے آیا اور شاید کسی رکشا ٹیکسی کے انتظار میں کھڑا ہو گیا۔ میں اس کے پاس آیا اور جان بوجھ کر اس کے سامنے سے آیا لیکن اس نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ میں اس کے پاس سے گزرا اور پھر پلٹ کر دوبارہ آیا۔ وہ بدستور یوں کھڑا رہا جیسے میری آمد کی کوئی خبر نہ ہو۔ میں واپس اپنی گاڑی کے پاس آیا اور پھر اس میں بیٹھ کر وجاہت کو دیکھنے لگا۔ میں اس مزاج کا آدمی نہیں ہوں کہ کسی کی جاسوسی کروں لیکن اس وقت وجاہت نے مجھے جاسوس بننے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ اداکاری کرتا تھا یا سچ مچ نابینا تھا۔ اگر اداکاری ہوتی تو کہیں نا کہیں جھول آتا۔ آدمی ہمہ وقت اداکاری کر بھی نہیں سکتا ہے۔ اس نے بے اختیار ٹیڈی بیئر کے کانوں کے رنگ کے بارے میں کہہ دیا۔

کچھ دیر بعد ایک رکشا آ کر اس کے پاس رکا اور وہ اس میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ میں نے کار اس کے پیچھے لگا دی وہ اپنے گھر تک گیا تھا۔ رکشا فلیٹ کمپلکس تک پہنچا۔ وہ مین گیٹ پر اترا اور چھڑی سے ٹٹولتا ہوا اندر چلا گیا تھا۔ اس کے انداز میں کوئی بناوٹ نہیں تھی۔ میں اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ مجھے اندر سے کچھ کھسیاہٹ اور شرمندگی بھی ہو رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا میں نے اپنی حیثیت کے منافی کام کیا ہے اور یہ حرکت مجھے زیب نہیں دیتی تھی۔ جب آدمی کھسیاتا ہے تو اسے کھسیاہٹ کی وجہ پر غصہ آنے لگتا ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ مجھے وجاہت پر غصہ آنے لگا۔ آخر اس کے ساتھ ایسا کیا چکر تھا کہ دوسرے اس پر شبہ کرنے لگتے تھے۔ اب مجھے سمجھ میں آیا کہ دفتر میں لوگ اس کے بارے میں کیوں شبہ کرتے تھے۔ ان کے سامنے بھی ایسی ہی باتیں آئی تھیں۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اگلے دن وجاہت کو بلا کر اس بارے میں پوچھوں لیکن پھر یہ بات مجھے عجیب سی لگی اور میں نے ارادہ ترک کر دیا۔

کچھ دن بعد میں اسے تقریباً بھول گیا۔ تقریباً یوں کہ عام طور سے مجھے اس کا خیال نہیں آتا تھا لیکن جب وجاہت سے بات ہوتی یا اس کا سامنا ہوتا تو مجھے وہ بات یاد آتی اور پھر میرا رویہ اس سے کسی قدر سرد ہو جاتا تھا۔ اب میں اس سے زیادہ بات نہیں کرتا تھا اور اس کے سلام کا جواب بھی رکھائی سے دیتا تھا۔ شاید اس نے یہ بات محسوس کر لی تھی۔ میرے جواب سے اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات آتے تھے۔ یہ سب اپنی جگہ لیکن مجھے کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ میں وجاہت کو جاب سے نکال دوں۔ شاید میرے خیال میں اگر اس میں کوئی چکر تھا بھی تو وہ اس قابل نہیں تھا کہ اس پر ایک حد سے توجہ دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ چند مہینے بعد میں بالکل بھول گیا اور وجاہت سے پہلے کی طرح خوشگوار انداز میں بات کرنے لگا۔

بچوں کے اسکول گرمیوں کی چھٹیوں میں بند ہوئے تو اس سے پہلے ہی انہوں نے تفریحات کی فرمائش شروع کر دی تھی۔ مگر دفتری مصروفیات کی وجہ سے میرے لیے شہر سے باہر جانا ممکن نہیں تھا اس لیے میں نے ان سے وعدہ کر لیا کہ ویک اینڈز پر انہیں کہیں نہ کہیں لے کر جاؤں گا۔ اس اتوار کو ایٹریم میں مووی کا پروگرام تھا۔ میں بیوی بچوں کو لے کر وہاں پہنچا۔ فلم شروع ہونے سے پہلے میں ان کے لیے آئس کریم اور ری فریشمنٹ کا دوسرا سامان لے کر آیا تو وہ اپنی نشستوں پر بیٹھ چکے تھے۔ میں لوگوں کے درمیان سے گزرتا ہوا ان کے پاس جا رہا تھا کہ پچھلی قطار پر بیٹھے وجاہت پر نظر گئی۔ میں دم بہ خود رہ گیا تھا۔ پہلے مجھے شبہ ہوا کہ شاید میں دھوکا کھا رہا تھا وہ وجاہت نہیں بلکہ اس سے ملتا جلتا کوئی شخص تھا۔ مگر جب میں نے اسے غور سے دیکھا تو شک کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ وہ وجاہت ہی تھا۔ کچھ دن پہلے اس کے

دائیں رخسار پر چوٹ آئی تھی اور اس کا نشان اب بھی موجود تھا، میں نے صبح بھی دیکھا تھا۔ میرا سر گھوم گیا یہ شخص اتنا بڑا دھوکے باز نکلے گا یہ میں نے سوچا نہیں تھا۔

ایک لمحے کو میرے دل میں خیال آیا کہ میں اس کا گریبان پکڑ لوں اور اسے بتاؤں کہ اب میرے دفتر میں اس کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ مگر مجھے بیوی بچوں کا خیال آ گیا۔ میں انہیں تفریح کرانے لایا تھا اور ان کی ساری تفریح غارت ہو جاتی۔ خود پر جبر کر کے میں اپنی نشست پر آیا اور پھر پوری فلم کے دوران میں خود پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ زندگی میں شاید ہی کبھی مجھے اتنی شدت سے غصہ آیا ہو جیسا اس وقت آیا تھا۔ فلم ختم ہونے پر میں نے اسے چھڑی سے راستہ ٹٹولتے ہوئے باہر جاتے دیکھا۔ میں بھی اس کے پیچھے جانا چاہتا تھا لیکن بیوی بچے رش ختم ہونے کا انتظار کر رہے تھے تاکہ سکون سے باہر نکل سکیں۔ وہ اس تفریح پر بہت خوش تھے اور میری ساری تفریح اس شخص نے غارت کر دی تھی۔

☆☆☆

میں دفتر میں بیٹھا تھا اور منتظر تھا کہ وجاہت اندر آئے۔ میں کمرے کی طرف آتے ہوئے اسے اندر آنے کا حکم دیتا آیا تھا۔ وہ چند منٹ بعد آیا۔ ”جی سر....“

”تم اسی وقت سجاد صاحب کے پاس جاؤ اور ان سے اپنا حساب کر کے یہاں سے چلے جاؤ۔“

”جی سر....“ شاید اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا۔

”تم نے سنا نہیں، اپنا حساب کرواور اسی وقت یہاں سے دفع ہو جاؤ۔“ میں نے بہت خراب لہجے میں کہا۔ میں نے اس سے پہلے کبھی اس لہجے میں کسی ملازم یا کسی بھی شخص سے بات نہیں کی تھی۔ ”میں اس دفتر میں آدھے گھنٹے بعد تمہاری صورت نہ دیکھوں۔“

وہ کھڑا تھا اور اس کا چہرہ اتر گیا تھا۔ اس نے آہستگی سے کہا۔ ”مجھے فائر کرنا آپ کا حق ہے سر، لیکن میں نے کبھی آپ سے اس طرح کے لہجے کی توقع نہیں کی۔“

اس سے پہلے میں اسے مزید کچھ کہتا وہ ٹٹولتا ہوا کمرے سے نکل گیا تو میں کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا پھر سجاد صاحب کو کال کر کے وجاہت کے بارے میں حکم دیا۔ میں نے جس انداز میں حکم دیا تھا وہ سمجھ گئے کہ اس کی فوری تعمیل کرنی ہے۔ انہوں نے بیس منٹ میں سارا حساب کیا اور وجاہت سے متعلقہ جگہوں پر سائن لے کر اسے واجبات کی ادائیگی کر دی اور دفتر سے رخصت کر دیا۔ جتنا حیران وہ تھا

لوئس بریل

ایک بڑھئی کا لڑکا تھا۔ ابھی وہ تین سال کا تھا کہ باپ کی دکان میں ایک حادثہ ہونے کی وجہ سے اس کی آنکھیں جاتی رہیں اور وہ ہمیشہ کے لیے اندھا ہو گیا۔ یہی وہ فرانسیسی اندھا ہے جس نے تاریخ میں پہلی بار اندھوں کے لیے پڑھنے لکھنے کا علامتی طریقہ ایجاد کیا جس کو اس کے نام پر بریل کا طریقہ (Braille System) کہا جاتا ہے۔

مرسلہ: زاہد تقی عثمانی، حیدر آباد

مشہور ماہرِ نباتات جان گرمشا ولکنسن دو سال کی عمر میں بصارت سے محروم ہو گیا لیکن وہ پھولوں کو اپنی زبان کی نوک سے چھو کر پہچان لیتا تھا۔ وہ 5000 اقسام کے پھولوں کے نام بتا سکتا تھا۔

............☆☆............

مینوئل پریرا (1574-1666) مشہور پرتگالی مجسمہ ساز تھا۔ چالیس برس کی عمر میں نابینا ہو گیا باقی عمر 53 سال تک محض چھو کر اپنا کام کرتا رہا۔

مرسلہ: احمد یاسین، کراچی

اس سے زیادہ حیران دفتر والے تھے کیونکہ آج تک کسی کو اس طرح ذلیل کر کے رخصت نہیں کیا تھا۔ جنہیں نکالا جاتا تھا انہیں بھی نرمی سے سمجھا کر استعفا لے لیا جاتا اور یہی ظاہر کیا جاتا کہ وہ کسی وجہ سے خود نوکری چھوڑ کر گئے ہیں۔ یہاں ملازموں کو اس طرح فائر کرنے کا رواج ہی نہیں تھا۔ وجاہت کے جانے کے بعد سجاد صاحب نے کسی کو فون آپریٹر کے لیے بھیج دیا۔ مگر یہ اس کے بس کی بات نہیں تھی اس لیے مجھے مسز کریم سے درخواست کرنی پڑی کہ وہ کچھ دن کے لیے آ کر یہ اہم ذمے داری سنبھال لیں، اس دوران میں کسی دوسرے تجربے کار فون آپریٹر کا بندوبست کر لیا جاتا۔

یہ مرحلہ بھی سر ہو گیا اور اس دوران میں خاصی مشکلات پیش آئیں۔ مسز کریم بہت کچھ بھول گئی تھیں اور نیا آنے والا آپریٹر مسز کریم یا وجاہت کی طرح ماہر اور ذہین نہیں تھا وہ بس لگے بندھے انداز میں کام کرتا تھا۔ درحقیقت ٹیلی فون آپریٹر اسی انداز میں کام کرتے ہیں

کیونکہ عام طور سے ہمارے ہاں بڑی سے بڑی کمپنی میں بھی اس پوسٹ کو اہمیت نہیں دی جاتی ہے۔ فون آپریٹر کی تنخواہ عام طور سے پیون کے برابر یا اس سے کچھ ہی زیادہ ہوتی ہے۔ اس لیے ایمپلائی مارکیٹ میں بھی اس کی اہمیت نہیں ہے۔ معمولی پڑھے لکھے لڑکے لڑکیاں اس طرف آتے ہیں۔ تعلیم کے لحاظ سے ان کا ذہنی کیلیبر بھی کم ہوتا ہے اور وہ کام کو بھگتانے کے انداز میں کرتے ہیں۔ یہ آپریٹر بھی ایسا ہی تھا۔ کچھ عرصے بعد مسز کریم نے ایک لڑکی ریفر کی اور اس نے آکر کام سنبھالا تو حالات بہتر ہوئے۔ ورنہ نئے آپریٹر نے نہ صرف دفتر والوں کو بلکہ کلائنٹ کو بھی تنگ کر دیا تھا اور اس کی وجہ سے کچھ کلائنٹس بھی کٹ گئے تھے۔

شمائلہ کے آنے سے سب پہلے کی طرح تو نہیں لیکن نوّے فیصد پہلے جیسا ہو گیا۔ کچھ عرصے وجاہت کو اس طرح نکالنے سے دفتر کا ماحول متاثر رہا تھا۔ جب کسی دفتر میں اس طرح فائر کیا جاتا ہے تو تمام ہی ملازمین میں بے چینی آجاتی ہے اور وہ پہلے کی طرح کام نہیں کر پاتے ہیں۔ اس لیے میں نے کچھ عرصے بعد سجاد صاحب کو ایک میٹنگ کے دوران بر سبیل تذکرہ انداز میں ساری بات ان کو بتا دی وہ بھی حیران رہ گئے۔ ”میرے خدا یہ شخص اتنا بڑا فراڈ نکلے گا اور اتنی کامیابی سے ہمیں بے وقوف بنائے گا یہ میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔“

”آپ سوچ سکتے ہیں اسے سینما میں دیکھ کر میری کیا حالت ہوئی ہوگی اور میں نے صبح تک خود پر کس طرح قابو پایا۔ یہ شخص تین سال سے ہمیں پوری طرح بے وقوف بنا رہا تھا۔“

”جی میں سمجھ سکتا ہوں سر اور آپ نے بالکل ٹھیک کیا‘ یہ شخص اسی قابل تھا۔ اس وقت مجھے اس سے کچھ ہمدردی ہوئی تھی۔ اس وقت بھی وہ جس طرح اندھے پن کی اداکاری کرتے ہوئے دفتر سے جا رہا تھا سب کے دل میں اس کے لیے ہمدردی آگئی تھی۔“

”اب تو کلیئر ہے یہ بات، یہ خاص کیس تھا اور اسی وجہ سے مجھے یہ رویہ اختیار کرنا پڑا۔“

سجاد صاحب نے دوسرے افراد کو بتایا اور ہوتے ہوتے تمام اسٹاف تک یہ بات پہنچ گئی اس سے ان لوگوں میں جو بے چینی پیدا ہوئی تھی وہ ختم ہو گئی اور دفتر کا ماحول پہلے کی طرح شفاف اور کھلا ہو گیا۔ وقت گزرتا گیا اور وجاہت ایک بھولی اور بری یاد بن کر رہ گیا اب اسے کوئی یاد کرتا تو یقیناً اسے دھوکے باز ہی کہتا ہوگا۔ کیونکہ میرے ذہن میں بھی کبھی خیال آتا تو یہی لفظ گونجتا تھا۔ اگر آج سے چند مہینے پہلے اتفاق سے یہ واقعہ نہ پیش آتا تو میں آپ کی خدمت میں یہ سچ بیانی نہ پیش کرتا۔ ایک فرم سے کمپنی کی نیا رابطہ ہوا تھا۔ یہ کمپنی باہر سے فوڈ آئٹم منگواتی تھی اور دوسری فرموں کے لیے بھی کام کرتی تھی کیونکہ وہئی میں کمپنی تھی اور اسے خاصی سرکاری مراعات حاصل تھیں۔ وہ کم قیمت پر باہر سے سامان منگوا دیتی تھی اور ہمیں درآمد کے مشکل مراحل سے نہیں گزرنا پڑتا تھا۔ ان کا دفتر سائٹ میں تھا۔ دو ڈیلنگ ہوئی تو فرم کے مالک حسان شاہ سے میری اچھی بات چیت ہو گئی اس نے اصرار کیا کہ میں کسی دن اس کے دفتر آؤں اور اس کا بزنس دیکھوں۔ دفتر گودام کے ساتھ تھا۔ ان ہی دنوں بعض ڈیپارٹمینٹل اسٹورز کی جانب سے کچھ آئٹم کی انکوائری آئی۔ میں نے معلوم کیا تو حسان شاہ کی فرم میں یہ آئٹم موجود تھے۔ میں نے اس سے خود رابطہ کیا اور اس نے مجھے بلا لیا۔

”پہلے تم دیکھ لو کیونکہ پنجاب سے بھی ایک پارٹی ان ہی آئٹمز کے لیے آئی ہے۔“

میں نے وقت ضائع نہیں کیا اور حسان شاہ کے دفتر پہنچ گیا۔ اب اتفاق کی بات ہے جب میں وہاں پہنچا تو ملازمین چھٹی کر کے نکل رہے تھے۔ تب میں نے وجاہت کو ایک شخص کے ساتھ بائک پر پیچھے بیٹھ کر جاتے دیکھا۔ میں چونک گیا کیونکہ پہلی بار اسے سیاہ عینک کے بغیر دیکھ رہا تھا وہ مجھ سے صرف چھ فٹ کی دوری پر کھڑی بائک پر آکر بیٹھا تھا اس لیے تمام جزیات نظر آگئی تھی۔ اس کی آنکھوں کی جگہ گڑھے نما سوراخ تھے اور اس کا چہرہ بہت عجیب لگ رہا تھا۔ کیا وہ یہاں کام کر رہا تھا؟ اس کے سوا یہاں اس کی موجودگی کا کوئی جواز نہیں تھا۔ میں اندر حسان شاہ کے دفتر میں پہنچا۔ کیونکہ وقت کم تھا گودام کا عملہ خاص طور سے اسی لیے رکا ہوا تھا کہ وہ مجھے آئٹم دکھا دے اس لیے ہم پہلے گودام میں آئے۔ یہاں آئٹم دیکھے۔ پھر حسان شاہ مجھے اپنے دفتر میں لے آیا۔ مجھے آئٹم پسند آگئے تھے اور قیمت بھی ٹھیک تھی اس لیے کچھ دیر میں معاملہ طے ہو گیا۔ پھر حسان شاہ نے کہا۔ ”چلو اس خوشی میں کہیں چل کر کچھ کھاتے پیتے ہیں یہاں تو کچھ نہیں ملے گا۔“

میں خود بھی اس سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔ جب سے میں نے وجاہت کو اس طرح دیکھا تھا میری حالت عجیب سی ہو رہی تھی۔ میں نے اسے دھوکے باز اور جھوٹا سمجھ کر ذلیل

کر کے نوکری سے نکالا تھا مگر آج پہلی بار اس کی آنکھیں دیکھیں جن میں بینائی ممکن ہی نہیں تھی۔ بلکہ سرے سے آنکھیں ہی نہیں تھیں۔ دو تاریک گڑھے تھے جو اندر تک جا رہے تھے۔ مگر پھر وہ سب کیا تھا جو میں نے دیکھا تھا اور دوسروں نے بھی دیکھا تھا۔ ایک ہوٹل میں چائے اور اسنیکس لیتے ہوئے میں نے حسان شاہ سے سرسری سے انداز میں پوچھا۔ ”تمہارے دفتر میں اچھے خاصے لوگ کام کرتے ہیں ابھی میں آرہا تھا تو اندر سے ملازم نکل رہے تھے۔“

”ہاں دفتر اور گودام میں ملا کر سو سے اوپر لوگ ہیں۔“ اس نے کہا۔

”ان میں ایک جوان آدمی مجھے نابینا لگا تھا وہ کسی کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر جا رہا تھا۔“

”وجاہت....؟ ہاں وہ بے چارہ دیکھ نہیں سکتا ہے۔ ایک سال سے میرے پاس فون آپریٹر ہے اور بہت ہی کام کا آدمی ہے۔ میں نے آج تک اتنا اچھا فون آپریٹر نہیں دیکھا۔“

میرے پاس سے اسے نکلے ہوئے دو سال سے زیادہ وقت ہو گیا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”وہ پہلے کہیں اور کام کرتا تھا؟“

”نہیں بے چارہ سال سے بے روزگار تھا۔ قسطوں پر فلیٹ لیا ہوا ہے۔ بیوی بھی نوکری کرتی ہے اس لیے گزارا چل رہا تھا پھر میرے پاس آیا تو میں نے ترس کھا کر رکھ لیا۔“

”تنخواہ کیا دیتے ہو؟“

حسان شاہ نے مجھے جو تنخواہ بتائی وہ اس تنخواہ کا ساٹھ فیصد تھی جو میں اسے دیتا تھا اور ان دو سالوں میں مہنگائی کہیں سے کہیں پہنچ گئی تھی۔ حسان شاہ نے کہا۔ ”کیا بات ہے تم اس کے بارے میں کچھ زیادہ ہی پوچھ رہے ہو۔“

”بس ایسے ہی تمہیں پھر کبھی بتاؤں گا۔“ میں نے کہا۔

”اس کی ایک عجیب عادت ہے عینک نہیں لگاتا۔ تم نے آنکھیں دیکھی ہیں اس کی ان کی وجہ سے اس کا سارا چہرہ خراب لگتا ہے اگر عینک لگائے تو اچھا ہینڈسم بندہ نظر آتا ہے مگر نہ جانے کیوں نہیں لگاتا۔ میں نے بھی اس سے کہا وہ عینک لگایا کرے مگر اس نے انکار کر دیا۔“

میرے سینے میں گھٹن سی ہونے لگی تھی اور مجھے پسینا آ رہا تھا۔ میں جان گیا تھا کہ وہ کیوں عینک نہیں لگاتا تھا؟ وہ کیوں لوگوں کو اس طرح اپنی آنکھیں دکھا کر یقین دلاتا تھا کہ وہ بینا نہیں نابینا ہے۔ اس کا قصے دار میں تھا۔ آج میری وجہ سے وہ اس فیکٹری میں کم تنخواہ پر کام کر رہا تھا اپنی انا و خودداری ترک کر کے ایک ساتھی کے ہمراہ بائک پر جا رہا تھا۔ چائے لے کر میں اٹھ گیا۔ میں نے حسان سے بہانہ کیا کہ مجھے آج جلد گھر جانا ہے۔ میں وہاں سے نکلا اور بے اختیار کار کا رخ گلشن اقبال کی طرف موڑ دیا جہاں وجاہت کا فلیٹ تھا۔ میں نے کار باہر ہی روک دی اور اتر کر پیدل اندر پہنچا۔ کال بیل بجانے پر شاہینہ دروازے پر آئی تھی اس نے پوچھا۔ ”کون ہے؟“

”عدنان احمد۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”مجھے وجاہت سے ملنا ہے۔“

اس نے دروازہ کھول دیا اور تلخ لہجے میں بولی۔ ”اب کیوں ملنے آئے ہیں۔“

وہ مجھے پہچان گئی تھی۔ ”میں اس سے معذرت....“

”ہمیں معذرت کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ہم نے جو مشکل وقت گزارنا تھا گزار لیا۔“ وہ شدت جذبات سے رونے والی ہو رہی تھی۔ وہ پہلے کے مقابلے میں کمزور ہو گئی تھی۔ اس کی صحت بتا رہی تھی کہ انہوں نے مشکل وقت گزارا ہے۔ میں ایک بار پھر عرق ندامت میں ڈوبنے لگا۔ مجھ سے بہت بڑا ظلم ہوا تھا۔ شاید اس کی تلافی بھی ممکن نہ تھا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ مجھے ناکام واپس جانا ہوگا میں پلٹنے والا تھا کہ وجاہت کی آواز آئی۔

”شاہین کون ہے باہر؟“

وہ کچھ دیر چپ رہی پھر بولی۔ ”عدنان صاحب آئے ہیں۔“

”عدنان صاحب۔“ بالوں کو تولیے سے رگڑتا ہوا وجاہت گیٹ تک چلا آیا۔ ”کہاں ہیں؟“

”میں... یہاں موجود ہوں۔“ میں نے کہا۔

”ارے آپ باہر کیوں کھڑے ہیں۔ شاہین تم نے انہیں اندر نہیں بٹھایا۔“

”میں....“ وہ نروس ہو گئی۔

میں نے جلدی سے کہا۔ ”یہ تو اصرار کر رہی تھیں لیکن تم مصروف تھے اس لیے میں نے سوچا پھر آجاؤں گا۔“

”پلیز اندر آئیے۔“ وجاہت نے کہا۔ وہ مجھے اندر لے آیا۔ ان کا گھر اسی طرح صاف ستھرا اور سجا ہوا تھا۔ مگر ان دونوں کی صحت گر گئی تھی۔ البتہ جب ان کا بیٹا بھاگتا ہوا آیا تو وہ خوب صحت مند اور پیارا سا ہو رہا تھا۔ ماں کے کہنے پر اس نے مجھے سلام کیا اور ہاتھ ملایا۔ پھر شاہینہ چائے بنانے کا کہہ کر اسے اٹھا کر چلی گئی۔ وجاہت اور میں اکیلے رہ گئے

تھے۔ کچھ دیر خاموشی کے بعد میں نے ہمت جمع کر کے کہا۔ ”وجاہت میں بہت شرمندہ.....“

”نہیں.....نہیں۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”ایسا مت کہیں، مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے کیونکہ آپ نے جو کیا اس کی وجہ غلط فہمی تھی۔“

”نہیں میں نے بہت کم نظری اور سخت دلی کا ثبوت دیا۔ مجھے تم سے پوچھنا چاہیے تھا۔“

وہ آہستہ سے بولا۔ ”مجھے معلوم ہے، اس رات آپ مجھے سینما میں دیکھ کر غلط سمجھے تھے۔“

میں چونکا۔ ”تمہیں معلوم تھا کہ میں وہاں بیوی بچوں سمیت موجود ہوں؟“

”کچھ ہی دور تو تھے، آپ کی آواز صاف آ رہی تھی۔ میری سماعت بہت تیز ہے۔“

”کاش کہ تم صرف عینک اتار دیتے۔“

”اب تو میں نے مستقل اتار دی ہے۔“ اس کے لہجے میں ہلکی سی تلخی آئی۔ ”بالکل نہیں لگتا کہ کہیں کوئی اور غلط فہمی کا شکار نہ ہو جائے۔“

میں نے پھر اس سے معذرت چاہی مگر اس نے منع کر دیا۔ ”پلیز عدنان صاحب، بار بار ایسا مت کہیں، آپ ان چند لوگوں میں سے ہیں جن کی میں دل سے عزت کرتا ہوں۔“

میری طرف سے جاب سے نکالے جانے کے بعد وہ بہت مشکل میں رہا تھا۔ ایک سال تک تو اسے کہیں نوکری نہیں ملی اور اس دوران میں فلیٹ کی ادائیگی بھی کرنی تھی۔ صرف شاہینہ کی تنخواہ تھی جس سے گزارا چل رہا تھا اور ادائیگی بھی ہو رہی تھی پھر ان کا بچہ بھی تھا۔ ایک سال بعد اسے حسان شاہ کے پاس نوکری ملی تو اس کی مشکلات کسی قدر کم ہوئی تھیں۔ مگر ابھی ان پر قرض تھا اور فلیٹ کی ادائیگی بھی باقی تھی۔ اوپر سے بڑھتی مہنگائی نے انہیں متاثر کیا تھا۔ وہ خود پر جبر کر سکتے تھے لیکن اپنے بیٹے کے لیے کوئی کمی انہیں گوارا نہیں تھی۔ وہ ڈھائی سال کا ہو گیا تھا اور ایک سال بعد وہ اسے اسکول میں داخل کرا دیتے اور اس کے لیے ابھی سے تیاری کر رہے تھے۔ بات واضح ہو گئی تھی مگر انسانی فطرت کا پہلو ہے وہ سب جان لینا چاہتا ہے اس لیے میں نے بھی جھجکتے ہوئے اپنے اندر کھٹکنے والے سوالات پوچھ لیے۔

اس نے ٹیڈی بیئر والے واقعے کے بارے میں کہا۔ ”ایسا ہی ٹیڈی بیئر ایک پڑوسی بچے کا تھا وہ راحت سے کھیلنے آتا تھا اس کا بیئر اسے پسند آ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کے کان آف وائٹ ہیں اس لیے جب دکان والے نے مجھے وہی ماڈل تھمایا تو میں جان گیا۔“

وجاہت کی آنکھیں پیدائشی طور پر نہیں تھیں۔ ان کی جگہ صرف سوراخ تھے مگر اسے نارمل زندگی گزارنے کا شوق تھا اس لیے وہ اکثر بینا لوگوں جیسی حرکتیں کر جاتا تھا۔ جیسے آئینے میں دیکھ کر کنگھی کرنا۔ جب سینما میں مووی دیکھنے کا پوچھا تو وہ کھسیا گیا۔ ”یہ حرکت تو میں شاہین سے بھی چھپ کر کرتا ہوں کیونکہ اسے معلوم ہوتا تو یہ میرا بہت مذاق اڑاتی۔ جب میں چھوٹا تھا تو ضد کر کے بابا کے ساتھ سینما جاتا تھا۔ حالانکہ مجھے نظر نہیں آتا تھا لیکن وہاں گونجنے والی آوازیں بہت اچھی لگتی تھیں۔ پھر میں بڑا ہو گیا تو کبھی کبھی خود جانے لگا۔ لوگ حیران ہوتے تھے۔ اب بھی کوئی ایسی مووی لگتی ہے جس میں ڈائلاگ اچھے ہوں اور بیک گراؤنڈ میوزک اچھا ہو تو میں چلا جاتا ہوں۔ اتفاق سے اسی دن آپ بھی وہاں آ گئے تھے۔“

میں سن رہا تھا اور دل ہی دل میں خود کو ملامت کر رہا تھا۔ جب میرا یہ حال تھا جو اپر کلاس کا اعلیٰ تعلیم یافتہ فرد تھا تو اس ملک اور معاشرے کے عام افراد کا ان ڈس ایبل پرسنز سے کیا سلوک ہوگا۔ ہم انہیں ایک محدود دائرے میں قید کر دیتے ہیں اور اگر وہ اس سے نکلنے کی کوشش کریں تو ہم ان کی حوصلہ افزائی کے بجائے ان کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں۔ جب میں نے اس سے کہا۔ ”وجاہت تم میرے پاس واپس آ جاؤ۔“

”نہیں سر اب میں وہاں موجود لوگوں کا سامنا نہیں کر سکوں گا وہ مجھے نہ جانے کیا سمجھ رہے ہوں گے۔“

”تم اس کی فکر مت کرو، یہ میری غلطی تھی اس لیے تلافی بھی میں ہی کروں گا۔ حسان شاہ کی فکر بھی مت کرو وہ میرا دوست ہے۔“

میرے بہت اصرار پر وہ بہ مشکل مانا تھا۔ میں نے اپنے کیے کی تلافی کے لیے جو کیا میں اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا مگر یوں سمجھ لیں کہ اب وہ تمام مشکلات سے نکل آیا ہے۔ میرے پاس پہلے سے ڈبل تنخواہ پر کام کر رہا ہے اور اسے پک اینڈ ڈراپ کے لیے میں نے خاص طور سے کمپنی میں وین کی سہولت متعارف کرائی ہے۔ وہ خوش ہے اس لیے امید ہے اللہ بھی مجھے معاف کر دے گا اس لیے اب میں بھی خوش ہوں۔

نعمت بے بصارتی

محترم مدیر اعلیٰ
آداب و نیاز!
اس دنیا میں سب سے بڑی نعمت آنکھیں ہیں مگر وہ اندھے پن کو نعمت کہتا تھا۔ اس کی وجہ کیا تھی آپ کو یہ کتھا بتائے گی۔

منظر امام
(کراچی)

میں پہلے بھی کئی بار تحریر کر چکا ہوں کہ میں کرداروں کی تلاش میں رہا کرتا تھا۔ اور شاید یہ عادت آج بھی ہے۔ چہروں کو غور سے دیکھنا۔ ان کی حرکات پر نظر رکھنا۔ ان کی عادتوں کے بارے میں جاننا یہ سب میرا محبوب مشغلہ ہے۔

کردار بہت عجیب ہوتے ہیں۔ ہمارے اردگرد پھیلے ہوئے۔ ہنستے بولتے ہوئے لوگ۔ ہر شخص خود ایک داستان ہوتا ہے۔

یہ اس زمانے کی بات ہے۔ جب میں ملیر میں رہا

کرتا تھا۔ اور بے فکرے شاعر اور ادیب قسم کے نوجوانوں کا ایک حلقہ اردگرد ہوا کرتا تھا۔

یہ سب سوچنے والے نوجوان تھے۔ غزلیں کہنے والے، افسانے لکھنے والے۔ شاید ہر ایک نے اپنی اپنی راہ کا تعین کرلیا تھا۔ کون کون نہیں تھا۔ مرحوم ثروت حسین (باکمال شاعر) شوکت عابد، انورسن رائے، احمد جاوید (معروف اسکالر) ایوب خاور، جمال احسانی (مرحوم) بعد میں اس قبیلے میں مرحوم سراج منیر بھی شامل ہوگئے تھے۔ ہاں اپنا یار، ممتاز رفیق (جس کے خاکوں کی کتاب نے ایک دھوم مچا رکھی ہے)

اس زمانے میں مضافاتی علاقے فکری اعتبار سے بہت زرخیز ہوا کرتے تھے۔ ابھی ٹی ٹی اور کلاشنکوف کلچر متعارف نہیں ہوا تھا۔ اس لیے ہر طرف سکون ہی سکون تھا۔

میرے ایک دوست ہوا کرتے تھے نفیس فریدی (وہ بھی اب مرحوم ہوگئے) ہائے۔

نفیس فریدی اچھے شاعر تھے۔ 65ء کی جنگ میں ان کا لکھا ہوا نغمہ بہت مشہور ہوا تھا۔ پاکستانی بڑے لڑیا۔ جن کی کبھی نہ جائے مار۔

اس زمانے میں ریڈیو ہی ہوا کرتا تھا۔ تو اس نغمے کو سننے کے لیے لوگ ریڈیو کے گرد بیٹھ جایا کرتے تھے۔ نفیس فریدی ملیر میں لیاقت مارکیٹ کے پاس رہا کرتے تھے۔

اس کہانی کا آغاز اسی مارکیٹ سے ہوتا ہے۔

ایک شام میں نے جوتوں کی دکان پر ایک عجب منظر دیکھا۔ یہ ایسا منظر تھا جس نے براہِ راست میرے دل کو متاثر کیا تھا۔ ایک بارہ گیارہ برس کا بچہ، جس کا باپ اس کے جوتوں کو چھو چھو کر دیکھ رہا تھا اور خوش ہو رہا تھا۔

اس باپ نے وہ جوتے اپنے بچے کو اس دکان سے دلائے تھے۔ بچہ جوتے پہن کر ان کی ٹرائی لے رہا تھا اور وہ باپ نابینا تھا۔ مکمل نابینا۔

بیٹے کو جوتے پہنے ہوئے محسوس کر کے جس قسم کی خوشی اس کے چہرے پر تھی وہ الفاظ میں بیان نہیں ہوسکتی۔ اس کے چہرے پر خوشیوں نے جیسے بسیرا کرلیا تھا۔

میں وہیں رک گیا۔ میں اس منظر کو دیکھتا ہی رہا۔ اس نابینا شخص نے جوتوں کے پیسے ادا کیے اور دونوں باپ بیٹے دکان سے باہر آگئے۔ میں بھی ان کا تعاقب کرنے لگا۔

وہ نابینا شخص مجھے ایک کردار محسوس ہوا تھا۔ اس قسم کا جس قسم کے کرداروں کی مجھے تلاش رہتی ہے۔ وہ دونوں پیدل ہی ایک طرف چل دیے تھے۔

میں نے اپنے قدم تیز کیے اور ان کے پاس پہنچ گیا۔ ”السلام علیکم جناب۔“ میں نے اس نابینا کو سلام کیا۔

وہ سلام کا جواب دے کر پوچھنے لگا۔ ”کون ہو بھائی، میں نے نہیں پہچانا۔“

”جناب میرا نام منظر امام ہے اور میں کھوکھراپار میں رہتا ہوں۔“

”ہاں، ہاں میں نے نام سنا ہے تمہارا۔ شاید شاعری بھی کرتے ہو۔“ اس نے کہا۔

”جی جناب۔“

”فرصت ہو تو میرے ساتھ آجاؤ۔“ اس نے کہا۔ ”میں کھوکھراپار چمن کالونی کے پاس رہتا ہوں۔ اطمینان سے بیٹھ کر باتیں ہوں گی۔“

میں تو خود اس کردار کو قریب سے دیکھنے اور اس کے بارے میں معلوم کرنے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔ اسی لیے اس کے ساتھ ہولیا۔

اس نے اپنا نام حافظ ذاکر حسین بتایا تھا۔

اس کا گھر (کوارٹر) بہت سلیقے کا بنا ہوا تھا۔ اس زمانے میں اس علاقے کے زیادہ تر کوارٹر اپنی اوریجنل حالت میں تھے، لیکن حافظ صاحب کا گھر بہت خوبصورت بنا ہوا تھا۔

وہ مجھے اندر کمرے میں لے آئے وہ بھی بہت سجا ہوا کمرا تھا۔ یعنی بہت سلیقے کا۔ حافظ صاحب کچھ دیر بعد کمرے میں آئے۔ ان کے پیچھے ان کا وہی بیٹا چائے کی ٹرے لے کر آگیا تھا۔ اس میں چائے کے ساتھ ساتھ اچھی قسم کے بسکٹ بھی تھے۔

لڑکا بہت مہذب انداز میں ٹرے سامنے رکھ کر چلا گیا۔ اس کا لباس اور اس کا انداز یہ بتا رہے تھے کہ اس کی تربیت بہت اچھی ہوئی ہے۔

اس گھر کی بناوٹ اور سجاوٹ بھی یہ بتا رہی تھی کہ اس گھر کو کوئی مالی پریشانی نہیں ہے۔

”جی جناب۔“ حافظ صاحب نے سامنے بیٹھتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔ ”پہلے تو کچھ اپنے بارے میں بتاؤ۔“

میں نے تفصیل سے بتایا کہ میں کیا ہوں اور کیا کرتا ہوں۔ میرے مشاغل کیا ہیں۔ حافظ صاحب یہ سن کر بہت خوش ہوئے تھے۔

”ہاں، میں خود بھی مشاعروں میں جایا کرتا تھا لیکن رات دیر ہوجاتی ہے اور اب صحت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ اسی لیے شرکت سے معذرت کرلیتا ہوں۔“

”حافظ صاحب، کیا آپ خود بھی؟“

”ہاں بھائی۔“ وہ ہنس پڑے۔ ”میں خود بھی ٹوٹی پھوٹی شاعری تو کر ہی لیتا ہوں۔“

”اگر آپ کو سننے کی خواہش ہو تو اس کے لیے کیا کیا جائے۔“

”کچھ نہیں میاں۔ بس کہہ کر دیکھو شروع ہو جاؤں گا۔“ حافظ صاحب نے کہا۔ ”کسی شاعر کو اور کیا چاہیے۔“

پھر انہوں نے میری فرمائش پر کئی غزلیں سنائیں۔ وہ اچھے خاصے شاعر تھے۔ پھر مجھ سے فرمائش کی۔ میں نے بھی دو چار غزلیں سنا ہی دیں۔ حافظ صاحب داد دیتے رہے تھے۔

اسی دوران ایک نوجوان کمرے میں داخل ہوا۔ وہ اپنے ساتھ کاغذ اور قلم دان لیتا ہوا آیا تھا۔ وہ حافظ صاحب کو سلام کرکے ایک طرف بیٹھ گیا تھا۔

”میاں، اگر تم دس منٹ اجازت دو تو میں جمیل کو فارغ کردوں۔“ حافظ صاحب نے یہ بات مجھ سے کی تھی۔

میرا خیال تھا کہ وہ نوجوان شاید اپنی شاعری پر اصلاح وغیرہ کے لیے آیا ہوگا۔ لیکن وہاں معاملہ دوسرا تھا۔ حافظ صاحب شاید کوئی تاریخی مضمون اسے ڈکٹیٹ کروا رہے تھے۔

دس پندرہ منٹوں تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر انہوں نے اس نوجوان سے کہا۔ ”میاں، میں شاید آج نہیں جاسکوں گا۔ تم اخبار کے دفتر چلے جانا۔“

”ٹھیک ہے جناب۔ میں چلا جاؤں گا۔“

اس نوجوان کے جانے کے بعد حافظ صاحب نے کہا۔ ”یہ بھی روزانہ کی ایکسرسائز ہے۔ یہ بے چارہ جب سے میری مدد کرنے لگا ہے، مجھے آسانی ہوگئی ہے۔“

”جناب، آپ نے اسے کیا لکھوایا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”اپنا کالم لکھوایا تھا میاں۔ روزنامہ مشرق میں روزانہ میرا کالم چھپا کرتا ہے۔“

اس وقت پتا چلا کہ حافظ صاحب روزنامہ مشرق کراچی کے باقاعدہ کالم نویس تھے اور وہاں سے انہیں معقول تنخواہ بھی ملا کرتی تھی۔

میاں غلام اللہ نام تھا۔ وہ حضرت میاں شیر محمد شرقپوریؒ کے بھائی اور خلیفہ تھے۔ شرقپور میں 1308ھ 1891ء میں پیدا ہوئے۔ چار سال کی عمر میں سایۂ پدری سے محروم ہوگئے۔ تربیت میاں شیر محمدؒ نے کی۔ میٹرک تک تعلیم پائی اور طبیہ کالج سے حکیم حاذق کا امتحان پاس کیا۔ پندرہ برس کی عمر میں شادی ہوئی تو طبابت چھوڑ کر میونسپل کمیٹی شرقپور میں سیکریٹری ہوگئے۔ میاں صاحب نے اپنی زمین واقع جھوک گندووالی ان کے نام کردی تو نمبرداری بھی مل گئی۔ ایک روز میاں صاحب نے نظرِ توجہ کی تو تصوف کی راہ پر آگئے اور ان کے بعد منصبِ خلافت پر فائز ہوئے۔ 1944ء میں انہوں نے جامعہ حضرت میاں صاحب کی بنیاد رکھی اور تبلیغ اسلام کے لیے ایک انجمن ”حزب الرسول“ قائم کی۔ تین حج کیے اور تقریباً تیس برس تک منصبِ خلافت ادا کر کے اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ پسماندگان میں دو صاحبزادے چھوڑے۔ حضرت ثانیؒ صحیح معنوں میں میاں صاحب کے ثانی تھے۔ انہی کی مانند وعظ فرمایا کرتے۔ دینِ اسلام کی اشاعت کا بے حد شوق تھا، جس کا مظہر تبلیغی انجمن ہے۔ 1378ھ۔ 1958ء میں انتقال کیا۔

اس کے علاوہ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ اسلامیات میں ایم اے کرچکے ہیں۔

میں ان سے متاثر ہوگیا تھا۔

کتنی بڑی بات تھی کہ ایک نابینا انسان نے اس انداز سے اپنے آپ کو سنبھال رکھا تھا۔ اچھا گھر، بچوں کی اچھی تربیت، تعلیم، اچھے کپڑے، خود ایم اے، ایک بڑے اخبار میں کالم نویس۔ اتنا تو آنکھوں والے بھی نہیں کرپاتے ہوں گے۔ بہرحال یہ تھی حافظ ذاکر حسین سے میری دوستی کی ابتدا۔

میں نے جب اپنے دوستوں کو ان کے بارے میں بتایا تو وہ بھی بہت حیران اور خوش ہوئے۔ اس کے بعد حافظ صاحب کے یہاں ہمارا آنا جانا شروع ہوگیا۔

میں اور احمد جاوید عام طور پر شام کے وقت ان کے پاس چلے جایا کرتے تھے۔ کبھی کبھی ہمارے ساتھ ثروت حسین بھی ہوتے۔ رات کا کھانا ان ہی کے یہاں کھایا جاتا۔ خوب پُرتکلف ہوا کرتا تھا۔ جس سے یہ پتا چلتا کہ اس گھر میں روپوں پیسوں کی پرابلم نہیں ہے۔

ہم دوست اکثر ان سے شرمندہ بھی ہوا کرتے (یہ اصطلاح بہت زبردست تھی۔ کسی سے پیسے لینے کو ہم شرمندہ ہونا کہا کرتے تھے)

حافظ صاحب کے اخراجات بھی بہت زبردست تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے ان کی آمدنی اچھی خاصی ہو۔ ایک بات سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ صرف ایک اخبار میں کالم لکھنے سے اتنی آمدنی کیسے ہوسکتی تھی۔

میں نے ایک بار جب انہیں کریدا تو انہوں نے بتایا۔ ''ہاں میاں، تمہارا یہ کہنا بالکل درست ہے۔ اخبار والے بے چارے کیا دے سکتے ہیں۔''

''تو پھر آپ کی آمدنی کے دیگر ذرائع کیا ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''مخیر حضرات کی مہربانی ہے۔'' انہوں نے کہا۔

پھر انہوں نے بتایا کہ کچھ ادارے اور کچھ حضرات باقاعدہ وظیفے دیا کرتے ہیں۔ وہ اچھی خاصی رقم ہوجاتی تھی اور اس طرح حافظ صاحب ایک پُرسکون اور آرام دہ زندگی گزار رہے تھے۔

خیر.. حافظ صاحب کے یہاں ہمارا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ایک دن ایک ایسی بات ہوئی، جس نے کم از کم مجھے تو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

ہم بیٹھے ہوئے تھے کہ ان کا چھوٹا بیٹا کمرے میں آیا اور وہ حافظ صاحب کو پیار کرنے لگا۔ اس وقت حافظ صاحب کی بھی خوشی دیکھنے کے قابل تھی۔

مجھے بھی یہ دیکھ کر بہت خوشگوار حیرت ہو رہی تھی۔ ایک بچہ اپنے نابینا باپ کو پیار کر رہا تھا اور ایک نابینا باپ اپنے بچے کا چہرہ دیکھنے سے قاصر تھا۔

کیا عجیب مجبوری تھی۔

ان ہی دنوں ایک خبر یہ بہت گرم ہو رہی تھی کہ سری لنکا سے آنکھوں کے عطیے آتے ہیں اور آپریشن کرکے نابیناؤں کی آنکھیں ٹھیک کردی جاتی ہیں۔

میں نے حافظ صاحب کو بتائے بغیر ایک دو ڈاکٹروں سے مشورہ لیا۔ انہوں نے یہ بتایا کہ اگر یہ نابینا پن پیدائشی ہے تو ناممکن ہے۔ لیکن بعد میں ہوا ہے تو پھر آنکھیں لگائی جاسکتی ہیں۔

حافظ صاحب یہ بتا چکے تھے کہ وہ پیدائشی نابینا نہیں تھے۔ بلکہ بعد میں ایک بیماری کے حملے کے نتیجے میں وہ نابینا ہوگئے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ حافظ صاحب کی آنکھیں ٹھیک ہوسکتی ہیں۔ لیکن صورتِ حال کچھ حیرت انگیز بلکہ بہت عجیب رہی تھی۔

میں نے جب حافظ صاحب سے بہت خوشی خوشی اس خبر کا ذکر کیا اور یہ امکان ظاہر کیا کہ ان کی آنکھیں بالکل ٹھیک ہوسکتی ہیں تو وہ ایک دم سے ناراض ہوگئے۔

''یہ تم کیسی باتیں کررہے ہو؟ جاؤ یہاں سے۔ میں تم سے بات بھی نہیں کرنا چاہتا۔''

''حافظ صاحب کیا ہوا ہے آپ کو۔'' میں حیران ہوگیا تھا۔

''میں نے کہا نا خدا کے لیے چلے جاؤ یہاں سے۔''

حافظ صاحب کا یہ رویہ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ میں نے تو ان کی بھلائی کی بات کی تھی... اور الٹا وہ مجھ ہی سے ناراض ہوگئے۔ بہرحال اس کے بعد سے میں نے ان سے ملنا جلنا تقریباً ترک کردیا۔

مشاعروں میں ملاقات ہوجاتی لیکن سلام دعا کی حد تک۔ ایک دو بار انہوں نے شکوہ بھی کیا کہ میں کیوں ان سے دور ہوگیا ہوں۔ جس کا میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

ایک شام اچانک حافظ صاحب خود ہی میرے گھر چلے آئے۔ وہ اسی نوجوان کے ساتھ آئے تھے جس کو وہ اپنا کالم لکھوایا کرتے تھے۔

ظاہر ہے ان کے آنے سے حیرت اور خوشی ہوئی تھی۔ میں نے انہیں کمرے میں بٹھایا۔ انہیں چائے پلائی۔ میں یہ کوشش کررہا تھا کہ وہ واقعہ دہرایا نہ جائے۔ لیکن حافظ صاحب تو اسی مقصد سے آئے تھے۔ وہ خاموش کیوں رہتے۔

انہوں نے چائے پینے کے بعد کہا۔ ''ہاں، میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے ناراض ہوگئے ہو۔''

''ارے نہیں حافظ صاحب! آپ سے کس بات کی ناراضی۔ بس آج کل فرصت نہیں مل رہی ہے۔ اسی لیے آنا جانا نہیں ہو رہا۔''

''بہانے مت بناؤ میاں، میں جانتا ہوں کہ معاملہ کیا ہے۔ میں نے اس دن جو کہا تھا، تم نے اس کا برا مان لیا ہے۔''

''اب چھوڑیں حافظ صاحب اس بات کو۔'' میں نے کہا۔ ''میں بھول چکا ہوں۔''

''تم ایک بار میرے گھر آؤ۔ میں تمہیں کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔''

"کیا دکھانا چاہتے ہیں؟"

"تم آؤ تو سہی۔" حافظ صاحب نے کہا۔ "اس کے بعد جو میں کہوں گا وہ تمہاری سمجھ میں آجائے گا۔"

حافظ صاحب نے اتنا اصرار کیا کہ میں نے ان کے گھر آنے کا وعدہ کرلیا۔ ویسے بھی میں خود... یہی چاہتا تھا کہ کسی بہانے ان کے یہاں آنا جانا شروع ہو۔ ان کی محفلیں یاد آتی تھیں۔ ان کے زندہ قہقہے یاد آتے تھے۔

اس میں تو کوئی شک ہی نہیں تھا کہ وہ ایک ہمدرد پرخلوص اور یار باش قسم کے انسان تھے۔ دوستوں کو اپنے گھر بٹھا کر انہیں کھلا پلا کر یا ان کی مالی مدد کر کے خوشی محسوس کیا کرتے۔

ان زمانے میں ہم سب کا یہی حال تھا۔ یعنی ہم ہر ایک سے شرمندہ ہوا کرتے تھے۔

بالآخر تیسرے دن میں ان کے پاس پہنچ ہی گیا۔ میں اکیلا ہی آیا تھا۔ وہ بہت گرم جوشی سے ملے تھے۔ "میاں، میں تو کل بھی تمہارا انتظار کرتا رہا تھا۔" انہوں نے شکوہ کیا۔

"بس حافظ صاحب۔ کل ذرا مصروفیت نکل آئی تھی۔" میں نے بتایا۔

"پھر ہمارے درمیان باتیں ہونے لگیں۔ وہی معمول کی باتیں۔ شاعری، ادب وغیرہ۔ حافظ صاحب چونکہ اسلامی تاریخ کے آدمی تھے۔ اسی لیے اس موضوع پر ان کی معلومات زبردست تھیں۔

ایک بات یہ بھی تھی کہ ان کی یادداشت بہت اچھی تھی۔ انہوں نے جو کچھ پڑھا یا سنا تھا، وہ سب ترتیب وار انہیں یاد تھا۔ یہ ان کی ایک غیر معمولی صلاحیت تھی۔ جس کا مظاہرہ ہمیں حیران کر دیتا تھا۔

کچھ دیر بعد ان کا بیٹا چائے لے کر آ گیا۔ حافظ صاحب نے اس سے کہا۔ "بیٹے، وہ اپنا پرانا والا البم کہاں رکھا ہے۔"

"وہ میز پر ہے بابا۔" بیٹے نے جواب دیا۔

"وہ لے آؤ۔"

اس کے جانے کے بعد حافظ صاحب نے مجھ سے کہا۔ "میں نے تم سے کہا تھا کہ میں تمہیں کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔"

میں ان کی بات سمجھ نہیں سکا۔ انہوں نے بچے کو البم لانے کے لیے کہا تھا۔ خدا جانے وہ مجھے البم میں کیا دکھانا چاہتے تھے۔ بیٹا کچھ دیر میں البم لے کر آ گیا تھا۔ وہ ایک خستہ سا البم تھا۔ "ذرا تصویریں دیکھو۔" حافظ صاحب نے مجھ سے کہا۔

میں نے ان کے کہنے پر البم کی تصویریں دیکھنی شروع کر دیں۔

اس البم میں سات آٹھ تصاویر تھیں۔ کوئی خاندان تھا، میاں بیوی اور پانچ عدد بچے۔ میں نے تصویریں دیکھ لینے کے بعد بتایا۔ "حافظ صاحب، میں نے یہ تصویریں دیکھ لیں۔ یہ عام قسم کی گھریلو تصویریں ہیں۔"

"یہ میرے بھائی کی تصویریں ہیں۔" حافظ صاحب نے بتایا۔ "کیا ان تصویروں سے یہ پتا نہیں چلتا کہ ان کے حالات بہت خراب ہوں گے۔"

"جی ہاں، یہ تو معلوم ہو رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "بے چارے غربت زدہ لوگ ہیں۔ جو مکان دکھائی دے رہا ہے۔ وہ بھی بہت خستہ حالت میں ہے۔"

"اور یہ اس لیے ہے کہ میرا بھائی نابینا نہیں ہے۔"

"جی۔" میں چونک اٹھا۔ کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میں جس انداز کی زندگی گزار رہا ہوں۔ میرے بچوں کے جسموں پر اچھے کپڑے ہیں۔ میرا مکان بنا ہوا ہے۔ فرنیچرز بھی بہت اچھا ہے۔ یہ سب اس لیے ہے کہ میں نابینا ہوں اور بہت سے لوگوں نے میرے لیے ماہانہ وظیفے باندھ رکھے ہیں۔ خود سوچو، جس دن مجھے آنکھیں مل گئیں۔ میں دیکھنے لگا اسی دن سے وظیفوں کا یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا۔ مجھے اسی لیے اس دن تمہاری یہ بات بری لگی تھی کہ تم میری روزی کا راستہ بند کرنے کی بات کر رہے تھے۔"

میں یہ سن کر دہل کر رہ گیا۔ خدا کی پناہ! یہ معاشی مجبوری بھی کیا ہوتی ہے کہ انسان اس کے لیے اندھا رہنا پسند کر لیتا ہے۔ اپنے پیاروں کے چہرے نہ دیکھنا برداشت کر لیتا ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں چاہتا کہ اس کے وظیفے بند ہوں۔

تو یہ تھا ایک کردار اور اپنے پیاروں کے لیے اتنی بڑی قربانی دینے والا کہ جس قربانی کی نظیر نہیں مل سکتی۔ اور زمانے سے لڑتا ہوا انسان۔ دن رات محنت کر کے اپنی سماجی حیثیت کو بحال رکھنے والا۔

حافظ صاحب کے سامنے تو ہم آنکھوں والے نابینا ہو کر رہ گئے تھے۔

فالتو سانس

مکرمی مدیر اعلیٰ
السلام علیکم!
سرگزشت کا خاص نمبر اپنی مثال آپ ہوتا ہے۔ اس نمبر میں شامل ہونا بہت بڑے اعزاز کی بات ہے پھر بھی میں نے کوشش کی ہے۔ اپنے علاقے کی ایک سرگزشت لکھی ہے۔ اگر یہ سرگزشت بینا نابینا نمبر میں شامل ہوجائے تو میں مشکور رہوں گا۔

آفتاب احمد
(ملیر، کراچی)

عجب تھے وہ لوگ۔

آج بھی یاد آتے ہیں تو ان کے حیرت انگیز واقعے پر حیرانی بھی ہوتی ہے اور ہنسی بھی آتی ہے۔ وہ چاروں نابینا تھے۔

یہ واقعہ ملیر کا ہے۔ جہاں اسّی اسّی گز کے چھوٹے چھوٹے کوارٹرز بنے ہوئے تھے۔ ان چاروں کی رہائش ایک ہی کوارٹر میں تھی۔

وہ چاروں بھکاری تھے۔ وہ ایک چوراہے پر ایک

ساتھ کھڑے ہو کر بھیک مانگا کرتے۔ ان کی آواز میں بلا کا سوز تھا۔

میں یہ دیکھتا تھا کہ آتے جاتے لوگ ان کو بھیک دینے میں بخل نہیں کرتے تھے۔ ہم نے ہمیشہ ان چاروں کو ایک ساتھ ہی دیکھا تھا۔

وہ ایک ساتھ ہی اپنے کوارٹر سے نکل کر اپنے مخصوص چوراہے پر آکر اپنی مخصوص جگہ پر آجاتے اور دوپہر کے وقت کلن بھائی کے ہوٹل میں ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے۔

ہم دوستوں کی محفل بھی کلن بھائی کے ہوٹل ہی میں ہر شام کو ہوا کرتی۔ ہم اکثر ان چاروں بھکاریوں کے بارے میں باتیں کیا کرتے۔

کیا زندگی تھی ان کی۔ ایک دوسرے کے ساتھ رہنا۔ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک، ان کے علاوہ اور کوئی ان کا شریک نہ تھا۔ ان حالات میں کون ان کے کام کرتا ہوگا۔ بیمار پڑتے ہوں گے تو کس طرح ایک دوسرے کی دیکھ بھال کرتے ہوں گے۔

ہم میں سے کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ کہاں سے آئے تھے۔ ان کا بیک گراؤنڈ کیا تھا اور یہ کس طرح ملیر میں آکر آباد ہو گئے تھے۔

میں بہت قریب سے ان کا مشاہدہ کرتا رہتا تھا۔ وہ آپس میں مذاق بھی کرتے تھے اور خوب زور زور سے ہنسا کرتے، ان کی اپنی الگ دنیا تھی، جس میں وہ مگن تھے۔

میرا دوست کہا کرتا تھا۔ ”یار، یہ چاروں ایک نمبر کے بدمعاش ہیں۔ ان کو تم بے وقوف نہیں بنا سکتے۔“

”وہ کس طرح۔“

”تم ان کو کوئی کھوٹا سکہ دے کر دیکھو، ان کو فوراً پتا چل جائے گا۔“

میں نے انہیں آزمانے کی خاطر ایک بار ان میں سے ایک کے ہاتھ پر کھوٹا سکہ رکھ دیا تھا۔ یقین کریں، اس نے تو واویلا مچانا شروع کر دیا۔

”واہ واہ بھائی، آنکھوں والے ہو کر اندھے کو دھوکا دیتے ہو۔ کھوٹے سکے کی بھیک دے رہے ہو۔ رکھ لو اپنا یہ سکہ۔ کسی آنکھوں والے کو دے دینا۔“

میں شرمندہ ہو کر رہ گیا۔ مجھے یہ شک ہونے لگا تھا کہ یہ کہیں بنے ہوئے تو نہیں ہیں لیکن ایسا نہیں تھا۔ وہ واقعی نابینا ہی تھے۔

ایک بار شام کے وقت میں کلن بھائی کے ہوٹل میں اکیلا بیٹھا تھا کہ وہ چاروں ایک ساتھ چائے پینے کے لیے آگئے۔ اتفاق سے وہ میرے پاس ہی کی میز پر آکر بیٹھے تھے۔

وہ آپس میں آہستہ آہستہ کچھ باتیں کر رہے تھے اور میں نے جب ان کی باتیں سنیں تو دنگ رہ گیا۔ وہ کسی لڑکی کے بارے میں بات کر رہے تھے، جو روزانہ ان میں سے کسی نہ کسی کو بھیک دیا کرتی تھی۔

”ابے، رحیم، وہ تجھ پر عاشق ہو گئی ہے۔“ ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا۔ ”وہ تجھے ایک روپے کا نوٹ دے کر جاتی ہے اور ہمیں اٹھنی چونی پر ٹرخاتی ہے۔“

”ابے میری ایسی قسمت کہاں۔“ رحیم نامی نابینا نے گہری سانس لی۔ ”وہ بے چاری تو ہمدردی میں ایسا کرتی ہے۔“

”ایسی ہمدردی ہم سے کیوں نہیں کرتی۔“

پھر سب ہنس پڑے۔ یعنی ان میں یہ سینس بھی تھا کہ وہ کسی لڑکی کی خوشبو پہچان لیتے اور اس کے بارے میں ایسی باتیں کرتے۔ جیسی باتیں بینا حضرات کیا کرتے ہیں۔

پھر ان میں سے ایک نے کہا۔ ”یار چلو، ہم اندازہ لگائیں کہ وہ لڑکی کیسی ہوگی۔“

”کیا فائدہ ایسے اندازے کا۔“ دوسرے نے کہا۔

”یار، دل پشوری کرنا ہے... اور کیا، چل بتا۔“ پہلے والے نے کہا۔

”اس کا رنگ بہت صاف ہوگا۔“ ایک نے بتایا۔

”اور اس کا قد بھی اونچا ہوگا۔“ دوسرے نے کہا۔ ”اس کا پتا ایسے چلا کہ وہ اونچی ایڑھی والی سینڈل پہنتی ہے اور اس کے قدموں کی کھٹ کھٹ یہ بتاتی ہے کہ وہ اونچے قد کی ہے۔“

”اب میں بتاؤں۔“ تیسرے نے کہا۔ ”وہ بہت گہرے رنگ کے کپڑے پہنتی ہے۔ خاص طور پر نیلا رنگ۔“

میں انتہائی حیرت سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ یہ کیسے لوگ تھے۔ اور کس طرح لڑکی کی چال، اس کے قد اور اس کے لباس کا اندازہ لگاتے جا رہے تھے۔

”فخرو، یہ بتا، تو نے کیسے اندازہ لگایا کہ وہ نیلا رنگ پہنتی ہے۔“ ایک نے پوچھا۔

”ابے دو تین بار اس کے کپڑے سے میرا ہاتھ لگا ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”میں نے اپنے ہاتھ میں نیلے رنگ کا کرنٹ محسوس کیا تھا۔“

یہ اور بھی حیران کر دینے والی بات تھی۔

نابیناؤں کو کپڑے میں کرنٹ کا احساس ہوتا تھا اور وہ اس کرنٹ سے رنگوں کی پہچان کر لیتے تھے۔ میں نے یہ بات پہلے بھی سن رکھی تھی لیکن اس دن ان کی باتوں سے کنفرم ہو گیا تھا۔ تو ایسے عجب لوگ تھے وہ۔

اب مجھے اس لڑکی کو دیکھنے کا شوق ہو چلا تھا جو اُن نابیناؤں کو روزانہ خیرات دیا کرتی تھی۔ ظاہر ہے، وہ جذبۂ ہمدردی ہی میں دیتی ہوگی۔

ان کی باتوں سے یہ پتا چلا کہ شاید وہ کہیں دفتر وغیرہ جایا کرتی ہے۔ اس لیے اس کی آمد ایک مقررہ وقت پر ہوتی ہے۔ یعنی صبح دفتر کے لیے جانے سے پہلے وہ ان کے پاس آیا کرتی ہے۔

میں اسے دیکھنے کے لیے ایک صبح اس اسٹاپ پر پہنچ گیا۔ وہ چاروں اپنی جگہ موجود تھے۔ گزرنے والے ان کو خیرات دیتے ہوئے گزر جاتے تھے۔

پھر میں نے ایک لڑکی کو ان کی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ وہ نیلے ہی رنگ کے لباس میں تھی۔ شاید یہ اس کا پسندیدہ رنگ تھا۔

مجھے پھر ان نابیناؤں کے اندازے پر حیرت ہوئی تھی۔ اس آدمی نے یقین سے بتایا تھا کہ وہ نیلا رنگ استعمال کرتی ہے۔

میں نے دیکھا کہ وہ لڑکی ان کے پاس آکر کھڑی ہوئی۔ اس نے اپنے بیگ سے کچھ سکے نکال کر تینوں کو دیے اور ایک کو ایک نوٹ۔

یہ بھی ایک سوال تھا کہ آخر اسی ایک نابینا پر اتنی مہربانی کس لیے۔ بقیہ تینوں نے کیا قصور کیا تھا کہ ان کو اٹھنی چونی پر ٹرخایا جا رہا تھا اور اس ایک کو نوٹ دیا گیا تھا۔

دل چاہا کہ آگے بڑھ کر اس لڑکی سے پوچھ ہی لوں۔ لیکن وہ بس اسٹاپ کی طرف بڑھ گئی تھی۔ وہ خاصی قبول صورت لڑکی تھی۔

اب یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ وہ لڑکی اس نابینا کو پسند کرنے لگی ہو اس لیے اس پر زیادہ مہربان ہو۔ اس قسم کی باتیں تو صرف کہانیوں میں ہوا کرتی ہیں۔

یہ معاملہ کچھ اور دکھائی دے رہا تھا۔

میرا تجسس کچھ اتنا زیادہ تھا کہ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں یہ راز معلوم کر کے رہوں گا۔

دوسری صبح میں پھر وہیں پہنچ گیا، وہ چاروں بھکاری اپنی جگہ کھڑے تھے۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ وہ لڑکی وہاں آتی ہے یا نہیں۔

کچھ دیر بعد وہ لڑکی نمودار ہوئی اور اس دن بھی وہ نیلے ہی لباس میں تھی۔ میں اس سے کچھ فاصلے پر تھا۔ اس نے گزشتہ دن کی طرح تینوں بھکاریوں کو سکے دیے اور

شوریدہ 1272ء میں شیراز میں پیدا ہوئے۔ سات سال کی عمر میں چیچک نکلی اور دونوں آنکھیں ضائع ہو گئیں۔ بلند پایہ شاعر تھے۔ ناصر الدین شاہ کے دربار میں ایک مرتبہ ایک رباعی فی البدیہہ کہی اور فصیح الملک خطاب پایا۔ آخری عمر میں شیراز کی آرام گاہ سعدی کی تولیت اور تنظیم ان کے سپرد کر کے ان کی عزت افزائی کی گئی۔ حافظہ کمال کا تھا۔ ساز بھی خوب بجاتے تھے۔ 6 ربیع الآخر 1345ھ میں شیراز میں انتقال کیا۔ اور شیخ سعدیؒ کے مزار کے قریب دفن ہوئے۔

☆☆☆

جیمز ہولمین (1786۔1857) سیاح اور برطانوی نیوی میں افسر تھا۔ چوبیس سال کی عمر میں اس کی نظر جاتی رہی۔ وہ چالیس سال تک سیاحت کرتا رہا۔ وہ فرانس، اٹلی، جرمنی، سوئٹزرلینڈ، ہالینڈ، آسٹریا، افریقا، برازیل، فلسطین اور بحیرۂ روم کے اردگرد سب ملکوں میں گیا۔ اس نے سارے سفر اکیلے کیے اور متعدد سفرنامے لکھ کر شائع کرائے جبکہ کسی اور اندھے شخص نے سیاحت کو شغل کے طور پر اختیار نہیں کیا۔

☆☆☆

کینٹ کلرز امریکا کا نامور اور سرکردہ سائنس دان ہے اسے اندھا ماہرِ فلکیات بھی کہا جاتا ہے۔ وہ خلا میں زندگی پر تحقیق کرتا ہے۔ وہ NASA میں ملازم اور پیدائشی نابینا ہے۔ اس کی بیوی بچے کی ولادت کے لیے اسپتال میں داخل تھی کہ ائرکنڈیشن مشین بند ہو گئی۔ کینٹ نے تاروں کو ”دیکھنا“ شروع کیا کیونکہ ایک تار مشین سے الگ ہو گیا تھا۔ اس نے اندازے سے تار لگایا تو مشین چل پڑی۔ بچپن سے نابینا ہونے کی وجہ سے اس کے دیگر حواس نے بہتر نشوونما پائی ہے۔

مرسلہ: نوشین اختر، ملتان

اس مخصوص بھکاری کو جب نوٹ دے کر اسٹاپ کی طرف جانے لگی تو میں اس کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔

وہ کچھ گھبرا گئی تھی۔

''گھبرائیں نہیں، مجھے آپ سے صرف ایک بات پوچھنی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''صرف ایک منٹ لوں گا۔''

چونکہ میرا لہجہ بہت جذباتی تھا اور میں اپنے حلیے سے ہی معقول دکھائی دیتا تھا۔ اس لیے وہ رک گئی۔ ''جی فرمائیں۔'' اس نے سوال کیا۔

''میں دو تین دنوں سے دیکھ رہا ہوں کہ آپ ایک مخصوص بھکاری کو نوٹ دیتی ہیں، جبکہ دوسروں کو سکے دیتی ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ میں یہی معلوم کرنا چاہتا تھا۔ میرا تجسس دور کردیں۔''

''بس اتنی سی بات۔'' وہ مسکرادی۔ ''بات صرف اتنی ہے کہ ایک دن میں نے پہلی بار جب اس فقیر کو کچھ پیسے دیے تو اس نے کہا۔ بی بی بہت جلد تیری تقدیر بدلنے والی ہے۔ تیرے لیے بہت اچھا رشتہ آنے والا ہے۔ لیکن ہمیشہ نیلے رنگ کے لباس میں رہنا۔ یہ رنگ تیری تقدیر کے دروازے کھول دے گا۔''

''خدا کی پناہ، اس نے کمال کا نفسیاتی حربہ استعمال کیا ہے۔''

''ہاں، اس کے بعد سے میں اس کو روزانہ نوٹ دیتی ہوں اور ڈھیری دعائیں لیتی ہوں۔''

لڑکی تو چلی گئی۔ لیکن میں اس نابینا بھکاری کی ذہانت پر دنگ رہ گیا تھا۔

ان لوگوں نے یہ ثابت کردیا تھا کہ وہ آنکھوں والوں سے زیادہ بینا ہیں۔

میں اس کے بعد بھی ان بھکاریوں میں دلچسپی لیتا رہا تھا۔ کبھی کبھی خود بھی انہیں کچھ نہ کچھ دے دیا کرتا۔ یہ اندازہ ہوگیا تھا ان کے اخراجات نہ ہونے کے برابر ہیں۔

عام طور پر سخی قسم کے حضرات ہی انہیں کچھ کھلا دیا کرتے۔ یعنی اپنے خرچ سے وہ بہت ہی کم کھایا کرتے تھے۔ یہ دوپہر کی صورتِ حال تھی۔ رات کے کھانے کے لیے کیا کرتے ہوں گے۔ یہ مجھے معلوم نہیں ہوسکا تھا۔

ایک بار میں نے انہیں ایک سنیما ہال میں بھی دیکھا۔ کوئی پرانی فلم لگی ہوئی تھی اور یہ چاروں بھی فلم دیکھنے آئے ہوئے تھے۔ کتنی حیرت کی بات تھی۔ اس وقت میرے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ شاید یہ نابینا نہیں ہیں، بلکہ بنے ہوئے ہیں۔

اگر ایسا نہیں ہوتا تو پھر فلم کیسے دیکھ سکتے تھے۔

یہ بھی اتفاق تھا کہ ان کی بالکل پچھلی نشست پر مجھے سیٹ ملی تھی اور جب فلم شروع ہوئی تو میں ان کی باتیں سن کر حیران رہ گیا۔

وہ چاروں واقعی نابینا تھے۔ انہیں فلم کے مناظر دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ وہ صرف مکالمے سن رہے تھے اور ان سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

شاید ان کی سمجھ میں سب کچھ آرہا تھا۔ جس طرح ہم ریڈیو کے ڈرامے سنا کرتے تھے۔ اسی طرح وہ لوگ فلم کو سن رہے تھے۔ اسے دیکھ نہیں رہے تھے۔ یہ کمال کی بات تھی اور اس سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ اس وقت ان کی قوتِ سماعت ان کی قوتِ بصارت بن گئی ہے۔

وہ چاروں کردار آج بھی میرے دھیان میں ہیں اور میں انہیں یاد کرکے ہنسا کرتا ہوں۔ حیران ہوتا ہوں۔ انتہا تو اس وقت ہوئی جب ایک رات میں نے ان کے کوارٹر کے باہر رش لگا ہوا دیکھ لیا۔

وہ چاروں بھی تھے اور انہوں نے ایک آدمی کو پکڑ رکھا تھا۔ اور محلے والوں کو صورتِ حال بتا رہے تھے۔

میں بھی صورتِ حال معلوم کرنے کے لیے ان کے پاس چلا گیا۔

پتا چلا کہ انہوں نے جس بندے کو پکڑ رکھا تھا وہ چور ہے۔ انہیں نابینا سمجھ کر ان کے کوارٹر میں چوری کرنے گھس گیا تھا لیکن ان چاروں نے مل کر اسے پکڑ لیا۔

''یہ تو بتاؤ تم لوگوں کو کیسے پتا چلا کہ گھر میں کوئی چور گھس آیا ہے۔'' کسی نے پوچھا۔

''بہت آسانی سے۔ ہمیں ایک سانس کی آواز زیادہ محسوس ہوئی تھی۔'' ایک نے بتایا۔ ''کیونکہ ہم چار ہیں اور گھر میں چار ہی سانسیں ہوتی ہیں۔ ایک سانس فالتو تھی۔ اس لیے ہم چاروں نے مل کر اسے پکڑ لیا۔''

خدا کی پناہ! یہ تھی ان چاروں نابیناؤں کی بینائی۔ کمال کا سینس تھا۔ میں نے ایسی حس بیناؤں میں بھی نہیں دیکھی۔

یہ میری آنکھوں دیکھا واقعہ ہے اور اس واقعے نے ثابت کردیا ہے کہ نابینا ہی دراصل بینا ہوا کرتے ہیں۔

جلد باز

جناب معراج رسول

السلام علیکم!

میں بصارت سے محروم ہوں، بریل میتھڈ کے ذریعے تعلیم حاصل کی لیکن جب کمپیوٹر عام ہوا تو کمپوزنگ نے لکھنے لکھانے کا مسئلہ بھی حل کردیا۔ آپ کی خدمت میں ارسال کردہ یہ چند صفحات خود میں نے ٹائپ کیے ہیں جو میری زندگی کا حاصل ہیں۔ میری زندگی کی سب سے بڑی لیکن دلچسپ غلطی کی کتھا ہے۔ اگر آپ نے شائع کیا تو قارئین بھی انجوائے کریں گے۔

مونا

(کراچی)

سب گھر والے حیران تھے۔ امی ابا، بھائی اور بھابی، کیونکہ میں نے شادی کے اگلے دن گھر آنے کے بعد واپس جانے سے انکار کردیا۔ ظہیر مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ یہ ہمارا رواج تھا۔ شادی کے اگلے دن لڑکی میکے آتی تھی اور پھر یہیں سے تیار ہوکر ولیمے میں جاتی، وہاں سے اپنے شوہر کے ساتھ جاتی تھی۔ ظہیر اجنبی نہیں تھا ایک ہی علاقے میں ہم رہتے تھے۔ ظہیر کی منور بھائی سے دوستی تھی اور اسی وجہ سے اس کا رشتہ آیا تھا۔ جب رشتہ آیا تو سب ہی خوش تھے۔

خاص طور سے امی اللہ کا شکر ادا کرتے نہیں تھک رہی تھیں۔

ان دنوں وہ دن رات نفل پڑھتی تھیں۔جب انہوں نے ہزار نفل مکمل کر لیے تب گھر والوں کو پتا چلا کہ انہوں نے میرا رشتہ طے ہونے کے لیے ہزار نفل کی منت مانی ہوئی تھی۔شادی کے وقت بھی مجھ سمیت پورا گھر بہت خوش تھا۔سویرا بھابی جو ایک طرح سے میری سہیلی بھی تھیں ان سے امی نے پوری تسلی کرالی تھی کہ میں اس رشتے سے خوش ہوں اور اس کے بعد ہاں کی گئی تھی۔

ظہیر اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا۔اس نے این ای ڈی سے سول انجینئر کی ڈگری لی تھی اور ایک ملٹی نیشنل فرم میں اچھے عہدے پر جاب کر رہا تھا۔جب رشتے کی بات چل رہی تھی تو سویرا بھابی نے شرارت سے کہا۔"شکل صورت کا اچھا ہے، بجے گا تیرے ساتھ۔"

برسوں پہلے جب مجھ پر بہار آئی۔اندر اور باہر تبدیلیاں رونما ہوئیں۔دل اور دماغ میں عجیب سے ارمان جاگنے لگے اور جب میں نے اور لڑکیوں کی طرح کسی شہزادے کا خواب دیکھنا شروع کیا تب سے یہ خواب بس خواب چلا آرہا تھا۔جب ظہیر سے میری شادی ہوئی تو میں پچیس برس کی تھی اگرچہ دیکھنے میں بیس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔پھر وہ رات آئی جس کا ارمان ہر لڑکی کے دل میں ہوتا اور میرے لیے یہ رات میرے ارمانوں کی موت بن کر آئی تھی۔اگلی صبح میں واپس آئی تو سیدھی اپنے کمرے میں آئی اور اس وقت وہاں سے نکلی جب ظہیر ابا اور منور بھائی سے مل کر چلا گیا تھا۔میرے چہرے پر شادی کی صبح والی کوئی خوشی نہیں تھی بلکہ شاید سختی تھی۔امی اور بھابی کھٹک گئی تھیں۔ظہیر کی موجودگی میں تو وہ چپ رہیں لیکن اس کے جاتے ہی امی اور بھابی نے کمرے کا دروازہ بند کر کے مجھ پر سوالوں کی بوچھاڑ کردی تھی۔

"مونا کیا بات ہے تو اتنی خاموش کیوں ہے؟"

"کوئی بات ہوئی ہے؟"

"ظہیر نے کچھ کہا ہے؟"

"وہاں سب خیریت تو ہے؟"

ان تمام سوالوں کا میں نے ایک ہی جواب دیا۔"اب میں واپس نہیں جاؤں گی؟"

امی حواس باختہ ہوگئی تھیں۔"مونا.... یہ تو کیا.... کہہ رہی ہے۔"

سویرا بھابی بھی پریشان ہوگئیں۔"مونا ایسا کیوں کہہ رہی ہو۔کوئی بات ہوئی ہے تو ہمیں بتاؤ.... تمہارے بڑے ہیں جو ہر مسئلہ حل کر سکتے ہیں۔"

مگر میں نے چپ سادھ لی تھی۔پھر امی کو خیال آیا۔انہوں نے سویرا بھابی کو ایک طرف بلایا اور آہستہ سے کچھ کہہ کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔ان کے جانے کے بعد بھابی نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔"مونا سب ٹھیک رہا ناں.... میرا مطلب ہے تمہارے اور ظہیر کے ازدواجی تعلق میں تو کچھ پرابلم نہیں ہوئی۔"

مجھے شرم آئی تھی اور میں نے جلدی سے کہا۔"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

مگر بھابی کی تسلی نہیں ہوئی انہوں نے میاں بیوی کے تعلق کی تمام تر باریکیوں کے حوالے سے سوال کر کر کے اپنی تسلی نہیں کرلی تب تک وہ پوچھتی رہی تھیں۔آخر میں انہوں نے زچ ہو کر کہا۔"مونا پھر کیا بات ہے...... تو سوچ نہیں سکتی کہ امی کی کیا حالت ہوئی ہے تیری بات سن کر۔"

مجھے اندازہ تھا کہ امی کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔ہر اس ماں کی یہی حالت ہوتی جس کی بیٹی شادی کے اگلے دن گھر آئے اور پھر شوہر کے گھر جانے سے انکار کر دے۔مگر اس کے باوجود میں ٹس سے مس نہیں ہوئی تھی۔میں نے ایک لفظ منہ سے نہیں نکالا کہ میں کیوں واپس نہیں جارہی تھی۔میرا فیصلہ برقرار رہا تھا۔کچھ دیر میں ابا اور منور بھائی کو بھی پتا چل گیا۔انہوں نے براہِ راست مجھ سے کچھ نہیں کہا لیکن ظہیر کو بلا لیا تھا۔ظہیر یہ جان کر دم بہ خود رہ گیا تھا کہ میں نے اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا ہے۔وہ چلّا اٹھا تھا۔"کیوں.... ایسی کیا بات ہوئی ہے۔"

"یہی تو ہم بھی پریشان ہیں۔اس سے پوچھ پوچھ کر تھک گئے ہیں لیکن وہ منہ سے ایک لفظ نہیں پھوٹ رہی ہے۔" امی نے کہا۔"جبھی تم کو بلایا ہے۔"

"مونا کہاں ہے میں خود اس سے بات کرتا ہوں۔"

"ایک منٹ بیٹا۔" ابا نے کہا۔"تم اس سے ضرور بات کرو وہ تمہاری بیوی ہے۔لیکن پہلے میرے ایک سوال کا جواب دو۔کیا تمہارے درمیان کوئی بات ہوئی ہے جو مونا کے دل پر لگی ہو۔اس نے تم سے یا تم نے اس سے کچھ کہا ہے؟"

"خدا کی قسم انکل، میری اس سے ایسی کوئی بات نہیں ہوئی ہے۔اب سے چند لمحے پہلے تک میں خود کو دنیا کا خوش

قسمت ترین انسان سمجھ رہا تھا جسے مونا ملی ہے۔میری طرف سے کوئی ذرا سی بات بھی نہیں ہے میں نے نہ اس کے حوالے سے اور نہ آپ کے حوالے سے اس سے کوئی بات کی ہے۔"

امی ابا سے اجازت لے کر ظہیر میرے کمرے تک آیا۔اس نے دستک دی لیکن میں نے کوئی جواب نہیں دیا پھر اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو وہ اندر سے بند نکلا۔میں نے ظہیر کی آواز سنتے ہی دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔جب میں نے جواب نہیں دیا تو اس نے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔"مونا یہ کیا مذاق ہے دروازہ کھولو.... میری بات سنو...."

مگر میں خاموشی سے اپنے بستر میں دبکی رہی۔ظہیر کچھ دیر ضبط کرتا رہا پھر اس نے شور شروع کر دیا۔چیخنے چلّانے پر اتر آیا تھا۔بہ مشکل منور بھائی اسے وہاں سے لے گئے تھے۔پھر امی آگئیں انہوں نے دروازہ کھولنے کو کہا تو میں نے جواب دیا۔"جب تک ظہیر اس گھر میں ہے میں دروازہ نہیں کھولوں گی۔"

مجبوراً ابا اور منور بھائی نے ظہیر کو وہاں سے جانے پر آمادہ کیا۔اس کے جانے کے بعد میں نے دروازہ کھول دیا تھا۔اس کے بعد میں نے امی اور سویرا بھابی کے سوالوں کے جواب میں چپ سادھ لی تھی۔میں نے سوچ لیا تھا کہ اپنی زبان کبھی نہیں کھولوں گی۔امی اور بھابی ہلکان ہوئی جارہی تھیں۔اچانک بھابی نے امی سے کہا۔"میرا خیال ہے مینا کو بلوالیں وہی اس کی زبان کھلوا سکتی ہے۔"

یہ سن کر میں دہل گئی تھی۔کیونکہ میری زبان بندی کا تعلق مینا سے بھی تھا۔

☆☆☆

آج کل لڑکیوں کے رشتے مسئلہ بنتے جارہے ہیں کیونکہ معاشرے میں صبر و قناعت عنقا ہو گیا ہے اور لالچ و ہوس نے رواج کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ایسے میں غریب گھرانوں میں لڑکیاں بوجھ بن گئی ہیں۔لیکن میرے ساتھ یہ مسئلہ نہیں تھا۔ابا کاروبار کرتے تھے۔ان کی ریگل صدر میں بڑی سی الیکٹرانکس کی دکان تھی۔ابا زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے مگر کاروبار کے گر آتے تھے۔پھر منور بھائی تعلیم حاصل کر کے ان کے ساتھ دکان پر لگ گئے تو کاروبار اور اچھا چلنے لگا تھا۔صدر کے پاس ہی ایک متوسط آبادی میں ہمارا بہت اچھا بنا ہوا مکان تھا۔ابا چاہتے تو اس سے اچھی کسی

معروف نابینا افراد

ایران کا نامور شاعر رودکی پیدائشی نابینا تھا۔رودکی نے 13 لاکھ اشعار اور چھ مثنویاں لکھیں۔رباعی پہلی مرتبہ رودکی کے ہاں نظر آتی ہے۔

☆☆

اسکاٹ لینڈ کا شاعر تھامس بلیک لاک۔نابینا ہونے کے باوجود اس نے اعلیٰ پائے کی شاعری کی۔اس کی شاعری میں رنگوں اور پھولوں کا ذکر بہت ملتا ہے۔

☆☆

موسمیات کا سائنس دان ڈالٹن، اٹامک تھیوری کا موجد تھا۔وہ کلر بلائنڈ ہونے کی وجہ سے رنگوں میں تمیز کرنے سے محروم تھا۔گیس کے بارے میں اس کا نظریہ مشہور ہے۔

☆☆

وہ ساشی (جاپان) کا باشندہ تھا۔سات سال کی عمر میں بینائی کھو بیٹھا۔عمر کے بقیہ 94 سال اس نے پڑھانے اور تصنیف و تالیف میں گزارے۔اس نے چار لاکھ کتابوں کو اپنی یادداشت میں محفوظ کر رکھا تھا جو اس کی عمر بھر کی کاوش تھی۔اس نے (Vagakuso School) نامی ایک درس گاہ قائم کی جہاں وہ پڑھاتا رہا۔

☆☆

ہنگری کے بادشاہ کنگ بیلا ثانی نے ہنگری پر (1141-1131) دس سال حکمرانی کی۔اس کے چچا نے اسے اندھا کر دیا تھا تاکہ وہ بادشاہ نہ بن سکے۔

☆☆

نیل سلی ون نیویارک شہر کا واحد طالبعلم تھا جس نے Comprehensive Music میں نیویارک اسٹیٹ بورڈ میں سو فیصد نمبر حاصل کیے۔وہ نابینا تھا۔

مرسلہ: ناز نگہت، فیصل آباد

آبادی میں مکان بنا سکتے تھے لیکن انہیں اس جگہ سے پیار تھا۔ پاکستان بننے کے بعد ان کے ابو یہیں آ کر آباد ہوئے تھے۔ اس وقت یہ کچی آبادی تھی لیکن بعد میں لیز ہو گئی اور پانی، بجلی اور گیس کی سہولتیں بھی آ گئی تھیں۔ ہمارے گھر میں ہر طرح کی سہولت تھی۔ ابا ہمارے منہ سے نکلنے سے پہلے ہماری ہر خواہش پوری کر دیتے تھے۔ یعنی مالی تنگی نہیں تھی۔ اب بھی شادی میں کیا چیز تھی جو مجھے نہیں ملی تھی۔ فرنیچر سے لے کر کراکری اور ٹی وی سے لے کر اے سی تک جہیز میں دیا تھا۔ حد یہ کہ ابا نے آٹو میٹک جنریٹر تک جہیز میں دیا تھا۔ ظہیر کو بائیک اور سونے کی گھڑی سلامی میں دی تھی۔

لڑکیوں کی شادی میں ایک مسئلہ شکل و صورت بھی ہوتی ہے۔ تو میرے ساتھ یہ مسئلہ بھی نہیں، بچپن سے اچھی صورت پائی تھی۔ امی روز میری نظر اتارتی تھیں۔ بڑی ہوئی تو خوب صورتی میں جوانی کی دلکشی بھی شامل ہو گئی تھی۔ میرے اسکول اور پھر کالج کی سہیلیاں بتاتی تھیں کہ میں کس قدر خوب صورت ہوں۔ کالج میں تو لڑکیوں نے مجھے مس کالج کا لقب دے رکھا تھا۔ وہ کہتی تھیں کہ خوش نصیب ہوگا وہ شخص جو اس حسن و دلکشی کا مالک بنے گا۔ مجھے ان کی باتیں سن کر شرم آتی تھی لیکن اچھا بھی لگتا تھا۔ مگر جب اپنی کمی کا خیال آتا تو میں سہم جاتی تھی۔ کیا کوئی شخص اس کمی کے ساتھ مجھے قبول کرے گا۔ آج کل اچھی اچھی لڑکیاں گھر بیٹھی ہوئی ہیں۔ مجھ نابینا کو کون پوچھے گا؟

مجھے چار سال کی عمر میں میعادی بخار ہوا اور جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ ابا نے میرے علاج پر پانی کی طرح پیسا بہایا۔ جان بچ گئی لیکن کچھ عرصے بعد میری نظر کمزور ہونے لگی اور ایک سال کے اندر مجھے نظر آنا بند ہو گیا تھا۔ بخار کا اثر میری آنکھوں پر آیا تھا۔ ابا اور امی نے اس کے علاج کے لیے بھی بہت بھاگ دوڑ کی۔ ڈاکٹروں نے تو جواب دے دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ میری آپٹک نرو بیکار ہو گئی تھی اور اس کا دنیا میں کہیں علاج نہیں تھا لیکن جہاں جہاں سے امید ہوئی وہاں مجھے لے جایا گیا، ہر طریقہ علاج آزمایا گیا اور آخر میں ہار مان لی کیونکہ کسی بھی علاج سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔

میرے مقدر میں بس اتنی ہی دنیا تھی جو میں نے پانچ سال کی عمر تک دیکھ لی تھی۔ اس کے بعد اندھیرے آ گئے تھے۔ کم عمری کی وجہ سے میں شعوری طور پر بہت پریشان ہوئی تھی۔ روتی اور مچلتی تھی کہ مجھے دکھائی کیوں نہیں دے رہا ہے۔ مگر بینائی کی اہمیت کا صحیح اندازہ اس وقت ہوا جب امی ابا نے مجھے ایک عام نجی اسکول میں داخل کرا دیا جس کی تعلیم کا معیار بہت اچھا تھا لیکن ایک نابینا کو تعلیم دینے کا کوئی سسٹم نہیں تھا۔ اسکول کی پرنسپل امی کی واقف کار تھیں اس لیے داخلہ تو مل گیا مگر ان کی ٹیچرز کے لیے مجھے پڑھانا مسئلہ بن گیا تھا۔ ایک بچی جسے نظر ہی نہ آتا ہو اسے بھلا کس طرح پڑھایا جا سکتا تھا۔ آخر پرنسپل نے امی کو مشورہ دیا کہ مجھے نابینا بچوں کے لیے مخصوص اسکول میں داخل کرایا جائے اسی صورت میں، میں کچھ پڑھ اور سیکھ سکتی تھی۔ ابا نے بھی امی سے کہا کہ مجھے نابینا بچوں والے اسکول میں داخل کرایا جائے۔

یوں میں نزدیک ہی واقع ایک خصوصی بچوں کے اسکول میں داخل کر دی گئی۔ یہاں مجھے پڑھنے کا ماحول ملا اور جلد میرا دل یہاں لگ گیا تھا۔ کیونکہ یہاں سب بچے اور بچیاں میری طرح نابینا تھیں اور یہاں ٹیچرز ہمیں اس طرح پڑھاتی تھیں کہ کوئی مشکل پیش نہیں آتی تھی۔ سب سے پہلے ہمیں بریل سکھائی گئی تھی۔ اس کی مدد سے ہم نے پڑھنا اور پھر لکھنا سیکھا تھا۔ میں صبح وین سے اسکول جاتی تھی اور دوپہر میں یہی وین مجھے واپس گھر چھوڑ جاتی تھی۔ وین اسکول کی تھی۔ صبح سے دوپہر تک کا وقت اچھا گزرتا تھا لیکن اس کے بعد گھر آ کر مجھے بوریت ہوتی تھی۔ میں دیکھ نہیں سکتی تھی اس لیے کہیں باہر نہیں جا سکتی تھی۔ گھر میں ٹی وی تھا لیکن میں اسے دیکھ نہیں سکتی تھی۔ صرف سن لیتی تھی۔ البتہ آرام سے پورے گھر میں گھوم پھر لیتی تھی۔ امی نے پورا گھر اس طرح سے سیٹ کیا تھا کہ مجھے کوئی مشکل نہ ہو۔ راستے سیدھے اور سامان ہٹا کر رکھے تھے۔ پھر میں چھڑی لے کر گھومتی تھی اس لیے گھر کی حد تک مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آتی تھی۔ مگر گھر سے باہر مجھے مشکل ہوتی تھی۔ میں اکیلے نہیں جا سکتی تھی ہمیشہ امی کے ساتھ جاتی تھی۔

کراچی میں امی اور ابا کی طرف سے کچھ رشتے دار تھے جیسے ایک پھپھو ہیں، ایک ماموں ہیں لیکن وہ دور رہتے تھے اور ان سے مہینے میں ایک آدھ بار ملنا ہوتا تھا۔ محلے والوں سے اچھی جان پہچان اور سلام دعا تھی۔ ان کے ہاں اکثر آنا جانا رہتا تھا۔ ہمارے برابر والا گھر مینا کا تھا۔ مینا ماں باپ کی ایک ہی بیٹی تھی اور اسی لحاظ سے لاڈلی بھی تھی۔ خوب

صورت بھی تھی اور مغرور بھی اس لیے کسی کو لفٹ نہیں کراتی تھی۔ ظاہر ہے مجھے بھی نہیں کراتی تھی۔ پھر میں دیکھ نہیں سکتی تھی۔ البتہ اس کی امی سے میری امی کی اچھی سلام دعا تھی۔ کبھی امی ان کے ہاں جاتی تھیں اور کبھی وہ ہمارے ہاں آتی تھیں۔ جس گھر میں کھانے کی کوئی خاص چیز بنتی تو دوسرے کے ہاں ضرور بھیجی جاتی تھی۔

مینا کے گھر اور ہمارے گھر کی چھت آپس میں ملی ہوئی تھی۔ درمیان میں بس چند فٹ اونچی دیوار تھی۔ گرمیوں میں اکثر شام کے وقت میں اوپر چلی جاتی تھی۔ چاروں طرف بلند دیوار تھی اور زینے بھی مناسب اسٹیپ اور ریلنگ کے ساتھ تھے اس لیے امی کو خدشہ نہیں تھا کہ میں غلطی سے کہیں گر سکتی ہوں اسی لیے مجھے اکیلے اوپر جانے کی اجازت تھی۔ میں کھلی فضا میں جب گہرے سانس لیتی۔ اور اڑتے پرندوں کی آوازیں سنتی اور اپنے آس پاس کی دنیا کو محسوس کرتی تو میرے اندر کی تاریکی کم ہو جاتی تھی۔ ابا نے اینگل آئرن سے بنا ہوا ایک صوفہ نما جھولا لگوا دیا تھا۔ میں اس پر بیٹھ کر جھولتی تھی۔ ایک دن میں جھولے پر بیٹھی ہوئی تھی کہ اچانک مینا کی آواز آئی۔ ”کیا ہو رہا ہے؟“

میری بھی خواہش تھی کہ میری مینا سے دوستی ہو جائے لیکن جب وہ آگے نہیں آئی تو میں نے بھی خواہش چھوڑ دی۔ اس لیے اب اس نے پکارا تو مجھے ذرا بھی خوشی نہیں ہوئی تھی بلکہ اپنی تنہائی جس سے میں لطف اندوز ہو رہی تھی اس میں دخل مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔ میں نے بدمزگی سے کہا۔ ”میں دیکھ نہیں سکتی تم تو دیکھ رہی ہو پھر بھی پوچھ رہی ہو۔“

”اوہو.... بڑے مزاج ہیں۔“ اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”کیوں کیا صرف تمہارے مزاج ہو سکتے ہیں۔“ میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا تو وہ ذرا چپ ہو گئی پھر بدلے ہوئے لہجے میں بولی۔

”مجھ سے دوستی کرو گی؟“

”سوچوں گی۔“ میں نے مزے سے جھولتے ہوئے کہا۔ ”پر تم مجھ سے دوستی کیوں کرنا چاہتی ہو؟“

”تم مجھے اچھی لگتی ہو۔“

”تو کیا پہلے اچھی نہیں لگتی تھی؟“

”نہیں۔“ اس نے صاف گوئی سے کہا۔

”کیوں؟“

”پہلے تم بچی تھیں اور اب تم جوان ہو رہی ہو۔“

اس وقت میری عمر چودہ برس تھی۔ میں جانتی تھی کہ میں جوان ہو رہی تھی۔ امی نے میری حالت کے پیش نظر مجھے پہلے ہی سب کچھ سمجھا دیا تھا تاکہ میں ابا اور بھائی کے سامنے شرمندہ نہ ہوں اور اپنا خیال بھی رکھوں۔ اس وجہ سے مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوئی تھی۔ مینا مجھ سے دو سال بڑی تھی یعنی وہ جوان ہو چکی تھی۔ میں نے کہا۔ ”تو تم جوان لڑکی سے دوستی کرنا چاہتی ہو۔ ہمارے محلے میں اور بھی تو جوان لڑکیاں ہیں؟“

”بہت ہیں اور انہوں نے مجھ سے دوستی بھی کرنا چاہی لیکن مجھے ان میں سے کوئی اپنے معیار کی نہیں لگی۔“

”میں تمہارے معیار کی ہوں؟“

”ہاں تم میرے معیار کی ہو۔“ اس نے اعتراف کیا۔ ”لیکن میں بچی سے دوستی نہیں کر سکتی تھی اس لیے انتظار کر رہی تھی کہ تم ذرا بڑی ہو جاؤ۔“

مجھے اس کے منہ سے اچھا لگا تھا کہ وہ مجھے اپنے معیار کی اور دوستی کے قابل سمجھتی تھی۔ امی اس کی بہت تعریف کرتی تھیں۔ اس کی خوب صورتی کی، اس کی سلیقہ مندی اور ذہانت کو سراہتی تھیں۔ مینا نے اسی سال میٹرک کے پیپرز دیے تھے اور بورڈ میں اس کی پوزیشن آئی تھی۔ اخبار میں اس کی تصویر شائع ہوئی تھی۔ اس نے پُرامید لہجے میں کہا۔ ”سنو تم نے سوچ لیا ہوگا اور ہم نے اتنی ساری باتیں بھی کر لی ہیں تو ہماری دوستی ہو سکتی ہے نا؟“

مجھے اچھا نہیں لگا کہ میں بلاوجہ کا نخرہ دکھاتی یا اسے ڈی گریڈ کرتی اس لیے میں مان گئی۔ ”ٹھیک ہے آج سے ہم دوست ہیں۔“

وہ اتنی خوش ہوئی کہ دیوار پھلانگ کر ہماری چھت پر آ گئی۔ ان کی طرف دیوار چار فٹ اونچی تھی مگر ساتھ میں کرسیاں رکھی تھیں اس لیے وہ آرام سے آ گئی۔ میرے تعجب کرنے پر اس نے بتایا کہ وہ کیسے آئی۔ ”یہ تو بہت آسان ہے تم بھی میری چھت پر آ سکتی ہو۔“

”نہ بابا میں گر جاؤں گی، چوٹ لگے گی تو امی اوپر آنے کی اجازت بھی واپس لے لیں گی۔“

”کچھ نہیں ہوتا میں آنٹی سے پوچھ لوں گی۔ ویسے بھی اب ہماری دوستی ہو گئی ہے تو ہم ایک دوسرے کے گھر آ جا

سکتے ہیں۔"

میرا بھی یہی خیال تھا لیکن میں نے پہلے امی سے پوچھ لینا مناسب سمجھا۔ میں کوئی کام بھی جو میرے دائرۂ اختیار سے باہر کا ہو امی سے پوچھے بغیر نہیں کرتی تھی۔ امی سن کر ہی خوش ہو گئیں کہ میری بینا سے دوستی ہو گئی ہے۔ محلے میں لڑکیاں تو اور بھی تھیں مگر ان کا ذہنی معیار ایسا نہیں تھا کہ وہ ایک نابینا لڑکی سے دوستی کر کے اسے نبھاتیں۔ وہ تو مجھ پر ترس کھاتی تھیں اور اگر کبھی میں امی کے ساتھ ان کے گھر چلی بھی جاتی ان کا موضوع گفتگو میری معذوری ہوتی تھی۔ انداز جہالت آمیز ہوتا تھا جس سے مجھے شدید کوفت ہوتی تھی۔ اس لیے ایک دوبار کے بعد میں نے امی کے ساتھ محلے میں جانے سے انکار کر دیا تھا۔ امی کی کوشش اور خواہش تھی کہ عام لڑکیوں کی طرح میری بھی سہیلیاں ہوں اور میں ان کے ساتھ انجوائے کروں۔ اسکول میں کئی لڑکیاں میری دوست تھیں۔ مگر وہ سب بھی نابینا تھیں اور اپنے اپنے گھروں تک محدود رہتی تھیں۔ اتفاق سے کسی کا گھر ہمارے گھر کے پاس نہیں تھا۔ اس لیے جب میں نے ان کو بینا سے دوستی کا بتایا تو خوش ہو گئی تھیں۔ انہوں نے مجھے اجازت دے دی۔

"تم ضرور بینا کے گھر جایا کرو لیکن جب بھائی ہو تا کہ وہ آنے جانے میں تمہاری مدد کر سکے۔"

"میں خود چلی جاؤں گی۔" میں نے کہا۔

"نہیں گلی کی سطح ٹھیک نہیں ہے۔ تم آرام سے نہیں آ جا سکتی ہو۔"

جب بینا کو پتا چلا تو اس نے فوراً یہ ذمّے داری سنبھال لی۔ اس نے کہا۔ "آنٹی آپ بالکل فکر نہ کریں۔ اس گھر سے باہر اور میرے گھر میں مونا میری ذمّے داری ہے۔ میں اس کا پورا خیال رکھوں گی۔"

بینا سے دوستی میری زندگی میں خوشگوار ترین تبدیلی لے کر آئی تھی۔ اس وقت تک میں ترستی تھی کہ گھر سے باہر جاؤں۔ مارکیٹ میں خود جا کر شاپنگ کروں۔ میری دوست ہوں جن کے ساتھ گھوموں پھروں اور دوسری لڑکیوں کی طرح زندگی کا لطف اٹھاؤں۔ امی بے چاری اپنی حد تک میری خواہشیں پوری کرنے کی کوشش کرتی تھیں۔ مجھے باہر لے جاتی تھیں۔ شاپنگ کرنے بھی ان کے ساتھ جاتی تھی۔ مگر وہ بات نہیں آتی تھی جو دوستوں کے ساتھ تفریح میں آتی ہے اور بینا سے پہلے میری ایسی کوئی دوست نہیں تھی۔ اس سے دوستی ہوئی تو میں اس کے گھر جانے لگی۔ وہ کالج میں آ گئی تھی۔ جب میں اسکول سے آتی تو وہ کچھ دیر بعد کالج سے آ جاتی اور پھر وہ ہمارے ہاں آ جاتی۔ شام کو میں اس کے گھر جاتی تھی۔ مگر مغرب کے بعد کم ہی جاتی تھی کیونکہ ابا کو پسند نہیں تھا۔

میں بینا کو خشک مزاج اور نخرے والی لڑکی سمجھتی تھی لیکن جب اس سے دوستی ہوئی تو پتا چلا کہ وہ کتنی شوخ و چنچل اور ہنسی مذاق کرنے والی ہے۔ اس کے ساتھ باتوں میں وقت ایسا گزرتا تھا کہ پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ شروع میں تو ہمارے درمیان کچھ جھجک رہی لیکن جلد بے تکلفی اس درجے کو پہنچی کہ ہم ایک دوسرے سے ہر بات کر لیتے تھے۔ بینا کی باتوں میں صنفِ مخالف کا ذکر ہوتا تھا جب کہ میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ وہ مزے سے مجھے قصے سناتی کہ کس طرح اس نے کسی لڑکے سے بات کی۔ میں سن کر حیران بلکہ ششدر رہ جاتی تھی۔ اگرچہ وہ غلط نیت سے ایسا نہیں کرتی تھی لیکن میرے لیے تو یہ بھی بڑی بات تھی۔ ایک دن میں اس کے گھر میں اور اس کے کمرے میں تھی تو اس نے اچانک پوچھا۔ "مونا سچ سچ بتا لڑکے تجھے کیسے لگتے ہیں؟"

میں ہنسی۔ "میں نے آج تک کوئی لڑکا دیکھا ہو تو مجھے معلوم ہو کہ وہ کیسے ہوتے ہیں۔"

"دیکھا نہیں لیکن کسی لڑکے سے ملی تو ہو گی، بات تو کی ہو گی؟"

"نہیں۔" میں نے شرما کر کہا۔ "آج تک ایسا نہیں ہوا۔ اسکول میں کئی لڑکے پڑھتے ہیں مگر میری کسی سے بات نہیں ہوئی۔"

"تو تو بالکل بدھو ہے۔" اس نے مجھے چٹکی کاٹی۔ "اتنا ڈھیر سارا حسن کس کے لیے رکھا ہے۔"

"بدتمیز۔" میں نے اسے جوابی چٹکی کاٹی۔ "مجھ سے ایسی باتیں نہ کیا کر، مجھے اچھا نہیں لگتا ہے۔"

"واقعی؟" اس نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔ "چل تیری کسی لڑکے سے بات کراتی ہوں۔"

"بالکل نہیں۔" میں نے گھبرا کر کہا۔ "میں نے آج تک ایسا نہیں کیا، امی کو پتا چلا....."

"ان کو پتا نہیں چلے گا۔" اس نے اطمینان دلایا۔

اگلے روز وہ شام کو ہمارے گھر آئی۔ "آنٹی مجھے شاپنگ

کرنی ہے پاس ہی مارکیٹ جا رہی ہوں۔ مونا کو لے جاؤں؟"

امی فکرمند ہو گئیں۔ "بیٹا تم جانتی ہو کہ اس کے ساتھ مسئلہ ہے۔"

"آپ فکر نہ کریں یہ میری ذمّے داری ہے۔ دیکھیے گا کتنے آرام سے لے جاؤں گی۔ اسے بھی مزہ آئے گا۔" خود بھی میری یہی خواہش تھی۔ میں نے امی سے کہا۔ "پلیز امی جانے دیں۔ مجھے بھی کچھ چیزیں لینی ہیں۔"

امی نے اجازت دے دی لیکن جلدی آنے کو کہا۔ میں خوش ہو گئی تھی۔ مارکیٹ ہمارے علاقے میں تھی۔ گلی کے کونے سے رکشا لے کر ہم مارکیٹ آئے۔ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا لیکن بہت اچھا لگ رہا تھا۔ بینا میرا ہاتھ تھام کر رہنمائی کرتی کسی دکان میں لائی۔ یہ کپڑے کی دکان تھی۔ یہاں سے بینا نے سوٹ لینے تھے۔ جیسے ہی ہم دکان میں داخل ہوئے۔ دکان والے لڑکے نے پُرجوش انداز میں کہا۔ "آپ..... بہت دن بعد آئی ہیں۔"

"پیپر زدے رہی تھی پھر کالج میں داخلہ لینا تھا۔" بینا نے یوں کہا جیسے اس لڑکے (آواز سے وہ لڑکا لگ رہا تھا) سے اس کی پرانی جان پہچان ہو۔

"میں تو روز انتظار کرتا تھا کہ آج آپ آئیں گی۔" لڑکا بولا پھر اسے میرا خیال آیا۔ "یہ کون ہیں؟"

"میری فرینڈ..... مونا۔"

"بینا اور مونا۔" وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ "یہ بھی آپ کی طرح ہیں یا چپ رہتی ہیں۔"

"مونا یہ اسد ہے۔ میں اسی سے سوٹ لیتی ہوں۔ اچھا ڈسکاؤنٹ دیتا ہے۔"

"میں تو قیمت بھی نہ لوں لیکن آپ مانتی نہیں ہیں۔" اسد نے شکوہ کرنے کے انداز میں کہا۔

"نہیں آپ ڈسکاؤنٹ کر دیتے ہیں یہی کافی ہے۔"

"آپ کی دوست بھی آپ کی طرح خوب صورت ہیں۔" اسد نے بے تکلفی سے کہا۔ میں پہلے ہی گھبرا رہی تھی اس کے جملے پر میرے پسینے چھوٹ گئے تھے۔ اول تو میں نے آج تک کسی اجنبی لڑکے یا آدمی سے بات نہیں کی تھی اور نہ ہی کسی نے یوں میرے بارے میں بات کی تھی۔ میں نے بینا کا ہاتھ دبایا اور پھر چہرے کے تاثرات سے بھی وہ سمجھ گئی تھی۔ اس نے اسد سے کہا۔

"پلیز یہ ایسی باتوں کی عادی نہیں ہے۔"

یک چشم معروف شخصیت

- ○ لوئیس اینشے (اداکارہ/ماڈل گرل) ایک آنکھ نہیں تھی۔
- ○ اینز موینڈ نا قلے (برطانوی اداکار) ایک آنکھ نہیں تھی۔
- ○ ممی ڈیوز جینیز (گلوکار اداکار) بائیں آنکھ سے محروم تھے۔
- ○ نڈرے ڈی ٹوتھ (ڈائریکٹر و مشہور فلم ہاؤس آف ویکس) ایک آنکھ سے محروم تھے۔
- ○ ریکس ہیری سن (اداکار) ایک آنکھ نہ تھی۔
- کلاؤڈ رینز (اداکار) ایک آنکھ نہ تھی۔

مرسلہ: زاہد نقی، لاہور

"ٹھیک ہے نہیں کرتے ان کی تعریف لیکن یہ کوئی سوٹ تو لیں گی۔"

میں نے آنکھوں پر سیاہ سن گلاس لگا رکھا تھا۔ پھر میرے انداز سے بھی شاید اسد کو پتا نہیں چلا تھا کہ میں دیکھ نہیں سکتی ہوں، اس نے سوٹ نکال کر ڈھیر کرنا شروع کر دیے۔ "یہ دیکھیں یہ آپ پر بہت سجے گا۔"

بینا نے اسے روکا۔ "اتنی تیزی کیوں دکھا رہے ہو۔ مونا کے بارے میں، میں بتایا نہیں۔ یہ دیکھ نہیں سکتی ہے۔"

وہ دنگ رہ گیا تھا۔ "سچ سچ..... مجھے بالکل پتا نہیں چلا۔"

"اس کے لیے بھی سوٹ میں ہی لوں گی۔"

مجھے سوٹ نہیں لینا تھا لیکن بینا نے اصرار کیا۔ اس نے سوٹ مجھے گفٹ کیا۔ اسد قیمت نہیں لے رہا تھا لیکن بینا نے اسے زبردستی رقم دے دی۔ جب ہم دکان سے باہر آئے تو میں دم بہ خود تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کسی لڑکے سے اس طرح بے تکلف ہو کر بات کرنا۔ یہاں بات بینا کر رہی تھی اور پسینے مجھے آ رہے تھے۔ ایک جوس اسٹال پر جوس پیتے ہوئے میں نے اپنی سانس بحال کرتے ہوئے سرگوشی میں بینا سے کہا۔ "اللہ..... تم کیسے اس سے بات کر رہی تھیں۔"

"پاگل لڑکوں سے ایسے ہی بات کی جاتی ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "ان سے بات کرو لیکن ان کو ان کی حد میں رکھو۔"

"میری بھی ہمت نہ ہو۔"

"فکر نہ کرو میرے ساتھ رہو گی تو ہمت بھی کر لو گی۔"

واپس آنے کے بعد میں نے مینا سے کہا۔ "سنو یہ اچھی بات نہیں ہے ہمارے گھر والے ہم پر اعتماد کر کے ہمیں باہر جانے دیتے ہیں۔"

"ہاں تو ہم کون سا ان کے اعتماد کو دھوکا دے رہے ہیں۔" وہ بے پروائی سے بولی۔ "بس ذرا انجوائے منٹ ہوتی ہے۔ بات کر لیتے ہیں۔"

اس کے بعد میں اکثر مینا کے ساتھ مارکیٹوں میں جانے لگی۔ صرف اس کپڑے والے سے ہی نہیں بلکہ مینا جہاں جہاں دکانوں پر جاتی تھی وہاں وہ لڑکوں سے اسی طرح بے تکلفی سے بات کرتی تھی۔ وہ صرف ان دکانوں پر جاتی تھی جہاں نوجوان اور اکیلے لڑکے ہوتے تھے اس طرح اسے ان سے بات کرنے کا موقع ملتا تھا۔ یہ اس کی تفریح تھی۔ اس کی وجہ سے مجھے بھی حوصلہ ہوا تھا۔ کیونکہ گفتگو میں کوئی نازیبا بات نہیں ہوتی تھی۔ لڑکے کبھی ہلکی پھلکی تعریف کر دیتے تھے۔ اپنی تعریف کسے بری لگتی ہے۔ اگر کوئی حد سے بڑھنے کی کوشش کرتا تھا تو مینا اسے ٹھیک کر دیتی تھی۔ وہ اس چیز کا بہت خیال رکھتی تھی، ایک تو کسی لڑکے کو ایک حد سے زیادہ بے تکلف ہونے نہیں دیتی تھی دوسرے وہ کسی سے کچھ لیتی نہیں تھی۔ چیزوں کی قیمت میں رعایت قبول کر لیتی تھی لیکن کبھی کسی سے مفت میں کوئی چیز نہیں لی۔ اس کا کہنا تھا۔

"اگر میں ان سے تحفے لوں گی تو مجھے کسی اور طرح سے اس کی ادائیگی کرنا پڑے گی۔ پھر یہ مطالبات پر اتر آئیں گے۔"

میں مینا کے ساتھ گھومتی، ہم باہر کھاتے پیتے اور پارکوں میں جاتے تھے۔ میرے لیے یہ سب بہت زیادہ تھا۔ پندرہ سال کی عمر تک میں نے ایسی تفریح بہت کم کی تھی۔ اس لیے میں اس کی ایسی حرکتیں بھی برداشت کر لیتی تھی جو اصل میں مجھے اچھی نہیں لگتی تھیں۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ شروع میں اچھی نہیں لگتی تھیں اور بعد میں، میں ان کی عادی ہوتی چلی گئی تھی۔ میں نے میٹرک کا امتحان دیا تو مینا کے اصرار پر امی اور ابا نے مجھے اسی کے کالج میں داخلے کی اجازت دے دی۔ وہ مجھ سے ایک سال آگے تھی۔ کالج اچھے معیار کا تھا اور کیونکہ میں نابینا تھی اس لیے مجھے کچھ چیزوں میں استثنا دے دیا گیا تھا۔ میں لیکچر ریکارڈ کر لیتی تھی۔ اسی طرح ٹیسٹ اور پیپرز میں بول کر کسی سے لکھواتی۔ ٹیسٹ میں مسئلہ نہیں تھا۔ مینا کو لکھنے کی اجازت مل جاتی تھی حالانکہ وہ مجھ سے ایک کلاس آگے تھی لیکن اس کے مضامین مختلف تھے۔ البتہ سالانہ امتحانات میں مجھے کسی ایسی لڑکی کو ساتھ لے جانا پڑتا تھا جو مجھ سے کم پڑھی ہوئی ہو۔ یا پیچھے کی کلاسز میں ہو۔ کسی قدر مشکل سے یہ مرحلہ بھی حل ہو گیا تھا۔

مینا کی وجہ سے مجھے آسانی ہو گئی تھی۔ ہم وین میں جاتے تھے اور پھر کالج میں بھی تقریباً ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ صرف دو مضامین الگ تھے تو کبھی وہ کلاس چھوڑ دیتی اور کبھی میں چھوڑ دیتی یوں ہمارا تقریباً سارا ہی وقت ایک ساتھ گزرتا تھا۔ مینا کے ہونے کی وجہ سے ایک سہولت یہ بھی تھی کہ کبھی وین نہ آتی تو وہ مجھے آرام سے بس یا رکشے میں لے جاتی یا لے آتی تھی۔ امی ابا کو اس کی فکر نہیں تھی کہ اگر وین کا مسئلہ ہوا تو میں کیسے گھر آؤں گی۔ پھر بھی ابا نے مجھے موبائل دلا دیا۔ آج سے نو سال پہلے موبائل آ گیا تھا لیکن اتنا عام نہیں تھا۔ مینا کو موبائل اچھا لگتا تھا۔ کبھی کبھی وہ مجھ سے موبائل لے کر دیکھتی تھی۔ اسے بھی شوق تھا لیکن اس کے ماں باپ لڑکیوں کو موبائل دلانے کے قائل نہیں تھے۔ اس لیے مینا کو موبائل کے لیے مزید دو سال انتظار کرنا پڑا تھا۔

کئی بار ایسا ہوا کہ میں گھر میں ہوتی تو مینا مجھ سے موبائل لے جاتی تھی اور پھر واپس کر جاتی۔ وہ میری سم استعمال نہیں کرتی تھی۔ اس نے اپنی سم لے لی تھی اور یہ کام اپنے ماں باپ سے چھپ کر کیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ صرف تفریح کے لیے سم استعمال کرتی ہے۔ اس کا کوئی غلط مقصد نہیں ہوتا ہے۔ کیونکہ میں نے آج تک اس میں کوئی غلط بات نہیں دیکھی تھی۔ دکان والے لڑکوں سے بے تکلفی بھی ایک حد میں تھی۔ اس لیے مجھے اس کی بات پر اعتماد ہوتا تھا۔ ایک دو بار امی نے اسے موبائل لے جاتے دیکھ لیا تھا تو انہوں نے مجھ سے پوچھا تو میں نے جواب دیا۔ "اسے اپنی کسی کزن سے بات کرنی ہوتی ہے۔"

"تو فون پر کرے۔" امی نے کہا۔ مینا کے گھر میں پی ٹی سی ایل لگا ہوا تھا۔

"ان کے ہاں شاید پی ٹی سی ایل نہیں ہے موبائل سے کال سستی پڑتی ہے۔"

امی کو اعتراض تھا مگر جلد مینا نے اپنا موبائل لے لیا یوں مسئلہ ہی ختم ہو گیا۔ جب اس نے موبائل لیا تو ایک دن

میں اس کے گھر گئی۔ اتنے عرصے میں آ جا کر مجھے آئیڈیا ہو گیا تھا میں خود چلی جاتی تھی اور اس کے گھر میں بھی آسانی سے گھومتی پھرتی تھی۔ میں نے مینا کی امی سے پوچھا۔ "آنٹی، مینا کہاں ہے؟"

"اپنے کمرے میں ہے آج کل وہیں گھسی رہتی ہے۔" وہ بولیں۔

مجھے مینا کی آواز سنائی دی، وہ کسی سے بات کر رہی تھی۔ "آنٹی کیا کوئی آیا ہے؟"

"نہیں تو بس میں اور مینا ہیں۔"

تو مینا کس سے بات کر رہی تھی، میں نے آنٹی سے نہیں کہا اور مینا کے کمرے تک آئی۔ دستک پر اس کی آواز رک گئی پھر اس نے دبے لہجے میں کہا۔ "میں تم سے بعد میں بات کروں گی۔"

دوسرے نابینا افراد کی طرح میری سماعت بہت تیز تھی اور میں بالکل ہلکی سی اور دور کی آواز بھی سن لیتی تھی۔ لیکن مینا اور دوسرے لوگ سمجھتے تھے کہ میری سماعت عام انسانوں جیسی ہے۔ اس نے دروازہ کھولا تو میں نے انجان بن کر پوچھا۔ "خیریت دروازہ بند کر کے کیوں بیٹھی تھیں؟"

"وہ چینج کر رہی تھی۔" اس نے صفائی سے جھوٹ بولا حالانکہ میں اسے بات کرتے سن چکی تھی، وہ کسی سے موبائل پر بات کر رہی تھی۔

"کیا ہو رہا ہے، میرے پاس کم آتی ہو اور آنٹی کہہ رہی تھیں آج کل ہر وقت کمرے میں گھسی رہتی ہو۔"

"امی تو بس میرے پیچھے پڑی رہتی ہیں۔" اس نے تیز لہجے میں کہا۔ "ان کا بس چلے تو صبح سے شام تک گھر کے کاموں میں لگا کر رکھیں۔"

"اب ایسا بھی نہیں ہے صفائی اور کپڑے دھونے کے لیے ماسی آتی ہے اور کھانا آنٹی بناتی ہیں۔" میں نے کہا۔ "مینا ٹھیک سے بتاؤ تم کس چکر میں ہو؟"

"کیسا چکر؟"

"وہی جس سے تم موبائل پر بات کر رہی تھیں اور دستک کی آواز سن کر تم نے اسے کہا تھا کہ تم بعد میں بات کرو گی۔ تم کپڑے نہیں بدل رہی تھیں دروازہ اندر سے بند کر کے۔"

"تم.... نے سن لیا تھا؟" وہ مجبوراً بولی۔

"جبھی تو پوچھ رہی ہوں اس طرح چھپ کر کس سے بات کر رہی تھیں؟"

"مونا تو کسی سے کہنا مت۔" مینا اپنی فطرت کے خلاف منت پر اتر آئی۔ "میری ایک لڑکے سے دوستی ہو گئی ہے۔"

"صرف دوستی؟" میں نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

"نہیں، میں اسے پسند کرنے لگی ہوں۔" مینا نے اعتراف کیا۔ "وہ بھی مجھے پسند کرتا ہے۔"

"تیری اس سے بات کیسے ہوئی؟" مجھے تجسس ہونے لگا تھا۔

"بس ایک دن ایسے ہی موبائل پر کال آئی میں نے ریسیو کی تو دوسری طرف وہ تھا مجھ سے بات کرنے کو کہا۔ میرا موڈ بھی ہو رہا تھا میں بات کرنے لگی۔ بس اس طرح سے دوستی شروع ہوئی۔ رفتہ رفتہ بات محبت تک آ گئی۔"

"تو اسے جانتی ہے؟"

"ہاں اسی علاقے میں رہتا ہے۔" مینا نے کہا۔

"نام کیا ہے؟"

"نام تو اس نے نہیں بتایا۔"

میں حیران ہوئی۔ "یہ کیسی محبت ہے کہ اس نے نام بھی نہیں بتایا ہے؟"

"پتا نہیں مجھے خود سمجھ نہیں آتا کہ میں کیسے اسے پسند کرنے لگی ہوں۔ وہ میرا موبائل نمبر ہی نہیں، میرا نام اور گھر کا پتا بھی جانتا ہے، مجھے دیکھا ہوا ہے۔"

"اور تو اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی؟"

"نہیں، بس ایک موبائل نمبر ہے اور اس کی آواز ہے۔" مینا نے بے بسی سے کہا۔ "مونا میں کیا کروں، میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے سامنے بے بس ہو گئی۔ اس کی آواز میں کوئی جادو ہے۔ کئی بار مجھے خیال آیا کہ اب میں اس سے بات نہیں کروں گی اس سے کہوں گی کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے تو اپنے ماں باپ کو میرے گھر بھیجے مگر نہ جانے کیا ہے جب اس کی کال آتی ہے میں بے ساختہ ریسیو کر لیتی ہوں اور جب اس سے بات کرتی ہوں تو ساری دنیا بھول جاتی ہوں مجھے بس وہی یاد رہتا ہے۔"

"اللہ تیرے حال پر رحم کرے۔ لیکن مینا یہ سوچا اگر آنٹی یا انکل کو پتا چلا تو ان کا کیا ردِعمل ہو گا؟"

مینا نے جھرجھری لی۔ "ابو تو اس معاملے میں بہت سخت ہیں، وہ مجھے موبائل بھی نہیں دلا رہے تھے میں نے کتنا رو دھو کر لیا تھا۔"

"ٹھیک نہیں دلا رہے تھے، مینا مجھے تم سے ایسی توقع نہیں تھی میں تمہیں بہت مضبوط لڑکی سمجھتی تھی۔"

"میں مضبوط ہوں لیکن نہ جانے مجھے اس وقت کیا ہو جاتا ہے جب میں اس سے فون پر بات کرتی ہوں۔"

"کیا ہو جاتا ہے؟ میں نہیں سمجھتی کہ کوئی لڑکا کسی لڑکی کو اس حد تک اپنے قابو میں کر سکتا ہے جب کہ لڑکی اسے جانتی بھی نہ ہو۔"

"شاید تجھے میری بات کا یقین نہیں آرہا ہے، اچھا ایسا کر اب اس کی کال آئی تو میں تجھے سناؤں گی پھر تو دیکھنا وہ الفاظ سے کیسے جادو کرتا ہے۔"

میں گھبرا گئی۔ "نہ بابا وہ نہ جانے تجھ سے کیا ڈائیلاگ بولے اور میں سنوں۔"

"وہ کوئی ایسی بات نہیں کرتا ہے۔ بے شک محبت کے جملے کہتا ہے لیکن یقین کرو اس کے انداز یا الفاظ میں ہلکا پن نہیں ہوتا ہے۔" مینا نے اصرار کیا۔ "اچھا ایسا کرتی ہوں میں اس کی کال ریکارڈ کرلوں گی پھر تو سننا۔"

"کیسے ریکارڈ کرلوگی؟"

"تیرے نئے موبائل میں ریکارڈنگ سسٹم ہے نا۔"

ابا نے مجھے نیا موبائل دلایا تھا جس میں ایف ایم ریڈیو اور ریکارڈنگ کا سسٹم بھی تھا۔ "ہاں اس میں ہے۔"

"بس تو اس کی کال آنے والی ہوگی تو میں تجھ سے موبائل لے لوں گی۔"

ان دنوں مینا بی اے فائنل اور میں بی اے پارٹ ون کے پیپرز کی تیاری کر رہی تھی۔ پیپرز میں کچھ ہی دن باقی رہ گئے تھے اور کالج بند ہوگئے تھے۔ ہم گھر میں تیاری کر رہے تھے۔ میرے ساتھ میری کزن مدد دینے کے لیے جاتی۔ ایک دن اس نے موبائل مانگ لیا۔ میں مان گئی لیکن میں نے اسے خبردار کر دیا کہ موبائل امی سے چھپ کر لے جائے ورنہ وہ دیکھ لیں گی تو مجھ سے دس سوال کریں گی اور مجھے جھوٹ بولنا پڑے گا۔ اس نے کہا۔ "ٹھیک ہے، میں خیال رکھوں گی۔"

دو دن بعد وہ صبح کے وقت عجلت میں آئی اور مجھ سے موبائل لے کر چلی گئی۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ واپس آئی اور اس نے مجھے سرگوشی میں بتایا۔ "میں نے ریکارڈنگ کر لی ہے تو موقع دیکھ کر سن لینا اور پھر اسے ڈیلیٹ کر دینا۔"

"مجھے ڈیلیٹ کرنا نہیں آتا ہے تم آکر کر دینا۔"

نابینا ہونے کی وجہ سے میں اپنے بہت اچھی قسم کے موبائل کے بہت سارے فیچرز استعمال نہیں کر سکتی تھی۔ مینا کے جانے کے بعد میں نے امی کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھایا۔ پھر امی آرام کرنے چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد میں کمرے میں آئی اور ہیڈ فون لگا کر ریکارڈنگ سننے لگی۔ مجھے لڑکے کی آواز سن کر مینا کی بات درست لگی تھی۔

وہ بہت ہی خوب صورت آواز اور لہجے کا مالک تھا۔ ساتھ ہی مجھے لگا جیسے میں نے یہ آواز اور لہجہ سنا ہوا ہو۔ وہ دھیمے اور مخصوص لہجے میں مینا سے ایسی باتیں کر رہا تھا جو کسی بھی لڑکی کا دل اپنی مٹھی میں لے سکتی ہیں۔ میں سن رہی تھی اور جیسے اس کے سحر میں ڈوبتی جا رہی تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھا اسے لڑکیوں کو رجھانا آتا تھا اور خاص بات یہ تھی کہ اس نے ایک بار بھی مینا سے کوئی نازیبا جملہ یا لفظ نہیں کہا تھا سوائے آخری الفاظ کے جب اس نے بہت جذبات میں ڈوبے لہجے میں کہا۔ "خدا حافظ.....میری جان۔"

اس نے جس طرح میری جان کہا تھا ایسا لگا جیسے ان دو الفاظ میں اپنی ساری جان کھینچ کر شامل کر دی ہو۔ یہ دو الفاظ اور اس کا لہجہ میرے ذہن میں نقش ہو کر رہ گیا تھا۔ ریکارڈنگ سن کر میں نے دل میں اعتراف کیا کہ اگر یہ باتیں وہ مجھ سے کرتا تو میں یہ جانے بغیر کہ وہ کون ہے اس کی دیوانی ہو جاتی اور پھر میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے مجھ سے نہیں کہا تھا۔ مینا جس طرح اس کے سحر میں آگئی تھی مجھے اس کہانی کا انجام اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ مینا کے ابو واقعی سخت آدمی تھے۔ اگر انہیں معلوم ہو جاتا کہ مینا کسی لڑکے سے یوں بات کرتی ہے اور اسے پسند کرتی ہے تو ان کا ردِعمل پتا نہیں کیا ہوتا لیکن وہ مینا پر پابندیاں ضرور لگا دیتے۔ شام کو مینا آئی اور اس نے میرے موبائل سے ریکارڈنگ صاف کر کے پوچھا۔ "سچ بتا کیسا لگا؟"

"تو ٹھیک کہہ رہی تھی۔" میں نے اعتراف کیا۔ "میں نے آج تک کسی لڑکے یا مرد کو اس لہجے میں بولتے نہیں دیکھا۔"

"ہائے، اسی چیز نے تو پاگل کر دیا ہے مجھے۔" اس نے ٹھنڈی سانس لی۔

"لیکن مینا یہ اچھی بات نہیں ہے تم اسے بالکل نہیں جانتی ہو، اب فرض کرو کہ وہ تمہیں بے وقوف بنا کر اچانک غائب ہو جاتا ہے تو تم کیا کرو گی۔ کیا تم تباہ نہیں ہو جاؤ گی۔"

مینا نے شاید ایسا سوچا نہیں تھا۔ وہ جذباتی طور پر اس سے اتنی وابستہ ہوگئی تھی کہ وہ غائب ہوتا تو مینا شاید جیتے جی مر جاتی۔ اس نے لرز کر کہا۔ "پلیز ایسا مت کہو، میں مر جاؤں گی۔"

"مینا مرتا کوئی نہیں ہے لیکن پھر جیتا بھی نہیں رہتا ہے۔ اس لیے اب تم اس سے دوٹوک بات کرو۔"

"کیا بات کروں؟"

"یہی کہ وہ اپنے گھر والوں کو بھیجے اور اپنے بارے میں بتائے اس طرح کی محبت کوئی نہیں کرتا ہے۔"

"اچھا میں اس سے بات کروں گی۔"

میرے اصرار پر مینا نے اس سے بات کی لیکن وہ اسے ٹال رہا تھا۔ پھر مینا نے دوٹوک بات کی تو اچانک ہی اس کی کالز آنا بند ہوگئیں۔ اس کا نمبر بھی بند جا رہا تھا۔ اس زمانے میں نمبر کسی شناختی کارروائی کے بغیر لیا جا سکتا تھا اس لیے نمبر کے بارے میں بھی نہیں معلوم کیا جا سکتا تھا کہ یہ کس کا تھا۔ مینا نے کوشش کی، اس کمپنی کی فرنچائز بھی گئی جس کی سم تھی مگر وہاں سے بھی اسے کچھ معلوم نہیں ہوا تھا۔ ان چند دنوں میں مینا کا برا حال ہوگیا تھا۔ میں دیکھ نہیں سکتی تھی لیکن میری اور اس کی امی نے بتایا کہ مینا کی صحت اچانک گر گئی تھی۔ آنکھوں کے گرد حلقے آگئے تھے اور ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی ہرا بھرا باغ اجڑ گیا ہو۔ مینا کی امی سخت پریشان تھیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔ "مونا اس سے پوچھ کیا بات ہے۔ ایسی کیوں ہو رہی ہے۔" وہ کہتے ہوئے روہانسی ہو گئیں۔ "ہماری تو ایک ہی اولاد ہے۔"

"آنٹی اس نے کچھ بتایا نہیں؟" میں نے انجان بن کر کہا۔

"کہاں بیٹا، میں پوچھ پوچھ کر تھک چکی ہوں لیکن اس کے منہ سے ایک لفظ نہیں نکلا۔ بس یہی کہتی ہے کہ اسے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔"

"میں پوچھتی ہوں آنٹی۔"

مینا اپنے کمرے میں تھی۔ میں اس کے پاس آئی تو وہ میرے گلے لگ کر رو دی تھی۔ "مونا تو نے ایسا کیوں کہا تھا۔ دیکھ وہ سچ مچ مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔"

"مینا صبر کر، میں نے کہا تھا نا کہ وہ فراڈ ہو سکتا ہے ورنہ تو خود سوچ کہ کون اپنے بارے میں اس طرح چھپاتا ہے۔"

"پر میں کیا کروں میں تو اجڑ گئی۔" وہ شدت سے رو دی تھی۔

"مینا ہوش کر۔" میں نے اسے جھنجوڑا۔ "تیرے ماں باپ کو کچھ نہیں پتا ہے لیکن تیری حالت ایسی رہی تو جلد ان کو پتا چل جائے گا۔ خود کو سنبھال جو ہونا تھا وہ ہو گیا ہے۔ اگر تو اجڑی ہے تو اسے اپنے تک رکھ اپنے ماں باپ کو کیوں دکھی

معروف نابینا شخصیت

ڈیوڈ بلاکٹ (پیدائش 1967ء) برٹش کیبنٹ منسٹر

- سڈنی بیڈفورڈ (1960ء-1906ء) دس ماہ کی عمر سے نابینا تھے۔ 52 سال کی عمر میں نیا قرنیا لگا کر روشنی پالی۔
- جیسیکا کولاین (گلوکارہ) پیدائشی نابینا۔
- جوز فیلین (پیدائش 1945ء) پیدائشی نابینا۔
- لیمون جیفرسن (1929ء-1893ء) معروف موسیقار گلوکار پیدائشی نابینا۔
- ویلی میکٹیل (1959ء-1901ء) معروف موسیقار۔
- جارج شیرنگ (1919) جاز بجانے والا۔
- لیلک کمپلٹن ...... معروف جاز بجانے والا۔
- فرنگی آرمسٹرونگ، لوک گیت کا گلوکار۔
- ٹیلی آسٹن (1947ء-1873ء) پیدائشی نابینا تھے مگر آسٹریلیا میں معذوروں کی 1895ء میں انجمن بنا کر بہت خدمت کی۔
- جوہن سیبٹین بچ (1750ء-1685ء) ابتدائی زندگی میں نابینا ہو گئے تھے۔
- لیونہارڈ ایولر (1783-1707ء) ریاضی دان پیدائشی نابینا تھے۔
- ایلانغر کیرالڈ (1996ء-1917ء) جاز سنگر۔
- ڈبلیوسی ہنڈی (1873-1958) موسیقار، درمیانی عمر میں نابینا ہو گئے۔
- آئزک دی بلائنڈ (1160-1235) فرنچ سیاست دان، پیدائشی نابینا۔
- جیمز جوئز (1882-1941) معروف مصنف۔
- رابنسن، رولینڈ کرک (1935-1977) معروف موسیقار، ایک ساتھ کئی جاز بجانے کے ماہر۔

مرسلہ: محمد ایاز راہی، مانسہرہ

کرتی ہے۔"

"میں بھی ایسا نہیں چاہتی لیکن کیا کروں، مجھے لگ رہا ہے میرا دم گھٹ جائے گا۔"

"مینا تجھے صبر کرنا پڑے گا۔"

میرے سمجھانے بجھانے اور پھر خود مینا کے حوصلہ کرنے سے اس کی حالت رفتہ رفتہ بہتر ہوتی چلی گئی۔ اس کی امی ابو نے سکون کا سانس لیا تھا۔ پھر پیپرز شروع ہو گئے اور اس وجہ سے بھی اس کا دھیان بٹ گیا تھا۔ پیپرز کے بعد اس کا کالج ختم ہو گیا تھا۔ پہلے اس کا ارادہ یونیورسٹی میں داخلے کا تھا لیکن اس حادثے کے بعد اس نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ "اب میرا پڑھنے یا کچھ کرنے کو دل نہیں چاہتا ہے۔"

"میرا تو خیال ہے تمہیں آگے پڑھنا چاہیے اس طرح ذہن بٹ جائے گا۔"

پہلے وہ نہیں مان رہی تھی لیکن میرے اصرار پر اس نے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ کالج کا آخری سال میں نے اکیلے ہی پڑھا تھا اور مجھے مینا کے بغیر کچھ دقت ہوئی تھی۔ دل بھی نہیں لگا تھا مگر جیسے تیسے یہ ایک سال گزر ہی گیا تھا۔ بی اے کے بعد میں گھر بیٹھ گئی۔ مینا یونیورسٹی سے آتی تو اس سے ملاقات ہوتی تھی۔ مگر اب وہ پہلے کی طرح شوخ و چنچل اور زندہ دل نہیں رہی تھی۔ شاپنگ کے لیے لڑکوں والی شاپس پر جانا چھوڑ دیا تھا۔ بلکہ باہر بھی کم جاتی تھی۔ اس نے خود کو سنبھال لیا تھا لیکن مجھے لگتا تھا کہ اس کے اندر کی تکلیف گئی نہیں تھی۔ اس کی امی کی خواہش تھی کہ اس کی شادی کر دیں اس کے کئی رشتے بھی تھے مگر وہ نہیں مان رہی تھی، اس کا کہنا تھا کہ کم سے کم ماسٹر کے بعد اس کی شادی کا سوچا جائے۔ ادھر میری امی میری شادی کے لیے ہلکان ہو رہی تھیں۔

منور بھائی مجھ سے چار سال بڑے تھے۔ میں نے امی سے کہا کہ ان کی شادی کر دیں۔ پہلے تو امی نہیں مان رہی تھیں لیکن پھر میں نے زور دیا تو مان گئیں۔ سویرا بھابی امی کی پسند تھیں جو شادی کے وقت بھائی کی اور شادی کے بعد سارے گھر کی پسند بن گئی تھیں۔ انہوں نے اپنے اخلاق، اطوار اور طریقے سلیقے سے سب کا دل جیت لیا تھا۔ مجھ سے ان کی سہیلیوں جیسی دوستی ہو گئی تھی۔ منور بھائی بہت خوش تھے۔ انہوں نے سارا کاروبار سنبھال لیا تھا اور ابا بس نگرانی کرتے تھے۔ لیکن وہ اتنے سعادت مند تھے کہ ایک ایک روپے کا حساب ابا کو دیتے تھے اور ان کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کرتے تھے حالانکہ ابا نے سب ان پر چھوڑ رکھا تھا۔

کچھ عرصے بعد مینا نے ماسٹر کر لیا تو اس کی امی نے ایک اچھے رشتے پر ہاں کر دی۔ مینا راضی نہیں تھی لیکن ماں باپ کی خاطر راضی ہو گئی۔ میری شادی سے ایک سال پہلے اس کی شادی ہو گئی۔ میرے لیے کوئی رشتہ ہی نہیں آ رہا تھا اور جو آئے وہ صاف لالچی لگ رہے تھے اس لیے ابا نے خود انکار کر دیا۔ پھر ظہیر کا رشتہ آیا تو گھر کے سب لوگ ہی خوش ہو گئے تھے۔ ظہیر دیکھا بھالا تھا۔ منور بھائی کے ان گھر والوں سے بھی تعلقات تھے۔ خاص طور سے ظہیر کی والدہ نے منور بھائی کو بھی بیٹا بنایا ہوا تھا۔ فیملی بہت اچھی تھی۔ خود ظہیر پڑھا لکھا اور منور بھائی کے مطابق سلجھا ہوا انسان تھا۔ میں بھی اس رشتے سے خوش تھی۔ مجھے شادی سے زیادہ اس بات کی خوشی تھی کہ اب میری امی کی فکریں ختم ہوں گی۔

مینا کو پتا چلا تو وہ بھی بہت خوش ہوئی تھی۔ شادی کے بعد اس سے ملاقات کم ہو گئی تھی۔ کیونکہ اس کا سسرال اسٹیل ٹاؤن میں تھا۔ وہاں سے آنا جانا آسان نہیں تھا۔ مہینے میں مشکل سے ایک بار اپنے میکے آتی تھی اور وہ بھی ایک دو دن کے لیے اس سے بس ایک آدھ گھنٹے کی ملاقات ہو پاتی تھی۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ میری شادی پر رکنے آئے گی۔ وہ شادی سے دو دن پہلے آ گئی تھی۔ شادی کے کچھ عرصے بعد وہ بدل گئی تھی۔ پہلے کی طرح خوش مزاج اور ہنسنے بولنے والی بن گئی تھی۔ میں نے اس کی تبدیلی کو محسوس کیا تھا اور اس پر خوش تھی۔ یقیناً شاہد بھائی نے اسے خوش رکھا تھا اور ان کی محبت اور دل جوئی سے اس کے دل کا زخم بھر گیا تھا۔ اسی طرح میرا رشتہ ہونے پر وہ بہت خوش تھی۔ جب اسے پتا چلا کہ میری شادی کس سے طے ہوئی ہے تو اس نے ملاقات پر میرے کان میں کہا۔ "کیا ہاتھ مارا ہے؟"

"کیا مطلب؟"

"ظہیر بھائی بہت خوب صورت ہیں، تیرے ساتھ جوڑی سجے گی۔"

میں شرما گئی تھی۔ مجھے تو معلوم بھی نہیں تھا کہ خوب صورتی کہتے کسے ہیں۔ بس ایک احساس تھا، بچپن کی کچھ دھندلی سی تصویریں ذہن میں رہ گئی تھیں کہ کوئی شہزادہ ایسا ہوتا ہے۔ تو ظہیر کی صورت میں شہزادہ مجھے لینے آ گیا تھا۔ مگر

شادی کی رات جب یہ خوب صورت سفر اختتام کو پہنچ رہا تھا تو اچانک مجھے لگا جیسے میں نے کوئی بھیانک خواب دیکھ لیا ہو۔ یا جو شہزادے کا خواب دیکھا تھا اس کے بجائے خوفناک جادوگر نکل آیا ہو۔ میں نے امی کے گھر کی طرف جاتے ہوئے دل ہی دل میں فیصلہ کرلیا تھا کہ اب میں واپس یہاں نہیں آؤں گی۔

☆☆☆

میں کمرے میں تھی۔ صبح کا وقت تھا اور آج رات ولیمہ تھا۔ ظہیر کی امی اور بہن آنے والی تھیں لیکن فی الحال ظہیر نے امی کے کہنے پر انہیں روک دیا تھا۔ میرے کان باہر سے آنے والی آوازوں پر لگے ہوئے تھے۔ مینا آگئی تھی اور امی سے پوچھ رہی تھی۔ ''کہاں ہے وہ احمق، سب کو پریشان کردیا ہے۔ میں اس کا دماغ درست کرتی ہوں۔''

وہ میرے کمرے میں آئی۔ ''مونا یہ کیا حرکت ہے، کیوں گھر والوں کو تنگ کررہی ہو؟''

میں اس کے گلے لگی اور سرگوشی میں کہا۔ ''مینا یہ وہی ہے۔''

وہ چونکی۔ ''کون وہی؟''

''پہلے دروازہ اندر سے بند کرو پھر بتاتی ہوں۔''

وہ دروازہ بند کرکے آئی۔ ''مونا تو نے پورے گھر کو پریشان کردیا ہے۔''

میں رونے لگی۔ ''میں کیا کروں میری قسمت ہی خراب ہے پہلے تو رشتہ نہیں آرہا تھا اور پھر شادی بھی ہوئی تو ایک دھوکے باز سے۔''

''ظہیر بھائی....انہوں نے کیا کیا؟''

''مینا یہ وہی شخص ہے جو تجھے کال کرتا تھا۔ تیرا بے نام عاشق۔''

''مونا کیا بکواس کررہی ہے۔''

''سچ کہہ رہی ہوں۔ میں نے اس کی آواز سنی تھی اور جب اس نے تجھے میری جان کہا تھا تو جس لہجے اور انداز میں کہا تھا اسی انداز اور لہجے میں ظہیر نے مجھے کہا۔ ایک ہی انداز میں ایک ہی بات دو آدمی تو بات نہیں کرسکتے۔''

''مونا یہ نہیں ہوسکتا......'' مینا ٹھہرے ہوئے انداز میں بولی۔

''کیوں نہیں ہوسکتا۔'' میں تیز لہجے میں بولی۔ ''میں سننے کے معاملے میں دھوکا نہیں کھاسکتی مجھے پورا یقین ہے یہ وہی شخص ہے۔''

''مونا یہ ممکن نہیں ہے۔'' مینا نے پھر کہا۔

''کیوں؟''

''کیونکہ شاہد وہی شخص ہیں جو گم نام بن کر مجھے کال کرتے تھے۔ جب وہ غائب ہوئے تو یو اے ای میں ان کی جاب لگ گئی تھی اور ان کا ارادہ وہاں جاب کے بعد اپنے گھر والوں کو بھیجنے کا تھا مگر بدقسمتی سے ان کا ایکسی ڈنٹ ہوگیا اور انہیں واپس آنا پڑا۔ پھر وہ ٹھیک ہوئے اور انہیں پورٹ قاسم پر جاب ملی تو انہوں نے اپنے گھر والوں کو رشتے کے لیے بھیجا تھا۔ یہ بات انہوں نے شادی کے کئی مہینے بعد مجھے بتائی تھی۔''

میں دم بہ خود سی سن رہی تھی۔ میں نے بہ مشکل کہا۔ ''مینا تب ظہیر.... میں تو سمجھ رہی تھی کہ گم نام آدمی کی آواز اسی لیے مجھے جانی پہچانی لگی تھی کہ میں گھر میں اکثر ان کی آواز سنتی تھی۔''

''تجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔ ممکن ہے ظہیر بھائی نے تجھے اسی انداز میں کہا ہو۔ لیکن گم نام آدمی شاہد تھے۔''

میرا شرمندگی اور خفت سے برا حال ہوگیا۔ یہ میں نے کیا کیا تھا لیکن جب میں نے ظہیر کے منہ سے یہ دو لفظ سنے تھے تب مجھے پورا یقین ہوگیا تھا کہ وہی وہ گم نام شخص تھا جو مینا کو بے وقوف بنا کر غائب ہوگیا تھا۔ میں گھر والوں کو کیسے بتاتی کہ خاص لمحات میں ظہیر نے مجھے کس طرح پکارا تھا۔ اسی وجہ سے میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ میں اس دھوکے باز آدمی کے ساتھ نہیں رہوں گی۔ اس کے بجائے طلاق لے کر ماں باپ کے گھر آجاؤں گی۔ لیکن اس کی وجہ کسی کو نہیں بتاؤں گی۔ میں نے مینا سے کہا۔ ''اب میں کیا کروں میں تو انہیں اتنا بے عزت کرچکی ہوں۔''

''دیکھ میاں بیوی کے رشتے میں سب سے اہم چیز اعتماد ہوتا ہے تو اسی وقت ان کو بلا اور ان کے سامنے سب کچھ رکھ دے۔ مجھے یقین ہے وہ سلجھے ہوئے آدمی ہیں اور تجھ سے محبت کرتے ہیں تبھی تو تیرے لیے رشتہ بھیجا۔ وہ بات سنبھال لیں گے۔''

مینا سے بات کرکے میرا دل ہلکا ہوا تھا لیکن جب تک میں نے ظہیر سے بات نہیں کرلی اور انہوں نے میری حماقت کو معاف نہیں کردیا میں خوف زدہ ہی رہی تھی۔ شکر ہے آج میں اپنے گھر میں خوش ہوں۔